ایمان والے
محی الدین نواب

پیش لفظ

محترم محی الدین نواب صاحب کی پانچ شاہکار کہانیوں کا ایک اور مجموعہ پیش خدمت ہے۔ پہلے مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی قارئین میں یقیناً پذیرائی حاصل کرے گا۔

نواب صاحب آپ کو کسی اور ہی دنیا میں لے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کہانیاں کسی نئی یا انوکھی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ اسی دنیا اور اسی معاشرے کی داستانیں ہیں جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ہمیں آپ کو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا نہ محسوس ہوتا ہے۔

یہ ایک کامیاب قلمکار کی نظر کی وسعت ہوتی ہے اور کامیاب قلمکار کا ہاتھ معاشرے کی نبض پر ہوتا ہے اور وہ وہی کچھ لکھتا ہے جو ایک عام شخص کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ یہ خوبیاں نواب صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کی تحریر میں موجوں کی روانی اور تلوار کی سی کاٹ ہے۔

وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں' بلا تکان بڑی فصاحت و بلاغت سے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ زبان نہایت آسان اور سادہ استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان کی تحریر کے بہاؤ میں بے خود ہو کر بہتا چلا جاتا ہے۔

نواب صاحب کی تحریر میں برجستگی اور ایک توازن پایا جاتا ہے۔ ایک ایک جملہ اور ایک ایک لفظ اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ نظر آتا ہے۔

ان کا بے رحم قلم بڑی خوبی سے معاشرے کی ناہمواریوں کو بے نقاب کرتا اور معاشرے کے ناسوروں کا پوسٹمارٹم کرتا نظر آتا ہے۔

نواب صاحب سچائی کو اتنی بے رحمی سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بے اختیار کتاب سے نظریں چرانے لگتا ہے۔

ادارہ

فہرست

ایمان والے

وہ پکا ایمان والا تھا۔

بے ایمان اس کے ایمان کے درپے تھے۔

ایسی لرزہ خیز کہانی آپ نے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔

خیرالدین شاہ کی یہ عادت تھی کہ ہر صبح دانتوں کی اور منہ کے اندر کی صفائی دیر تک کرتا تھا۔ یوں تو سب ہی ہر صبح دانتوں کی اور منہ کے اندر کی صفائی کرتے ہیں لیکن اسے صفائی کا خبط تھا۔ برش سے صرف دانت ہی نہیں مسوڑھوں کو بھی خوب رگڑتا تھا۔ الٹے انگوٹھے سے زبان کی صفائی حلق تک کرتا تھا۔ پھر محض کُلی نہیں کرتا تھا' غرغرہ بھی کرتا تھا تاکہ پانی حلق کے اندر تک صفائی کرے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ صفائی محض غسل کے ذریعے اوپری جسم کی نہ ہو' اندر کی بھی ہو۔

صفائی بدن کی ہو تو وہ محض صفائی ہے اور صفائی اگر بدن کے اندر سے ہو تو اسے احساس کی پاکیزگی کہتے ہیں۔

وہ کہا کرتا تھا' اگرچہ خدا کا نام بڑی صفائی سے لیا جائے لیکن ایمان کی گہرائی سے نہ لیا جائے تو پھر وہ صفائی نہیں ہوتی' ایمان کا صفایا ہوتا ہے۔

وہ پیشے کے اعتبار سے ایک صحافی تھا۔ اپنی آنکھوں سے جو دیکھتا تھا' اسے من و عن لکھ کر شائع کر دیتا تھا۔ اس میں اپنی طرف سے ترمیم و اضافہ نہیں کرتا تھا اور کسی خبر کو چٹخارے دار نہیں بناتا تھا۔ حتی الامکان صفائی اور نیک نیتی سے صحافت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ وہ اس پیشے میں ایک فرض شناس اور صاحبِ کردار صحافی نثار عثمانی (مرحوم) سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ ان کا یہ نکتہ ضرور یاد رکھتا تھا "صحافت یہ ہے کہ آج کی خبر آج ہی قارئین تک پہنچا دی جائے اور یہ کہ اگر آپ حکمرانِ وقت کے دورِ اقتدار میں خاموش رہتے ہیں لیکن اس کے رخصت ہوتے ہی اس کے غیر آئینی اقدامات کے خلاف آپ کا قلم حرکت میں آجاتا ہے تو یہ صحافت نہیں ہے۔"

خیرالدین شاہ نے صحافت کا یہی اصول اپنایا تھا اور یہ اصول اپناتے ہی حکمران پارٹی کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ اخبار کا مالک اپنا سر پیٹ کر کہہ رہا تھا کہ وہ حکومتِ وقت کے خلاف کیوں لکھتا ہے؟ جن کی حکومت گزر گئی ہے۔ ان کے غیر آئینی اقدامات اور دھاندلی کے متعلق کیوں نہیں لکھتا؟

خیرالدین شاہ نے پوچھا "آپ کو پریشانی کیا ہے؟ میرے لکھنے سے آپ کے اخبار کو

جبراً بند نہیں کیا جا رہا ہے؟"

اخبار کے مالک نے کہا "تم صحافی ہو۔ بزنس مین نہیں ہو۔ کیا تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری وجہ سے سرکاری اشتہارات ملنے بند ہو گئے ہیں۔ لاکھوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اشتہاروں کے بغیر اخبار کی آمدنی آدھی رہ گئی ہے۔ کیا یہ نقصان تم پورا کرو گے؟"

برسوں پہلے کی حکومتیں جب ناراض ہوتی تھیں تو ناپسند صحافیوں کو جیلوں میں ٹھونس دیتی تھیں۔ مگر جمہوریت کے دور میں پریس کو اور صحافیوں کو آزادی دی جاتی ہے لیکن اشتہارات وغیرہ روک کر اخباروں کے مالکان کے ذریعے یہ پابندیاں لگائی جاتی ہیں کہ قلم کو نرم کرو اور ذرا جھکائے رکھو۔ قلم تو لکھتے وقت جھکتا ہی ہے لیکن وہ قلم کو سجدہ کرانا چاہتے ہیں۔

اس روز خیرالدین شاہ صبح اٹھنے کے بعد دانتوں کو برش کر رہا تھا۔ اسے نو بجے تک اخبار کے دفتر جانا تھا اور اس کے مالک سے دو ٹوک فیصلہ کرنا تھا لیکن شاید ابھی فیصلے کا وقت نہیں آیا تھا۔ وہ دفتر نہیں جا سکتا تھا۔ صبح سے موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان چھلنی ہو گیا ہے اور اب سارا آسمانی پانی زمین پر پہنچ کر ختم ہو گا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں آیا۔ اس کا ملازم کرمو دھوتی باندھ کر کھلے لان میں چلا گیا تھا اور بھنگڑا ڈالتے ہوئے موسم کی پہلی بارش کا مزہ لے رہا تھا۔ شاہ نے اسے آواز دی "اوئے! تیری مت ماری گئی ہے۔ بارش میں بھیگ رہا ہے۔ تجھے ڈبل نمونیا ہو جائے گا۔ چل اندر آجا۔"

وہ ملازم تھا۔ مگر گھر جیسا فیملی ممبر تھا اور اس گھر میں دو ہی فیملی ممبرز تھے۔ ایک وہ خود اور دوسرا کرمو' تیسرا کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی اس سے کہتا کہ بھئی عمر گزر رہی ہے۔ اب تو شادی کر کے گھر بسا لو تو وہ ایک ہی جواب دیتا "میں تو صحافت سے شادی کر چکا ہوں۔ یہ دلہن دن رات فل ٹائم مانگتی ہے اسی لیے میں کسی اور دلہن کو ٹائم نہیں دے سکوں گا۔"

کرمو نے لان میں اچھلتے کودتے بارش میں بھیگتے ہوئے کہا "صاحب جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بارش میں بھیگنا نہیں چاہیے لیکن ہمارے بزرگوں نے یہ بھی تو کہا ہے کہ پہلی بارش میں نہانے سے جسم کے تمام گرمی دانے مرجھا جاتے ہیں۔ سچ کہتا ہوں' بڑا آرام اور سکون محسوس کر رہا ہوں۔"

دانے خیرالدین شاہ کے جسم پر بھی تھے۔ ان میں چبھن اور خارش بھی ہوا کرتی تھی۔ کرمو کی باتیں سن کر اسے اپنے دانوں سے پیدا ہونے والی تکلیف کا احساس ہوا۔ یہ

نفسیاتی حقیقت ہے کہ احساس دلاؤ تو بیماری کا احساس ہوتا ہے۔ اُس نے بھی بزرگوں سے سنا تھا کہ پہلی بارش میں بھیگنا چاہیے۔ بزرگوں کے اقوال پر عمل کرنے سے جسمانی اور ذہنی امراض دور ہو سکتے ہیں تو ضرور عمل کرنا چاہیے کیونکہ فرد کا جسم اور ذہن امراض سے دور ہوں تو پورا معاشرہ صحت مند ہوتا ہے۔

وہ بھی قمیض اتار کر برآمدے سے نکل کر لان میں آگیا۔ بارش میں خوب جی بھر کے بھیگنے لگا۔ بدن کے گرمی دانوں کو ٹھنڈک پہنچنے لگی۔ مگر ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ چہرے پر اگنے والے کیل مہاسے جوانی کی گرمی سے ہوتے ہیں اور جوانی کی برسات میں ہی بھیگ کر رخصت ہوتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب سے اس کی بے تکلفی تھی۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ شادی کرلو۔ ان کیل مہاسوں پر صرف گھر والی ہی مرہم لگا سکتی ہے۔ اس نے بارش میں بھیگتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل یوں گرج رہے تھے جیسے بزرگوں کی طرح گرج گرج کر پوچھ رہے ہوں' نالائق تُو شادی کیوں نہیں کر رہا ہے؟

آسمان پر بجلیاں بھی کڑکتی ہوئی' چمکتی ہوئی' اپنی جھلک دکھاتی ہوئی چھپ رہی تھیں زمین پر کتنی ہی بجلیاں اس کی زندگی میں چمکتی دمکتی آئیں پھر مایوس ہو کر گم ہو گئیں۔ کیونکہ وہ اُن سے اخباری لہجے میں گفتگو کرتا تھا۔ سب سے پہلے ایک اچھی قبول صورت لڑکی اسے پسند آئی تھی۔ لڑکی نے بھی اسے پسند کیا تھا۔ ایک دن وہ بولی "میں ہر روز اپنے ماں باپ کے جھگڑوں سے تنگ آگئی ہوں۔"

خیرالدین شاہ نے کہا "اچھا تو تمہارے گھر میں بھی دو پارٹیاں ہیں۔ یہ بتاؤ ان میں سے عوام کا اعتماد کسے حاصل ہے؟"

لڑکی نے حیرانی سے پوچھا "عوام کا اعتماد؟"

"میرا مطلب ہے۔ گھر میں جتنے لوگ ہیں' وہ اپنے اعتماد کا ووٹ تمہاری امی کو دیتے ہیں یا ابو کو؟"

وہ بولی "یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ گھر کے لوگ کبھی امی کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اور کبھی ابو کی طرف لڑھک جاتے ہیں۔"

"یہی خرابی ہماری قوم میں ہے۔ کوئی حالات کو پیشِ نظر رکھ کر ذہانت سے اور مستقل مزاجی سے نہ سوچتا ہے' نہ سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کئی ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔"

وہ جھنجلا کر بولی "تم قوم کو ہمارے درمیان کہاں سے گھسیٹ لائے؟ میں اپنے گھر

کی بات کر رہی ہوں۔"

"یہی تو ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے اپنے گھر کی باتیں کرتے ہیں۔ اپنے اپنے گھر کی فکر کرتے ہیں اور ملک کو بھول جاتے ہیں۔"

اس دن کے بعد اس لڑکی نے کبھی خیرالدین شاہ سے بات تک نہیں کی۔ کبھی وہ نظر آیا تو منہ پھیر کر چلی گئی۔ وہ روٹھ گئی تھی۔ منائی جا سکتی تھی لیکن فل ٹائم لکھنے پڑھنے والے صحافی کو اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ وہ محبوبہ کو منانے کے سلسلے میں کچھ پُر اثر مکالمے یاد کر لیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے فل ٹائم محبت کرنے والے سے شادی کر لی۔ اب وہ پانچویں بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کے بعد بھی چند لڑکیوں اور چند عمر رسیدہ عورتوں نے بھی' اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ پھر اسے پانچ عدد لعنتی انگلیاں دکھا کر چلی گئیں۔

اس صحافی کے سینے میں بھی دل تھا۔ ایک قلم کار ہونے کے باعث اسے خشک سیاسی موضوع کے علاوہ شاعری سے' پڑھنے اور سننے کی حد تک لگاؤ تھا۔ کبھی خیالوں میں کبھی خوابوں میں کوئی آتی تو وہ اس کے متعلق سوچتا رہ جاتا۔ اس وقت بارش میں بھیگتے وقت اسے ساون کے گیت یاد آ رہے تھے۔

ہر انسان کے دل میں چاہے جانے کی تمنا ہوتی ہے۔ اس کے دل میں بھی یہ خواہش تھی کہ اسے کوئی چاہنے والی اس کے پاس' اس کے گھر میں رہے۔ عورت کیسی ہوتی ہے؟ کیا ہوتی ہے؟ اس نے دور سے دیکھا تھا۔ کبھی قربت حاصل نہیں کی تھی۔ شادی کے بغیر قربت کے تصور کو بھی گناہ سمجھتا تھا۔ ایک عورت کو اس کی اور اپنی پاکیزگی سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں کبھی بھولے بھٹکے کوئی چور خیال پیدا ہوتا تو وہ فوراً سجدے میں پہنچ جاتا تھا۔

ایسے مسلمان کہیں کہیں پائے جاتے ہیں جو طہارت کو نصف ایمان سمجھتے ہیں اور سمجھ کر عمل کرتے ہیں۔ خیرالدین شاہ کو غسل کرتے وقت ایک عجیب ہی روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اس نے بارش میں بھیگتے ہوئے کہا "کرمو! بارش زور پکڑتی جا رہی ہے۔ جا' ذرا اندر کا چکر لگا کر آ۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے پانی کمروں میں آ سکتا ہے۔"

جہاں اس کا مکان تھا' وہاں آس پاس کئی ہزار گز کے فاصلے پر کوئی دوسرا مکان تھا۔ اُدھر نئی بستی بسائی جا رہی تھی۔ کرمو مکان کے اندر چلا گیا۔ خیرالدین شاہ کو اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بارش کا نظارہ کرنے احاطے کے گیٹ کے پاس آیا لیکن گیٹ کے باہر قدم رکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ عین نگاہوں کے سامنے ایک لڑکی گٹھری کی طرح سمٹی پڑی تھی۔ اس کا سر

دونوں گھٹنوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ پہلا خیال یہی آیا کہ کسی نے لڑکی کو قتل کر کے لاش اس کے گیٹ کے پاس پھینک دی ہے۔

ایک برس پہلے کی بات ہے وہ گوجرانوالہ میں تھا۔ اس کے ابا کی پرچون کی دکان شہر سے باہر تھی۔ جب کالج کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو وہ لاہور سے آ کر والدین کے پاس رہا کرتا تھا اور کبھی کبھی پرچون کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا۔ ایک روز دکان کے سامنے ایک ویگن کار ایک سائیکل سوار کو ٹکر مار کر چلی گئی۔ وہاں کوئی راہ گیر نہیں تھا۔ دکانیں بھی چار تھیں' جن میں سے دو بند تھیں۔ ایک سبزی فروش کی دکان کھلی تھی۔ وہ اور سبزی فروش اس حادثے کے عینی گواہ تھے۔ دونوں اپنی دکانوں سے نکل کر زخمی سائیکل سوار کے پاس گئے۔ وہ زمین پر ساکت پڑا تھا۔ اس کی حالت بہت نازک تھی۔

انہوں نے فوراً ایک رکشا پکڑا اور اسے لے کر اسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر نے اسے پولیس کیس کہہ کر ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے زخمی کو وہیں چھوڑ کر قریبی تھانے میں جا کر رپورٹ کی۔ پولیس ان کے ساتھ اسپتال پہنچی مگر اس وقت تک زخمی چل بسا تھا۔

خیرالدین شاہ غصے سے کھول گیا۔ ان دنوں وہ کالج میں یونین کا لیڈر تھا۔ تعلیم کے دوران ہی سیاست کی راہ اختیار کر چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کا گریبان پکڑ کر پوچھا "تم انسانوں کو زندگی دیتے ہو' اگر پولیس کے آنے سے پہلے اس زخمی کو ابتدائی طبی امداد پہنچا دیتے تو تمہارا یا قانون کا کیا نقصان ہوتا؟"

انسپکٹر نے کہا "اے لڑکے! زیادہ لیڈری نہ دکھاؤ۔ ڈاکٹر نے قانون کے مطابق عمل کیا۔ تم دونوں اسے ہلاک کر کے اسپتال لے آئے۔ ذرا تھانے چلو' معلوم تو ہو بے چارے مقتول سے تمہاری دشمنی کیا تھی؟"

وہ پولیس والا اپنی کمائی کے چکر میں وہ مُردہ اُن دونوں کے سر ڈال رہا تھا۔ خیرالدین شاہ طیش میں آ کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سبزی فروش اسے پکڑ کر اسے ایک طرف لے گیا۔ اسے سمجھانے لگا "عقل سے کام لو۔ وہ لاش ہم لائے ہیں۔ تمہاری یونین والی لیڈری' دھونس اور دھمکیاں یہاں نہیں چلیں گی۔"

وہ پڑوسی دکان دار سبزی فروش روزانہ منڈی سے دکان آنے تک ایسے پولیس والوں سے سمجھوتا کرنے اور معاملات طے کرنے کے گُر جانتا تھا۔ خیرالدین شاہ کے والد اور چچا وغیرہ بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے قتل کا خواہ مخواہ الزام لگنے نہیں دیا۔ انسپکٹر کو اسپتال کے ایک کمرے میں لے جا کر اس کے مطالبات پورے کر دیئے۔ اس طرح وہ دونوں جیل جانے اور سزائیں پانے سے بچ گئے۔

یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ خیرالدین شاہ نے دل میں عہد کیا تھا کہ وہ صحافی بن کر ایسی حرام خوری اور ملک میں ہونے والی دھاندلیوں کے خلاف لکھے گا اور اپنے قلم سے قوم کو بیدار کرے گا۔

یہ بہت مشکل تھا۔ وہ برسوں سے لکھتا آرہا تھا۔ اس کی طرح بے شمار صحافی حضرات تھے۔ وہ سب جتنا لکھ رہے تھے' اتنا ہی ملک میں کرپشن بڑھتا جارہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے قلم سے واہ واکر رہے ہوں اور مجرا کرنے والے ہرواہ پر پہلے سے زیادہ ٹھمکے لگا رہے ہوں۔

بات ابھی کی تھی۔ خیرالدین بارش میں بھیگتا ہوا گیٹ کے پاس کھڑا پریشانی سے اس لڑکی کی لاش کو دیکھ رہا تھا جو ایک گٹھری کی طرح گیلی زمین اور کیچڑ میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ لاش اس کے دروازے کے سامنے کیوں پھینکی گئی ہے؟ یہ ایک اہم سوال تھا خیرالدین شاہ نے دو روز پہلے ایک کالم لکھا تھا۔ جس کا عنوان تھا "سب ٹھیک ہے۔"

اس نے اس عنوان کے تحت لکھا تھا "ملک میں کرپشن بڑھتا جا رہا ہے۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام رشوت دیئے بغیر نہیں ہوتا۔ منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات ہوں یا سیاسی پارٹیوں کے جھگڑے ان کے باعث بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی ساکھ بگڑ رہی ہے مگر سیاست دان ہمیشہ یہ بیان دیتے ہیں کہ سب ٹھیک ہے۔ یعنی ملک میں امن و امان اور خوش حالی ہے۔ دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ دہشت گرد بھرے بازار میں فائرنگ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور برسوں سے سیاست دانوں کا ایک ہی بیان ہے کہ اب کسی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ گویا پہلے اجازت دی گئی تھی۔ اب نہیں دی جائے گی۔ ایسے بیانات دیتے دیتے حکومت کی مدت پوری ہو جاتی ہے۔ وہ چلی جاتی ہے' دوسری حکومت آجاتی ہے پھروہ بھی بالکل یہی فقرے ادا کرتے کرتے رخصت ہو جاتی ہے۔"

خیرالدین شاہ نے یہ کالم دو روز پہلے لکھا تھا اور تیسرے دن اُس کے مکان کے سامنے وہ لاش پڑی تھی۔ یہ ایک سچ لکھنے والے صحافی کے خلاف سازش بھی ہوسکتی تھی۔ اس پر کیس بنایا جاسکتا تھا۔ برسوں پہلے کی طرح ایک مُردہ اس کے کھاتے میں ڈالا جاتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح رٹی ہوئی وارننگ دی گئی تھی کہ کسی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور یہ ثابت ہونے والا تھا کہ سچ لکھنے کا دعویٰ کرنے والے صحافی نے قانون کو ہاتھ میں لیا ہے۔ ایسی حالت میں اسے فوراً ہی اپنے اخبار کے دفتر میں جانا چاہیے

تھا اور فون کے ذریعے سب سے پہلے صحافی برادری سے رابطہ کرنا تھا۔ کسی کے قتل کے الزام میں پھنسنے سے پہلے اپنی پوزیشن کو مضوط بنانا لازمی تھا۔

وہ قمیض پہننے کے لیے پلٹ کر جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت ایک کراہ سنائی دی۔ اس نے چونک کر لاش کو دیکھا۔ وہ لاش نہیں تھی۔ ابھی اس میں زندگی کے آثار تھے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر کراہ رہی تھی۔ اس نے ذرا قریب جاکر دیکھا۔ اس کے گلابی ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور دانت پر دانت جمے ہوئے تھے۔ اس نے ذرا جھک کر اسے ہاتھ لگایا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی مگر سانس چل رہی تھی۔ اس نے آواز دی "اے! تم کون ہو؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سردی اور تیز بارش میں تھر تھرا رہی تھی۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ اسے اس حالت میں چھوڑ کر اپنے اس اخبار کے دفتر نہیں جاسکتا تھا' جو وہاں سے میلوں دور شہر کے وسط میں تھا۔

اور اگر پہلے رپورٹ کرنے جاتا تو وہ لڑکی اسی طرح مرجاتی جیسے وہ سائیکل سوار فوری طبی امداد نہ ملنے پر مرگیا تھا۔ یہ دستور لازمی ہے کہ پہلے زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے والوں کی جان بچائی جائے پھر قانونی کاروائی کی جائے۔

خیرالدین شاہ کے لیے یہ سیدھا سادا سا ایک دم توڑنے والی لڑکی کا کیس تھا۔ مگر جو اوپر سے جسیم ہی نہیں' اندر سے دل کو بھی پاک و صاف رکھتا تھا' اس نے اللہ کا نام لیا اور اس لڑکی کو دونوں بازوؤں میں اٹھالیا۔ پھر مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ کرمو نے برآمدے میں آکر حیرانی سے اسے دیکھا۔ جو عورتوں سے ہمیشہ دو ہاتھ دور رہ کر باتیں کیا کرتا تھا' وہ کسی لڑکی کو بازوؤں میں اٹھا کر لا رہا تھا۔ اس نے پوچھا "صاحب جی! .... یہ کون ہے؟"

اس نے جواب دیا "بارش میں اولے پڑتے ہیں۔ ہمارے سر پر یہ آپڑی ہے۔ کچھ بولنے کے قابل ہوئی تو بتائے گی کہ کون ہے۔ تم فوراً دوڑ کر جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو لے آؤ۔"

"اتنی بارش میں شاید ہی کوئی ڈاکٹر آئے پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ اسے اٹھائے برآمدے میں آگیا۔ کرمو جارہا تھا۔ اس نے کہا "ڈاکٹر نہ آئے تو رکشہ یا ٹیکسی پکڑلانا۔ ہم اسے اسپتال لے جائیں گے۔"

کرمو چلا گیا۔ وہ اسے اٹھائے اپنے کمرے میں آیا پھر اسے بستر پر لٹا دیا۔ وہ پہلے گٹھری جیسی تھی۔ لٹاتے ہی الف کی طرح ایسی سیدھی پھیل گئی جیسے کسی شاعر کا دیوان کھل گیا ہو۔ اس کا بھیگا ہوا بدن غزل کے ایک ایک مصرعے کے معنی و مفہوم ادا کر رہا

تھا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے بخار تھا یا وہ رواں دواں عمر کی حرارت تھی؟ وہ اس پر کمبل ڈالتا' تب بھی کمبل کے اندر بھیگا ہوا لباس اس پر کپکپی طاری رکھتا۔

اسے خشک لباس اور گرمی پہنچانے کی ضرورت تھی۔ خیرالدین شاہ اسے اپنا کوئی سا بھی لباس پہننے کو دے سکتا تھا مگر وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ پھر خود ہی کیسے پہنتی؟

اس نے الماری سے اپنا ایک لباس نکالا' بستر کے پاس آکر اسے آواز دی "سنو! آنکھیں کھولو۔ حوصلہ کرو اور یہ لباس پہنو ورنہ سردی سے مر جاؤ گی۔"

وہ دوڑ کر ایک ہیٹر لے آیا۔ اسے پلنگ کے قریب رکھ کر آن کر دیا پھر کہا "اب کمرا کچھ گرم ہو گا......... جب لباس بدل لو تو کمبل اوڑھ لینا۔ ڈاکٹر آنے والا ہے۔ میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔ سن رہی ہو؟ باہر سے دروازہ بند کر دوں گا۔ تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا' کپڑے بدل لو۔"

وہ کمرے سے باہر گیا پھر دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ انتظار کرنے لگا کہ ڈاکٹر آجائے اور وہ لباس بھی بدل لے۔ ایسے میں اطمینان بھی تھا کہ اب وہ پوری طرح زندگی کی طرف لوٹ آئے گی۔

اس نے تھوڑی دیر بعد آواز دی "کیا لباس بدل لیا؟ کمبل اوڑھ لو۔" اندر خاموشی رہی۔ وہ بے چینی سے بولا "بھئی کچھ تو بولو۔ میری نیکی کے بدلے کچھ تو بول کر زندگی کا ثبوت دو۔"

لیکن اندر مسلسل خاموشی رہی۔ وہ دروازے کی چٹخنی نیچے کرتے ہوئے بولا "میں دروازہ کھول دوں؟"

خاموشی دل دھڑکا رہی تھی۔ خوف طاری کر رہی تھی۔ وہ بولا "میں دروازہ کھول کر آرہا ہوں۔"

وہ اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر کلیجہ دھک سا رہ گیا۔ وہ ایک لاش کی طرح چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ وہ اپنے بھیگے ہوئے لباس میں بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ صرف سینے کی ہلکی سے لرزش بتا رہی تھی کہ ابھی سانس چل رہی ہے۔ اگر وہ مسیحائی نہیں کرے گا تو وہ چل بسے گی۔

اس نے سوچا' کتنا اچھا ہوتا کہ گھر میں کوئی عورت ہوتی۔ سارے مسائل حل ہو جاتے۔ وہ سہارے کے لیے دوڑتا ہوا برآمدے میں آیا تاکہ کرمو آجائے تو کچھ کیا جائے۔

مگر کرمو بھی تو مرد تھا۔ اسے گیلے کپڑوں سے کون نجات دلاتا۔ ویسے کرمو نہیں تھا۔ اتنی تیز بارش میں شاید ہی کوئی ڈاکٹر آتا اور اگر آنا چاہتا تو رکشا' ٹیکسی والے نخرے

دکھاتے۔ اس نے واپس آ کے کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ کسی لڑکی کے قتل سے بچنے کا اب صرف ایک ہی راستہ تھا کہ اپنے ہی ہاتھوں سے گیلا لباس اتارا جائے اور اپنا کوئی جوڑا اسے پہنا کر اچھی طرح کمبل میں لپیٹا جائے۔ صرف ایک ہیٹر گرمی نہیں پہنچا سکتا تھا۔

وہ پیدائشی کنوارا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دل کبھی خوف سے' کبھی خوشی سے اور کبھی احساسِ گناہ سے دھڑکتا تھا۔ وہ دل کو سمجھا رہا تھا کہ وہ تو نیکی کر رہا ہے اور اکثر نیکیاں گناہوں کے راستوں سے ہو کر گزرتی ہیں تاکہ نیکی کرنے والوں کی ثابت قدمی کی آزمائش ہوتی رہے۔

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر لباس تبدیل کر رہا تھا۔ بعض اوقات اخلاقی تقاضے ناگوار فرائض کی ادائیگی پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ ایسا نہ کرتا تو یہ انسانیت سے بعید ہوتا۔ ڈاکٹر بھی زندگی دینے کے لیے آپریشن کرنے سے پہلے لباس اتارتے ہیں لیکن اخلاقی حدود میں رہتے ہیں۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں کی شرم رکھی۔ نظریں چرا کر' ایک حد میں رہ کر اسے گیلے کپڑوں سے نجات دلائی اور اپنا ایک لباس اسے پہنا دیا۔ کمبل بھی اس پر ڈال دیا۔ ہیٹر پہلے سے آن تھا لیکن اب وہ ہیٹر سے قریب ہونے کے باوجود کانپ رہا تھا۔ حواسِ خمسہ میں ایک حس یعنی چھونے کی حس اس کی پارسائی کو چیلنج کر رہی تھی کہ آدھی جوانی گزار کر آخر اس نے کسی کو اندھے کی طرح ٹٹول ہی لیا اور یہ اندھاپن اسے چشمِ تصور سے جانے کیا کیا دکھا رہا تھا اور اس بے چارے پر کپکپی طاری کر رہا تھا۔

اگرچہ اس نے اپنا لباس بھی بدل لیا تھا اس کے باوجود ایسے کانپ رہا تھا جیسے ساون میں برف باری ہونے لگی ہو۔ وہ ڈاکٹر نہیں تھا۔ اس لیے علاج الٹا ہو گیا تھا۔ کمبل میں لپٹنے والی کے حصے کی سردی اب اسے لگ رہی تھی۔

کرمو ڈاکٹر کو لے آیا۔ دونوں نے اندر آتے ہی اس حسینہ کے گیلے کپڑے ایک طرف پڑے دیکھے۔ کمبل کے اندر سے جابجا مردانہ لباس جھلک رہا تھا۔ کرمو معنی خیز انداز میں اپنا سر کھجانے لگا۔ خیرالدین شاہ جھینپ رہا تھا۔ اس نے نیکی کرنے کے دوران یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ لباس کی تبدیلی ایک افسانہ بن جائے گی۔

ڈاکٹر نے تھوڑی دیر تک اس کا معائنہ کیا۔ ایک انجکشن لگایا پھر خیرالدین شاہ سے کہا "اگر آپ نہ جانتے ہوں تو میں یہ خوش خبری سنا دوں کہ آپ باپ بننے والے ہیں۔"

"جی؟" اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ ڈاکٹر سمجھا کہ باپ خوشی سے چیخ پڑا ہے۔ جب ڈاکٹر سے نظریں ملیں تو اسے جبراً مسکرانا پڑا۔ تبدیل شدہ کپڑوں نے اسے کچھ کہنے

کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے کہا "آپ تعلیم یافتہ ہیں' سمجھ دار ہیں' ایسی حالت میں وائف کو بھیگنے سے منع کرنا چاہیے تھا۔"

کرمو نے کہا "ہماری مالکن بڑی ضدی ہیں۔ بس نہانے کو جی چاہا۔ بارش میں نکل پڑیں۔"

خیرالدین شاہ نے کرمو کو گھور کر دیکھا۔ ڈاکٹر نے کہا "میں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ کچھ دوائیں میڈیکل اسٹور سے ملیں گی۔ باقی میری ڈسپنسری سے مل جائیں گی۔ ابھی آپ کا ملازم لے آئے گا۔"

اس نے ڈاکٹر کی فیس ادا کی۔ کرمو اس کے ساتھ چلا گیا۔ وہ پلنگ کے قریب ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اسے بے اختیار دیکھنے لگا۔ اس میں بے انتہا کشش تھی۔ وہ اس کشش کو دور تک سمجھ سکتا تھا۔ بیان نہیں کر سکتا تھا۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ماں بننے والی ہے اسے یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ کسی کی بیوی ہے یا بیوی بننے سے پہلے کسی مرد سے ہار چکی ہے؟ ہاری ہوئی لڑکیاں بدنامی کے خوف سے میکا چھوڑ کر بھاگتی ہیں اور جیتنے والی لڑکیاں اپنا سسرال چھوڑ کر نہیں آتیں۔ پتا نہیں وہ کن حالات سے گزر کر آئی تھی۔ شاید وہ سسرال بھی ہار گئی ہو' شوہر نے گھر سے نکال دیا ہو۔

ظہر کی اذان سن کر وہ اٹھ گیا۔ وضو گڑبڑا گیا تھا۔ اس نے تازہ وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ پھر اس اجنبی حسینہ کی صحت یابی اور اس کی نیک چلنی کے لئے دعائیں مانگیں۔

وہ دن گزرنے لگا۔ شام کو اس نے کراہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ اس نے کرمو کی لائی ہوئی دوا اسے کھلائی اور پلائی۔ وہ کچھ کھانا نہیں چاہتی تھی۔ کرمو نے اسے دودھ اور ڈبل روٹی کھلائی۔ دوسری صبح پھر بخار تیز ہوا۔ شاہ نے پھر ڈاکٹر کو بلوایا۔ اس نے معائنہ کیا پھر بڑبڑایا۔ "آج کل کی دواؤں میں ایسی ملاوٹ ہوتی ہے کہ ہم ڈاکٹر ہو کر سمجھ نہیں پاتے۔ ہمیں بار بار نسخہ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔"

اس نے دوسرا انجکشن لگایا۔ دوسرا نسخہ لکھ دیا پھر چلا گیا۔ وہ پچھلے دن سے سو رہی تھی یا پھر غنودگی طاری رہتی تھی۔ دوسرے انجکشن اور دواؤں نے اثر دکھایا۔ اس کا بخار اتر گیا لیکن وہ آنکھیں نہیں کھول رہی۔ اس کی لانبی پلکوں میں ہلکی سی لرزش ہوتی تھی۔ اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر پھر بند کر لی تھیں جیسے طویل تاریکی کے بعد روشنی اسے چبھ رہی ہو۔

وہ کرمو کے ہاتھوں سے کھاتی پیتی تھی۔ خیرالدین شاہ کا سامنا ہوتے ہی لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ شاہ کو یہ معلوم کرنے کی بے چینی تھی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ مگر دو دن اور دو راتیں اِس طرح گزریں کہ وہ اُس سے کتراتی رہی۔ اس کا اندازہ بتا رہا تھا کہ وہ جھجک رہی ہے اور اس کی طرف سے ہونے والے ان سوالات سے کترانا چاہتی ہے' جو ابھی اس نے کئے نہیں تھے۔

اس نے مریضہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ کرمو سے کہا۔ "دو دن ہو گئے۔ ذرا دفتر ہو کر آتا ہوں۔ محترمہ کو ایسی حالت میں جانے نہ دینا۔ ذرا سمجھانے کی کوشش کرنا کہ سہارا دینے والے اجنبی ہوتے ہیں مگر سہارا دینے کا عمل آپس میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔ بہتر ہے کہ وہ مجھ پر اعتماد کرے۔"

وہ دفتر پہنچا تو مدیر اور مالک اس کی غیر حاضری سے فکر مند تھے۔ اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کیا۔ ابھی وہ اجنبی مریضہ کے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اس کے بارے میں خود کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایک اطمینان تھا کہ وہ زندہ ہے اور بخیریت ہے اور اس نیکی کرنے والے پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔

وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن دفتر میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے یاد آنے لگی تھی۔ مدیر نے اس سے کہا۔ "تمہارے کتنے ہی مضامین جمع ہو چکے ہیں لیکن ابھی شائع کرنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ایسا کرو جو مضمون شائع ہونے والا ہے اسے اس لفافے سے نکال کر اس دوسرے لفافے میں رکھ دو۔"

اس نے ہدایت پر عمل کیا۔ اس کے سامنے لفافے دو تھے۔ اسے یوں لگا جیسے لباس دو ہیں اور وہ ایک مضمون ایک بدن ہے اور وہ اس بدن کو ایک لباس سے دوسرے لباس میں منتقل کر رہا ہے۔

اسے بچپن سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ ذرا بھی بھول ہو فوراً ٹھٹک جایا کرے اور اس بھول کا احساس کرے۔ کیونکہ احساسات مثبت ہوں تو انسان کے اندر پاکیزگی مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ اس وقت بھی ایک لفافے سے دوسرے لفافے میں اس بدن کو منتقل کرتے وقت مضمون کے صفحات ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ وہ تربیت کے مطابق ٹھٹک گیا۔ اسے غلطی کا احساس ہوا کہ وہ ایک ایسی پرائی عورت کے متعلق سوچ رہا ہے' جو کسی کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

وہ لفافے کو مدیر کے حوالے کر کے قریبی مسجد میں نماز پڑھنے چلا گیا۔ جب سے وہ گھر آئی تھی' وہ نماز پڑھنے کے بعد اُس کے لیے دعائیں مانگتا رہتا تھا کہ وہ اگر شوہر کی کسی

غلط فہمی سے دور کردی گئی ہے تو وہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ اسے اس کا مجازی خدا مل جائے۔ وہ اپنے ہونے والے بچے کو اس کے باپ کا نام دے کر فخر محسوس کرے اور اگر وہ کسی مرد کے فریب میں آکر یہ سنگین غلطی کر بیٹھی ہے تو غفورالرحیم اس کی اِس غلطی کو معاف کردے۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ صراط مستقیم پر چلے۔

وہ نماز کے بعد دفتر کے کچھ کام نمٹا کر گھر واپس آیا۔ پھر برآمدے پر پہنچ کر دستک دی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھلا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے خوش ہو کر کہا "خدا کا شکر ہے تم چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہو۔ وہ کرمو کہاں چلا گیا؟"

اس نے سوال کا جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر اندر جانے لگی وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آیا پھر کرسی پر بیٹھ کر جوتے اور جرابیں اتارتے ہوئے بولا "میں نے ابھی پوچھا تھا کہ کرمو کہاں ہے؟"

اس نے سنا پھر کمرے سے ایسے چلی گئی جیسے گونگی اور بہری ہو۔ نہ سن سکتی ہو اور نہ بولنا جانتی ہو۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ لڑکی دو دنوں سے وہاں تھی اور اس نے ابتدا میں صرف اس کے کراہنے کی آوازیں سنی تھیں۔ ابھی تک اس کی گفتگو نہیں سنی تھی۔

وہ پھر کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھوں میں پانی سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ وہ شام کو دفتر سے آکر وٹامن کی ایک گولی کھاتا تھا اور پانی پیتا تھا۔ کرمو روز کا یہ معمول جانتا تھا۔ اس نے پوچھا "کیا کرمو نے تمہیں میرا یہ معمول بتایا ہے؟ وہ خود کہاں ہے؟"

اسی وقت احاطے کا گیٹ کھلا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا' کرمو بازار سے سودا لے کر آرہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ کچن کی طرف جانے لگی۔ اس نے کہا "رک جاؤ کچن کا کام وہ سنبھال لے گا۔ تم اِدھر آؤ اور میرے سامنے بیٹھو۔"

وہ سامنے آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ کرمو نے کمرے میں آکر پوچھا "صاحب جی! آپ آگئے۔"

وہ لڑکی سے باتیں کرنا چاہتا تھا' اس کی مداخلت پر جھنجلا کر بولا "عجیب گدھے ہو' آیا ہوں' تب ہی نظر آرہا ہوں۔ جاؤ جلدی کھانا تیار کرو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ سودے کے تھیلے اٹھائے کچن میں چلا گیا۔ شاہ نے پوچھا "کیا تم بول سکتی ہو؟" اس نے سر جھکا لیا' وہ بولا "اگر گونگی ہو تو اشاروں کی زبان آتی ہو گی اور اگر کچھ پڑھنا لکھنا جانتی ہو تو لکھ کر بتاؤ تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟"

اس نے ایک ڈائری کھول کر اس کے سامنے کردی اور ایک قلم بھی اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے قلم اٹھا کر لکھا۔ "میرا نام شاہدہ ہے اور میں گونگی نہیں ہوں۔"

خیرالدین شاہ نے اسے حیرانی سے دیکھا' پھر کہا۔ "تعجب ہے۔ گونگی نہیں ہو۔ بول سکتی ہو پھر کیوں لکھ رہی ہو؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میں گونگی رہنا چاہتی ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے بولنے یا لکھنے پر مجبور نہ کریں۔"

"میں مجبور نہیں کروں گا لیکن گونگی بن کر رہنے کی وجہ بتا دو۔"

"ڈرتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ آپ کے بے شمار سوالات کے جواب کیسے دوں گی؟"

"اور میں دنیا والوں کو کیا جواب دوں گا۔ سوالات ہوں گے۔ لڑکی کون ہے؟ میرا تم سے کیا رشتہ ہے؟ تم مجھے کہاں ملیں؟ کن حالات میں ملیں؟"

"یہ مردوں کی دنیا ہے۔ مردوں کے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا ہے۔ جواب نہ ہو تو حیلے بہانے بہت ہوتے ہیں۔"

"اس کے باوجود میرے پاس ایک سوال کا جواب نہیں ہے۔ وہ جواب صرف تمہارے پاس ہے یعنی یہ کہ تمہارا علاج کرنے والا ڈاکٹر مجھے تمہارے ہونے والے بچے کا باپ سمجھ رہا تھا۔"

اُس کا سر جھک گیا۔ اس نے سر پر آنچل لینے کے بہانے اپنا آدھا چہرہ چھپا لیا۔ وہ بولا۔ "ابھی وہ ڈاکٹر ایسا سمجھ رہا ہے۔ پھر ایک ایک کر کے دنیا والے بھی یہی سمجھنے لگیں گے۔"

"ہاں۔ یہ بات تو چھپی نہیں رہے گی۔ میں گونگی بن کر رہوں گی تو تین چار ماہ کے بعد میرا پیٹ بولنے لگے گا۔"

"تمہیں سہارے کی اور پناہ کی ضرورت ہے۔ اپنے لئے نہ سہی' اپنے بچے کے لئے مجھ پر بھروسا کرو۔" اس کے حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ بھروسا کرنے پر مجبور تھی۔

خیرالدین شاہ نے اسے حوصلہ دینے کے لئے کہا۔ "جسم سے بیماری کو اور گھر سے مصیبت کو نکالا جاتا ہے۔ اگر تم بیمار ہو تو تمہارا علاج کراؤں گا اور مصیبت ہو تو مصیبت کی وجوہات کو ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

شاہدہ نے اسے احسان مندی سے دیکھا۔ پھر دھیمی آواز میں بولی۔ "میں ایک پنڈ کی رہنے والی ہوں۔ آپ مجھ سے میرے پنڈ کا اور میرے بابا کا نام نہ پوچھیں۔"

"میں اپنی طرف سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ جتنا بتاؤ گی' اتنا ہی سنوں گا۔"

اس نے اپنی داستان سنانی شروع کردی۔

☆=========☆=========☆

"میں بچپن ہی سے اپنے پنڈ میں بہت خوش نصیب سمجھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ میری خوب صورتی کا چرچا ہوتا تھا یا شاید اس لئے کہ وہاں کا سنگدل زمیندار مجھ پر اور میرے بابا پر مہربان تھا۔ میں سات برس کی تھی تب میری ماں مرگئی۔ پنڈ میں وہ پہلی عورت کی میت تھی، جسے زمیندار کاندھا دینے آیا تھا۔ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے بیٹی کہا تھا۔ ہر عید پر میرے لئے قیمتی کپڑوں کا جوڑا اور عیدی کے سو روپے بھیجا کرتا تھا۔ بابا اس کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ وہ ایسا مغرور اور سنگدل تھا کہ کسانوں کو گالیاں دیتا تھا۔ انہیں لاتوں اور جوتوں سے مارتا تھا۔ وہاں کے غریب اس سے مار کھاتے تھے۔ اس کے منہ پر کچھ نہیں بولتے تھے لیکن زیرِ لب کہا کرتے تھے کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ غریبوں پر ظلم کرتا ہے اس لئے اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔

اس نے شادی کی، چار برس تک انتظار کیا۔ پھر بیوی کو بانجھ کہہ کر طلاق دے دی۔ دوسری بیوی بھی چھ برس تک اسے باپ نہ بنا سکی۔ اس نے اس کی بھی چھٹی کر دی۔ اگلے پانچ برس تک سوچتا رہا کہ اولاد ہوگی یا نہیں؟ اگر پھر مایوسی ہوگی تو خوامخواہ ایک اور بیوی کا بوجھ اور اس کے نخرے برداشت کرنے ہوں گے۔ جب بازار سے کھانا مل جاتا ہے تو گھر میں چولہا جلانے والی اور بستر میں آگ لگانے والی کی کیا ضرورت ہے۔ کبھی وقتِ ضرورت رات کو بستر میں آگ رہے اور صبح ٹھنڈی ہو جایا کرے تو یہی طریقۂ کار درست رہے گا۔

پنڈ والے کہتے تھے اور میں نے بعض عورتوں سے بھی اس کی بدنیتی کے چرچے سنے تھے لیکن وہ مجھے بڑا مان دیتا تھا اور سب کے سامنے کہتا تھا "شادو میری بیٹی جیسی ہے۔ اگرچہ میں چھوٹے لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں جوڑتا لیکن میں نے خوابوں میں شادو کو اپنی گود میں کھلاتے دیکھا ہے۔ ایک بار ایسا خواب دیکھتا تو بھول جاتا۔ میں نے کئی بار نیند کی گہرائیوں میں اسے بیٹی کہا ہے۔ میرا اور اس کا رشتہ خوابوں کا رشتہ ہے۔ اس کے بعد میری حویلی اور اس کی جھونپڑی کا فرق ہے اور ہمیشہ یہ رہے گا۔"

وہ بے اولاد رہنے والا زمیندار عجب خر دماغ تھا۔ اپنے کارندوں اور کسانوں کو جوتیوں کی نوک پر رکھتا تھا اور کہتا تھا کہ میں صورت شکل سے غریب اور معمولی لڑکی نہیں لگتی ہوں۔ اس کا دل میری طرف کھنچا جاتا ہے اس لیے وہ مجھ پر مہربان رہتا تھا۔ میں سوچتی ہوں، اچھا ہوا کہ اس نے میرے بچپن میں ہی سارے پنڈ والوں کے سامنے بیٹی کہہ دیا تھا۔ اگر میرے جوان ہونے کے بعد مجھ پر نظر پڑتی تو شاید ایسا پاکیزہ رشتہ قائم نہ کرتا۔

ایک روز ایک بڑی سی، خوب صورت چمکتی دمکتی کار زمیندار کی حویلی کے سامنے آئی۔ ایسی کار پنڈ والوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یوں تو کئی کاریں اور چھوٹی بڑی گاڑیاں اُدھر سے گزرتی رہتی تھیں لیکن اس کار کو دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ دنیا کا کوئی بہت ہی امیر کبیر آدمی آیا ہے۔ اس کار کے اطراف عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کی بھیڑ لگ گئی۔ اس کا دروازہ کھول کر ایک خوبرو جوان باہر آیا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ کسی ملک کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ وہ کار سے باہر آکر چاروں طرف پھیلے ہوئے لوگوں پر نظریں دوڑانے لگا جیسے دیہاتی ماحول کا معائنہ کر رہا ہو۔ میں بہت سی عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر آکر رک گئیں۔ یہ عورتوں کی قدرتی حس ہوتی ہے کہ وہ دیکھنے کے انداز سے دیکھنے والے کی نیت کو سمجھ لیتی ہیں۔ میں نے فوراً ہی دوپٹے کو گھونگھٹ بنالیا، اپنے چہرے کو کسی حد تک چھپالیا۔ زمیندار اپنی حویلی سے نکل کر دوڑتا ہوا آیا پھر اس جوان کو سلام کرتے ہوئے ایسے جھکا جیسے اس کے قدموں کی خاک ہو۔ جبکہ وہ سجدے میں شاذو نادر ہی جھکتا تھا۔ کبھی کبھی جمعے کی نماز پڑھنے مسجد میں جاتا تو مجبوراً پیش امام کے پیچھے کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ پیش امام کے حجرے میں تین وقت کی روٹیاں حویلی سے ہی جایا کرتی تھیں۔ اپنا نمک کھانے والے کے پیچھے کھڑے ہونے سے توہین کا احساس ہوتا تھا مگر خدا کو بھی خوش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کبھی کبھی نماز تو پڑھ لیتا تھا مگر نماز کے بعد کسی نہ کسی بہانے پیش امام کو ڈانٹتا تھا۔ اس کی توہین کرنے کے بعد انا کو تسکین پہنچتی تھی۔

اس روز کار والے صاحب کے سامنے اپنی برتری اور رعب و دبدبہ بھول گیا تھا۔ تمام پنڈ والوں کو مخاطب کرکے کہہ رہا تھا "یہ جناب اکمل شریف صاحب ہیں۔ قرضہ دینے والے زرعی بینک کے بہت بڑے عہدے دار ہیں۔ تم سب کے لیے خوش خبری ہے کہ تمہیں کاشتکاری کے لیے بینک سے ہزاروں لاکھوں روپے دلادیں گے۔"

تمام کسانوں اور کھیت مزدوروں کے چہروں پر رونق آگئی۔ ان کی بجھی ہوئی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ زمیندار اس بڑے عہدے دار کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا اور کسانوں کو مستقبل کے حسین خواب دکھا رہا تھا۔

اور وہ صاحب مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پورا گھونگھٹ نہیں نکالا تھا۔ کیونکہ میں بھی اس قیمتی کار کو اور اس بڑے عہدے دار کو ذرا چھپ چھپ کر دیکھنا چاہتی تھی۔ میں پنڈ کی لڑکیوں کے مقابلے میں مہنگا لباس پہنتی تھی اور خوب سنور کر رہتی تھی اور یہ سب بننے سنورنے اور پہننے اوڑھنے کی قیمتی چیزیں ہر ماہ حویلی سے میرے لئے آتی تھیں۔ وہ

صاحب اس لئے بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا کہ میں وہاں لاکھوں میں ایک لگ رہی تھی۔

خوشبو نہیں جانتی کہ وہ کہاں کہاں پہنچتی ہے اور ہوا اسے کتنی دور تک اڑا کر لے جاتی ہے۔ میں بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ امیر کبیر جوان میرے حُسن و شباب کا چرچا سن کر آیا ہے۔ اس نے زمیندار کے کان میں کچھ کہا۔ زمیندار نے لوگوں سے کہا۔ "تم سب جاؤ اور شام کو میری حویلی میں آؤ۔ تم سب کے دن پھرنے والے ہیں۔ اب جاؤ' گاڑی سے ذرا دور رہو۔ یہ میلی ہو جائے گی۔"

میں سب کے ساتھ وہاں سے جانا چاہتی تھی۔ زمیندار نے آواز دی۔ "اری شادو! تیرا بابا کہاں ہے؟ چل اِدھر آ۔ میں اتنی دور سے تیرا جواب سن نہیں پاؤں گا۔"

میں جھجکتی اور شرماتی ہوئی قریب آگئی پھر بولی۔ "وہ ابھی کھیت سے آتا ہی ہو گا۔"

اس نے تعارف کرایا۔ "جناب شریف صاحب! اس کا نام شاہدہ ہے۔ ہم اسے پیار سے شادو کہتے ہیں۔"

شریف صاحب نے بڑی بے باکی سے کہا۔ "یہ ہے ہی اتنی پیاری کہ میں بھی پیار سے شادو کہنا چاہتا ہوں۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آج تک کسی غیر مرد نے اس انداز میں' اتنی اپنائیت سے ایسی بات نہیں کی تھی۔ ہمارے پنڈ میں بڑے تگڑے جوان ہیں مگر وہ زمیندار کے خوف سے سرجھکا کر میرے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ زمیندار نے کہا۔ "اری یہ تُو نے گھونگھٹ کیا نکالا ہوا ہے۔ چل ہٹا اسے۔ ہمارے شریف صاحب کوئی غیر تو نہیں ہیں؟"

وہ غیر تھا۔ کوئی اور کہتا تو میں گھونگھٹ نہ ہٹاتی۔ مگر کہنے والا باپ کی جگہ تھا اور ایک باپ کے انداز میں حکم دے رہا تھا۔ میں نے سر سے دوپٹے کو گرا دیا۔ اکمل شریف یوں سحر زدہ سا ہو کر دیکھنے لگا جیسے پیدا ہونے کے بعد پہلی بار حُسن کا جلوہ دیکھ رہا ہو۔ میں بھی اس کی چمکتی دمکتی کار سے اس کی آن بان اور شان سے متاثر ہو رہی تھی۔ اسے جھکی جھکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ زمیندار نے مجھ سے کہا۔ "بابا آئے تو اسے حویلی میں بھیج دینا۔ اب یہاں سے جا۔"

اکمل شریف نے زمیندار سے کہا۔ "ملک نعیم صاحب! کیوں اسے جانے کو کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو نظر نہیں بھری۔ دل نہیں بھرا۔ دل تو چاہتا ہے کہ ...."

زمیندار نے کہا۔ "نہیں شریف صاحب! پہلے کام کی باتیں ہو جائیں پھر میں بتا چکا ہوں کہ یہ میری بیٹی جیسی ہے۔ یہ جلد ہی عزت آبرو سے دلہن بن کر جا سکتی ہے۔ پہلے

کام کی باتیں کرو' اری تُو ابھی تک کھڑی ہے' چل جا۔"

میں دوڑتی ہوئی گھر چلی آئی۔ میرے دل میں ایسی خوشی تھی جیسے ایک اچھے اور پکے مکان میں رہنے کا خواب پورا ہونے والا ہو۔ یہ میرے بابا کا بھی خواب تھا کہ میں مٹی کے کچے مکان سے نکل کر پکی اینٹوں والے بڑے مکان میں بیاہ کر جاؤں' جہاں چھت پر بجلی کے پنکھے لگے ہوتے ہیں۔ جب وہ گردش کرتے ہیں تو گرمی بھاگ جاتی ہے۔ موسم بدل جاتا ہے۔ میرے بھی حالات بدلنے والے تھے۔ میرے بابا شام کو حویلی میں گئے۔ دوسرے کسانوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ ان سب کے نام پتے اور دوسرے کوائف قرضہ دینے والے بینک کے فارموں میں لکھے گئے تھے۔ ان فارموں پر کسانوں کے دستخط کرائے جا رہے تھے یا انگوٹھے لگائے جا رہے تھے۔ یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ زرعی ترقی کے لئے انہیں سرکار کی طرف سے بڑی بڑی رقمیں قرض کے طور پر دی جائیں گی۔

ہمارے پنڈ میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ وہ کہہ رہا تھا' یہ سب ناٹک ہے۔ ان تمام فارموں کے ذریعے جو ہزاروں لاکھوں روپے قرض کے طور پر ملیں گے وہ کچھ زمیندار کی تجوری میں جائیں گے اور کچھ اُس عہدے دار کی جیب میں پہنچیں گے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ بات عام کی جائے گی کہ قرضے نامنظور ہو چکے ہیں یا حکومت بدل گئی ہے۔ آئندہ نئی حکومت کی نئی پالیسیوں کے مطابق پھر نئے سرے سے قرضے کے فارم پُر کئے جائیں گے۔

زمیندار کی اور اس نوجوان کی آپس میں بنتی نہیں تھی۔ وہ اسے باغی اور مجرمانہ ذہن رکھنے والا فتنہ پرور کہتا تھا۔ کئی بار تھانے دار سے اس کی پٹائی کرا چکا تھا مگر وہ زہر اگلتا ہی رہتا تھا۔

بہرحال بابا حویلی سے واپس آئے تو ان کے ساتھ پنڈ کے دوسرے بزرگ بھی تھے۔ وہ صحن میں منجیوں پر بیٹھ کر بابا کو مبارک باد دینے لگے۔ کہنے لگے کہ وہ خوش نصیب ہے۔ شہر کا اتنا بڑا سرکاری افسر اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ رہا ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ سوچنا اور دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔

میں دروازے کے پاس کھڑی سن رہی تھی اور ہواؤں میں اُڑی جا رہی تھی۔ بابا کہہ رہے تھے۔ "میں زمیندار کے سامنے ہاتھ جوڑے چپ بیٹھا رہا۔ اس کے آگے بھلا ہم سب کیا بول سکتے ہیں مگر وہ جو ہونے والا داماد ہے' اس کے بارے میں کچھ معلوم تو ہو۔"

ایک بزرگ نے پوچھا۔ "معلوم کیا کرو گے؟ ہمارے تمہارے جیسے غریبوں کا کوئی خاندانی شجرہ ہوا کرتا ہے؟"

دوسرے بوڑھے نے کہا۔ ”اس سے بڑی ضمانت کیا ہو گی کہ زمیندار صاحب یہ شادی طے کر رہے ہیں اور وہ شریف صاحب کے پورے خاندان کو جانتے ہیں۔“

تیسرے نے کہا۔ ”اور وہ کہہ تو رہے تھے کہ شریف صاحب لاہور میں تنہا رہتے ہیں۔ باقی رشتے دار سمندر پار رہتے ہیں۔“

اسی سلسلے میں آدھی رات تک بحث ہوتی رہی۔ بزرگوں کے تمام ووٹ قرض دلانے والے افسر اور زمیندار کے حق میں تھے اور ہم باپ بیٹی کے خواب پورے ہو رہے تھے۔ پھر ہم نے جو سوچا بھی نہ تھا' وہ ہو گیا۔ دوسرے ہی دن شام کو میرا نکاح اکمل شریف سے پڑھا دیا گیا۔ میں دلہن بن کر حویلی کے مہمان خانے میں آ گئی۔ وہاں ایک کمرے کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ میں سہاگ کے پھولوں سے مہکتی ہوئی سیج پر پہنچا دی گئی پھر میرا مجازی خدا بھی اس سیج پر آ گیا۔

مجھے تو یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ وہ میرا ایسا دیوانہ ہو رہا تھا اور ایسا بھرپور پیار دے رہا تھا کہ میں زمین سے آسمان پر پہنچ گئی تھی۔ دوسرے دن بابا نے روتے روتے مجھے رخصت کیا اور میں اس بڑی سی قیمتی کار میں اکمل شریف کے ساتھ بیٹھ کر لاہور آ گئی۔ یہ خوشی کچھ کم نہ تھی کہ جس کار میں بیٹھی تھی' وہ اب میری بھی تھی۔ پہلے میں نے کار دیکھی تھی پھر ایک خوب صورت سی کوٹھی بھی دیکھی۔ آہنی گیٹ کے دربان نے ہمیں سلام کیا۔ پھر گیٹ کھول دیا۔ کار ایک خوب صورت سے باغیچے کی درمیانی روش سے گزرتی ہوئی پورچ میں آ کر رک گئی۔

اُس کوٹھی میں وہی ایک گیٹ کا دربان تھا اور وہی کوٹھی کے اندر کام کرنے والا نوکر بھی تھا۔ اُس نے گیٹ بند کرنے کے بعد دوڑتے ہوئے آ کر کار کا دروازہ کھولا۔ میں اکمل شریف کے ساتھ کار سے اتر کر کوٹھی کے اندر آئی۔ مجھ جیسی کچے مکان میں رہنے والی نے بڑی حیرانی سے اس وسیع و عریض کوٹھی کو دیکھا۔ وہ بے حد قیمتی سامان سے آراستہ تھی۔ شریف نے مجھے ایک صوفے پر بٹھا کر کہا۔ ”آرام سے بیٹھو۔ میں کار کی ڈکی سے سامان نکلوا کر ابھی آتا ہوں۔ گرمی لگ رہی ہو تو یہ ائرکنڈیشنر آن کر لو۔“

وہ چلا گیا۔ میں نے ائرکنڈیشنر کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس کے متعلق سنا تھا کہ اسے آن کرو تو گھر کے اندر جنت سے ہوا آنے لگتی ہے لیکن مجھے آن کرنا نہیں آتا تھا۔ گرمی لگ رہی تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چھت کے پنکھے کا سوئچ کہاں ہے۔ میں نے دوپٹے سے چہرے کا پسینہ پونچھا تو پتا چلا کہ ایک کان میں سونے کا جھمکا نہیں ہے۔ کہیں گر گیا ہے۔ شاید کار میں رہ گیا ہے؟

کوٹھی کا اکلوتا ملازم جوان تھا مگر کچھ بیمار سا تھا۔ وہ سامان اندر لا رہا تھا۔ میں صوفے سے اٹھ کر بیرونی دروازے پر آئی۔ پھر اسے کھول کر باہر برآمدے میں پہنچی۔ کھلی فضا میں ذرا ہوا لگنے لگی۔ سامنے پورچ میں اکمل شریف کار سے ٹیک لگائے' دوسری طرف منہ کیے موبائل فون پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے سوچا گفتگو کے دوران مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ فون پر بات ہو جائے گی تو میں گم ہونے والے جھمکے کے بارے میں اسے بتاؤں گی۔

میں اس کے پیچھے ذرا اور قریب آ گئی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”یار! کہاں مر گئے تھے؟ کب سے نمبر ملا رہا ہوں۔“

اس نے چپ ہو کر دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر کہا۔ ”بس ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ رہی کامیابی کی بات تو پہلے کبھی ناکام ہوا ہوں؟ اڑتی چڑیا کو ہاتھ اٹھا کے پکڑ لیتا ہوں۔“

وہ پھر دوسری طرف کی باتیں سن کر ”ہوں.......... ہاں“ کرنے لگا پھر بولا۔ ”یہ تو نہ پوچھو۔ ایسی چیز لایا ہوں کہ دیکھو گے تو رال ٹپکنے لگے گی۔ ہوں.......... ہاں ہاں' بھئی دیکھو معاہدے کے مطابق تم تینوں میں سے کوئی یہاں نہیں آئے گا تم لوگ ایک ماہ تک للچاتے رہو۔“

وہ پھر چپ ہوا' کچھ سنتا رہا اس کے بعد بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ دور سے دیکھ سکتے ہو۔ میں آج پرل کے ڈائننگ ہال میں اس کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔“

میں سن رہی تھی مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سلسلے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ میرا محبوب جو بڑی محبت سے مجھے بیاہ کر لایا تھا' اُس پر میں کسی طرح کا شبہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”اِس میں شبہ نہیں کہ زمیندار ملک نعیم الدین ہماری نفاست پسندی اور اعلیٰ ذوق کو سمجھتا ہے۔ اس نے ہمارا کام کیا ہے۔ تم بھی اپنے ڈیڈی سے کہہ کر قرضوں کی وہ درخواستیں منظور کرا دو۔ اس کا بھی بھلا ہونا چاہیے۔“

میں سن رہی تھی۔ اس کی باتیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے اس کی دیوانہ وار محبتیں دیکھی تھیں۔ اُس پر شبہ نہیں کر سکتی تھی اور یہ سمجھ نہیں سکتی تھی کہ ایسی کون سی چیز لایا ہے جسے دیکھ کر کسی کی رال ٹپک سکتی ہے؟ ایسی تو کوئی کھٹی میٹھی کھانے کی چیز ہی ہو سکتی ہے۔

کہتے ہیں عورتیں بڑی شکی ہوتی ہیں لیکن شک کرنے کے برعکس مجھے اس کی فرض شناسی پر پیار آیا۔ اس نے یہاں پہنچتے ہی غریب کسانوں کو نہیں بھلایا تھا اور قرضوں کی

منظوری کے سلسلے میں کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں بڑی محبت اور عقیدت سے اس سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

میرے بدن سے بدن لگتے ہی وہ یکبارگی ایسے اچھل پڑا جیسے بجلی کا جھٹکا پہنچا ہو۔ اس کے ہاتھ سے موبائل فون گر پڑا تھا۔ اسے فون کو اٹھانا چاہیے تھا۔ مگر وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں نے کیا سنا ہے اور کیا سمجھا ہے اور اب کیا ردِ عمل پیش کرنے والی ہوں؟ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا ہو گیا؟ آپ ایسے کیوں گھبرا گئے؟ میں تو چاہتی تھی' مداخلت نہ کروں مگر میں بہت وہ ہوں' آخر پنڈ کی رہنے والی ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔"

وہ کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "وہ.......... وہ میری بچپن کی عادت ہے۔ کوئی توقع کے خلاف اچانک آ جائے تو میں گھبرا جاتا ہوں۔"

میں نے فون کو زمین پر سے اٹھا کر دیتے ہوئے کہا۔ "میں آئندہ اچانک آپ کے قریب نہیں آؤں گی۔ آنے سے پہلے دور ہی سے آواز دوں گی۔ میں جا رہی ہوں' آپ باتیں کریں۔"

میں جانا چاہتی تھی اس نے بازو پکڑ لیا۔ پھر فون پر کہا۔ "یار شاہنواز! سوری' میری وائف یہاں میرے پاس ہے اور میں اپنی وائف کے ہوتے ہوئے کسی اور سے بات نہیں کر سکتا۔ سمجھ گئے نا؟"

اس کے دوست شاہنواز کو جو سمجھنا چاہیے تھا' وہ سمجھ گیا ہو گا۔ میں یہ سن کر خوش ہو گئی کہ وہ میری موجودگی میں کسی اور کو اہمیت نہیں دے رہا ہے اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے کہا۔ "میرے کان کا ایک جھمکا نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں گر پڑا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "بریلی کے بازار میں گرا ہو گا۔ گرنے دو۔ پریشان کیوں ہو رہی ہو۔"

"ہائے اللہ وہ بڑا قیمتی تھا اور آپ کہہ رہے ہیں' مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار کا ہو گا۔ وہ گیا سو گیا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کتنی بڑی بیگم صاحبہ بن گئی ہو۔ چار پانچ ہزار کا ماتم کرو گی تو میری توہین ہو گی۔"

اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کیسا رئیسِ اعظم ہے اور میں بھی خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ اس قدر دولت مند جیون ساتھی کو پا کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر تھی۔

وہ جھمکا کار کی اگلی سیٹ کے نیچے مل گیا۔ میں اسے اٹھا کر شریف کے ساتھ کوٹھی کے اندر آئی۔ وہ مجھے کوٹھی کے دوسرے کمروں کی سجاوٹ اور نہایت قیمتی آرائشی سامان دکھانے لگا۔ ساتھ ہی چھیڑ چھاڑ بھی کرتا رہا اور ہنستا ہنساتا بھی رہا۔

میں نے خواب میں بھی ایسی محل نما کوٹھی نہیں دیکھی تھی۔ بڑی مشکل سے خود کو یقین دلا رہی تھی کہ وہاں کی بیگم صاحبہ اور مالکن بن چکی ہوں۔ ہم نے دوپہر کا کھانا سفر کے دوران راستے میں کھایا تھا۔ میں نے شام کو بستر سے اٹھنا چاہا تو اس نے اٹھنے نہیں دیا' میں نے کہا۔ "میں آپ کی ہوں' کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہوں۔ کیا آپ نہیں چاہتے' میں رات کا کھانا تیار کروں؟"

"بالکل نہیں۔ تم ابھی نئی دلہن ہو۔ چولہا نہیں جلاؤ گی۔ یہاں جو ایک ملازم ہے' وہ کھانا بھی پکایا کرتا ہے۔ ویسے ہم گھر میں نہیں کھائیں گے۔ آج پرل میں ڈنر کریں گے۔"

پرل؟ پرل؟ پرل؟ میرے دماغ میں چھوٹے چھوٹے سے کنکر آ کر لگنے لگے۔ پرل کا لفظ میں نے شریف کی زبان سے اس وقت سنا تھا' جب وہ فون پر گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "یہ پرل کیا چیز ہے؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "پرل کانٹی نینٹل دنیا کے چند بڑے ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ اس مہنگے ہوٹل میں ہم جیسے رئیس لوگ ہی جایا کرتے ہیں۔ وہاں یہ پنڈ والی شلوار قمیص نہیں چلے گی۔ چلو اٹھو' پہلے ہم کسی بوتیک میں جائیں گے۔ پھر.........."

میں نے پوچھا۔ "یہ بوتیک کسے کہتے ہیں؟"

"اُس دکان کو کہتے ہیں' جہاں جدید ڈیزائن کے مہنگے ملبوسات فروخت ہوتے ہیں۔ وہاں سے چند لباس خرید کر تمہیں ایک بیوٹی پارلر میں لے جاؤں گا پھر تم ایک ایسی حسین ترین ماڈرن دوشیزہ بن جاؤ گی کہ دیکھنے والوں کے منہ سے رال ٹپکنے لگے گی۔"

اس بار دماغ میں کنکر نہیں' کھٹ سے ایک پتھر لگا۔ فون پر ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔ اس نے فون پر کسی سے کہا تھا کہ ایسی چیز لایا جسے دیکھنے والے کے منہ سے رال ٹپک جائے گی۔

اب میرے دماغ میں کہیں بہت دور سے خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی لیکن ایسا ہوتا ہے کہ بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ خطرے کا احساس ہوتا ہے لیکن خطرے کی نوعیت معلوم نہیں ہوتی۔ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ میں بچپن سے اپنے حُسن و جمال کی تعریفیں سنتی آئی ہوں اس وقت بھی میں نے اس پہلو سے سوچا کہ بعض شوہروں کی عادت ہوتی ہے' وہ اپنے دوستوں کی محفل میں اپنی حسین بیوی کی تعریفیں انہیں للچانے کے لیے کرتے

ہیں۔ محبت کرنے اور تعریف کرنے والے شوہر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حُور جیسی بیوی اسے ملی ہے اور اس کے دوستوں کو ایسی حُور پری نہیں ملے گی۔ ایسا کہنے سے بھی شوہر کی چاہت اور دیوانگی کا ثبوت ملتا ہے۔ عام عورتیں جس طرح اپنے حُسن کی تعریفیں سن کر اترانے لگتی ہیں' اسی طرح میں بہل گئی تھی بلکہ اس کی محبت میں اور زیادہ گرفتار ہوگئی تھی۔اس نے بوتیک سے تقریباً بارہ ہزار کے پانچ بہترین لباس خریدے۔ میں نے کبھی اپنے بابا کے پاس ایک ساتھ بارہ روپے نہیں دیکھے۔ مگر میرے شوہر کے لیے بارہ ہزار روپے کچھ بھی نہیں تھے۔ اس نے مول تول بھی نہیں کیا تھا جو قیمت کہی گئی تھی' اسے ادا کردیا۔ میں نے کار میں بیٹھ کر کہا۔ "آپ کو قیمت کم کرانا چاہیے تھا۔"

وہ بولا "ایسی چھوٹی باتیں نہ کرو۔ چھوٹے لوگ محدود رقم لے کر شاپنگ کرنے آتے ہیں اور قیمتیں کم کرانے کے لیے دکان داروں سے جھگڑتے ہیں۔ ایسا جہالت اور غریبی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کسی چیز کی قیمت کم کرانا بڑے لوگوں کی شان کے خلاف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قیمت میں رعایت نہیں بھیک مانگ رہے ہیں۔"

بڑے لوگ کیسے باوقار اور شاہ خرچ ہوتے ہیں اور کس طرح رئیسانہ شان و شوکت برقرار رکھتے ہیں۔ یہ سب وہ مجھے سکھا رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے ایک بیوٹی پارلر میں لے جاکر میرے حُسن کو چار چاند لگا دیئے۔ اسی پارلر کے کیبن میں جاکر میں نے ایک نہایت قیمتی لباس پہنا تو خود اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں کسی ریاست کی شہزادی لگ رہی تھی۔ انسان خوب ہوتا ہے۔ دولت اسے خوب تر بنا دیتی ہے۔ اس سے پہلے کبھی کسی آئینے نے مجھے اس قدر حسین نہیں دکھایا تھا۔ آئینوں کو کیا الزام دوں؟ خود میری آنکھوں نے میرے موجودہ حُسن کو کبھی میرے اندر سے باہر نہیں نکالا تھا۔

پرل کے ڈائننگ ہال میں پہنچ کر کچھ احساسِ کمتری ہوا مگر میں دل ہی دل میں یہ کہہ کر خود کو سنبھالتی رہی کہ اب میں کوئی پنڈ والی نہیں ہوں۔ ایک بڑی بیگم صاحبہ ہوں اور یہ اتنی اونچی جگہ ہے کہ یہاں کسی پنڈ کی چوہدرائن نے بھی کبھی قدم نہیں رکھا ہوگا۔ پھر یہ کہ وہاں جتنی رئیس زادیاں تھیں' اُن میں سب سے زیادہ میں نمایاں تھی۔ نہ جانے کتنے مردوں کی نظریں بار بار صرف مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اکمل شریف نے کہا "تم کچھ نروس ہو رہی ہو۔ یہ تو جانتا ہوں کہ پہلے کبھی ایسے ماحول میں نہیں آئی ہو۔ اگر تم اپنے اندر سے چھوٹا پن نکال دو' خود کو سب سے برتر سمجھ لو تو یہاں کی تمام حسینائیں تمہیں اپنے پاؤں کی جوتیاں نظر آئیں گی۔ ایک دم شانِ بے نیازی دکھاؤ۔ لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں تو فخر کرو۔ ان کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں کہ ہاتھ اٹھاکر میرے اس چاند کو

چھولیں۔"

شریف کی باتیں مجھے حوصلہ دیتی رہیں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ہوٹل میں اتنے دیکھنے والوں کے درمیان وہ آنکھیں بھی ہیں جنہیں شریف دکھانا اور للچانا چاہتا تھا۔ میں تو نئی زندگی کی چکاچوند میں کچھ اور دیکھنے اور سوچنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس دن سے خود کو امیر کبیر سمجھ کر بڑی بیگمات کے طور طریقے اور انگریزی کے چھوٹے بڑے ضروری فقرے سیکھنے لگی اور ایسے فقرے ادا کرتے وقت میں اپنے قد سے اونچی ہوجایا کرتی تھی۔

شریف میرے ساتھ دن رات نہیں رہتا تھا۔ اپنی مصروفیات کچھ ایسی بتایا کرتا تھا کہ اکثر آدھی رات سے پہلے ہی چلا جایا کرتا تھا۔ مجھے سمجھایا کرتا تھا کہ اس کی نائٹ ڈیوٹی رہا کرتی ہے۔ اس کا سرکاری کام کچھ ایسا ہی ہے۔ ڈیوٹی کے اوقات مقرر نہیں ہوتے جب بھی بلایا جاتا ہے' اسے فرائض کی ادائیگی کے لئے جانا پڑتا ہے۔

میں اٹھارہ برس کی ہوں۔ اکمل شریف زیادہ سے زیادہ بیس برس کا ہوگا۔ یہ عمر اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی' میں ہی کیا پنڈ کے بھولے بھالے لوگ بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ بیس برس کی عمر میں کوئی اعلیٰ سرکاری عہدے دار نہیں بن جاتا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ چوبیس گھنٹوں میں وہ چھ سات گھنٹے میرے ساتھ کوٹھی میں رہتا تھا پھر اپنے بیان کے مطابق سرکاری ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا۔ میں اس کی طویل غیر حاضری کو اس لئے محسوس نہیں کرتی تھی کہ انگریزی پڑھنے اور بولنے میں مصروف رہتی تھی۔ ایک سب سے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس کوٹھی کا اکلوتا ملازم مجھے پڑھاتا اور سکھاتا تھا۔ شریف نے بتایا کہ اُس کا نام نورالدین ہے چونکہ بڑے آدمی کو پورے نام سے پکارا جاتا ہے اس لئے اسے نورے کہہ کو مخاطب کرتے تھے۔

میں نورے کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتی ہوں۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ بی اے پاس تھا۔ کہیں ملازمت نہیں ملتی تھی۔ اس کے آگے دو ہی راستے تھے کہ وہ بی اے کا سرٹیفکیٹ پھاڑ کر ناخواندہ لوگوں کی طرح مزدوری کرے۔ روز کمائے اور روز کھائے۔ جب بیمار پڑ جائے یا شہر میں ہڑتال ہو اور اس روز مزدوری نہ ملے' بھوک اور محتاجی ملے تو پھر منشیات کا دھندا کرے۔ اسلحہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے۔ یا اسی طرح کا کوئی کام کرے کہ رہنے کو اپنا مکان اور ہڑتال یا ہنگامی حالات میں زندہ رہنے کے لئے بینک بیلنس رہے۔

اس نے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ اکمل شریف کی کوٹھی کا ملازم بن گیا۔ پوری کوٹھی

کے اندر اور باہر کا کام سنبھالنے کے لئے اکمل شریف اسے ماہانہ پانچ ہزار روپے تنخواہ دیتا تھا۔ اس نے یہ ملازمت کیوں اختیار کی یہ میں ابھی بتاؤں گی۔ ویسے انگریزی سیکھنے کے دوران میں نے کئی بار پوچھا۔ اس نے یہی جواب دیا۔ "ماہانہ پانچ ہزار کسی ایم اے پاس ہیڈ کلرک کو بھی نہیں ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ تین وقت کا کھانا اسی کوٹھی میں کھاتا ہوں' کافی رقم بچاتا ہوں........"

میں نے پوچھا۔ "کیا بی اے پاس کرنے کے بعد گیٹ کا دربان اور کوٹھی کا ملازم بننا چھوٹا پن نہیں ہے؟"

"میری کوئی سوسائٹی ہوتی یا ذات برادری ہوتی تو شاید میں یا برادری والے ایسا سوچتے۔ میں اتنی بڑی دنیا میں اکیلا ہوں۔ کون جانتا ہے کہ نورالدین عرف نورے کس کھیت کی مولی ہے۔"

"میں بھی پنڈ میں بہت خوش تھی۔ تمہارے صاحب جیسے چاہنے والے کا سپنا دیکھتی تھی اور تمہاری طرح اپنی اوقعات میں رہ کر خواب دیکھتی تھی لیکن خدا مجھ پر مہربان ہے۔ اس نے میری اوقعات سے زیادہ مجھے دیا ہے۔ شاید کسی دن خدا تم پر بھی مہربان ہو جائے۔"

اس نے مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ میں نے نظریں چرائیں۔ وہ کبھی کبھی چور نظروں سے مجھے دیکھتا تھا۔ مردوں کی نظریں بڑی حد تک پہچان میں آ جاتی ہیں۔ مجھے کئی بار اس پر غصہ آیا مگر میں اسی انتظار میں خاموش رہی کہ نظروں کے بعد جب اس کی زبان کچھ بولے گی تو منہ توڑ جواب دوں گی۔ شریف سے شکایت کروں گی تو اس کے پیٹ پر لات پڑے گی۔ مگر میں اسے لگی لگائی روزی سے محروم نہیں کروں گی۔ میری بے رخی کے بعد وہ راستے پر رہے گا تو اپنا بھلا کرے گا۔

حُسن ہو' شباب ہو' نگاہوں کے سامنے پھول کھلا ہو اور اسے چھونے اور سونگھنے کی اجازت نہ ہو تو پھر لوگ اسے دور ہی سے دیکھ کر صبر کر لیتے ہیں۔ نورے بھی صابر تھا۔ صرف چور نظروں سے دیکھنے کی حد تک محدود رہا۔ شریف کبھی کبھی اپنے دوستوں سے مجھے ملاتا تھا تاکہ میرے اندر جھجک ختم ہو جائے اور میں رئیس زادیوں یا بیگمات کی طرح اپنے اندر اعتماد پیدا کر سکوں۔

یوں اس کی کوٹھی میں انیس دن گزر گئے۔ شریف نے دوسری صبح کہا۔ "ہر ماہ کی آخری رات کو میرے وہ تینوں دوست یہاں آتے ہیں۔ جن سے تم کئی بار مل چکی ہو۔ یہاں ہم پیتے ہیں اور رمی کھیلتے ہیں۔ تم چاہو تو اپنے کمرے میں آرام کرنا یا ہمارے ساتھ

انجوائے کرنا' تمہاری مرضی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ رات کے آٹھ بجے دوستوں کے ساتھ آؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ اس عرصے میں اب میں وہ پنڈ والی پسماندہ عورت نہیں رہی تھی۔ یہ دیکھتی اور سمجھتی آئی تھی کہ اونچی سوسائٹی میں شراب پی جاتی ہے اور بڑے لوگ ایک دوسرے کی بیویوں اور جوان بہنوں سے فری ہو کر گفتگو کرتے ہیں۔ اس مختصر سے عرصے میں شریف نے مجھے اپنے صرف تین دوستوں سے ملایا تھا۔ ان میں ایک کا نام جمال شہزاد' دوسرے کا شاہ نواز' اور تیسرے کا نام اکبر پاشا تھا۔

رات کے آٹھ بجے وہ چاروں ڈرائنگ روم کے تمام صوفوں کو سنٹر ٹیبل کے قریب کھسکا کر بیٹھ گئے۔ پہلی بوتل کھل گئی۔ پیکٹ سے تاش کے پتے نکل آئے۔ پھر وہ پینے اور رمی کھیلنے لگے۔ شرط یہ تھی کہ رات بارہ بجے تک جو سب سے زیادہ پوائنٹ حاصل کرے گا۔ وہ فاتح کہلائے گا۔

میں کھیل کے دوران کبھی شریف کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی کبھی وہاں سے کچن میں جا کر اپنے لئے چائے بنا کر پی لیتی تھی۔ نورے باہر برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب اسے آواز دی جاتی تو وہ آ کر خدمات انجام دیتا تھا پھر باہر جا کر بیٹھ جاتا تھا۔

رات کے بارہ بجے ہار جیت کا فیصلہ ہو گیا۔ سب سے زیادہ پوائنٹ جمال شہزاد نے حاصل کئے تھے۔ وہ فاتح بن کر خوشی سے ناچ رہا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ تو ایسے ناچ رہے ہیں جیسے دنیا فتح کر لی ہو۔"

وہ ناچتے ناچتے میرے پاس صوفے پر آ کر گر پڑا پھر بولا۔ "آج میں سکندرِ اعظم ہوں۔ ساری دنیا میں جتنا حُسن و شباب ہے' وہ سب تم میں بھرا ہوا ہے اور میں نے تمہیں جیت لیا ہے۔"

میں نے مسکرا کر ذرا پرے ہٹ کر کہا۔ "آپ نے بہت زیادہ پی لی ہے۔"

وہ بولا۔ "ہر ماہ کی آخری رات رمی کھیلتے وقت ہم زیادہ نہیں پیتے۔ اپنی جیت کا مزہ لینے کے لئے ہوش میں رہتے ہیں۔ ہاں بس ذرا سا سرور طاری رہتا ہے۔"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ میں نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ "یہ سرور نہیں' نشہ ہے۔ کیوں شریف؟ کوئی ہوش میں رہ کر اپنے دوست کی بیوی کے بارے میں ایسا کہہ سکتا ہے؟"

شریف نے کہا۔ "ہم سب ہوش میں ہیں اور یہ جمال درست کہہ رہا ہے۔ ہر ماہ کی آخری رات رمی میں جو زیادہ پوائنٹ حاصل کرتا ہے' وہ ہارنے والے کی عورت کو جیت لیتا ہے۔"

میں صوفے سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ کانوں سے سن کر بھی اتنی جلدی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسی باتیں میرے شوہر کی زبان کہہ رہی ہے۔ میں نے شریف سے کہا۔ "پلیز! آپ یہ مذاق ختم کریں۔"

"مذاق؟" وہ چاروں دوست قہقہے لگانے لگے۔ شریف نے کہا۔ "یہ مذاق نہیں ہے۔ میں ہارنے کے بعد تمہارا شوہر نہیں رہا۔ آج بارہ بجے سے جمال شہزاد اس کوٹھی کا اور تمہارا مالک بن چکا ہے۔"

میں نے اس کے قریب آ کر اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "شریف! یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ تم نشے میں ہو اور خود کو ہوش مند سمجھ رہے ہو۔ کیا ایک ہوشمند اپنی بیوی' اپنے گھر کی عزت کے بارے میں ایسی بے حیائی سے بولتا ہے؟"

"بیوی؟" شریف نے پوچھا۔ "تم سے نکاح پڑھایا۔ اس لئے خود کو بیوی کہہ رہی ہو؟ اگر نکاح ٹوٹ جائے تو بیوی نہیں رہو گی نا؟ تو پھر چلو' میں تمہاری چھٹی کر دیتا ہوں۔ تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

میں ایک دم سے لرز گئی۔ اُس کا منہ بند کرنے کو اپنا ہاتھ بڑھایا اس نے میرا ہاتھ پکڑا پھر ایک جھٹکا دے کر دوسری طرف پھینک دیا۔ میں ایک صوفے سے ٹکرا کر قالین پر اوندھے منہ گر پڑی اس نے کہا۔ "میں تمہیں دوسری طلاق دیتا ہوں۔"

"نہیں!" میں نے ایک چیخ ماری پھر اس سے پہلے کہ میں قالین پر سے اٹھ کر اسے آگے بولنے سے روکنے جاتی۔ اُس نے تیسری طلاق دے دی پھر کہا۔ "اب تم میری منکوحہ نہیں ہو؟ اب غیر ہو اور غیر کو غیر کے حوالے کرنے والا بے غیرت شوہر نہیں کہلاتا۔"

مجھ پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ دل اور دماغ کے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ میں بیگم صاحبہ کے مقام سے گر کر ایسی پستی میں پہنچ رہی تھی' جہاں طوائف بھی نہیں پہنچتی۔ کیونکہ طوائف کا کوئی مول ہوتا ہے۔ میری تو کوئی قیمت بھی نہیں تھی۔ ایک کھلاڑی نے صرف تاش کے پتوں سے زیادہ نمبر حاصل کر کے مجھے جیت لیا تھا۔ میں نے اُن چاروں دوستوں کو دیکھا۔ "پھر چیخ پڑی میں کوئی بازاری عورت نہیں ہوں۔ کوئی ٹرافی نہیں ہوں کہ جیتنے والا کھلاڑی مجھے اٹھا کر لے جائے اور نہ ہی اغوا شدہ ہوں کہ مجھے مفت کا مال سمجھ کر دوسرے کے حوالے کر دیا جائے۔ تم نے جس طرح نکاح پڑھوایا ہے شریف! اسی طرح پنڈ واپس لے جا کر وہاں سب کے سامنے طلاق دو۔"

اکمل شریف کے دوسرے دوست اکبر پاشا نے کہا۔ "تم جہاں جانا چاہو گی' وہاں

تمہیں پہنچا دیا جائے گا لیکن چار ماہ کے بعد.........."

"چار ماہ؟" میں نے پریشان ہو کر شریف کو دیکھا۔ اکبر پاشا نے کہا۔ "ہم چار ہیں اور ہر ماہ کی آخری تاریخ کو رمی کھیلتے ہیں۔ ہم میں سے جو زیادہ پوائنٹ حاصل کر لیتا ہے' وہ اس کوٹھی میں آنے والی حسینہ کو جیت لیتا ہے۔"

اکمل شریف کے تیسرے دوست شاہنواز نے کہا۔ "شریف نے تمہیں دریافت کیا تھا۔ اس لئے پہلا حق دار یہ تھا۔ آج یہ جان بُوجھ کر ہار گیا کیونکہ یہ تمہارے ساتھ ایک ماہ کی مدت پوری کر چکا تھا۔ اصل بازی ہم تین دوست کھیل رہے تھے۔ تقدیر نے جمال شہزاد کا ساتھ دیا۔ اس لئے آئندہ ایک ماہ تک شہزاد اس کوٹھی کا اور تمہارے بدن کا مالک رہے گا۔"

شاہنواز نے کہا۔ "آج سے ٹھیک ایک ماہ کی آخری تاریخ کو پھر اسی جگہ تاش کی بازی ہو گی۔ آج تمہیں جیتنے والا شہزاد آئندہ بازی جان بُوجھ کر ہار جائے گا۔ اصل بازی میرے اور اکبر پاشا کے درمیان ہو گی۔ دستور کے مطابق ہم دونوں میں سے جو زیادہ پوائنٹ حاصل کرے گا' وہ ایک ماہ تک تمہارے حُسن و شباب کو کیش کرتا رہے گا۔"

میں پھٹ پڑی۔ "یہ کیسی بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں کر رہے ہو۔ میرے ساتھ ایسا ظلم کیوں کر رہے ہو؟"

جمال شہزاد نے کہا۔ "غصہ نہ کرو۔ کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو کہ ہم تمہیں کسی بازار میں نہیں پہنچا رہے ہیں۔ یہ صرف چار ماہ کی من موجی ہے۔ ہم رئیس زادوں کا ایک مشغلہ ہے۔ ہم خدا سے ڈرتے ہیں اس لئے اپنے پاس آنے والی کسی حسینہ کی بھی آئندہ زندگی برباد نہیں ہونے دیتے۔ چار ماہ بعد ہم چاروں پچیس پچیس ہزار یعنی ایک لاکھ روپے دیں گے۔ تم پنڈ جانا چاہو گی تو ہم زمیندار ملک نعیم کو بلا کر تمہیں اس کے حوالے کر دیں گے اور نہیں جانا چاہو گی تو اس شہر میں جہاں رہو گی' اُس مکان کا کرایہ ہم اس وقت ادا کرتے رہیں گے' جب تک تمہاری کہیں شادی نہیں ہو گی۔"

شاہنواز نے کہا۔ "ہم ہر عورت پر بُری نظر ڈالنا برا سمجھتے ہیں۔ بازار کا کھانا کبھی نہیں کھاتے۔ اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ جب اچھی طرح چھان بین کر لیتے ہیں کہ کھانے کو کسی ایرے غیرے نے جھوٹا نہیں کیا ہے تب ہم اسے یہاں لے آتے ہیں اور ہم چاروں میں سے جو سچا اور کھرا مال ڈھونڈ کر لاتا ہے' وہی اس کا پہلا حق دار ہوتا ہے۔"

اکمل شریف نے کہا۔ "شادو! تمہیں یہ باتیں بری لگ رہی ہوں گی یا تم سمجھ رہی

ہو گی کہ اس طرح ہم اعلیٰ خاندان کے لوگ بازاری بیماریوں سے خود کو محفوظ رکھتے ہیں۔"

جمال شہزاد نے کہا۔ "ہم شریف زادے ہیں۔ گناہ بھی شرافت سے کرتے ہیں۔ کیا یہ شرافت نہیں ہے کہ تمہاری جیسی جتنی حسینائیں آتی ہیں' ہم انہیں چار ماہ کے بعد غلط ہاتھوں میں پڑنے نہیں دیتے۔ اسے ایک لاکھ روپے بھی دیتے ہیں اور اس کی کہیں شادی ہونے تک اس کی رہائش وغیرہ کے انتظامات بھی کر دیتے ہیں۔"

میں نے تڑخ کر کہا۔ "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے ایک لاکھ نہ دو۔ مجھے اچھے مستقبل کے خواب نہ دو۔ صرف میری شرم مجھے دے دو۔"

"شرم کی بات نہ کرو۔ جب تک کوئی بے شرمی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی نہیں جاتی تب تک وہ شرم والی اور عزت دار کہلاتی رہتی ہے۔ چار ماہ کے بعد یہاں سے جاؤ گی تو کوئی تم پر انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔ جو ہمارے پاس آتی ہے' اسے ہم کبھی بدنام نہیں ہونے دیتے۔"

میں نے کہا۔ "بے شرمی ظاہر ہو یا پسِ پردہ ہو۔ وہ ہر حال میں قابلِ ملامت ہے۔ میں کہتی ہوں' تم سب اعلیٰ خاندانوں سے نہیں' ذلیل خاندانوں سے تعلق رکھتے ہو۔ میں یہاں سے جاؤں گی اور دنیا والوں سے چیخ چیخ کر کہوں گی کہ تم رئیس زادے مشغلے کے طور پر کیسی کیسی بے ہودہ حرکتیں کرتے ہو۔"

ایک نے پوچھا۔ "تم کہاں کہاں جاؤ گی۔ کتنی دیر تک اور کتنے دنوں تک ہمارے خلاف شور مچاؤ گی۔ آج کے سیاسی لیڈر اپنے جلسوں میں ہزار دو ہزار آدمی جمع نہیں کر سکتے۔ تم کتنوں کو بلاؤ گی؟ پھر وہ آنے والے ہمارا کیا بگاڑیں گے؟ وہ مہنگا آٹا خریدنے کی فکر کریں گے یا تمہارے لئے تھانے کچہری جائیں گے؟"

میں نے دونوں مٹھیوں کو مضبوطی سے بھینچ کر کہا۔ "کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا۔ میں خود تھانے جاؤں گی۔"

"اتنی دور جانے کی زحمت کیوں کرو گی؟ ہم تھانے کو یہیں بلا لیتے ہیں۔" شاہنواز نے نورے کو آواز دی۔ وہ برآمدے کی سیڑھی سے اٹھ کر اندر آیا' شاہنواز نے کہا۔ "تھانے دار مولا داد کو یہاں بھیج دو۔ اس سے کہو' اپنی پوری نفری کے ساتھ آئے۔"

نورے سر جھکا کر حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ ایک منٹ کے اندر ہی ایک تھانے دار وردی میں ملبوس اندر آیا۔ اس کے پیچھے دس عدد موٹے' تگڑے اور قد آور پہلوان تھے' جو صرف لنگوٹ پہنے ہوئے تھے۔ تھانے دار نے آتے ہی ان چاروں رئیس زادوں

کو سلام کیا پھر کہا۔ "میں تو یہاں گیارہ بجے ہی آ گیا تھا۔ باہر آپ کے حکم کا منتظر تھا۔"

شاہنواز نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تھانے جا کر ہمارے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہتی ہے۔ اسے بتاؤ کہ اس کوٹھی میں اور تھانے میں کیا فرق ہے؟"

وہ بولا۔ "فرق صاف ظاہر ہے۔ کوٹھی میں آپ چار شریف زادے ہیں' جو بڑی شرافت سے پیش آتے ہیں۔ تھانے میں یہ دس پہلوان رہیں گے اور اسے حوالات میں لے جا کر بڑی بدمعاشی سے صبح کرتے رہیں گے۔"

میری آنکھیں اُن دس پہلوانوں کو دیکھ رہی تھیں۔ دماغ میں ایک شور بپا تھا۔ خوف کے مارے محسوس ہو رہا تھا کہ تھانے جانے سے پہلے ہی میرے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہے۔ شاہنواز نے کہا۔ "مولا داد! آگے بولو۔ یہ چیخے گی' چلّائے گی تو کیا ہو گا؟"

"ہونا کیا ہے صاحب! اسے جی بھر کے چلّانے دیں گے۔ اس کی آواز باہر تک جائے گی اور باہر والے تھانے میں آنے سے ڈرتے ہیں۔ کون مائی کا لال ہم سے آ کر پوچھے گا کہ حوالات میں کیا ہو رہا ہے؟"

میں کھڑی ہوئی تھی۔ ایک دم سے سر چکرا گیا۔ آگے پیچھے کوئی سہارا نہیں تھا۔ میں گرنے کے انداز میں دھپ سے قالین پر بیٹھ گئی۔ جمال شہزاد نے کہا۔ "یہ بیٹھ گئی ہے۔ سیاسی اصطلاح میں بیٹھ جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سامنے والے امیدوار سے شکست تسلیم کر لینا یا سمجھوتا کر لینا۔ اب یہ راضی رہے گی۔ ویسے یہ اسے بتا دو کہ ہم کون ہیں؟"

تھانے دار مولا داد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ سب مائی باپ ہیں۔ ویسے لڑکی! تم سن لو' یہ جو اکمل شریف صاحب ہیں' یہ ایک ایم این اے صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ یہ جمال شہزاد صاحب کے والد صاحب اور چچا صاحب وغیرہ سب کے سب ارب پتی کہلاتے ہیں۔ یہ اکبر پاشا صاحب ایک بہت بڑے بیورو کریٹ کے صاحب زادے ہیں اور جناب شاہنواز صاحب اس ملک کے ایک ایسے زبردست صاحب کے صاحبزادے ہیں کہ میں ان کے والد ماجد کا نام زبان پر نہیں لا سکوں گا۔ لاؤں گا تو زبان جل جائے گی۔"

شاہنواز نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس بہت تعارف ہو چکا۔ اب جاؤ اور کوٹھی کے باہر سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دو۔ یہ چلّائے گی تو سپاہی اسے اٹھا کر حوالات میں پہنچا دیں گے۔"

تھانے دار انہیں سلام کر کے اپنے دس عدد ہٹے کٹے پہلوانوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

اکمل شریف نے کہا۔ "میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میں اگلے تین ماہ تک کنوارا نہیں رہ سکوں گا۔ اس لئے نیا امریکہ دریافت کرنے جا رہا ہوں۔"

اس کے ساتھ اکبر پاشا اور شاہنواز بھی چلے گئے۔ میں تنہا بے یار و مددگار اسی کوٹھی

میں رہ گئی، جہاں دلہن بن کر آئی تھی۔ کوٹھی وہی تھی، میں بھی وہی تھی، صرف دولہا بدل گیا تھا۔

☆========☆========☆

وہ خاموش ہو گئی۔ جیسے بولتے بولتے تھک گئی ہو یا ایک پُرزے کی طرح مسلسل استعمال ہوتے رہنے کے باعث مشین چلتے چلتے رک گئی ہو۔

خیرالدین شاہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ ایک شرم ناک واقعہ سن کر شرم سے گردن جھک گئی تھی۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا پھر بھی جھجک رہا تھا اور شاہدہ عرف شادو سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ ایک کہنی میز پر ٹیک کر اس ہاتھ سے سر کو تھام کر جیسے اشرف المخلوقات ہونے کا ماتم کر رہا تھا۔ شادو نے اسے اس حال میں دیکھا پھر کہا۔ "آپ نمازی پرہیزگار ہیں۔ میں نے یہاں دو دنوں میں دیکھا ہے کہ آپ اپنے جسم اور قلب کی صفائی کیسے رکھتے ہیں اور میں غلاظت کا ایک مجسمہ ہوں۔ مجھے یہاں رہنے کا حق نہیں ہے۔"

وہ کرسی سے اٹھنے لگی۔ خیرالدین شاہ نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں نے بڑے بڑے رئیس زادوں کے بڑے عجیب و غریب مشغلے دیکھے ہیں اور سنے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک شرمناک اور منفرد مشغلہ ہے۔ یا خدا! جب دولت حد سے زیادہ ہو جائے تو اسے خرچ کرنے کے لئے کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں۔"

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ "تم خود کو غلیظ کہہ رہی ہو۔ جب غلاظت حد سے بڑھ جاتی ہے تو اُس غلاظت کے ڈھیر سے زہریلی گیس پیدا ہوتی ہے۔ میں نے بھی ملکی سیاست اور معاشرت میں اس قدر گندگی دیکھی ہے کہ میرے قلم میں بھی زہر بھر گیا ہے۔ جن کے خلاف لکھتا ہوں، وہ مجھے زہریلا صحافی کہتے ہیں۔ میں فی الوقت تمہارے اندر بھرے ہوئے زہر کو سمجھ رہا ہوں۔ اسے باہر نکالو۔ مجھے بتاؤ، پھر کیا ہوا؟"

وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر بولی۔ "ہونا کیا تھا۔ وہ بے غیرت طلاق دے کر چلا گیا۔ اس کے بعد جمال شہزاد نے مجھے کوٹھی کی چار دیواری سے بھی نکلنے نہیں دیا۔ وہ بھی اکمل شریف کی طرح کبھی دن کو کبھی رات کو چار یا چھ گھنٹے گزارنے آتا تھا پھر چلا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تمام رئیس زادے کسی یونیورسٹی یا ٹیکنیکل کالج وغیرہ میں علم حاصل کر رہے تھے یا اپنے بزرگوں کے وسیع ذرائع کے باعث وسیع کاروبار وغیرہ میں مصروف رہتے تھے۔ پھر اپنے والدین کے اطمینان کے لئے آدھی رات سے پہلے اپنے گھروں میں پہنچ جاتے تھے۔ یوں جانے سے پہلے جمال شہزاد مجھے ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے دروازے کو مقفل کر کے جاتا تھا تاکہ میں ملازم کو دھوکا دے کر فرار نہ ہو سکوں۔ دروازہ

مقفل رہنے کے دوران نورے ایک کھڑکی کی آہنی جالیوں کے راستے میرے لئے کھانا پہنچایا کرتا تھا۔ اُس نے چار دنوں کے بعد پوچھا۔ "کیا اب انگریزی بولنا نہیں سیکھو گی؟" میں نے کہا۔ "حالات نے سمجھا دیا ہے۔ اکمل شریف مجھے خواہ مخواہ مصروف رکھنے کے لئے بڑی بیگم بننے کو کہتا تھا تاکہ میں روز اس کی طویل غیر حاضری کے متعلق سوالات نہ کروں۔ اب ان رئیس زادوں نے خود ہی اصلیت دکھا دی ہے۔ میں کوئی بیگم صاحبہ نہیں ہوں۔ ایک مٹی کا کیڑا ہوں، چار ماہ بعد پھر مٹی میں مل جاؤں گی۔"

وہ کھانا دے کر جانے لگا۔ میں نے کہا۔ "پانچویں بے غیرت تم ہو۔ تم میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو مجھ پر ترس کھاتے اور پہلے ہی دن مجھے شریف کے شیطانی ارادوں سے آگاہ کر دیتے۔"

وہ بولا۔ "تمہاری باتوں کا پہلا جواب یہ ہے کہ تمہیں ابھی تک ان چار رئیس زادوں کی طاقت اور وسیع ذرائع کا اندازہ نہیں ہوا ہے۔ میں پہلے ہی دن تمہیں یہاں سے بھگا کر خود کہاں بھاگتا۔ ہم اس ملک سے باہر بھی چلے جائیں تو وہاں بھی یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ویسے تم غیرت مند ہو تو مرجاؤ۔ میں تو زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"ان کی اصلیت معلوم ہونے کے بعد پچھلے چار دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ خودکشی کرلوں لیکن انسان بدترین حالات میں امید کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ مجھے امید بھی ہے اور یقین بھی کہ تمام مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ شاید کوئی غیرت مند مجھے یہاں سے رہائی دلانے آجائے۔"

"صاف طور سے کہو کہ آبرو لٹانے کے بعد بھی مرنے سے ڈرتی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ خودکشی حرام ہے۔ جب تک دل میں یہ ایمان رہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عزت دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ذلت دیتا ہے تو پھر اس انتظار میں خودکشی سے پرہیز کرنا چاہئے کہ وہی اللہ ہماری کھوئی ہوئی عزت ہمیں پھر دے گا اور ظالموں سے ان کے مظالم کا حساب ضرور لے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "اس ملک میں ظالموں کا حساب کبھی ہوا ہے نہ ہونے کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ اسی لیے میں نے بی اے کرنے کے بعد جب اچھی طرح بے روزگاری کی ٹھوکریں کھالیں تو پھر یہ ملازمت کرلی۔ منشیات اور اسلحہ وغیرہ کے دھندے میں ہمیشہ ہم جیسے چھوٹے کارندے مارے جاتے ہیں یا جیل چلے جاتے ہیں۔ بڑے باس کہلانے والوں پر کوئی آنچ نہیں آتی۔"

میں نے کہا "اس لیے تم عورتوں کے دلال بن گئے ہو۔"

"عورتیں سپلائی کرنے والوں کو دلال کہا جاتا ہے۔ میں نے چاروں آقاؤں کے سامنے کبھی کوئی عورت پیش نہیں کی۔ بلکہ یہاں جو عورتیں آتی ہیں۔ وہ مجھے کبھی کبھی خوش کر دیتی ہیں۔ کیا تم خوش نہیں کرو گی؟"

"لومڑی اپنی چھلانگ سے اونچے انگوروں تک نہیں پہنچتی۔ میں ہمیشہ تمہاری نظروں کو بھانپتی رہی ہوں۔ آج تم نے زبان ہی کھول دی۔ تم مجھے ایک ہی شرط پر حاصل کر سکتے ہو۔"

"تم سے پہلے یہاں قید رہنے والی حسینہ نے کہا تھا کہ میں اسے قید سے نکال کر لے جاؤں' کیا تم بھی یہی کہنا چاہتی ہوں؟"

"میں اس سے آگے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مرد بنو۔ صرف یہاں سے رہائی نہ دلاؤ۔ بلکہ مجھے اپنے گھر کی عزت بنا کے رکھو۔ خدا گواہ ہے کہ میں صرف ایک مرد کی ہو کر ساری زندگی اس کے ساتھ گزار دینا چاہتی ہوں۔"

"ایسا تو چار ماہ بعد ہو گا۔ جب یہ چاروں رئیس زادے تمہیں ایک لاکھ دے کر کہیں بھی شادی کرنے کی اجازت دے دیں گے۔ پھر تم سے وہی شادی کرے گا جو تمہاری زندگی کے بدترین چار ماہ کا حساب نہ جانتا ہو گا۔ میں تو جانتا ہوں۔ جب تمہاری عزت ہی نہیں رہی تو میں اپنے گھر کی عزت کیوں بناؤں گا؟ کیا میں پاگل کا بچہ ہوں۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کوٹھی کے ملازم کے لیے بھی میں قابلِ قبول نہیں رہی تھی۔ وہ بھی اپنے آقاؤں کی طرح میری عزت سے کھیلنے کے لیے للچا رہا تھا لیکن مجھے اپنے گھر کی عزت بنائے رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں ناگواری سے منہ پھیر کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔ ایک چھوٹی سی میز پر رکھے ہوئے کھانے کو زہر مار کرنے لگی۔ زندہ رہنے کے لیے تو کھانا ہی پڑتا ہے۔

میں نے اس سے دو دن تک بات نہیں کی لیکن اس قید خانے میں وہی تو ایک تھا' جس سے باتیں کر کے وقت گزارا جا سکتا تھا۔ جمال شہزاد چار چھ گھنٹوں کے لیے آتا تھا پھر چلا جاتا تھا۔ میں نے کھڑکی کے راستے کھانا لیتے ہوئے اس سے پوچھا "یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

وہ بولا "یہاں سے یورپ اور امریکا تک ان رئیس زادوں کی اور ان کے بزرگوں کی بے شمار کوٹھیاں اور کاٹیجز ہیں۔ یہ تو ان کی ایک معمولی سی کوٹھی ہے۔ ان چار رئیس زادوں میں سے کسی کے باپ نے اسے یہ کوٹھی گفٹ میں دی ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

"آخر یہ ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہیں؟"

"شغل کرتے ہیں۔ بڑے لوگ ہیں' جب تک لاکھوں روپے خرچ ہونے والا مشغلہ نہ ہو' انہیں مزہ نہیں آتا۔ ویسے یہ ہر عورت کے ساتھ گھٹیا حرکتیں نہیں کرتے ہیں۔"

"کیا یہ گھٹیا حرکت نہیں ہے' جو میرے ساتھ ہو رہی ہے۔"

"تم ایسا کہہ سکتی ہو۔ ہماری دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو ایک کے لیے بری ہوتی ہیں لیکن دوسرے کو مزہ دیتی ہیں۔ ایک عام شخص کا منہ جس سے میٹھا ہوتا ہے' وہ مٹھائی شوگر کے مریض کو مار ڈالتی ہے جبکہ مٹھائی زہر نہیں ہوتی۔ وہ چاروں تمہارے لیے زہر ہیں تم ان کے لیے مٹھائی ہو' یہی ہماری دنیا ہے۔"

"تم ان رئیس زادوں کی طرح تعلیم یافتہ ہو۔ کیا تمہارے اندر یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا کہ تم بھی بڑے آدمی بن جاؤ؟"

"آج کے دور میں ہر شخص پلک جھپکتے میں رئیس اعظم بن جانا چاہتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں نے بے روزگاری کے زمانے میں فوٹو گرافی کا کام سیکھا تھا۔ اب میں ویڈیو فلمیں تیار کر لیتا ہوں۔ جب میرا یہ کام چل نکلے گا تو میں رفتہ رفتہ دولت مند بنتا جاؤں گا۔"

پتا نہیں وہ اپنا خواب کب اور کیسے پورا کرنا چاہتا تھا؟ ہر خواب کی تعبیر نہیں ملتی۔ میں بھی پنجرہ توڑ کر اُڑ جانے کے خواب صرف دیکھتی ہی رہتی تھی۔ یوں دیکھتے دیکھتے دوسرے ماہ کی آخری تاریخ آ گئی۔ وہ چاروں دوست پھر ڈرائنگ روم میں رات کو آٹھ بجے آئے۔ حسبِ معمول پیتے' کھاتے اور کھیلتے رہے۔ شریف اور جمال شہزاد محض ان کا ساتھ دینے کے لیے کھیل رہے تھے۔ اصل ہار جیت کی بازی اکبر پاشا اور شاہنواز کے درمیان تھی۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی جیت جاتا تو میرے لیے کوئی فرق نہ پڑتا۔ انہوں نے مجھے ایسی جگہ پہنچا رکھا تھا جہاں میرے پاس آنے والا کالا ہوتا یا گورا' دبلا پتلا ہوتا یا موٹا' صحت مند ہوتا یا بیمار' مجھے ہر حال میں اسے قبول کرنا پڑتا۔ حالات عوام کی پسند کے مطابق کبھی نہیں ہوتے۔ عوام کو اچھے اور برے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس رات رمی کھیلنے کے دوران میں اپنے کمرے میں رہنا چاہتی تھی مگر انہوں نے جبراً مجھے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ آہ! کیسی بے حیا زندگی گزر رہی تھی۔ مردوں نے اپنی حفاظت کے بڑے سامان کئے ہیں۔ عورت کو اپنی عزت کے تحفظ کا ایک رستہ بھی نہیں

ملتا۔ ہمارے دین میں عورت کو عزت و آبرو کے ساتھ شریعت کے مطابق ایک تمہارے چہرے سے ایک طرح کا پچھتاوا نظر آ رہا ہے۔"
ساتھی ملتا ہے لیکن افراطِ زر' نے افراطِ ہوس نے شرعی طور پر نکاح پڑھوانے کو بھی اس نے کھڑکی کے راستے کھانا دے کر منہ پھیر لیا پھر کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں
کا ایک طریقہ بنا دیا ہے۔ آخر اکمل شریف نے مجھ سے باقاعدہ نکاح پڑھایا تھا۔ پنڈ ہے۔ میں بھلا کیوں پچھتاؤں گا۔"
کے سامنے مجھے عزت دی تھی پھر شہر لا کر عزت کی دھجیاں اُڑا رہا تھا۔ اس رات بار میں نے پوچھا۔ "منہ پھیر کر کیوں جا رہے ہو؟"
تک شاہنواز نے زیادہ پوائنٹ حاصل کئے اور مجھے جیت لیا۔ اکبر پاشا نے اپنے پتّے "تم کہہ رہی ہو کہ برا آدمی پچھتاتا ہے جبکہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں
پٹختے ہوئے کہا "لعنت ہے میری قسمت پر۔ پچھلی بار روزینہ جیسی حسین لڑکی آئی' کی ہے۔"
مجھے تم سب کے بعد ملی۔" "کیا یہ نہیں جانتے کہ بروں کا ساتھ دینا بھی بہت بڑی برائی ہے۔"
اس کی بات پر سب ہنسنے لگے۔ اکمل شریف نے کہا۔ "اگر پہلا چانس لینا چاہ وہ سنی ان سنی کر کے چلا گیا۔ میں کھانے کے لئے بیٹھی۔ سوچنے لگی کہ صرف
تو میری طرح شادو جیسی حسینہ کو پھانس کرلاؤ۔ ورنہ ہمیشہ پیچھے رہو گے' کیونکہ تم ری سوچنے سے رہائی نہیں ملے گی۔ انتظار کرتے رہنے سے تقدیر مہربان نہیں ہو گی۔ مجھے کچھ
میں اناڑی ہو۔" کرنا چاہئے۔ مگر کیا کروں؟ کیا شاہنواز رات کو آئے تو اس کا سر توڑ دوں؟ ایسا میں نے کئی
شاہنواز نے کہا۔ "یار پاشا! کیوں ناشکری کرتے ہو؟ پیاسے تو نہیں رہے۔ آ بار سوچا تھا اس سے پہلے بھی اکمل شریف اور جمال شہزاد اکثر نشے کی حالت میں میرے
روزینہ کا چوتھا مہینہ اس کے ساتھ گزار رہے ہو۔" پاس آتے تھے۔ مگر مدہوش نہیں رہتے تھے۔ نشے اور مستی میں رہتے تھے اور مجھ پر
"مگر ایک ہفتہ بعد اس کے چار ماہ پورے ہو جائیں گے۔ اسے اس کے حقوق بھاری پڑتے تھے۔ میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اندیشوں میں گھر جاتی تھی کہ فرار
کر رخصت کرنا ہو گا۔" ہونے میں ناکام رہوں گی تو مجھے حوالات میں پہنچا دیا جائے گا۔ یہاں تو ایک ہی کو ایک
"ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے۔ روزینہ کے جاتے ہی دوسری کوٹھی میں دوسری آفت میں بھگت رہی تھی۔ حوالات میں دس ہٹے کٹے بدمعاش میرا ریشہ ریشہ نوچ کر رکھ
گی۔ جاؤ پاشا! آج خوب پیو اور غم غلط کرو۔" یں گے۔
اکمل شریف اور جمال پاشا ہنستے بولتے رہے۔ پھر اکبر پاشا کو اپنے ساتھ لے اس میں شبہ نہیں ہے کہ پولیس اور انتظامیہ کے عہدے دار ان چاروں کو سلام
وہاں میرے تیسرے فاتح کے پاس مجھے چھوڑ دیا۔ کئی بار خیال آیا کہ اب خدا پر بھر رتے تھے۔ ان کے تمام احکامات کی فوراً تعمیل کرتے تھے۔ ایسے شیر جوانوں کے سامنے
کروں۔ خودکشی حرام ہے تو ہوا کرے۔ مجھے مرجانا چاہئے۔ بدترین حالات میں یہ مظلوموں کی فریاد اور صدائیں بے آواز ہو جاتی ہیں۔ قانون کی شکل بگڑ جاتی
ہے۔
نہیں رہتی کہ بے شرمی کے ماحول سے نکلنے کا کوئی راستہ ملے گا۔ اس کے باوجود میں میں نے ایک سرد آہ بھری۔ زمین والوں سے اور آسمان والے سے مایوس ہوئی پھر
جان نہیں دی۔ میں چوتھا مہینہ گزرنے کے بعد اور وہاں سے رہائی حاصل کرنے کمانے کے لئے لقمہ اٹھایا۔ اس لقمے کو بسم اللہ پڑھ کر منہ میں رکھا تو معجزہ ہو گیا۔ مایوسی
اپنے حالات لکھنا چاہتی تھی اور دنیا والوں سے پوچھنا چاہتی تھی کیا موت ہی شرم رہ رہے' یہ یقین پختہ ہو گیا۔ انسان کی عقل وہ سوچ بھی نہیں سکتی' جو قدرت کر بیٹھتی
ایک راستہ رہ گیا ہے کیا شرم والی عورتوں کو اپنی زندگی سے پیار نہیں ہوتا؟ کہ۔ میں دوڑتی ہوئی باتھ روم میں آئی۔ نجات کا راستہ مل رہا تھا۔ واش بیسن پر جھکتے ہی
ہاتھوں سے نکلنے کے بعد دوبارہ حاصل ہو جاتی ہے۔ لٹی ہوئی دولت بھی واپس ڑا سا چبایا ہوا لقمہ اگل دیا۔ پہلے ابکائی سی آتی رہی تھی پھر قے ہونے لگی۔
ہے۔ پھر لٹی ہوئی عورت کو دوبارہ عزت و آبرو کی زندگی حاصل کیوں نہیں ہو سکتی اندر سے میری حالت ایسی تھی جیسے سب کچھ باہر آ رہا ہو۔ جان بھی نکل رہی ہو۔
خود نہیں جانتی تھی کہ چار ماہ بعد مجھے کن راستوں پر چلنا ہو گا؟ تیسرے ماہ کا پہلا ہفتہ کمزوری اور گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ کچھ عجیب طرح سے جی متلا رہا تھا۔ میں
گیا۔ ان دنوں ملازم نورے کچھ مرجھایا ہوا سا نظر آنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ "آدمی نا تھی' ذرا سی اور قے ہو جائے تو جی ہلکا ہو جائے لیکن ابکائیاں سی آ رہی تھیں اور
برا ہو' اس کے اندر شرافت سوئی رہتی ہے جو کسی وقت بھی بیدار ہو سکتی ہے نہیں ہو رہی تھی۔ میں بڑی دیر تک واش بیسن پر جھکی رہی۔ آنکھوں سے یوں پانی

بہہ رہا تھا جیسے رو رہی ہوں جبکہ رونے کی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے' تولیا اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھا تو اچانک خیال آیا کہ یہ تو ماں بننے کے آثار ہیں۔ کھٹا کھانے کو جی چاہنے لگا تھا۔ نورے کھانے کے ساتھ اچار لے کر آیا تھا۔ میں کمرے میں آ کر میز کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اچار کا ایک ٹکڑا اٹھا کر چاٹنے لگی۔ اگرچہ طبیعت گھبرا رہی تھی۔ بے حد کمزوری سی لگنے لگی تھی۔ تاہم یہ خیال تقویت پہنچا رہا تھا کہ اب مجھے نجات مل جائے گی۔ اب شاہنواز ایک ماں بننے والی عورت کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ میری رہائی کے لئے ایک ماہ اور تین ہفتے رہ گئے تھے لیکن یہ مدتِ قید شاید ختم کر دی جائے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں میری بات پر یقین نہ آئے اور وہ اپنے ذرائع سے میرا طبی معائنہ کرائیں۔ معائنہ کے بعد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شراب کا نشہ اور ہوس ان پر غالب آ جائے۔ میں تو بس ہاتھ جوڑ کر منتیں کر سکتی تھی کہ عورت کا احترام نہیں کرتے نہ کرو' ایک ماں بننے والی کو تو بخش دو۔ ویسے اب میں مایوس نہیں تھی۔ وہ چاروں خود کو اعلیٰ ذوق کے حامل کہتے تھے۔ ہو سکتا تھا' اب مجھے کچرا سمجھ کر باہر پھینک دیتے۔ کاش میں پیدائشی کچرا ہوتی اور کوئی مجھے ہاتھ نہ لگاتا۔ میں نے نورے کو آواز دی۔ وہ کچن میں کام کر رہا تھا۔ اس نے آ کر پوچھا۔ "کیا اور روٹی لاؤں؟"

میں اندر سے مطمئن تھی۔ ایک عرصے کے بعد مسکرا کر بولی۔ "روٹی کھانے کو جی نہیں کرتا ہے۔ ذرا اچار کی بوتل دے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "مجھے یاد نہیں ہے کہ میں کتنے عرصے بعد تمہیں مسکراتے دیکھ رہا ہوں۔ قیدی تو عید کا چاند دیکھ بھی خوش نہیں ہوتے۔ تمہیں کون سی خوشی حاصل ہو گئی ہے؟"

دیکھا جائے تو یہ خوشی کی بات نہیں تھی۔ پتا نہیں میں کس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جب عورت اپنے ہونے والے بچے کے باپ کی صحیح نشاندہی نہ کر سکے تو اس سے بڑی بے شرمی اور بے غیرتی کوئی اور نہیں ہو سکتی اور یہ خوشی کی بات تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میں تو ناپسندیدہ رئیس زادوں سے نجات حاصل کرنے کے خیال سے خوش ہو رہی تھی۔ بعض حالات میں ایسا ہوتا ہے۔ مصائب سے نجات حاصل کرنے والوں کو میری طرح کیچڑ' دلدل اور غلاظتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

میں نورے سے کہنا چاہتی تھی کہ کس قدر ایمانی طہارت' اخلاقی پاکیزگی اور جسمانی پارسائی کو گالیاں بناتے رہنے کے بعد مجھے رہائی ملنے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں مگر اس سے

پہلے کہ میں کچھ کہتی' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر کراہنے اور ڈگمگانے لگا۔

میں نے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا تم بیمار ہو؟ تمہیں کوئی تکلیف ہے؟"

وہ ذرا دور ہو کر ایک صوفے کو تھام کر سنبھل گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بیمار ہے اور اپنے اندر کوئی تکلیف برداشت کر رہا ہے۔ بعض لوگ ہمیشہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کسی سے زیر نہیں ہوتے اور جب حالات کی مار پڑتی ہے تو وہ اپنی مردانگی قائم رکھنے کے لیے حالات کی مار کو اندر ہی اندر برداشت کرتے ہیں اور اپنی توہین ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

وہ صوفے کے پاس سے ڈگمگاتا ہوا چلا اور ایک طرف جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑی سوچتی رہی اور اس کا انتظار کرتی رہی مگر وہ نہیں آیا۔ حالات کچھ عجیب سے موڑ پر آ رہے تھے۔ ادھر میری طبیعت بوجھل سی ہو گئی تھی۔ ایک ایسی ناگواری تھی' جو عورت کو خوش گوار لگتی ہے۔ ادھر نورے نہ جانے کس عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا؟

وہ ایک گھنٹے بعد آیا۔ میں نے اسے کھڑکی کے راستے کھانے کے برتن دیتے ہوئے کہا "کیا مجھے اچار کی بوتل لا کر دو گے؟"

وہ خاموشی سے چلا گیا۔ پھر اس نے چند منٹ کے بعد اچار کی ایک چھوٹی سی بوتل لا کر دے دی۔ میں نے اسے لیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم بیمار ہو؟"

"نہیں" وہ مختصر سا ٹالنے والا جواب دے کر جانے لگا۔ میں نے کہا "تم دنیا میں بالکل اکیلے ہو۔ مجھے اپنا سمجھ کر تکلیف بیان کرو۔"

وہ ذرا اکڑ کر اور جھنجھلا کر بولا "مجھے کیا تکلیف ہو گی؟ کیا میں تمہاری طرح عورت ہوں۔ میں بڑی سے بڑی تکلیفیں جھیل سکتا ہوں۔ مجھے کسی رشتے' کسی سہارے اور کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ تیزی سے جانے لگا۔ میں نے اونچی آواز میں کہا "تمہیں اس بات کا غصہ ہے کہ تمہارا کوئی نہیں ہے۔ تم کسی کو اپنا سمجھ کر نہ دکھ درد بیان کر سکتے ہو نہ اپنا غبار نکال کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہو۔"

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں کھڑکی کی جالیوں سے لگ کر سامنے دیکھ سکتی تھی' دائیں بائیں کچھ نظر نہیں آتا تھا لیکن اس کا سایہ سامنے والی دیوار پر نظر آ رہا تھا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو کر کہیں کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سایہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی ایک

آستین سے آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

میں نے کہا ”نورے! تم جہاں بھی ہو۔ یہ سن لو کہ میں تمہیں اپنا سمجھتی ہوں۔ جب اتنی بڑی دنیا میں دو اکیلے مل جائیں تو پھر وہ اکیلے نہیں رہتے۔“

سائے کا سر جھکا ہوا تھا۔ میں نے کہا ”میں قسم کھا کر کہتی ہوں، تم سے کبھی یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے یہاں سے رہائی دلاؤ۔ میں صرف تمہارا دکھ بانٹنا چاہتی ہوں اور جب عورت دکھ میں حصہ لیتی ہے تو اکیلے مرد کی دنیا اپنوں ہی اپنوں سے بھر جاتی ہے۔“

سایہ دیوار سے سرک گیا۔ وہ چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر تک کھڑکی سے لگی کھڑی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔ میں بہت زیادہ کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اس حالت میں مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا، جب شاہنواز میرے پاس آتا۔ رات کو نو بج رہے تھے۔ وہ آٹھ بجے تک آ جایا کرتا تھا۔ پھر آدھی رات سے پہلے چلا جاتا تھا۔ اس رات میں نے بے چینی سے اس کا انتظار کیا جبکہ پہلے میں ان کے نہ آنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ دعائیں قبول بھی ہوتی تھیں۔ وہ لوگ ہفتہ میں کبھی دو تین دنوں تک نہیں آتے تھے۔ اپنے خاندانی، تعلیمی یا کاروباری معاملات میں مصروف رہتے تھے۔

مجھے امید تھی کہ شاہنواز میرے ماں بننے کی خبر سن کر قریب نہیں آئے گا۔ خواہ وہ ایک ماں بننے والی کا لحاظ کرے یا نہ کرے مگر شاید اس کی نفاست پسندی مجھے غلاظت کا ڈھیر سمجھے اور وہ منہ پھیر لے۔ وہ سب اعلیٰ خاندان والے کہلاتے تھے۔ اب مجھے فالتو مال سمجھ کر، ایک ناجائز بچہ پیدا کرنے والی سمجھ کر شاید مجھ پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتے۔

کوئی ہمیں اس قدر غلیظ اور ناقابلِ نفرت سمجھے کہ ہم پر تھوکنا بھی پسند نہ کرے تو اپنی توہین کا احساس ہوتا ہے مگر میں دعا مانگ رہی تھی کہ وہ چاروں مجھے کوٹھی سے باہر تھوک دیں۔

میں بڑی بے چینی سے شاہنواز کا انتظار کرتی رہی۔ پھر آدھی رات گزر گئی۔ وہ نہیں آیا اور نہ ہی اب دوسرے دن تک آ سکتا تھا۔ کیونکہ شریف خاندانوں کے بچوں کو آدھی رات کے بعد گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ بچے کبھی کاروبار کے سلسلے میں یا کبھی آؤٹنگ کے نام پر لاہور سے باہر جانے کے بہانے صبح تک رہ جاتے تھے۔ ورنہ بڑی سعادت مندی سے اپنے والدین کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔

اس رات میں اچھی طرح سو نہ سکی۔ کچھ بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ کمزوری بھی لگ رہی تھی اس لئے کچی نیند میں رہی۔ میں نے اذان کی آواز سنی۔ باہر تیز بارش ہو

رہی تھی۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت میں نے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھا۔ ورے کمرے کے مقفل دروازے کو کھول کر اندر چلا آیا تھا۔ میں فوراً ہی بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے اس طرح آنے پر مجھے اعتراض کرنا چاہئے تھا اور یہ پوچھنا چاہئے تھا کہ جس دروازے کی چابی مالک کے پاس رہتی ہے، وہ نوکر کے پاس کیسے آ گئی؟ لیکن اس کی حالت کچھ ایسی تھی کہ میں اپنا تجسس بھول گئی اس کے چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ بھیگی بھیگی سی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ تھوڑی دیر پہلے تک روتا رہا ہے۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا یا وہ پہلے والا نورے دکھائی دیتا تو میں اسے دھکا دے کر ایک شور مچا کر بھاگ جاتی۔ بھاگنے کا یہ اچھا موقع تھا لیکن میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم رو رہے تھے؟ ایک مرد ہو کر رو رہے تھے؟“

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”مرد کبھی نہیں روتا مگر عذابِ الٰہی اسے رُلا دیتا ہے۔“

”میں کل رات سے پوچھ رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی تکلیف کیوں چھپا رہے ہو؟“

وہ نیچے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کل رات صاحب کا فون آیا تھا۔ وہ اسلام آباد گئے ہیں۔ سارا دن وہاں رہیں گے۔ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں آیا کہ وہ مجھے وہاں سے بھاگ جانے کو کہہ رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”تم اپنے ہوش و حواس میں ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کچھ دنوں سے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا تمہارے پاس اس دروازے کی چابی رہتی ہے؟“

وہ دھیمی سی آواز میں بولا۔ ”میں نے ایک بار موم پگھلا کر اس دروازے کے کی ہول کا سانچہ بنایا تھا پھر ایک کاریگر سے چابی بنوالی تھی۔ بس تم اب جاؤ۔“

”میں تو چلی جاؤں گی لیکن جانتے ہو کہ مجھے یہاں سے بھگا کر خود اپنے لئے کتنی بڑی مصیبت مول لے رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”مصیبت تو ایسی آئی ہے کہ یہ رئیس زادے بھی میری مصیبت سے بڑی مصیبت نہیں بن سکیں گے۔“

میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ بولا۔ ”جب کوئی مصیبت آتی ہے تو مصیبت زدہ لوگ بازار جاتے ہیں، وہاں سے پنجرے میں بند طوطے خرید کر پھر پنجرہ کھول کر انہیں آزاد کر دیتے ہیں تاکہ آئی ہوئی بلا ٹل جائے یا دکھ مصیبت کچھ کم ہو جائے۔“

میں نے بھی پنجرے کا دروازہ کھول دیا ہے' تم اُڑ جاؤ۔"

"مگر بات کیا ہے۔ میں تمہارا دکھ معلوم کئے بغیر نہیں جاؤں گی اور صرف معلو
نہیں کروں گی' تمہارا دکھ دور بھی کروں گی۔ یاد ہے نا؟ کل رات میں نے کہا تھا کہ
اکیلے نہیں ہو۔"

اس نے بڑی احسان مندی اور اپنائیت سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ "اگر میں زندہ رہا
کیا میرے ساتھ رہو گی؟"

"تم زندہ رہو گے۔ اگر مگر کیا کر رہے ہو۔ کیا تمہیں کوئی خطرہ پیش آیا ہے؟"

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرا دل بھر آیا میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے برین ٹیومر ہو گیا ہے۔ میرے دماغ میں گلٹی پڑ گئی ہے
مجھے لگتا ہے. میرا پورا دماغ پھوڑا بن گیا ہے۔"

یہ برین ٹیومر کیا ہوتا ہے' میں نہیں جانتی تھی۔ آخر پنڈ کی رہنے والی تھی۔ پہلے
صاحب بننے کی خوش فہمی میں انگریزی کے چند بول سیکھے تھے۔ پھر ان پر مٹی ڈال دی تھ
اگر وہ کہتا کہ دماغ میں رسولی ہو گئی ہے۔ تب بھی یہ طب اور حکمت والی بات سمجھ میں
آتی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ دماغ میں گلٹی کیسے پڑ جاتی ہے۔
دماغ کے اندر پھوڑا کیسے نکل آتا ہے؟ کیا تمہیں کسی ڈاکٹر نے بتایا ہے؟"

"ہاں' پچھلے کئی ماہ سے علاج کرا رہا تھا۔ پھر بڑے تجربے کار ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ا
نے کتنے ہی ٹیسٹ لئے۔ ایکسرے لیا پھر بتایا کہ یہ بیماری ہے۔ ایسی بیماری جو لاکھوں رو
خرچ کرنے کے بعد بھی شاید ہی ختم ہو۔"

میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔ "جب ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بیماری
ہو جائے گی تو پریشانی کی کیا بات ہے؟ میں تمہیں ایک لاکھ روپے دوں گی۔"

اس نے مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا پھر پوچھا۔ "تم......... تم مجھے ایک لا
روپے دو گی......... مگر کیسے؟"

"تم کمرے سے چلے جاؤ۔ دروازے کو مقفل کر دو۔ میں یہاں سے نہیں جاؤ
گی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ تمہیں رہائی مل رہی ہے اور تم جانے سے انکار کر رہی ہو؟"

"ایک ماہ تین ہفتوں کے بعد بھی رہائی مل جائے گی اور اس کے ساتھ ایک لا
روپے بھی ملیں گے۔ اس رقم سے تمہارا علاج ہو جائے گا۔"

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو پھر کہا۔ "تم میری خاطر ان ر

زادوں کی عیاشیاں برداشت کرو گی؟ کیا میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم کھٹا کیوں کھا رہی ہو۔ تم
ماں بننے والی ہو۔"

"میں کھٹا نہیں کھاؤں گی۔ ایک ماہ تین ہفتوں تک انہیں پتا نہیں چلے گا کہ میں ماں
بننے والی ہوں۔"

وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "تم اتنی بڑی بات چھپاؤ گی اور ان کے
مظالم برداشت کرتی رہو گی۔ میں تمہارا کوئی نہیں ہوں اور تم میرے لئے اتنی بڑی بڑی
قربانیاں دو گی۔ میرا تمہارا کیا رشتہ ہے۔ تم میرے لئے رہائی سے صرف اس لئے انکار کر
رہی ہو کہ مجھے علاج کے لئے ایک بڑی رقم دے سکو اور یہ رقم کیا چیز ہے۔ تم تو اپنی ممتا
کو داؤ پر لگا رہی ہو۔ شادو! تم نے تو میری آدھی بیماری ختم کر دی۔"

وہ روتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ "تم نے کہا تھا کہ دو اکیلے مل جائیں تو پھر وہ
اکیلے نہیں رہتے اور جب عورت کسی کے دکھ میں حصہ لیتی ہے تو اس اکیلے کو اپنوں ہی
اپنوں کی محبتیں ملتی ہیں۔ پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا مگر اب میں تمہیں سلام کرتا ہوں اور
تمہیں دنیا کی سب سے عزت دار عورت تسلیم کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بس کرو نورے! آنسو پونچھ لو اور پھر سے مجھے قید کر کے چلے جاؤ۔
ورنہ شاہنواز آ سکتا ہے۔"

"وہ آج رات سے پہلے نہیں آئے گا اور میں اسی لمحے سے تمہیں عزت کی زندگی
دوں گا۔ میرے پاس رقم کی کمی نہیں ہے۔ کافی بینک بیلنس ہے۔ مجھے ماہانہ پانچ ہزار روپے
ملتے ہیں۔ پھر یہ رئیس زادے خوش ہو کر دو چار سو روپے بخشش دیتے ہیں۔ کھانا اور کپڑا
بھی دیتے ہیں۔ میں پچھلے چھ برس سے پوری تنخواہ جمع کرتا آ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی
میری آمدنی کا ایک خفیہ ذریعہ ہے۔ وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

"میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی؟ یہاں میرا کوئی نہیں ہے اور میں اپنے پنڈ
میں کیا منہ لے کر جاؤں گی۔"

"تم جہاں جاؤ گی' ان رئیس زادوں کے کارندے پہنچ جائیں گے۔ تم صرف میرے
ایک ایسے مکان میں کچھ عرصہ چھپی رہ سکتی ہو' جس کا علم ان رئیس زادوں کو نہیں
ہے۔"

"پھر کچھ عرصے بعد کیا ہو گا؟ تھانہ پولیس عدالت سب ان کی ہے۔ مجھے کب تک
چھپا کر رکھو گے؟"

"جب تم میرے مکان میں پہنچ جاؤ گی تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں نے ان رئیس

زادوں کے خلاف ایسے ایسے ثبوت جمع کر رکھے ہیں کہ یہ سب اونچی اڑان بھول جائیں گے۔ میں ابھی تفصیل نہیں بتا سکتا۔"

اس نے جیب سے سیلوفین کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی۔ اس کے اندر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا۔ کاغذ پر ایک مکان کا پتا لکھا ہوا تھا۔ وہ سیلوفین تھیلی کے اوپر سے ہی نظر آرہا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ بارش بند نہیں ہو گی۔ اس لئے اپنے مکان کا پتہ اس کے اندر لکھ کر رکھا ہے۔ یہ بارش میں نہیں بھیگے گا' اسے رکھ لو اور یہ میرے مکان کے باہر اور اندر کی چابیاں ہیں۔ ٹیکسی کے کرائے کے لئے پانچ سو روپے رکھو اور جاؤ۔"

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں آرہے ہو۔ میں نے لاہور اچھی طرح دیکھا نہیں ہے۔ بھٹک جاؤں گی۔"

"ٹیکسی ڈرائیور کو یہ پتا بتاؤ گی تو وہ تمہیں سیدھا اس مکان تک پہنچا دے گا۔ یہاں دس بجے صاحب کا فون آنے والا ہے۔ میں اسے اٹینڈ نہیں کروں گا تو بات بگڑ جائے گی۔ میں بارہ بجے تک تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

جب اس نے یقین دلایا کہ علاج کے لئے رقم کی کمی نہیں ہے اور وہ رئیس زادے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے تو میں نے اس کا ہاتھ تھام کر وعدہ کیا۔ قسم کھائی کہ اس کا انتظار کروں گی اور اسی مکان میں چھپی رہوں گی۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا کوٹھی کے برآمدے میں لے آیا پھر بولا۔ "جاؤ' جتنی جلدی ہو سکے۔ یہاں سے دور چلی جاؤ۔ میں بارہ بجے کے بعد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

میں برآمدے سے باہر کوٹھی کے احاطے میں آگئی۔ بارش میں بھیگتی ہوئی کھلے ہوئے آہنی گیٹ سے باہر آکر دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر اونچی آواز میں کہا۔ "میں انتظار کروں گی۔ خدا حافظ۔"

وہ مرجھائی ہوئی مسکراہٹ سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں بارش میں بھیگتی ہوئی تیزی سے چلنا چاہتی تھی۔ مگر رہائی کی اور ایک نئی زندگی گزارنے کی خوشی میں بھول گئی تھی کہ پچھلی رات کو بخار تھا اور تب سے کمزوری بھی پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ ایسی حالت میں عورت کو آرام کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹروں کے مشوروں پر باقاعدہ عمل کرنا چاہئے مگر میں بھری برسات میں نکل پڑی تھی۔ پچھلی رات قے کرتے وقت ابکائیاں لیتے وقت سر چکرا تھا اور جس طرح کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ کمزوری غالب آرہی تھی۔

ایسی موسلا دھار بارش میں کوئی رکشا یا ٹیکسی دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔ ان بڑی بڑی کوٹھیوں کے علاقے سے نکل کر ایک ویران سے راستے میں پہنچ گئی۔ شہر میں

بھٹک جانے کا خدشہ تھا۔ آخر بھٹک گئی۔ کہیں دو چار دکانیں نظر آئیں تو وہ بند پڑی تھیں۔ کیونکہ صبح چھ بجے کا وقت تھا۔ نورے نے جو پتا دیا تھا۔ اسے کسی کو دکھاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ جس سے پوچھوں گی پتا نہیں وہ کون ہو گا اور کیسی نیت کا ہو گا۔ میں دودھ کی جلی ہوئی تھی۔ اندیشہ تھا کہ پھر کسی کے ہاتھوں لگ کر تھانے نہ پہنچ جاؤں اور تھانے والوں کے تیور میں دیکھ چکی تھی۔

میں پتا نہیں کب تک اور کتنی دور تک چلتی رہی۔ میری قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ ایک خوف تھا' جو پیچھے سے چابک مار کر مجھے آگے اور آگے چلتے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مگر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں چکرا کر آپ کے مکان کے سامنے گر پڑی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆==========☆==========☆

یہ اس شاہدہ کی روداد تھی' جسے پنڈ والے بڑے پیار سے شادو کہتے تھے۔ وہی پیاری اور پنڈ والوں کی دلاری بڑی ہی گھناؤنی اور شرمناک راہوں سے ٹھوکریں کھاتی ہوئی خیرالدین شاہ کے پاس پہنچی تھی۔

وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ "میں بڑے برے نصیب لے کر پیدا ہوئی ہوں۔ میں نے رہائی دلانے والے اور خطرات مول لینے والے نورے کو بھی مایوس کیا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں نے اسے دھوکا دیا ہے۔ آج تیسرا دن ہے اور میں اس کے مکان تک نہیں پہنچ سکی۔ بیماری کے بعد آج توانائی محسوس کر کے ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوئی ہوں۔"

خیرالدین شاہ سر جھکائے سن رہا تھا۔ جواباً کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کہاں آپ نمازی پرہیز گار اور کہاں میں غلاظت کا ڈھیر۔ ہمارے درمیان جنت اور جہنم کا فرق ہے۔ آپ اپنے ملازم کرمو سے پوچھ لیں۔ میں نے کھانے کے لئے ایک برتن اور پانی پینے کے لئے ایک گلاس الگ رکھ لیا ہے۔ میں جہنمی ہوں' آپ کی پاکیزگی پر حرف لانا نہیں چاہتی۔"

وہ بڑی دیر بعد بولا۔ "خدا بہتر جانتا ہے اور اگر تم نے سچ بیانی سے کام لیا ہے تو پھر تم جہنمی نہیں ہو۔ خدا تم پر رحم کرے۔"

"آپ سے گزارش ہے۔ میں لاہور شہر کے علاقوں اور راستوں کو نہیں جانتی ہوں۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے کرمو کو میرے ساتھ کر دیں تو وہ مجھے نورے کے مکان تک پہنچا دے گا۔"

اس نے کہا۔ "تم اتفاق سے ایک صحافی کے گھر آئی ہو' جو سچائی کے لئے سیاسی اور

سماجی لیڈروں اور کارکنوں کا محاسبہ کرتا ہے۔ میں کراچی اور لاہور سے لے کر اسلام آ تک سیاست اور سماج کے بڑے بڑے ٹھیکے داروں کو جانتا ہوں۔ شاہنواز اور اکمل شر جیسے رئیس زادوں سے بھی واقف ہوں۔ البتہ ان کے یہ کرتوت نہیں جانتا تھا' جو تم چکی ہو۔"

"کرمو نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت نامور صحافی ہیں۔"

"اگر تم مجھ پر بھروسا کرو اور میرے مشوروں پر عمل کرو تو مزید نقصانات اٹھانے محفوظ رہو گی۔"

"میں آپ کے مشوروں پر عمل کروں گی لیکن آج ہی نورے سے ملنا چاہ ہوں۔"

"میرا پہلا مشورہ یہی ہے کہ نورے سے تم نہ ملو۔ پہلے مجھے ملنے دو۔ میں اس مکان پر جاؤں گا۔ اس کے حالات معلوم کروں گا۔ پھر اسے اپنے ساتھ یہاں لے آ گا۔"

"آپ کا مشورہ مناسب ہے لیکن میرے لئے زحمت اٹھا رہے ہیں۔"

"یہ میرا پیشہ ہے۔ صحافیوں کو اہم خبریں جمع کرنے کے لئے دنیا کے ایک سرے دوسرے سرے تک جانا پڑتا ہے۔ میں تو صرف نورے کے مکان تک جاؤں گا۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر ایک کمرے میں گئی۔ وہاں سے چابیوں کا ایک گچھا اور ایک کا کا پرزہ لا کر دیا پھر کہا۔ "یہ نورے کے مکان کی چابیاں ہیں اور اس کاغذ پر اس کا پتا لکھا ہو ہے۔"

اس نے وہ چیزیں لے کر کہا۔ "تم ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی ہو۔ جا اور آرام سی لیٹی رہو۔ کرمو کے کھانا تیار کرنے تک شاید تمہارے نورے کو یہاں لے آؤں۔"

وہ پھر جرابیں اور جوتے پہن کر باہر چلا آیا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد اسے ایک رکشا مل گیا۔ نورے کا مکان ایک گنجان آباد علاقے میں تھا۔ ایک تنگ سی گلی میں پہنچ کر اس نمبر کا مکان مل گیا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے دو تین چابیاں آزمائیں تو تا کھل گیا۔ اندر تاریکی تھی۔ سوئچ کا بٹن دبانے سے کمرا روشن ہو گیا۔

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے دیکھا۔ وہاں ایک بڑا اور ایک چھو کمرا تھا۔ کمرے میں ایک قیمتی ویڈیو کیمرا اور اسٹل فوٹو گرافی کے بھی دو کیمرے رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب دو الماریوں میں تھے اور ان الماریوں میں ویڈیو فلمیں' ساؤنڈ

ریکارڈنگ اور ایڈیٹنگ کے آلات بھی تھے۔ چھوٹے سے کمرے کو ڈارک روم بنایا ہوا تھا۔ تاکہ فلموں کی ڈیولپنگ اور پرنٹنگ کی جا سکے۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ اتنی قیمتی اور کام کی چیزیں کوٹھی کے ایک ملازم کے پاس تھیں۔

وہ شادو کو بتا چکا تھا کہ ایک بی اے پاس نوجوان ہے اور ملازمت کے علاوہ دولت مند بننے کے لئے ویڈیو فلموں کا بھی کچھ کام کرتا ہے۔ اس نے کام کی نوعیت نہیں بتائی تھی۔ خیرالدین شاہ نے ویڈیو فلموں کے لیبل پڑھے تو کسی پر اکمل شریف' کسی پر جمال شہزاد' کسی پر شاہنواز اور کسی پر اکبر شاہ کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اُن کے علاوہ اور بھی کئی مردوں اور عورتوں کے نام کے لیبل کئی ویڈیو کیسٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ ایک ویڈیو کیسٹ کے لیبل پر شاہدہ عرف شادو کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔

اس نام نے تجسس پیدا کیا۔ خیرالدین شاہ نے وی سی آر اور ٹی وی آن کر کے شادو کے نام کا کیسٹ لگایا پھر سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دیکھنے کے لئے بیٹھا تھا مگر ٹی وی اسکرین پر ابتدائی چند مناظر دیکھتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نگاہوں کی پاکیزگی مجروح ہو رہی تھی۔ اس نے بے اختیار "لاحول ولا قوۃ" کہا پھر ٹی وی اسکرین سے نظریں چراتے ہوئے اسے بند کر دیا۔ اس نیک اور پارسا شخص کو تقدیر کہاں لے آئی تھی؟ اس نے اپنے بیڈ روم میں شادو کا لباس اتار کر اپنا لباس پہناتے وقت آنکھیں بند رکھی تھیں۔ اپنی اور شادو کی حیا کو برقرار رکھا تھا لیکن ٹی.وی اسکرین نے دھوکے سے اُس کی نظروں کی پارسائی کا مذاق اڑایا تھا۔

آخر وہ انسان تھا۔ ٹی وی کو بند کرنے کے باوجود بڑی دیر تک اس کا دل دھڑکتا رہا اور اسی دل سے وہ توبہ توبہ کرتا رہا تھا۔ شادو کا چہرہ اور سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ وہ اسے دماغ سے نکالنے کے لئے الماری میں رکھے ہوئے دوسرے تمام کیسٹوں کے متعلق رائے قائم کرنے لگا کہ ان تمام کیسٹوں میں بھی بے حیائی کی متحرک تصاویر ہوں گی۔

نورے نے شادو سے کہا تھا کہ وہ دولت مند بننے کے لئے ویڈیو فلموں کا بھی کام کرتا ہے۔ اب یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ رئیس زادے شادو یا کسی اور حسینہ کے پاس کسی قدر نشے میں جاتے تھے۔ انہیں یقین ہوتا تھا کہ نورے کوٹھی کا بیرونی دروازہ بند رکھتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے ویڈیو کیمرے کے ساتھ کبھی کسی کھڑکی اور کبھی روشندان کے راستے سنسنی خیز مناظر کو کیسٹ میں محفوظ کرتا رہتا تھا۔

اس نے اچھی خاصی تعداد میں بڑی بڑی شخصیات اور ان کے صاحب زادوں کے

متعلق کیسٹس تیار کئے تھے۔ اگر وہ انہیں بلیک میل کرتا تو اب تک کم از کم کروڑ پتی بن چکا ہوتا۔ شاید وہ پچھلے چھ برس سے اسی طرح کے منصوبے بنا رہا ہو گا لیکن اُن پر عمل کرنے کا موقع نہیں مل رہا ہو گا۔ چونکہ فولادی شخصیات سے دشمنی مول لینا تھا اس لئے پہلے بچاؤ کے راستے بھی اختیار کر رہا ہو گا۔

اِس سلسلے میں بہت سی باتیں نورے سے معلوم ہو سکتی تھیں لیکن شاید وہ پچھلے تین دنوں سے اِدھر نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اس مکان کی چابیاں اس نے شادو کو دے دی تھیں۔ وہ اسے تلاش کر رہا ہو گا۔ ایک اور سوال ذہن میں ابھر رہا تھا کہ نورے نے اپنے آقاؤں کے سامنے شادو کے بھاگ جانے کا کیا جواز پیش کیا ہو گا؟ یا پھر شادو کے جانے کے بعد اس نے بھی کوٹھی چھوڑ دی ہو گی اور چھپ چھپ کر شادو کو تلاش کر رہا ہو گا۔ بے چارہ بیماری کی حالت میں پریشان ہو رہا ہو گا۔

ایک صحافی خبروں کی تصدیق کے لئے ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوت حاصل کرتا ہے۔ اس وقت خیرالدین شاہ کے آس پاس ایسے ایسے ثبوت تھے کہ چند بڑی شخصیات کے مکروہ چہرے اور کردار عوام کے سامنے آ جاتے۔ بعض صحافیوں پر یہ الزام ہے کہ وہ بڑی شخصیات کی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ان سے نوٹوں سے بھرے ہوئے لفافے اور بڑی مراعات حاصل کرتے ہیں لیکن خیرالدین شاہ کا شمار ان صحافیوں میں تھا جنہیں کوئی بھی آنے جانے والی حکومت خرید نہیں پاتی۔ وہ ہمیشہ دن کو دن اور رات کو رات ہی لکھتے ہیں۔

اور خیرالدین شاہ جیسے صحافی تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے شرم تھی اور نگاہوں کی پاکیزگی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ خود اپنی آنکھوں سے گناہ نہیں دیکھ سکتا تو کسی بڑی شخصیت کے خلاف ثبوت پیش کرنے کے لئے اُن میں سے کسی بھی کیسٹ کا ایک منظر بھی کیسے دیکھ پائے گا۔ جس شادو کا لباس اس نے آنکھیں بند کر کے تبدیل کیا۔ اسی شادو کو وہ ثبوت کی خاطر کیسے بے لباس پیش کرے گا؟ اور بات صرف شادو کی نہیں تھی۔ وہاں اور بھی کئی لڑکیوں کے ویڈیو کیسٹس اور فوٹو گراف تھے۔ وہ لڑکیاں بھی شادو کا بدن رکھتی ہیں۔ وہ بھی شرم والیاں ہوں گی۔ ان میں سے کئی لڑکیاں بے حیائی کے چار ماہ گزارنے کے بعد کہیں شادی کر کے عزت سے زندگی گزار رہی ہوں گی۔ کئی شوہر اور بچوں والیاں بن گئی ہوں گی۔ کیا چند شیطانوں کا اصلی چہرہ دکھانے کے لئے اور شیطانوں کے خلاف ثبوت پیش کرنے کے لئے کیا اُن بے چاریوں کی بے لباسی دکھا دی جائے؟

نہیں، خیرالدین شاہ کے صرف جسم میں، قلب میں ہی نہیں، حواسِ خمسہ میں بھی پاکیزگی تھی۔ اسی لئے وہ محض اپنی ہی نہیں دوسروں کی آنکھوں میں بھی نظروں کی وہ نیک نیتی چاہتا تھا، جو کبھی گناہ دیکھے اور نہ ہی دکھائے۔

یہی مشکل آن پڑی تھی کہ وہ ساکت اور متحرک تصاویر کسی کو دکھا نہیں سکتا تھا۔ وہ نورے کو اسی لئے یاد کر رہا تھا کہ وہ مل جائے تو ذہنی اور قلبی طہارت اس میں پیدا کرے اور اسے مائل کرے کہ وہ ان تمام تصاویر اور کیسٹس کو جلا ڈالے۔ یہ ضرور ہے کہ شادو وغیرہ کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں، ان کی تلافی ممکن نہیں ہو گی۔ عیاش دولت مند ہمیشہ کی طرح اپنی کھال میں مست رہیں گے اور ہمیشہ رہتے ہی ہیں۔ کوئی اُن کا کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن اِن بے چاریوں کا سب کچھ بگڑ جائے گا جو ابھی اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ عزت کی زندگیاں گزار رہی ہیں۔

خیرالدین شاہ نے ان الماریوں کو، کمروں کو پھر مکان کو تالے لگا دیئے۔ گلی سے نکل کر ایک رکشا میں بیٹھ کر جنرل پوسٹ آفس آیا۔ جیب سے ڈائری نکال کر کئی فون نمبر دیکھے پھر ایک نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔ وہ بولا "میں مسٹر اکمل شریف سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف سے ہولڈ کرنے کو کہا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اکمل شریف کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ میں شریف بول رہا ہوں۔"

"مسٹر شریف! میں نورالدین عرف نورے کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم کون ہو؟ میں کسی نورے کو نہیں جانتا؟"

"کیا شادو کو بھی نہیں جانتے؟ کیا اس کوٹھی کو بھی نہیں جانتے جہاں ہر چار ماہ کے لئے ایک حسینہ لائی جاتی ہے۔"

فون پر چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر اکمل شریف نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟ اور یہ جو کچھ کہہ رہے ہو، اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟"

"تم سمجھدار ہو۔ میری تحقیقات کے انداز سے معلوم کر سکتے ہو کہ میں کیا کیا کچھ جانتا ہوں اور کس شعبے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"اگر تم انٹیلی جنس سے تعلق رکھتے ہو تو تمہیں میرے ڈیڈی سنبھال لیں گے۔"

"میں تو اس شادو کو سنبھال رہا ہوں جو تمہارے جیسے مزید تین رئیس زادوں کے جال سے نکل آئی ہے اور تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا تعلق کسی سرکاری شعبے سے نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارے ڈیڈی کے زیر اثر ہوں۔"

"تو پھر اُس شادو کو کسی تھانے میں لے جا کر ہم چاروں کے خلاف بیان لکھوا دو۔ ایف آئی آر درج کروا دو۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں شادو کو تھانے نہ لے جاؤں اور تم نورے کو میرے حوالے کر دو۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ کسی نورے کو نہیں جانتا ہوں۔ آئندہ اِس نمبر پر فون نہ کرنا۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ خیرالدین شاہ نے دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر ایک شخص کی آواز سنائی دی۔ خیرالدین شاہ نے کہا۔ "میں مسٹر جمال شہزاد سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں اس کا باپ بول رہا ہوں' کیا بات ہے؟"

"آپ کے صاحب زادے کی کوٹھی میں نورالدین عرف نورے ایک ملازم تھا۔ وہ تین دنوں سے لاپتا ہے۔ میں اس کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو مسٹر! میرے بیٹے کی نہ کوئی کوٹھی ہے اور نہ ہی کوئی نورے نامی ملازم ہے۔ تم نے رانگ نمبر پر ڈائل کیا ہے۔"

"آپ ابھی اعتراف کر چکے ہیں کہ آپ جمال شہزاد کے والد ہیں۔"

"بات نہ پکڑو۔ میں نے کہہ دیا کہ ہم کسی نورے کو نہیں جانتے۔ اگر وہ تین دنوں سے لاپتا ہے تو کہیں مرکھپ گیا ہو گا۔"

فون بند کر دیا گیا۔ خیرالدین شاہ نے ڈائری دیکھ کر تیسرا نمبر ڈائل کیا اس نے رابطہ ہونے پر کہا۔ "میں مسٹر شاہنواز سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف سے گرج دار آواز سنائی دی۔ "کتے! ابھی مجھے اکمل شریف نے فون پر بتایا ہے کہ تو نورے کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ کیا نورے تیرا باپ ہے؟"

اس نے تحمل سے کہا۔ "ایک غریب ملازم کا پتا پوچھنے پر تم بدتمیزی کیوں کر رہے ہو۔ کیا صرف اس لئے کہ تم ایک بہت بڑی ہستی کے خاندان کے چشم و چراغ ہو؟"

"جب یہ جانتے ہو تو پھر اپنی اوقعات کے مطابق صرف اپنی سطح کے لوگوں سے باتیں کیا کرو' نان سینس۔ اُلو کا پٹھا۔"

فون وہاں سے بھی بند کر دیا گیا۔ خیرالدین شاہ کی سمجھ میں آ گیا کہ نورے کو شادو کا پتا معلوم کرنے کے لئے کہیں لے جا کر قید کر دیا گیا ہے یا پھر اسے قتل کر کے اس کی لاش کہیں پھینک دی گئی ہے۔ اس نے ڈائری سے چوتھا فون نمبر دیکھا۔ وہ نمبر ڈائل کئے پھر

رابطہ قائم ہونے پر پوچھا۔ "کیا تم مسٹر اکبر پاشا ہو؟"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "کیا تو وہی ہے جو میرے یاروں کو باری باری فون کر رہا ہے؟"

"ہاں۔ میں وہی ہوں اور تمہارا جواب بھی وہی ہو گا جو تمہارے یاروں نے دیا ہے۔"

"تو جواب پہلے سے جانتا تھا پھر فون کرنے کی حماقت کیوں کی تھی؟"

"میری پوری بات ان تینوں نے نہیں سنی۔ تم سن لو گے تو تمہیں میری نہیں اپنی حماقت کا پتا چل جائے گا۔ کیا تم لوگ نہیں جانتے تھے کہ نورالدین بی اے پاس جوان تھا اور اسے فوٹوگرافی کے علاوہ ویڈیو فلمیں تیار کرنے کا شوق تھا۔ تم چاروں کے کئی فوٹو گرافس اور ویڈیو کیسٹس مختلف لڑکیوں کے ساتھ میرے پاس محفوظ ہیں۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔ کسی کی مجال ہے کہ ہماری کوٹھی میں گھس کر ہمارے خلاف ویڈیو فلمیں بنائے اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔"

"کیسے خبر ہو گی۔ تم چاروں اکثر نشے میں رہتے تھے۔ تم لوگوں کو صرف شراب کا نہیں اقتدار اور اختیارات کا بھی نشہ رہا کرتا ہے۔ ایسے میں تم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک تعلیم یافتہ ملازم تمہارے خلاف ایسے ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہے۔"

"اگر تم درست کہہ رہے ہو تو ہمیں وہ فوٹوگرافس اور ویڈیو کیسٹس دکھاؤ۔"

"ان کی چند کاپیاں ضرور دکھاؤں گا لیکن اس شرط پر کہ نورے ہمیں زندہ ملے۔ میں کل صبح دس بجے تک فون کروں گا۔ مجھ سے فون پر نورے کی بات ہو گی تو آگے معاملات طے ہوں گے۔"

اس بار خیرالدین شاہ نے پہلے فون بند کیا۔ اکبر پاشا ہیلو ہیلو کہہ کر چیختا رہا پھر اس نے ریسیور فون پر پٹخ دیا۔ اس کے والدین' بہنیں اور بھائی ڈائننگ ٹیبل کے اطراف بیٹھے کھا رہے تھے۔ باپ نے پوچھا۔ "پتر! فون پر غصہ کیوں دکھا رہے ہو؟"

وہ کھانے کی میز کے پاس آ کر کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا "ڈیڈ! معاملہ کچھ الجھا ہوا سا لگتا ہے۔ کوئی شخص فون پر ہم چاروں ساتھیوں سے نورے کے متعلق پوچھ رہا ہے۔"

باپ نے پوچھا "یہ نورے کیا بلا ہے؟ میں نے ہزار بار کہا ہے' بات پوری کیا کرو۔"

اکبر پاشا اپنی ماں' بہنوں اور بھائیوں کی موجودگی میں پوری باتیں بتانے لگا۔ ان کی تہذیب میں یہ جائز تھا۔ وہ سب عیاشی اور تفریح کے موضوعات پر ایک دوسرے سے فری

ہو کر باتیں کیا کرتے تھے۔ باپ نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا "تمہیں ایک تعلیم
جوان کو کوٹھی کے دربان اور ملازم کی حیثیت سے رکھنا نہیں چاہیے تھا۔ ویسے پر
کرو۔ یہ حقیقت معلوم کرو کہ واقعی اس گمنام شخص کے پاس تم چاروں کے قابلِ اعتر
فوٹوگرافس اور ویڈیو کیسٹس ہیں یا نہیں؟"

"مگر ڈیڈ! ہم کیسے یہ معلوم کریں؟ وہ کہتا ہے، پہلے نورے سے کل صبح دس
فون پر گفتگو کرائی جائے۔"

"تو اس میں قباحت کیا ہے؟ نورے سے بات کراؤ اور اس بلیک میلر سے تصاو
چند کاپیاں حاصل کرو۔"

"ہم نورے سے بات نہیں کراسکتے۔ ہمارے کارندوں نے اسے قتل کر کے
کہیں پھینک دی ہے۔"

ماں نے کہا "پتا نہیں، یہ کتوں بلیوں کی طرح مرنے والے کیوں پیدا ہو جاتے ہ
اور پتر تجھے کئی بار کہا ہے کہ میرے کھانے کے وقت کتوں اور ان کی لاشوں کی باتیں
کرو۔ توبہ ہے، کھانا حرام ہو گیا ہے۔"

بیگم صاحبہ کھانے پر سے اٹھ کر چلی گئیں، انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ بیٹا
مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ محترمہ کا شوہر ایسا زبردست بیوروکریٹ تھا کہ بیٹے پر
نہیں آسکتی تھی۔ بیوروکریٹ باپ عظیم پاشا نے پاس رکھے ہوئے موبائل فون سے
کیا تھا اور کسی کو حکم دیا تھا کہ اکبر پاشا اور اس کے ساتھیوں کو کوئی شخص بلیک میل
ہے۔ پولیس، انٹیلی جنس اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کو الرٹ کیا جائے۔ اس بلیک م
سراغ لگا کر شاہدہ عرف شادو نامی لڑکی کو بھی گرفتار کیا جائے۔ وہ گمنام شخص کل صبح
بجے کہیں سے فون کرے گا۔ لہٰذا اس کا فون ٹیپ کیا جائے اور جس فون نمبر سے وہ
کرے، وہ نمبر ڈیٹکٹ کیا جائے۔ یہ تمام احکامات صادر کرنے کے بعد عظیم پاشا نے
سیکریٹری کو بلا کر کہا

"وہ جو گلبرگ والی کوٹھی ہم نے اکبر بیٹے کو گفٹ کے طور پر دی تھی، اب
کوٹھی کے کاغذات بدل دو۔ یہ ثابت ہونا چاہیے کہ دو برس پہلے وہ کوٹھی کسی کو فر
کر دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں اپنے وکیل کو بلاؤ۔ مشورے کرو اور دو برس پہلے
تیار کرو۔"

سیکریٹری احکامات کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ عظیم پاشا بیٹے نے سے کہا "تم نوجوا
کے خون میں گرمی بہت ہے۔ نورے کو قتل کرنا کیا ضروری تھا؟ اس کی موت

حاصل کر رہے ہو؟"

"وہ ڈیڈ! شادو دراصل شاہنواز کے پاس تھی۔ نورے نے اسے بھگا دیا تو ایک ملازم
کی جرأت کو شاہنواز برداشت نہ کر سکا۔ ایک نوکر نے اس کی انسلٹ کی تھی اس لیے اس
نے اسے گولی مار دی۔"

"شاہنواز اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے کہ کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن اس نے غصے میں
اپنے دوست اکمل شریف کے لیے مصیبت پیدا کر دی ہے۔ وہ شادو کو ایک پنڈ سے
باقاعدہ بیاہ کر لایا تھا۔ سینکڑوں پنڈ والے گواہ بن جائیں گے۔ کیا سب کو گولیوں سے اڑا دیا
جائے گا۔ شادو نہ ملی تو کیا ہو گا؟ ہم اس ملک کے جاہل عوام سے ڈرتے نہیں ہیں۔ اس
کے باوجود جو الٹا سیدھا کرتے ہیں، چھپ کر کرتے ہیں تاکہ ہماری کوئی غلطی پاکستان کی
تاریخ میں ریکارڈ نہ ہو سکے۔"

باپ کی باتیں سن کر اکبر پاشا نے سر جھکا لیا۔ وہ بھی شادو کی اہمیت کو سمجھ رہا تھا اور
سوچ رہا تھا کہ وہ بھاگ کر کہاں پناہ لے سکتی ہے؟ کیا پورے شہر کی پولیس اسے ڈھونڈ
نکالے گی؟

☆=========☆=========☆

خیرالدین شاہ ابھی گھر واپس نہیں گیا تھا۔ اس نے لاہور کے چار ایسے صحافیوں سے
فون پر رابطہ کیا، جو اس کی طرح صحافت کے پیشے کے تقدس کو برقرار رکھتے تھے۔ فون پر
اس نے ایک صحافی ملک جاوید حیات کے گھر میں باقی تین صحافیوں کو فوراً ملاقات کرنے کو
کہا۔ ملک جاوید حیات کے گھر کراچی کا ایک نامور اور بے باک صحافی علی کوثر مہمان کے
طور پر آیا تھا اور جب خیرالدین شاہ، ملک صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں صحافیوں کی تعداد چھ
ہو گئی تھی۔ خیرالدین شاہ نے انہیں شادو اور نورے کی تمام روداد سنائی پھر پوچھا "اب
آپ حضرات اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟"

صحافی علی کوثر نے کہا "یہ کیس بہت زبردست ہے۔ اس میں بڑی بڑی سیاسی اور
سرکاری شخصیات لپیٹ میں آئیں گی۔ ہمیں سب سے پہلے شادو سے تحریری بیان لے کر
اپنے پاس محفوظ کر لینا چاہیے۔"

ملک جاوید نے کہا "فوٹوگرافس اور ویڈیو کیسٹس کی صورتوں میں جو ثبوت موجود
ہیں، ان کے سامنے بڑی شخصیات کے بڑے بڑے ہتھکنڈے دھرے کے دھرے رہ جائیں
گے لیکن یہ خیرالدین شاہ کی ایمانداری اور پاکبازی آڑے آ رہی ہے۔"

ایک صحافی رانا حمید نے کہا "بھائی خیرالدین! ہم تمہارے ایمان کی پختگی اور پاکیزہ

خیالات کی قدر کرتے ہیں۔ بے شک عورت کوئی بھی ہو۔ اس کی عزت کو تصاویر کے ذریعے مٹی میں نہیں ملانا چاہیے لیکن دو چار عورتوں کا کیس بنا کر ہم اگر دوسری بہت سی عورتوں کو دولت مند عیاشوں سے بچا سکتے ہیں اور فرشتے بن کر رہنے والی شخصیات کے مکروہ چہرے عوام کو دکھا سکتے ہیں تو ہمیں ضرور ان فوٹوگرافس اور کیسٹس کو کام میں لانا چاہیے جو تمہارے پاس ہیں۔"

خیرالدین شاہ نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ سب شرمناک تصاویر کو بھول جائیں۔ ہمارے پاس علم ہے' ذہانت ہے اور تجربات ہیں۔ شادو ہماری پناہ میں ہے۔ کل صبح دس بجے تک نورے کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے گا۔ ہماری پوری صحافی برادری شادو کے معاملے میں ہمارا ساتھ دے گی تو ہمارے خلاف سیاسی ہتھکنڈے کام نہیں آئیں گے۔"

ایک صحافی نے کہا "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر شعبے میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ صحافیوں میں بھی کچھ دوست ہیں اور کچھ دشمن۔ کچھ حکومتی پارٹی کی شان میں لکھتے ہیں' کچھ اپوزیشن سے وفاداری بناتے ہیں اور کچھ ہماری طرح غیر جانبدار ہیں۔ ہم نہ حکومت کے دشمن ہیں اور نہ اپوزیشن کے۔ ہمارا قلم تو آئینہ ہوتا ہے۔ جو جیسا ہوتا ہے ہمارا قلم اسے ویسا ہی دکھاتا ہے اس لیے آپ پوری صحافی برادری کی بات نہ کریں۔ سب ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔"

خیرالدین شاہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا "یہ ہم سب جانتے ہیں کہ بڑے لوگوں پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ وہ بڑے بڑے الزامات سے بچ نکلتے ہیں لیکن اس پہلو پر غور کریں کہ ہم شادو اور نورے کے بیانات لے کر شادو پر ہونے والی زیادتیوں کی تلافی کرا سکیں۔ اسے آئندہ ان مشغلہ اختیار کرنے والے رئیس زادوں سے محفوظ رکھ سکیں تو یہ کافی نہیں ہو گا۔ بلا سے بڑے لوگ الزامات سے بچتے ہیں تو بچتے رہا کریں۔ ایک غریب شادو کو تو آئندہ عزت اور تحفظ حاصل ہو جائے گا۔"

"یعنی آپ ایک بہت بڑے زبردست کیس کو بہت چھوٹا بنا کر اسے صرف شادو تک محدود کر دینا چاہتے ہیں۔"

خیرالدین شاہ نے کہا۔ "میرے بھائیو! میرے دوستو! بڑی شخصیات والے میرے دشمن نہیں ہیں اور شادو میری دوست نہیں ہے۔ میرے پیشِ نظر پاکی اور صفائی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "ایمان کے ستر سے بھی زیادہ شعبے ہیں اس میں سے ایک شعبہ یہ ہے کہ راستے سے گندگی یا تکلیف دہ چیز کو دور کر دیا جائے۔"

اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں مومن پر فرض ہے کہ اگر کسی دوسرے نے بھی کہیں گندگی پھیلا دی ہے تو وہ اس گندگی کو اور آگے پھیلنے نہ دے۔ اسی جگہ ختم کر دے۔ اگر شرمناک تصاویر دوسروں کو دکھانے سے وہ بے شرمی دوسروں تک جاتی ہے اور آگے بڑھتی اور پھیلتی ہے اور پاکیزگی کے خلاف آلودہ ہیجان پیدا کرتی ہے تو پھر نگاہوں کی شرم رکھنے کے لئے اُن تصاویر کو وہیں ختم کر دینا چاہئے۔ انہیں کسی ایک فرد کے سامنے بھی نہیں لانا چاہئے۔"

وہاں بیٹھے ہوئے باقی پانچ صحافی خیرالدین شاہ کی قلبی پاکیزگی کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بحث کو طول نہیں دیا۔ ملک صاحب نے کہا۔ "چلو' بڑے پیمانے پر نہ سہی' ہم شادو جیسی ایک مظلوم عورت کی حفاظت کے لئے جو کر سکتے ہیں کریں گے۔ کل نورے سے گفتگو کرنے کے بعد یہ طے کیا جائے گا کہ ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہئے۔"

رانا حمید نے کہا۔ "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ لوگ بڑے ذرائع کے مالک ہیں۔ یہ فوراً ہی ٹریس کر سکتے ہیں کہ نورے سے بات کرنے والا کس فون نمبر پر ہے۔"

ایک نے تائید کی۔ "بے شک وہ ایسا کر سکتے ہیں۔"

دوسرے نے مشورہ دیا۔ "فون نہ کیا جائے۔ شاہ صاحب نے انہیں یقین دلانے کے لئے کہا ہے کہ ان رئیس زادوں کی تصاویر کی چند کاپیاں بھیجی جائیں۔ بہتر یہ ہے کہ چار مختصر سے خطوط ٹائپ کئے جائیں اور ان خطوط کے ساتھ تصاویر پوسٹ کر دی جائیں۔"

ایک نے خیرالدین شاہ سے کہا۔ "لیکن شاہ صاحب! وہ شرمناک تصاویر چار گھروں میں جائیں گی۔ کیا اس طرح بے شرمی اور گندگی دوسروں کی نگاہوں تک نہیں پہنچے گی؟"

خیرالدین شاہ نے کہا۔ "میں ابھی سیاہ مارکر لے جاؤں گا اور چند تصاویر میں جو عورتیں ہیں اُن کے چہروں پر اور بدن کے شرمناک حصوں پر مارکر کی سیاہی پھیر دوں گا۔ اس طرح ان عورتوں کی شرم رہے گی اور پردہ بھی رہے گا۔ خطوط میں یہ لکھا جائے گا کہ ان ساکت تصاویر کے علاوہ ویڈیو کیسٹس بھی ہیں' جنہیں بوقتِ ضرورت پیش کیا جا سکتا ہے۔"

ملک جاوید حیات نے کہا۔ "ٹھیک ہے شاہ صاحب! آپ جا کر تصاویر لے آئیں۔ میں ابھی دفتر جا کر وہ خطوط ٹائپ کر کے لے آؤں گا۔ ہم انہیں فوراً پوسٹ کر دیں گے۔"

خیرالدین شاہ ایک مارکر لے کر نورے کے علاقے میں پہنچا تو گلی کے موڑ پر ملازم کرمو نظر آیا۔ اس کے ساتھ شادو چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ خیرالدین شاہ نے پریشان ہو کر

پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو۔ وہ چاروں درندے اور ان کے پولیس والے تم
ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

وہ بولی۔ "رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔ آپ بھوکے پیاسے گئے تھے اور لوٹ
نہیں آ رہے تھے اس لئے میں کرمو کے ساتھ آپ کو ڈھونڈنے نکلی ہوں۔"

کرمو نے کہا۔ "بی بی جی کو صرف اس علاقے کا نام یاد تھا۔ مکان نمبر بھول
تھیں۔ ہم مایوس ہو کر واپس جا رہے تھے۔"

وہ تینوں پھر نورے کے مکان کا تالا کھول کر اندر آ گئے۔ شادو ایک کرسی پر بیٹھ گ
شاہ نے کرمو سے کہا۔ "تم گھر جاؤ' میں شادو کو لے آؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شاہ نے سر جھکا کر کہا۔ "مجھے یہ کہتے ہوئے شر
رہی ہے کہ یہاں اس مکان کے اندر ہمارے چاروں طرف بے حیائی ہے۔ نورے۔
آخری وقت میں تم سے نیکی کی لیکن اس سے پہلے وہ دولت مند بننے کے لئے بڑی بے
حیائی کے دھندے کرتا رہا ہے۔"

شادو نے کہا۔ "آپ کی یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن خدا کے لئے میر
سامنے میرے محسن کی برائی نہ کریں۔"

"میں مانتا ہوں کہ اب وہ برا نہیں رہا ہے۔ تم سے نیکی کرتے وقت وہ گمراہی
باز آ چکا تھا لیکن ہر انسان کی اچھائیوں کے ساتھ اس کے کچھ برے پہلوؤں کو بھی پیشِ
رکھنا چاہئے۔ وہ جو دوسرا چھوٹا کمرا ہے' وہ فلمیں ڈیویلپ اور پرنٹ کرنے والا ڈار
روم ہے۔ وہاں جاؤ اور چند تصاویر دیکھ کر آؤ۔"

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ پھر دو چار منٹ میں ہی واپس آ کر اس
سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے بعد بولی۔ "میں نے کچھ زیادہ نہیں دیکھا لیکن جو بھی دیکھا
کے بعد کوئی عورت کسی مرد سے نظریں نہیں ملا سکتی مگر میں آپ کے روبرو آ گئی ہوں
اس لئے کہ حالات نے مجھے بہت بے حیا اور بے باک بنا دیا ہے۔"

"تمہارے بیان کے مطابق نورے نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ وہ دولت مند
کے لئے ویڈیو فلمیں بھی تیار کرتا ہے۔ اس کا ویڈیو کیمرا اور بے شمار ویڈیو کیسٹس ان
الماریوں میں رکھے ہوئے ہیں اور وہ ایسے شرمناک کیسٹس ہیں جنہیں شرم والے دیکھ
ہی آنکھیں بند کر لیں گے۔ اُن میں ایک کیسٹ تمہارا بھی ہے۔"

شادو نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے بول رہا تھا "نورے رات کو کوٹھی
باہر نہیں رہتا تھا۔ اپنے ویڈیو کیمرے کے ذریعے بیڈ روم کی کھڑکیوں اور روشن دانوں

فلمیں تیار کرتا رہتا تھا۔"

اِس بار شادو کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک منٹ پہلے خود کو بے حیا اور بے باک کہا
تھا جبکہ وہ ایسی نہیں تھی' بنا دی گئی تھی۔ چونکہ حالات نے اسے ایسا بنایا تھا اس لئے
حالات نے اُس کا سر بھی جھکا دیا تھا۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "نورے کہاں ہے؟"

"ان چار رئیس زادوں نے اسے کہیں قید کر رکھا ہے۔ شاید اس سے تمہارا پتا پوچھ
رہے ہوں گے۔ میں نے ان چاروں کو فون پر دھمکی دی ہے کہ ان کی تصاویر منظرِ عام پر
آ سکتی ہیں۔ وہ اپنی عزت برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو کل صبح دس بجے نورے سے فون پر
بات کرائیں۔"

خیرالدین شاہ پوری تفصیل شادو کو بتانے لگا کہ وہ اپنے صحافی ساتھیوں کے تعاون
سے آئندہ کیا کرنے والا ہے۔ پھر وہ بولا۔ "تمہارے آنے سے میری ایک مشکل آسان ہو
گئی ہے۔ ان تصاویر کو میں پھر دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور ان عورتوں کے چہروں اور جسموں پر
مارکر کی سیاہی بھی پھیرنا چاہتا تھا تاکہ اُن عورتوں کی شرم رہے۔ یہ لو مارکر' اب یہ کام تم
کر سکتی ہو۔"

وہ مارکر لے کر بولی۔ "میں نے کرمو سے کرید کرید کر آپ کے متعلق بہت کچھ
معلوم کیا ہے۔ بخدا میں نے آپ جیسا آنکھوں کی شرم رکھنے والا شخص نہیں دیکھا۔"

"ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ زندگی گزارتی رہو گی۔ ارادے نیک رکھو گی تو نیک
بندے ملتے رہیں گے۔"

وہ مارکر لے کر دوسرے کمرے میں گئی۔ تھوڑا وقت گزارنے کے بعد واپس آئی تو
ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ تھا۔ وہ لفافہ اسے دے کر بولی۔ "اِس میں بارہ تصویریں ہیں اور
ساری ان چار رئیس زادوں کی ہیں۔ آپ ہر ایک کے پتے پر تین تین تصویریں ارسال
کر سکتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "ابھی ہم ملک جاوید حیات کے گھر جائیں گے لیکن اس سے پہلے ہمیں
یہاں کی تمام تصاویر کو' نیگیٹو کو اور تمام ویڈیو کیسٹس کو جلا دینا چاہئے۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ دشمن
کتنے وسیع ذرائع اور کیسے کیسے اختیارات والے ہیں۔ خدانخواستہ کبھی آپ پر برا وقت
آئے گا تو آپ یہاں کے تمام سامان کو اپنے تحفظ کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کر
سکیں گے۔"

"مجھ پر کیا برا وقت آئے گا؟ اگر میں سچائی اور انسانی پاکیزگی کے لئے لڑنے میں ناکام

رہوں گا اور وہ غالب آئیں گے تو زیادہ سے زیادہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"ایسے ہی وقت کے لئے کہہ رہی ہوں۔ یہ سارے کیسٹس رہیں گے تو وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

ذرا سوچو۔ شادو! ان کیسٹوں میں صرف تم نہیں ہو اور بھی کئی عورتیں ہیں جو نہ معلوم کہاں کہاں عزت سے گھر بسا کر زندگی گزار رہی ہیں۔ کیا میں اپنی جان بچانے کے لئے اُن عورتوں کے گھر اجاڑ دوں؟ کیا میں دنیا والوں کے سامنے اِن کیسٹوں کے ذریعہ عورت ذات کو ننگا تماشا بنا دوں؟"

شادو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ میں خود ایک ننگا تماشا بننے کو تیار ہوں۔ آپ جانتے ہیں کیوں؟"

"میں کوئی سی بھی غلط بات نہ جاننا چاہتا ہوں' نہ ماننا چاہتا ہوں۔ ان سب کو آگ لگاؤں گا۔"

"اور میں آگ لگانے نہیں دوں گی۔ میں اور مجھ جیسی سینکڑوں عورتیں تماشا بنتی آئی ہیں۔ آئندہ بھی بن جائیں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر آپ جیسے فرشتے زندہ رہیں گے تو دوسری عورتوں کو تحفظ حاصل ہوتا رہے گا۔"

"شادو! میرے طرزِ عمل کو سمجھو۔ تم اس لفافے میں بارہ تصویریں لائی ہو۔ یہ تصویریں دیکھ کر ہی دشمن اپنے وسیع اختیارات کو بھول کر گھٹنے ٹیک دیں گے۔ تو... نے یہ تمام کیسٹس دولت مند بننے کے لئے تیار کئے تھے۔ ہمیں حرام کی دولت نہ چاہئے اور نہ ہی اِن کیسٹس کی مظلوم عورتوں کو تماشا بنا کر مجھے زندہ رہنا گوارا ہے۔"

شادو نے جواب نہیں دیا' اسے گھور کر دیکھا۔ پھر پیروں کو پٹختی ہوئی چھوٹے کمرے میں گئی۔ وہاں سے ایک ماچس کی ڈبیا لا کر بولی۔ "آپ سگریٹ پیتے ہیں؟"

"کبھی نہیں' پان کا تمباکو ہو یا تمباکو نوشی کا دھواں' میں کوئی ایسی چیز منہ اور حلق کے اندر جانے نہیں دیتا' جس کے بعد کلی کرنا پڑے۔ غرغرہ کر کے حلق صاف کرنا پڑے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا پاک نام لینے کے لئے منہ' زبان اور حلق سے لے کر قلب تک کو صاف رہنا چاہئے۔"

"میں جانتی ہوں۔ مجھے کرمو نے بتایا ہے کہ آپ صرف ظاہری ہی نہیں باطنی صفائی کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ میں نے یہ اس لئے پوچھا ہے کہ اِس مکان میں باورچی خانہ نہیں ہے۔ صرف یہی ایک دیا سلائی دوسرے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ آپ کو اسی سے آگ لگانا ہو گا' جبکہ میں لگانے نہیں دوں گی۔"

اس نے یہ کہہ کر ماچس کی ڈبیا کو اپنی قمیض کے گریبان کے اندر رکھ لیا۔ خیرالدین شاہ نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟ دیا سلائی مجھے دو۔ اِس گندگی کے ڈھیر کو جلا ڈالنے دو۔"

"میں جس گندگی کے ڈھیر سے گزر کر آئی ہوں اور اس اٹھارہ برس کی عمر میں جو بدمعاشیاں اور اختیارات کے غرور دیکھتی رہی ہوں' اس کے بعد اپنی عمر سے کہیں زیادہ بدمعاشیاں سیکھ چکی ہوں۔ جسے آپ گندگی کا ڈھیر کہہ رہے ہیں' یہ دراصل ایسے اختیارات ہیں جن کے ذریعے ہم دشمنوں کی فرعونیت کو ختم کر سکتے ہیں۔"

"شادو! ہم اختیارات اور قوت حاصل کرنے کے لئے ایسی برائیوں کو ذریعہ نہیں بنائیں گے' ماچس دو۔"

وہ بولی۔ "میں نے ڈبیا کو اسی لئے ہاتھ میں نہیں رکھا۔ آپ اسے چھین کر اپنی ضد پوری کر لیتے۔"

خیرالدین شاہ نے بے بسی سے ایک نظر اس کے گریبان پر ڈالی پھر سر جھکا کر بولا۔ "خدا کے لئے ایمان کو اپنا ہتھیار بناؤ۔ یہ شیطانی چیزیں ہیں۔"

"میں ایک ایمان والے سچے اور پاکباز بندے کے لئے ایسا کر رہی ہوں۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "تم کیا سمجھتی ہو۔ میں دوسری ماچس کی ڈبیا خرید کر نہیں لا سکتا؟"

وہ تیزی سے پلٹ کر باہر آیا پھر اس گلی سے گزرتا ہوا مین روڈ پر پہنچا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں صرف ایک پان سگریٹ کی دکان ذرا دور کھلی ہوئی تھی۔ اس نے وہاں جا کر ایک ماچس کی ڈبیہ خریدی۔ پھر واپس آیا تو شادو چادر میں لپٹی ہوئی گلی سے گزرتی آ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک گیا' وہ بولی۔ "میں نے کمروں کو اور مکان کو باہر سے مقفل کر دیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "واپس چلو۔ میں دیا سلائی لے کر آیا ہوں۔"

"مگر دروازوں کے تالے کیسے کھولیں گے؟ میں نے چابیوں کا گچھا وہیں رکھا ہے' جہاں ماچس کی ڈبیا رکھی ہے' آیئے۔"

وہ گلی سے باہر مین روڈ کی طرف چلنے لگی۔ وہ ساتھ چلتے ہوئے بولا "یاد کرو۔ تم کس بری حالت میں میرے دروازے پر آئی تھیں۔ میں نے تمہارا علاج کرایا۔ تمہیں ایک نئی زندگی دی۔ ایسی ہی نئی زندگی اُن عورتوں کو دینا چاہتا ہوں جو کیسٹوں میں نظر آتی ہیں۔ ذرا سمجھو' ایک گھر کے سامان کو آگ لگانے سے کئی گھر آباد رہیں گے۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کو اور نیکیاں دے۔ میں دعا کرتی رہوں گی کہ زمانے کے دستور کے

مطابق آپ بھی بدمعاشیوں سے گزر کر نیکیاں کرتے رہیں۔ جہاں زخم دینا ہو' وہاں ز
دیں۔ پھر مرہم لگائیں تاکہ دشمنوں کو زخم کی ٹیسیں ہمیشہ یاد رہیں اور وہ مرہم لگانے وا
کے احسانات نہ بھولیں۔"

خیرالدین نے ایک گزرنے والے رکشے کو روکا۔ پھر شادو کے ساتھ بیٹھ کر ملک جا
حیات کے گھر کی طرف جانے لگا۔ وہ مجبور ہو گیا تھا۔ ابھی اُن تصاویر اور ویڈیو فلموں
مناظر کو آگ نہیں لگا سکتا تھا' جنہیں دیکھنے والے کی آنکھیں گناہ گار ہو سکتی تھیں۔

ایک بڑی سی شاندار کوٹھی کے بڑے سے ڈرائنگ روم میں ان چار رئیس زادو
کے سات عدد بزرگ حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ان چاروں کے والد بھی تھے ا
چچا اور ماموں وغیرہ بھی تھے۔ جس ڈرائنگ روم میں وہ تھے' اس کی آرائش و زیبائش
تقریباً پندرہ لاکھ روپے خرچ کئے گئے تھے۔ وہ کوٹھی ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کی تھی۔
نہیں اس کوٹھی کے دوسرے بیڈ روم اور ٹوائلٹ وغیرہ کو امیرانہ شان و شوکت دینے
لیے مزید کتنے لاکھ خرچ کئے گئے ہوں گے؟ اس سے ایک ملحقہ کمرے میں کمشنر ا
پولیس کے اعلیٰ افسران کے علاوہ انٹیلی جنس کے بھی اعلیٰ افسران اور ان کے چند ماتح
منتظر تھے کہ ڈرائنگ روم سے بلاوا آئے تو فوراً حاضر ہو سکیں اور وہاں سے جو احکاما
صادر ہوں' ان پر بلا تاخیر عمل کر سکیں۔ کوٹھی کے باہر سیکیورٹی گارڈز اور ان کے افسرا
بھی مستعد کھڑے ہوئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں ان کے درمیان ایک میز پر وہ بارہ تصویریں رکھی ہوئی تھیں
تین تصویروں میں اکمل شریف' دوسری تین تصاویر میں جمال شہزاد' تیسری تین م
شاہنواز اور چوتھی تین میں اکبر پاشا صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سب بے لباس تھ
لیکن ان کے ساتھ جو عورتیں تھیں' وہ پہچانی نہیں جا سکتی تھیں۔ ان پر مارکر کی سیاہ
پھیر دی گئی تھی۔ عظیم پاشا نے شاہنواز کے باپ رب نواز سے کہا "میں نے یہ تصو
ایک ماہر کو دی تھی اور کہا تھا کہ کسی بھی کیمیکل سے مارکر کی سیاہی کو صاف کر ڈالے لیکن
ایک کیمیکل کے استعمال کے نتیجے میں مارکر کی سیاہی کے ساتھ اس عورت کا چہرہ اور جس
بھی کھرچ گیا ہے۔"

رب نواز نے کہا "ہوں۔ ان عورتوں کے چہرے نظر آ جاتے تو ہمارے جاسوس ان
کے ذریعے بلیک میلر تک ضرور پہنچ جاتے۔"

جمال شہزاد کے باپ چودھری غلام سرور نے کہا "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' آپ
حضرات میری بات تسلیم کریں۔ بلیک میلر کوئی اجنبی نہیں ہے۔ یہ اپوزیشن والے ہیں

ہمارے بچوں کی غلطیاں ان کے علم میں آ گئی ہیں۔"

رب نواز نے کہا "آپ کی یہ بات اس حد تک درست ہے کہ کوئی اجنبی بلیک میلر ہم سے ٹکرانے کی جرأت نہیں کرے گا اور کرے گا تو ہم سے بڑی رقم کا مطالبہ کرے گا لیکن اس کے ٹائپ شدہ خط میں صرف نورے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔"

"اس مطالبہ کرنے والے نے اپنا نام اور پتا بھی نہیں لکھا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نورے کو کہیں چھپا کر رکھا گیا ہے تو اسے رہا کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے طور پر زندگی گزارے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مطالبہ کرنے والا نہ تو رقم کا لالچی ہے اور نہ ہی کوئی سیاسی آدمی ہے۔"

اکمل شریف کے باپ دلاور شریف نے کہا۔ "میں آپ کی تائید کرتا ہوں۔ اگر ہماری یہ کمزوری اپوزیشن والوں کے ہاتھ لگتی تو وہ ہمارے خلاف پورا ملک سر پر اٹھا لیتے۔"

رب نواز نے کہا۔ "میرے بیٹے شاہنواز نے طیش میں آ کر نورے کو گولی مار دی۔ اگرچہ بڑے سے بڑے سیاسی قتل کو چھپا دیا جاتا ہے اور قتل کا الزام غیر ملکی ایجنسیوں کے سر تھوپ دیا جاتا ہے لیکن نورے جیسے ملازم کے قتل کے سلسلے میں ہم اس مطالبہ کرنے والے کو کیا جواب دیں؟"

"فی الحال تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح شادو کوٹھی سے فرار ہو گئی تھی۔ اسی طرح نورے ہمارے بچوں کی قید سے نکل بھاگا ہے۔"

"یہ بہانہ زیادہ دنوں تک نہیں چلے گا۔ وہ مطالبہ کرنے والا ایک یا دونوں کی مہلت دے گا کہ ہم نورے کو پیش کر دیں۔"

شاہنواز کے چچا نے ایک تصویر اٹھا کر کہا۔ "نورے کا مطالبہ کرنے والا شخص کوئی ایمان والا اور نہایت ہی مہذب ہے اسی لئے اس نے مارکر کے ذریعے عورتوں کو چھپا کر اُن کی شرم رکھی ہے۔ پھر یہ کہ وہ رقم کا مطالبہ کرنے والا لالچی نہیں ہے۔ ایسے معقول شخص سے جھوٹ بول کر ایک ہفتے یا ایک ماہ کی مہلت حاصل کی جا سکتی ہے کہ ہم اسے ایک ماہ میں تلاش کر لیں گے۔ اس عرصے میں شادو اور اس مطالبہ کرنے والے اجنبی کو تلاش کر کے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"اُن دونوں کی گرفتاری لازمی ہے۔ اس مطالبہ کرنے والے کو قابو میں کرنے کے بعد ہم ان تصویروں کے نیگیٹو اور ویڈیو کیسٹس وغیرہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔"

عظیم پاشا نے کہا۔ "یہ کام جلد سے جلد ہو گا تو اطمینان حاصل ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ

یہ بات اپوزیشن والوں کے کانوں تک پہنچ جائے۔ وہ تو ہم پر کیچڑ اچھالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔"

اکمل شریف کے بوڑھے سے ماموں نے کہا۔ "تم لوگوں نے جوان لڑکوں کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ ہمارے زمانے میں بچوں کو اپنے قابو میں رکھا جاتا تھا۔"

دلاور شریف نے کہا۔ "اس کے باوجود ہم ہیرا منڈی جاتے تھے اور اپنے بزرگوں کو خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ ہم بڑے سعادت مند بچے ہیں لیکن ہم اپنے بچوں کو یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ ہمیں دھوکا دیں اور بے تحاشا دولت لٹا کر بازاروں سے بیماریاں خرید لائیں۔ شریف اور غریب گھرانوں میں جو لڑکیاں ہوتی ہیں' وہ پاک صاف اور اچھوتی ہوتی ہیں۔ ہر طرح کی بیماریوں سے محفوظ رہتی ہیں اسی لئے انہوں نے یہ مشغلہ اختیار کیا ہے۔"

رب نواز نے انٹرکام کے ذریعے کمشنر سے کہا۔ "اندر آؤ۔"

وہ چند سیکنڈ میں آگیا پھر ان سب کو سلام کیا۔ رب نواز نے کہا۔ "یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی راز داری ضروری ہے اگر اپوزیشن والوں کو اس معاملے کی بھنک بھی پڑے گی تو وہ تیر کی طرح ہمارے خلاف میدان میں آئیں گے۔ انہوں نے پہلے ہی بہت زیادہ پریشان کر رکھا ہے۔ ویسے ہمارے راز اُن کے پاس کیسے پہنچ جاتے ہیں؟"

کمشنر نے کہا۔ "جناب! بالکل اسی طرح جیسے اُن کے راز ہم تک پہنچتے ہیں۔ ہمارے کچھ بندے ان کی پارٹی کے وفادار بن کر رہتے ہیں۔ ہمارے درمیان بھی ان کے بندے ہو سکتے ہیں۔ ہم اس معاملے میں بڑے محتاط رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے اپنے جاسوس لگائے رکھتے ہیں۔"

"میں تم سے کہتا ہوں اور تم پولیس اور انٹیلی جنس کے افسران سے کہو۔ اگر وہ اونچے عہدوں پر پہنچنا چاہتے ہیں اور ایک ایک لاکھ روپے بونس میں لینا چاہتے ہیں تو آج رات کسی بھی طرح شادو اور اس کے ساتھی بلیک میلر کو پکڑ کر ہمارے پاس لے آؤ۔"

"آل رائٹ سر! ہم انہیں ڈھونڈ نکالنے کے لئے شہر کی ہر گلی اور ہر مکان میں انہیں تلاش کریں گے۔"

"یہ تم سمجھو کہ کیا کرنا ہے لیکن عوام سے دھونس' دھمکیوں سے اور تشدد سے کام لو گے تو اپوزیشن کے بندے تمہاری تلاش کے مقصد کو سمجھ لیں گے۔"

"سر! آپ اطمینان رکھیں۔ ہم بہت رازداری سے کام لیں گے۔"

ایسے وقت انٹرکام کا بزر سن کر رب نواز نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہوں' کیا بات

ہے؟"

دوسری طرف سے آئی جی نے کہا۔ "سر! ابھی نیو ٹاؤن پولیس اسٹیشن سے تھانے دار نے فون کیا ہے کہ وہاں شادو نامی ایک لڑکی آئی ہے اور وہ آپ کے صاحبزادے شاہنواز اور اس کے دوستوں کے خلاف رپورٹ لکھوانا چاہتی ہے۔"

رب نواز نے کہا۔ "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ آپ کو فوراً وہاں جانا چاہئے۔ کیا تھانے دار سے کہا گیا ہے کہ وہ ابھی رپورٹ نہ لکھے اور لڑکی کو وہاں روکے رکھے؟"

"یس سر! ایسی ساری کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ مجھے بھی وہاں جانا چاہئے لیکن ایک بہت اہم اطلاع دینے کے لئے رک گیا ہوں۔ کیا میں آپ کے پاس آ سکتا ہوں؟"

"پوچھتے کیا ہو' فوراً آؤ۔"

اس نے انٹرکام کا ریسیور رکھا۔ آئی جی ڈرائنگ روم کے اندر آیا۔ پھر سلیوٹ کرنے کے بعد بولا۔ "سر! بڑی تشویش ناک بات ہے۔ شادو اس تھانے میں صحافیوں کی ایک چھوٹی سی فوج لے کر آئی ہے۔ تھانے دار کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ پریس والے ہیں۔ اُن سب کی موجودگی میں اسے ایف آئی آر درج کرنا ہو گی۔"

رب نواز نے غصے سے کہا۔ "میرے سامنے کوئی ایسی بات نہ کرو جو ناممکن ہو۔ کمشنر اور اپنے عملے کو ساتھ لے جاؤ۔ پریس والوں سے شیرو شکر ہونے کی ہر ممکن کوشش کرو۔ ناکامی ہو تو ان سے کہو' آج میں نے ان صحافیوں کو عشائیے پر بلایا ہے۔ جاؤ' کچھ بھی کرو۔ آج ایف آئی آر درج نہ ہو اور شادو نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ ہم یہاں رہیں گے' ہمیں پل پل کی رپورٹ ملتی رہنی چاہئے۔ اب جاؤ۔"

وہ دونوں اعلیٰ عہدے دار وہاں سے چلے گئے۔ ذرا سی دیر میں پوری انتظامیہ بجلی کی رفتار سے حرکت میں آ گئی۔ وہ سب تیز رفتاری سے گاڑیاں دوڑاتے ہوئے اس تھانے پر پہنچے۔ تھانے کے باہر جہاں کمشنر کی گاڑی پہنچ کر رکی' ٹھیک اس کے سامنے مخالف سمت سے آنے والی پجیرو آ کر رک گئی۔ اس کا دروازہ کھلا۔ پہلے ایک مسلح باڈی گارڈ باہر آیا۔ پھر اس نے پجیرو کا دروازہ کھولا تو اس دروازے سے اپوزیشن کا لیڈر باہر آیا اور کمشنر کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

پولیس اور انتظامیہ کو سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ اپوزیشن والے اس معاملے تک نہ پہنچیں لیکن ان کا لیڈر پہنچ گیا تھا اور وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے آنے والی گاڑیوں سے پارٹی کے دوسرے سیاستدان اور مختلف اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافرز بھی اتر کر تھانے کے اندر جا رہے تھے۔ کمشنر اور آئی جی اپوزیشن کے راہنما کے قریب آئے۔ پھر

کمشنر نے پوچھا۔ "آپ یہاں کیسے؟"
اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جیسے آپ حضرات یہاں' ویسے ہی میں یہاں۔ ش
ہماری ضرورت بھی ہو۔"
آئی جی نے کہا۔ "ہم یہاں دورے پر آئے ہیں۔"
"مجھ پر بھی دورہ پڑ گیا اور میں چلا آیا۔"
یہ کہہ کر اپوزیشن لیڈر تھانے کے اندر جانے لگا۔ کمشنر اور آئی جی اپنے ماتحتوں ک
ساتھ ایس ایچ او کے دفتری کمرے میں آئے تو وہاں کتنے ہی فوٹو گرافر حزب اختلاف ک
اہم سیاست دانوں کے ساتھ شادو کی تصویریں اتار رہے تھے۔ کتنے ہی رپورٹرز طرح طر
کے سوالات کر رہے تھے۔ شادو' خیرالدین شاہ' ملک جاوید حیات' رانا حمید اور علی کوثر جیس
فولادی صحافی ان کے جواب دے رہے تھے۔ پھر کمشنر کو دیکھ کر سب ایک طرف ہو گئے
سب نے سلام کیا۔ کمشنر نے پوچھا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"
خیرالدین شاہ نے کہا۔ "یہ لڑکی شادو یہاں چار' جوانوں کے خلاف رپورٹ در
کرانے آئی ہے۔ مگر وہ چاروں جوان ایسے زبردست اور بااختیار افراد کی اولاد ہیں کہ ا
کے خلاف رپورٹ لکھنے سے پہلے تھانے دار صاحب پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں۔ انہوں
پسینہ پونچھنے کے لئے آپ کو اور ان اعلیٰ افسران کو بلایا ہے۔"
کمشنر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اس لڑکی کو ایک کمرے میں لے جا کر اس ک
تحریری بیان لے لوں گا۔ میں ایک ذمے دار عہدے دار ہوں۔ اس لڑکی کے ساتھ کوئ
زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔"
علی کوثر نے کہا۔ "ہم بھی ملک کے ذمے دار صحافی ہیں۔ لہٰذا لڑکی ہمارے سام
بیان لکھوائے گی۔"
اپوزیشن لیڈر نے کمشنر سے کہا۔ "کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی' تمہیں یاد ہو ک
نہ یاد ہو۔ کیونکہ میں اقتدار سے ہٹ گیا ہوں' آپ اپنے عہدے سے مجبور ہیں۔ اس لئے
حکومتِ وقت کے وفادار ہیں لیکن صحافی حضرات تو آزاد اور غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ کیا
حرج ہے اگر سب کے سامنے بیان لکھوایا جائے پھر اس پر لڑکی کے علاوہ ہمارے اور آپ
کے بھی دستخط ہوں۔"
"حرج تو نہیں ہے لیکن ایک لڑکی سب کے سامنے بیان دیتے وقت جھجک اور شر
محسوس کرے گی۔"
خیرالدین شاہ نے کہا۔ "کمشنر صاحب درست فرماتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار یہ ہو

چاہئے کہ ہم میں سے دو صحافی شادو کے ساتھ رہیں گے۔ کمشنر صاحب اور آئی جی صاحب
رہیں گے اور اپوزیشن کے لیڈر جناب گوہر علی صاحب اپنے ساتھ کسی ایک صاحب کو
علیحدہ کمرے میں لے چلیں گے۔"
اس بات پر سب متفق ہو گئے۔ شادو ان کے ساتھ ایک کمرے میں آ گئی۔ اپوزیشن
کے لیڈر گوہر علی نے کہا۔ "لڑکی! تم نے ایف آئی آر درج کرانے سے پہلے کمال کر دیا
ہے۔ صحافیوں کی بارات لے آئی ہو۔ یہ نہ آتے تو ہمارے یہ مہربان' قانون کے حوالے
دے دے کر ہمیں تم سے دور رکھتے اور شاید تشدد سے بھی باز نہ آتے۔"
وہ سب مختلف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ خیرالدین شاہ نے کہا۔ "یہ شادو کی خوش قسمتی
ہے کہ یہاں اپوزیشن والے بھی آ گئے۔ ورنہ اختیارات کی قوت یک طرفہ ہوتی۔ میں
چاہتا ہوں کہ شادو کے بیان لکھنے سے پہلے جناب گوہر علی صاحب کو تمام پچھلے واقعات کا
علم ہو جائے۔"
کمشنر نے کہا۔ "جناب گوہر صاحب! وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ہم آپ
تنہائی میں کچھ گفتگو کر لیں۔ ایک لڑکی کی عزت کا معاملہ ہے۔"
گوہر علی نے کہا۔ "کمشنر صاحب! آپ سے بھی تنہائی میں کھل کر باتیں ہو جائیں
گی' ذرا صبر کر لیں۔"
خیرالدین شاہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر شادو کی روداد شروع کی اور اس
روداد کو موجودہ لمحے تک سنا دیا۔ اپوزیشن لیڈر گوہر علی نے مسکرا کر شادو سے کہا۔
"بی بی! اس بے چارے نورے پر فاتحہ پڑھ لو۔ ہمارے جیسے سیاستدان اپنی جانیں
ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں پھر نورے کی اوقات ہی کیا تھی؟"
آئی جی نے غصے سے کہا۔ "آپ کسی ثبوت کے بغیر ایسا الزام نہ دیں نورے کہیں
فرار ہو گیا ہے یا کسی نے اسے اغوا کر لیا ہے۔"
کمشنر نے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ بات نہ بڑھائی جائے۔ آیئے گوہر صاحب! ہم ذرا
تنہائی میں کچھ باتیں کر لیں۔"
نورے پر فاتحہ پڑھنے والی بات سن کر شادو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
خیرالدین شاہ نے کہا۔ "جناب گوہر صاحب اور کمشنر صاحب! تنہائی میں شادو کی قسمت کا
فیصلہ کرنے سے پہلے یہ یاد رکھیں کہ اس فیصلے سے ہم صحافیوں کا متفق ہونا لازمی ہے۔"
دونوں نے وعدہ کیا کہ تمام صحافیوں کو اعتماد میں لیا جائے گا پھر وہ دونوں تیسرے
کمرے میں آ گئے۔ ایک میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کمشنر نے کہا۔ "شادو ایک

ذریعہ ہے اور ذرائع بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ ہمیں بگڑنے والی نہیں بننے اور بنانے
باتیں کرنی چاہئیں۔"

گوہر علی نے کہا۔ "پچھلی بار میں نے حکومت کے اہم شخص پر کئی کروڑ روپے
ہیرا پھیری کا الزام لگایا تھا۔ بعد میں اس کے خلاف ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوت پیش
کرنے والا تھا۔ اس سلسلے میں اخبارات کے ذریعے دھوم مچا دی تھی۔ مگر ایسے
ثبوت پیش کرنے سے پہلے ہی میری پارٹی کی ایک بہت بڑی کمزوری حکمران پارٹی کے
لگ گئی۔ میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ناقابلِ تردید ثبوت ہونے کے باوجود اپنے مخالف
کچھ نہ بگاڑ سکا۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "مجھے سمجھوتا کرنا پڑا۔ میں نے حکومت سے وعدہ
کہ اس اہم شخص کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کروں گا اور حکمران پارٹی
وعدہ کیا کہ وہ میری پارٹی کی اس کمزوری کو نہیں اچھالے گی۔ ہماری پارٹیاں صرف بظاہر
اور قانونی حدود میں رہ کر ایک دوسرے کی مخالفت کریں گی۔ اندرونی طور پر جو گھپلے ہو
ہیں وہ تو ہوتے ہی رہیں گے۔"

کمشنر نے کہا۔ "یہ سب سیاسی باتیں ہیں۔ بہتر ہے' آپ فون پر حکمران پارٹی
معاملات طے کر لیں۔"

"میں فون پر بات کیوں کروں؟ وہ لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے رابطہ کریں
کمشنر نے موبائل فون کو آپریٹ کیا پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "سر! میں نیوٹاؤن
پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ معاملہ بری طرح الجھ گیا ہے۔ کیونکہ جناب گوہر
صاحب یہاں اچانک پہنچ گئے ہیں۔"

دوسری طرف سے ڈانٹ کر پوچھا گیا۔ "اسے کیسے خبر ہو گئی۔ وہ وہاں کیسے
گیا؟"

"سر! یہ تو میں نہیں جانتا۔ جناب گوہر علی صاحب اس وقت میرے سامنے
ہیں۔ ہم دونوں ایک بند کمرے میں ہیں' تیسرا کوئی نہیں ہے۔ شادو کے ساتھ جتنے مشہور
معروف صحافی آئے ہیں' ان میں خیرالدین شاہ بھی موجود ہے۔ اس نے گوہر علی صاحب
شادو کی پوری روداد سنا دی ہے۔ تصاویر اور ویڈیو کیسٹس کے متعلق بھی بتا دیا ہے۔
چار جوانوں کا تفریحی مشغلہ' سیاسی لیول پر پہنچ گیا ہے۔ آپ حکم کریں' اب مجھے کیا
ہے؟"

گوہر علی نے کرسی سے اٹھ کر کمشنر کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائل فون پر

کر کہا۔ "صاحب کیا حکم دیں گے۔ مجھ سے ہر حال میں بات کریں گے۔ نہیں کریں گے تو
اس تھانے سے بہت بڑا طوفان اٹھے گا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "کمشنر! مسٹر گوہر علی کو فون دو۔"

کمشنر نے فون دیا۔ گوہر علی نے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو۔ اس اسلامی ملک
میں کیسی بے حیائی ہو رہی ہے۔ بیاہنے والا ایک دولہا ہوتا ہے مگر چار دولہے عیش کرتے
ہیں۔"

"طعنے نہ دو۔ کام کی باتیں کرو۔"

"کام کی بات یہ ہے کہ شادو خیرالدین کی پناہ میں ہے۔ تصاویر اور ویڈیو کیسٹس ان
ہی دونوں کے پاس ہیں۔ یہ چیزیں میرے ہاتھ لگیں گی تو اس اسلامی ملک میں تمہاری
حکومت کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ تم چاروں کے خاندان بھی اس ملک میں نہیں رہ سکیں
گے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' وہ تباہ کن چیزیں ہمارے ہاتھ نہیں لگیں گی؟"

"ہاں یہ میں چیلنج سے کہتا ہوں کیونکہ یہاں خیرالدین شاہ کے علاوہ ملک جاوید حیات'
رانا حمید اور علی کوثر جیسے صحافی ہیں جو کسی قیمت پر خریدے نہیں جا سکیں گے۔ وہ شادو کو
حکومت کی نگرانی میں نہیں چھوڑیں گے۔"

"کیا تم اپنی نگرانی میں رکھ سکو گے؟"

"سونے' چاندی' ہیرے جواہرات سے نہیں' محبت سے انہیں خریدوں گا۔ شادو
اور خیرالدین شاہ تمہاری طرف سے پیش آنے والے خطرات کو خوب سمجھتے ہیں۔ میں
انہیں اپنی پناہ میں رکھوں گا تو وہ اس تھانے سے میرے ساتھ جائیں گے۔ تم قانون اور
اختیارات کے بل پر اس لئے نہیں روک سکو گے کہ یہاں اچھے خاصے پریس والے موجود
ہیں۔"

"پھر تو سیاسی سمجھوتا کرنا ہی ہو گا۔ میں تمہیں تین مختلف مقدمات میں ملوث کر رہا
تھا۔ تمہارے خلاف جتنے ٹھوس ثبوت ہیں' ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تمہارے پاس پہنچائی
تھیں اور تم مانتے ہو کہ ان ثبوت کی بنا پر تم مقدمات ہار جاؤ گے اور تمہارا سیاسی کیریئر تباہ
ہو جائے گا۔"

"ہاں' میں اپنا سیاسی کیریئر داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔ اسی لئے تو ابھی تمہاری دکھتی رگ
پر انگلی رکھ رہا ہوں۔ یعنی شادو کو اپنی پناہ میں رکھوں گا۔ اس کے اور خیرالدین شاہ کے
پاس تمہارے خلاف جتنا مواد ہے' میں انہیں کبھی ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔ تم چاروں

بڑوں کی عزت پر حرف نہیں آئے گا۔ یعنی میں تم لوگوں کا سیاسی کیریئر برباد نہیں کروں گا اور تم میرے سارے مقدمات واپس لے لو گے؟"

"ہمیں منظور ہے۔ یہی ہو گا۔ اقتدار تو آنی جانی چیز ہے۔ ہمارا سیاسی کیریئر سلامت رہنا چاہئے۔ تم شادو کو لے جاؤ' میں مقدمات کو ڈھیل دیتے دیتے ختم کر دوں گا۔"

"اس دوران میں ان سے تصاویر اور تمام ویڈیو کیسٹس حاصل کر لوں گا۔ میرے خلاف ہونے والے مقدمات کا فیصلہ میرے حق میں ہو گا تو میں ان تمام ویڈیو کیسٹس اور تصاویر کو تمہارے سامنے جلا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ فون کمشنر کو دو۔ میں اسے حکم دوں گا کہ وہ شادو کو تمہارے ساتھ جانے دے اور کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرے۔"

اس نے موبائل فون کمشنر کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر احکامات سننے لگا۔ پھر فون کو بند کر کے گوہر علی سے کہا۔ "ٹھیک ہے جناب! آپ شادو کو لے جا سکتے ہیں مگر ایک بات کہہ دوں کہ خیرالدین شاہ بڑا ہوشیار بندہ ہے۔ وہ شادو کو آپ کے ساتھ جانے نہیں دے گا۔"

گوہر علی نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ کمشنر! اور دیکھو کہ ہمارے سیاسی ہتھکنڈے کیسے ہوتے ہیں۔"

وہ کمشنر کے ساتھ دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں شادو' خیرالدین شاہ' علی کوثر اور آئی جی وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ گوہر علی نے خیرالدین شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "شاہ صاحب! آپ یہ پوچھیں گے کہ بند کمرے میں کیا باتیں ہوئیں۔ آپ ایمان والے ہیں۔ پاکیزہ خیالات کے حامل ہیں اس لئے میں شادو پر کسی طرح کی گندگی اچھلنے نہیں دوں گا۔"

شاہ نے پوچھا۔ "آخر کیا بات ہے؟"

وہ بولا۔ "لوگ مجھے مخالف لیڈر کہتے ہیں مگر میں غریبوں کا حمایتی لیڈر ہوں۔ اب جو بات ہو گی' وہ ڈنکے کی چوٹ پر ہو گی۔ آپ سب میرے ساتھ باہر آئیں۔"

وہ سب کرسیوں سے اٹھ کر اس کے ساتھ تھانے دار کے بڑے کمرے میں آئے۔ وہاں اخباری رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کے علاوہ لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اپوزیشن کے لیڈر گوہر علی نے تقریر کرنے کے انداز میں کہا۔ "میرے بزرگو اور بھائیو! اسے دیکھو' یہ شادو ہے۔ اسے فریب دے کر پنڈ سے لایا گیا تھا۔ میں اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں' مگر اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر' اس لٹنے اور برباد ہونے والی کو آپ سب کے سامنے بیٹی کہتا ہوں۔"

یہ ایسی جذباتی بات تھی کہ سب تالیاں بجانے لگے۔ شادو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ خیرالدین شاہ بڑی عقیدت سے گوہر علی کو دیکھنے لگا۔ گوہر علی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے کچھ صحافی حضرات اور کچھ پولیس والے جانتے ہیں کہ چند بڑے لوگوں نے اس معصوم لڑکی کو برباد کیا ہے۔ اب وہ بڑے لوگ خود کو بدنامی سے بچانے کے لئے اس معصوم کی جان لینا چاہتے ہیں۔ کیا کبھی کسی غریب کو پولیس والوں نے بڑے آدمیوں کے چنگل سے بچایا ہے؟ کبھی کسی اونچی شخصیت کو گرفتار کیا ہے؟"

سارا مجمع یک زبان ہو کر کہنے لگا۔ "کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ ان پولیس والوں سے کبھی انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

کمشنر' آئی جی اور دوسرے پولیس افسران پریشان ہو گئے تھے۔ ان کی توہین ہو رہی تھی۔ وہ پریس والوں اور معزز صحافیوں کے سامنے اسے تقریر کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔ گوہر علی نے کہا۔ "ہم نورے کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتے ہیں۔ کمشنر صاحب اور آئی جی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک ماہ کے اندر نورے کو تلاش کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیں گے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو یہی رائے قائم کرنی ہو گی کہ نورے کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ بڑے لوگ اپنا جرم چھپانے کے لئے ایسی واردات کرتے ہیں۔ میں آپ سب کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ شادو کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالوں گا۔ جب تک نورے زندہ واپس نہیں آئے گا' اس وقت تک میں شادو کو اپنی بیٹی بنا کر اپنی کوٹھی میں رکھوں گا۔ اس کے لئے سیکورٹی گارڈز ہوں گے۔ صرف ہمارے یہ معزز اور معتبر صحافی خیرالدین شاہ صاحب میری کوٹھی میں آ کر شادو سے ملاقات کر سکیں گے۔"

یہ ایسی تقریر تھی اور ایسے حقائق تھے جو دوسروں کے علاوہ شادو اور خیرالدین شاہ کو بھی قائل کر رہے تھے۔ جب تک نورے کی زندگی کا یقین نہیں ہوتا' شادو کی زندگی بھی خطرے میں رہتی۔ وہ بڑے لوگ تصاویر وغیرہ حاصل کرنے کے لئے شادو کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

ایک ایسی لڑکی کو جس کی عزت کو کھلونا بنایا گیا تھا' اسے گوہر علی نے بیٹی بنا کر اور اس کے تحفظ کی قسمیں کھا کر صرف عام لوگوں کے ہی نہیں' دانشور اور صحافیوں کے دل بھی جیت لئے تھے اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ شادو گوہر علی کے ساتھ جائے گی۔

جانے سے پہلے خیرالدین شاہ نے گوہر علی سے کہا۔ "میں چند منٹ کے لئے تنہائی میں شادو سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور' یہ تمہارا حق ہے۔ تم اب تک میری اس بیٹی کو پناہ دیتے رہے ہو۔ وہاں

دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔"

وہ دونوں ایک خالی کمرے میں آ گئے۔ خیرالدین شاہ نے دروازے کو بند کرنے کے بعد شادو کے قریب آ کر کہا۔ "عورت، محبت اور جذبات میں بہہ جاتی ہے۔ اس تمہیں بیٹی کہا ہے، تم اسے باپ مان کر اس مکان کی چابیاں دے دو گی؟"

وہ بولی۔ "بیٹی اپنے باپ کو ایسی کوئی چیز نہیں دیتی جو شرمناک ہو۔"

"لیکن کبھی غلطی سے وہ چابیاں گوہر علی کے ہاتھ لگ سکتی ہیں۔ تم عورت عورتوں کی شرم رکھنے کی خاطر وہ چابیاں مجھے دے دو۔ میں تمام تصاویر اور ویڈیو کیسٹ کو جلا دوں گا۔"

"اور میں آپ کی سلامتی کی خاطر قسم کھا چکی ہوں کہ انہیں جلنے اور ضائع ہونے دوں گی۔ میں نے ایک جگہ محفوظ دیکھ کر وہاں چابیاں چھپا دی ہیں۔ اب وہ میرے پاس بھی نہیں ہیں۔"

"خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جائے تو مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ چابیاں کہاں ہیں؟"

"وہ جہاں ہیں، وہاں کی خبر صرف خدا کو ہے۔ میں ان شیطانوں کو اچھی طرح گئی ہوں۔ وہ نورے کو کہیں قید کرنے کے بعد آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے لیکن خلاف مواد حاصل کئے بغیر آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"تم بہت ضدی ہو" وہ جھنجلا کر باہر آ گیا۔ شادو نے گوہر علی کے ساتھ رخصت ہوتے وقت پوچھا۔ "مجھ سے روز ملنے آؤ گے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ رخصت ہو گئی۔ وہ اپنے گھر آیا تو پہلی بار سے اپنا خالی خالی سا لگا۔ پہلی بار محسوس ہوا کہ ایک عورت کے رہنے سے گھر کی دنیا کتنی بھری جاتی ہے۔ وہ ایک سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

کمشنر نے رب نواز کے پاس آ کر تھانے کے واقعات سنائے۔ پھر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ عظیم پاشا نے کہا۔ "یہ گوہر علی قسمت کا دھنی ہے۔ جب بھی اسے چاہتے ہیں یہ ہماری کمزوریاں پکڑ کر بچ نکلتا ہے۔"

دلاور شریف نے کہا۔ "میرا بیٹا اکمل شریف شادو کو پنڈ سے لایا تھا۔ اگر وہ لیڈر کبھی ہمارے خلاف ہو گیا تو آپ لوگوں کے صاحبزادوں سے زیادہ میرے مصیبتیں آئیں گی۔"

رب نواز نے کہا۔ "ایسا نہیں ہو گا۔ یہ گوہر علی خود کو بہت ذہین سیاست دان وہ شادو کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہمارے لڑکوں

خلاف جتنی تصاویر ہیں، وہ خیرالدین شاہ کے پاس ہیں کیونکہ ہم سے اور ہمارے لڑکوں سے فون پر ایک مرد نے بات کی تھی۔ خطوط ٹائپ کرنا اور تصاویر پوسٹ کرنا بھی مرد ہی کا کام ہے۔ ہمیں اسی شاہ سے اگلوانا چاہئے کہ اس نے وہ تمام تصاویر کہاں چھپائی ہیں؟"

"خیرالدین شاہ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہے۔ اسے گرفتار کیا جائے گا یا کسی طرح کا جبر کیا جائے گا تو صحافیوں کی کثیر تعداد اس کی حمایت میں چیخ اٹھے گی۔"

"ہوں۔ ہمیں کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، جس سے وہ ہمارے قابو میں آ جائے اور صحافی برادری کوئی اعتراض نہ کرے۔"

وہ سب بڑی دیر تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ یہ سب ہی جانتے تھے کہ خیرالدین شاہ ان تصاویر کی خواہ مخواہ نمائش نہیں کرے گا۔ تھانے میں بیٹھ کر اس نے کمشنر اور آئی جی وغیرہ کے سامنے شادو کی جو روداد سنائی تھی، اس میں بھی اس نے کہا تھا کہ اس نے وہ شرمناک چیزیں اپنے صحافی ساتھیوں کو بھی نہیں دکھائی ہیں کیونکہ اول تو کسی مسلمان عورت کو بے پردہ نہیں ہونا چاہئے۔ پھر یہ کہ وہ بے لباس ہو تو اس پر کہیں نظر نہیں پڑنا چاہئے۔ اسی لئے خیرالدین شاہ نے کسی بھی تصویر یا ویڈیو کیسٹ پر کسی کی نظر نہیں پڑنے دی تھی۔

اس طرح یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ تمام بلیک میلنگ کا مواد خیرالدین شاہ کی تحویل میں ہے اور اسی نے وہ تمام چیزیں کہیں چھپا کر رکھی ہیں۔ اب چونکہ ان چیزوں کا تعلق شادو سے بھی تھا اور شادو تقریباً ایک ہفتہ خیرالدین شاہ کے گھر میں رہ چکی تھی اس لئے وہ لوگ یہ خیال قائم کر رہے تھے کہ اتنی اہم چیزیں ان دونوں نے اپنے گھر میں یا گھر کے آس پاس چھپائی ہوں گی۔

انہوں نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا کہ ایک بینک میں خیرالدین شاہ کا اکاؤنٹ ہے۔ اس میں چند ہزار روپے ہیں لیکن اس کے نام کا کوئی لاکر نہیں ہے۔ جب وہ چیزیں کسی لاکر میں نہ ہوں اور وہ کسی کو ایسی شرمناک چیز دکھانا گناہ سمجھتا ہو تو زیادہ تر یہی رائے قائم کی جا رہی تھی کہ انہیں اچھی طرح سیلوفین کی تھیلیوں میں اور کپڑوں میں لپیٹ کر زمین میں دفن کر دیا گیا ہو گا۔

ادھر گوہر علی نے شادو کو ایک کوٹھی میں پہنچا دیا تھا۔ وہاں صرف ایک عمر رسیدہ ملازمہ تھی لیکن باہر مسلح سیکیورٹی گارڈز کا پہرا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ گوہر علی نے سب کے سامنے اسے بیٹی بنایا ہے تو پھر اپنے اعلیٰ خاندان میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ لے جا کر رکھے گا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ گوہر علی کی وہ کوٹھی بھی ایسی ہی تھی جیسے ان چار

جوانوں کی تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہاں اسے ایک کمرے میں مقفل رکھا جاتا تھا اور یہاں
کوٹھی کے اندر آزاد تھی لیکن اپنی مرضی سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ دوسرے تیر
دن بھی خیرالدین شاہ اس سے ملنے نہیں آیا تو وہ پریشان ہو کر ملازمہ سے بولی۔ "گو
صاحب سے میری ملاقات کراؤ۔ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ شاہ صاحب مجھ سے
کیوں نہیں آ رہے ہیں۔"

ملازمہ نے جواب دیا۔ "ساہیوال میں ایک بہت بڑا سیاسی جلسہ ہونے والا
صاحب وہاں گئے ہیں۔ واپس آئیں گے تو ان سے ملاقات ہو گی۔"

وہ بولی۔ "میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میری وجہ سے شاہ صاحب پر مصیبتیں آ سکتی ہیں
گارڈز سے کہو کہ وہ اپنی حفاظت میں مجھے شاہ صاحب کے گھر لے جائیں۔ میں کچھ گ
میں جاؤں گی۔ پھر جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔"

"یہاں کا کوئی گارڈ بڑے صاحب کی اجازت کے بغیر تمہیں باہر نکلنے نہیں دے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہاں مجھے قیدی بنا کر رکھا گیا ہے؟ میں گوہر علی صاحب
فون پر بات تو کر سکتی ہوں؟"

"تم بڑے صاحب کو غلط نہ سمجھو۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں کہ ان سے
نمبر پر بات ہو سکتی ہے۔"

وہ ملازمہ ریسیور اٹھا کر ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا فون نمبر ڈائل کرنے لگی۔ تقر
آدھے گھنٹے بعد رابطہ ہو گیا۔ ملازمہ نے کہا۔ "سر جی! یہ شادو بی بی بہت پریشان ہیں
آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔"

شادو نے ملازمہ سے ریسیور چھین کر کان سے لگاتے ہوئے سلام کیا' پھر کہا۔ "آ
مجھے یہاں چھوڑ کر بھول گئے ہیں۔ خیرالدین شاہ صاحب کی بھی کوئی خیر خیریت نہیں
ہو رہی ہے۔ میں ابھی شاہ صاحب کے گھر جا کر ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا دل بہت
رہا ہے۔"

"بیٹی! دل تو میرا بھی گھبرا رہا ہے۔ میں نے عقلمندی کی جو تمہیں اس کوٹھی میں
کر چھپا دیا۔ ورنہ تم بھی شاہ صاحب کی طرح غائب کر دی جاتیں۔"

شادو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں
شاہ صاحب کیسے لاپتہ ہو گئے؟"

"میں دو دنوں سے اسی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں۔ میرا ایک ایک بندہ اسے
سے کراچی تک تلاش کر رہا ہے۔ کیونکہ تمہارا وہ صحافی حکمران پارٹی کے ایک جلسے

کوریج کے لیے پرسوں رات کی فلائٹ سے کراچی گیا تھا۔ لاہور کے جتنے صحافی گئے تھے وہ
آج شام واپس آ گئے ہیں۔ تمہارے شاہ صاحب کیوں نہیں آئے' یہ کوئی نہیں جانتا۔"

وہ بولی "ملک جاوید حیات صاحب اور رانا صاحب ان کے گہرے دوست ہیں۔ آپ
ان سے میری بات کرا دیں۔"

"میں ان سے بھی معلوم کر چکا ہوں۔ رانا صاحب کہہ رہے تھے کہ پرسوں شام کی
فلائٹ سے وہ تمام دوست گئے تھے۔ رات نو بجے کراچی پہنچے۔ صبح شاہ صاحب نماز پڑھنے
کے لئے کسی قریبی مسجد میں گئے۔ تب سے واپس نہیں آئے۔ ان کے بیان کے مطابق ان
کی گمشدگی کا سختی سے نوٹس لیا جا رہا ہے۔ تمام پولیس والے انہیں تلاش کر رہے ہیں۔
مگر بیٹی! یہ سب میری مخالف پارٹی کی ڈرامابازی ہے۔ میں نے ان کی نیت کو سمجھ کر ہی
تمہیں اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "آپ کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ شاہ صاحب کو
اغوا کیا گیا ہے۔ ان چار عیاش جوانوں کے باپ شاہ صاحب سے وہ تمام شرمناک مواد
حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"بالکل یہی بات ہے۔ اگر وہ کسی طرح شاہ صاحب سے وہ تمام چیزیں حاصل کرنے
میں کامیاب ہو جائیں گے تو تمہارا کیس بہت کمزور ہو جائے گا۔ تمہارے پاس ایسا کوئی
ٹھوس ثبوت نہیں رہے گا جس کے بل پر تم اپنی عزت اور عورتوں کے حقوق کے لئے
جنگ کر سکو۔"

وہ بولی۔ "اگر انہوں نے شاہ صاحب کو ذرا بھی نقصان پہنچایا تو وہ سب کسی کو منہ
دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"یہی ہونا چاہئے میری بیٹی! ہم شاہ صاحب پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ دشمنوں کے
خلاف جتنا مواد تمہارے پاس ہے' تم وہ سب وہیں کوٹھی میں لا کر چھپا دو' میرے گارڈز
تمہارے ساتھ جائیں گے اور وہ سب کچھ یہاں لائیں گے' وہ چیزیں میری اسی کوٹھی میں
محفوظ رہیں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ وہ چیزیں جہاں چھپی ہوئی ہیں' وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکے
گا۔"

دوسری طرف سے بات کرنے والا گوہر علی سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ "بیٹی! تم ابھی
نادان ہو۔ دشمن زمین کی تہہ میں چھپے ہوئے خزانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ شاہ صاحب
پر اتنا ظلم ڈھائیں گے کہ وہ بے چارا چھپا ہوا راز اگلنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"میں نے صرف ایک ہفتے میں شاہ صاحب کے ایمان اور پاکیزگی کو اتنے یقین سے پہچانا ہے، جتنے یقین سے خدا کو پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنی جان دے دیں گے مگر کسی بھی عورت کی بے لباس تصویر نہ خود دیکھیں گے اور نہ دوسروں کو دکھائیں گے۔"

گوہر علی جھنجلانے لگا۔ شادو یہ راز نہیں اگل رہی تھی کہ مخالف پارٹی کو زیر کرنے والی تصاویر اور ویڈیو کیسٹس کہاں چھپائے گئے ہیں۔ گوہر علی دشمنوں کی وہ تمام کمزوریاں اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہم شاہ صاحب کے ایمان کی پختگی کو خوب جانتے ہیں لیکن اغوا کرنے والوں کو یقین دلانا ہو گا کہ وہ شرمناک مواد شاہ صاحب کے پاس نہیں ہے۔ تمہارے پاس ہے اور جب انہیں تمہارے پاس ہونے کا یقین ہو جائے گا تو وہ شاہ صاحب کو ایک بے کار مہرہ سمجھ کر رہا کر دیں گے۔"

"میں انہیں یقین دلاؤں گی، آپ ان سے میری بات کرائیں۔"

"صرف زبانی یقین دلاؤ گی تو کوئی نہیں مانے گا۔ تمہیں ثبوت پیش کرنا ہو گا کہ وہ سب کچھ تمہارے پاس ہے۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ان ساری چیزوں کی نقل ثبوت کے طور پر ان کے پاس بھیج دوں؟"

"اگر ایسا کرو گی تو شاہ صاحب پر سے بلائیں ٹل جائیں گی اور دشمن یہ سوچ کر ہاتھ ملتے رہ جائیں گے کہ تم میرے مضبوط قلعے میں محفوظ ہو اور وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"لیکن میں ان میں سے ایک تصویر یا ایک کیسٹ بھی پیش نہیں کر سکوں گی۔"

"کیوں نہیں کر سکو گی۔ جبکہ وہ سب تمہارے پاس ہیں؟"

"اس لئے کہ میں نے اپنی شرم کھو دی مگر شاہ صاحب کی شرم ہے اور آخری سانس تک رہے گی۔ ان کی شرم یہ گوارا نہیں کرے گی کہ کوئی بھی حیا سوز تصویر کسی کی نگاہوں کے سامنے آئے۔"

"آج کے دور میں اتنی شرم اور شرافت کی بات کرو گی تو شاہ صاحب کو زندہ نہیں پاؤ گی۔"

وہ ریسیور کو کان سے لگائے رونے لگی پھر بولی۔ "میں نے شاہ صاحب کو یہی بات سمجھائی تھی۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ہم زندہ رہنے کے لئے خلافِ تہذیب ہتھیار سے نہیں لڑیں گے۔"

"تو پھر تم دونوں نے وہ شرمناک تصاویر اور ویڈیو کیسٹس کیوں رکھے ہیں؟"

"شاہ صاحب تو ان سب کو جلا ڈالنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں موقع نہیں دیا۔ میں نے وہ تمام متعلقہ چابیاں اپنے پاس چھپا لیں، جہاں وہ شرمناک چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔"

"یعنی شاہ صاحب کو علم ہے کہ وہ چیزیں کہاں ہیں؟ صرف ان کے پاس چابیاں نہیں ہیں۔"

"جی ہاں، وہ چابیوں کے بغیر ان چیزوں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"شادو! تم بہت بھولی ہو، کیا شاہ صاحب نے دوسری چابیاں بنوا کر تمہاری لاعلمی میں ان تمام چیزوں کو ضائع نہیں کیا ہو گا؟"

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیا ہے نہ کریں گے۔"

"یہ محض دل کی بات نہیں جسے تم مان رہی ہو۔ یہ وہ بات ہے جو پاکستانی عورتوں کی آبرو سے لے کر پاکستانی سیاست کے اکھاڑوں تک پہنچتی ہے۔ تمہیں ایک بار وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے کہ وہ تمام چیزیں موجود ہیں یا نہیں؟"

"میں شاہ صاحب کے بغیر وہاں نہیں جا سکوں گی۔ بات یہ ہے کہ............"

"تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ میرے مسلح محافظ اور ایک خاص آدمی تمہارے ساتھ جائے گا۔"

"آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ میں نے شاہ صاحب سے قسم لی تھی کہ وہ میرے بغیر اس مکان میں قدم نہیں رکھیں گے اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اجازت کے بغیر تصاویر کی کسی عورت کو منظرِ عام پر نہیں لاؤں گی۔"

"شادو! تم حالات کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہی ہو۔ تم دیر کرو گی تو شاہ صاحب زندہ نہیں ملیں گے۔"

وہ بولی "یہی سوچ کر رونا آ رہا ہے۔ مگر شاہ صاحب کی یہ ہدایت بھی یاد ہے کہ جب تک میں دوسری عورتوں کی شرم رکھوں گی اور ان پر کسی تیسرے کی نظر نہیں پڑنے دوں گی، تب تک دشمن مجھے اور میرے شاہ صاحب کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

اس بار گوہر علی طیش میں آ کر بولا "لعنت ہے تم پر۔ میں نے تمہیں بیٹی بنایا اور تم شاہ کو مجھ پر ترجیح دے رہی ہو۔ ایک دو کوڑی کے صحافی کے مقابلے میں مجھے بھروسے کے قابل نہیں سمجھ رہی ہو۔ میں چاہوں تو تمہارے ہوش ٹھکانے لگا دوں گا۔ میں تمہیں اس قدر مجبور کر سکتا ہوں کہ............"

شادو نے کہا "بس کریں بس۔ آپ نے طیش میں آ کر بہت کچھ کہا اور میں بہت کچھ

سن کر ایک بیٹی کی حیثیت سے برداشت کرتی رہوں گی لیکن آپ اپنے یہ الفاظ واپس لیں کہ خیرالدین شاہ جیسا مومن صحافی دو کوڑی کا ہے۔ وہ ایسا مومن ہے' جسے خدا سمجھتا ہے یا پھر ایمان والے سمجھتے ہیں اور جو نہیں سمجھتے' وہ بے ایمان ہیں۔"

"تم......... تم مجھے بے ایمان کہہ رہی ہو۔ بھانت بھانت کے مردوں سے کھیلنے والی کنجری! تم مجھے بے ایمان کہہ رہی ہو۔ دو ٹکے کی بازاری عورت! میں نے لوگوں کے سامنے تجھے بیٹی کہہ دیا تو سر پر چڑھ گئی۔ اپنی ذات' اپنی اوقات دکھا رہی ہے۔ اب میں تجھے دکھاؤں گا کہ ٹیڑھی انگلی سے صرف گھی نہیں نکلتا' وہ تمام تصویریں اور کیسٹ باہر نکلیں گے اور میرے ان ہاتھوں میں آئیں گے۔"

اتنا کہتے ہی فون بند کر دیا گیا۔ شادو ریسیور کو یوں دیکھنے لگی جیسے رنگ بدلنے والے گرگٹ کو دیکھ رہی ہو۔ پھر وہ دور کھڑی ہوئی ملازمہ کو دیکھ کر بولی "بڑے صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ فون بند کر دیا ہے۔ میں ان کا فون نمبر نہیں جانتی۔ تم بہت کچھ جانتی ہو' ایک بار میری بات کرا دو۔"

جب صاحب ناراض ہو جاتے ہیں تو پھر کسی کو منہ نہیں لگاتے۔ اب وہ فون پر نہیں بولیں گے۔"

"ضرور بولیں گے۔ تم صرف اتنا کہہ دو کہ میں ان کی مطلوبہ چیزیں ان کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔"

ملازمہ نے فون کے پاس آ کر نمبر ڈائل کئے پھر رابطہ ہونے پر بولی "سر! میں بول رہی ہوں۔ یہ شادو راضی ہو گئی ہے۔ وہ تمام چیزیں آپ کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔"

گوہر علی نے کہا۔ "اس سے کہو' اپنی اوقات میں رہ کر بات کرے۔ اگر وہ راضی ہے تو اسے ریسیور دو۔"

ملازمہ نے ریسیور دیا۔ شادو نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ "میں ایک پنڈ سے آ کر شہر میں لٹ گئی اور لٹنے کے بعد جتنی گالیاں میرے حصے میں آئیں۔ اسے میں نے قبول کیا.........."

گوہر علی نے غصے سے کہا۔ "صرف کام کی باتیں کرو۔"

"میں بہت بڑے کام کی بات کر رہی ہوں۔ یہ اتنی بڑی بات ہے جو پاکستان کی تاریخ میں درج ہو چکی ہے۔ یہ جتنی گالیاں آپ نے مجھے دی ہیں۔ اس سے زیادہ شرمناک گالیاں آپ جیسے شریف لوگ ایک دوسرے کو اسمبلیوں میں دیتے آ رہے ہیں۔ اس لئے تو آپ نے مجھے بیٹی کہا تھا کیونکہ آپ جیسوں کی بیٹیوں جیسی ہوں۔"

وہ فون پر غصے سے دہاڑنے لگا اور زیادہ گالیاں دینے لگا اور دھمکیاں دینے لگا کہ اب وہ دیکھے گی کہ اس کا انجام کتنا عبرت ناک ہوتا ہے۔

☆========☆========☆

خیرالدین شاہ ایک سیاسی جلسے کی کوریج کے لئے کراچی آیا تھا۔ تمام شہروں سے آنے والے صحافیوں کے لئے رہائش کا اور کھانے پینے کا باقاعدہ انتظام تھا۔ خیرالدین شاہ نے صرف ایک رات صحافیوں کے ساتھ گزاری۔ اگلی صبح منہ اندھیرے اٹھ کر نماز پڑھنے کے لئے ایک قریبی مسجد کی طرف گیا تو اچانک ہی ایک پجیرو اس کے قریب آ کر رک گئی۔ تین گن مین' بڑی پھرتی سے باہر آئے۔ ایک نے اسے گن پوائنٹ پر رکھا۔ اس نے کچھ پوچھنے کے لئے منہ کھولا تو وہ دوسرے نے اپنی گن کی نال اس کے منہ میں دے دی۔ تیسرے نے پوچھا۔ "خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو گے یا مرو گے؟"

شاہ کے منہ کے اندر گن کی نال گھسی ہوئی تھی۔ وہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے اشارے سے دونوں ہاتھوں کو کانوں سے لگا کر مسجد کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی اذان ہو چکی ہے' نماز پڑھنے جاؤں گا۔ تیسرے نے گن کے ہتھے سے اس کے سر پر زور کی ضرب لگائی۔ وہ چکرا کر گرنے لگا۔ دو گن مینوں نے اسے سنبھال کر گھسیٹتے ہوئے پجیرو کے اندر ٹھونس دیا۔ پھر ان تینوں کے بیٹھتے ہی گاڑی بڑھ گئی۔ ایک نے کہا۔ "بڑا جی دار بندہ ہے۔ ابھی ہوش میں ہے۔ اس کا منہ بند کرو۔"

اس کے منہ پر ایک ٹیپ چپکا دیا گیا۔ آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ پھر وہ دیکھ نہ سکا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ جہاں سر پر ضرب لگائی گئی تھی' وہ حصہ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی پتا نہیں کب تک چلتی رہی۔ وہ کبھی گاڑی کی آواز سنتا رہا اور کبھی غفلت میں گم ہوتا رہا تھا۔

پھر کہیں پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ اسے دھکا دے کر باہر نکالا گیا۔ پھر دو طرف سے دو افراد اسے کھینچتے ہوئے چلنے لگے۔ اس نے اپنے پیچھے ایک بڑے سے گیٹ کے بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ پھر چلتے رہنے کے بعد ایک دروازے کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد اسے روک دیا گیا۔ منہ سے ٹیپ ہٹا دیا گیا۔ آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اطراف دیکھنے لگا۔

وہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔ اس کی دیواریں سیاہ رنگ کی تھیں۔ دیواروں پر جابجا اذیت رسانی کے آلات آویزاں دکھائی دے رہے تھے۔ ایک طرف ایک بڑی سی مشین تھی' جس کے ذریعے بجلی کے جھٹکے پہنچائے جاتے تھے۔ فرش پر کہیں کہیں تازہ خون کے دھبے

تھے، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ پچھلی رات کسی کو یہاں لا کر ملکِ عدم کی طرف رخصت کر دیا گیا ہے۔

خیرالدین شاہ کے اطراف چار گن مین غنڈے تھے۔ اس نے کہا۔ "میں
ہوں کہ یہ ٹارچر سیل یعنی عقوبت خانہ ہے۔ مجرم اپنا جرم نہیں اگلتا تو ایسی جگہ ا
اس کے جرائم اگلوائے جاتے ہیں۔"

ایک نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "بڑے سمجھدار ہو۔ اتنی ہی سمجھ
سے سب کچھ اگل دو۔"

شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "میں اگل دوں؟ مگر کیا؟ میرا جرم کیا ہے؟"

دوسرے نے اسے دھکا دے کر کہا۔ "کرسی پر آرام سے بیٹھو۔ تمہارے جیسے
بھی یہاں آتے ہیں، جنہیں اپنے جرم کی خبر نہیں ہوتی۔ بعض جرائم یا غلطیاں انجا
ہو جاتی ہیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیسرے نے کہا۔ "ہمیں تمہاری پوری ہسٹری بتائی گئی ہے
بڑے مومن ہو۔ ہم بھی مسلمان ہیں۔ تم ہمیشہ سچ بولتے ہو، ہم نے بھی سچ اگلوا
لئے یہ جگہ بنائی ہے۔"

شاہ نے کہا۔ "مجھ سے جبراً اگلوانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جب
بولتا ہوں تو کسی جبر کے بغیر ہی سچ بولوں گا۔"

"شاباش! یہ دیکھو تمہارے سر کے اوپر ایک مائیک لٹک رہا ہے۔ اس کے ذ
تمہاری تمام باتیں دوسرے کمرے میں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ ہم یہ ریکارڈ اپنے آقاؤ
سامنے پیش کر دیں گے۔"

"پہلا سوال یہ ہے کہ تم اکمل شریف، جمال شہزاد، شاہنواز اور اکبر پاشا کو
ہو؟"

شاہ نے کہا "باقاعدہ نہیں جانتا۔ یہ سب بڑی شخصیات کی اولاد ہیں، کسی ن
تقریب میں انہیں دیکھا ہو گا۔ کبھی سامنا ہو تو پہچان لوں گا۔ پہچاننے کی ایک بڑی و
کی تصویریں ہیں۔"

"تم ہمارے دوسرے سوال کی طرف آ رہے ہو۔ کیا ان چاروں کی تص
تمہارے پاس ہیں اور اگر ہیں تو وہ کس قسم کی تصویریں ہیں؟"

"نہایت شرمناک تصویریں ہیں۔ انہیں دیکھنا بھی گناہ ہے۔"

"وہ تصویریں کتنی ہوں گی؟ اور کیا سب کے نیگیٹوز ہیں؟"

"میں نے ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر کو دیکھنا گناہ سمجھا۔ انہیں پھر ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس لئے ان کی گنتی نہیں کی۔ ایک اندازے کے مطابق وہ دو ڈھائی سو تصاویر ہوں گی اور اتنے ہی نیگیٹوز ہو سکتے ہیں۔"

"ہمیں خوشی ہے کہ تم ہر سوال کا معقول جواب دے رہے ہو۔ اب ویڈیو کیسٹوں کے متعلق بتاؤ۔"

"وہ کیسٹ تقریباً تیس یا زیادہ سے زیادہ چالیس ہوں گے۔ وہ بھی انتہائی شرمناک ہیں۔"

"جب ایسی تصاویر کو اور ویڈیو کیسٹ کو دیکھنا گناہ ہے تو تم نے اس گناہ کو اپنے پاس کیوں رکھا ہے؟"

"میں ایسی چیزیں کبھی اپنے پاس نہیں رکھتا ہوں۔ ان سے دور رہتا ہوں۔ یہ جس مکان میں ہیں، وہیں پڑی ہوئی ہیں۔"

ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے خیرالدین شاہ سے کہا۔ "کمال ہے۔ تم تو ہماری توقع کے خلاف سچوں کے باپ ثابت ہو رہے ہو۔ اب اس مکان کا نمبر اور پورا پتا بتا دو۔"

"میں سچ بول رہا ہوں اور بولتا رہوں گا۔ اس مکان میں شرم و حیا چھپی ہوئی ہے۔ اس لئے وہاں کسی کو جانا نہیں چاہئے۔"

"تم پٹڑی سے ہٹ رہے ہو۔ فوراً مکان کا نمبر اور پتا بتا دو۔ چابیاں دے دو پھر ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔"

"چابیاں میرے پاس نہیں ہیں شادو کے پاس ہیں۔"

"کوئی بات نہیں ہم اس مکان کے تالے توڑ دیں گے۔"

"لیکن وہ ایسی تصاویر ہیں کہ ان پر اب کسی کی نظر نہیں پڑنی چاہئے۔"

"تو پھر ان چار جوانوں کی تصویریں ان کے والدین کے پاس کیوں بھیجی تھیں۔ کیا انہوں نے وہ شرمناک تصویریں نہیں دیکھی تھیں۔"

"ان تصویروں میں جو لڑکیاں تھیں ان کا پردہ رکھا گیا تھا اور انہیں ارسال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ شادو کو انصاف دلایا جائے۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ جو اسے بیاہ کر لایا ہے، اس کے ہونے والے بچے کو باپ کا نام دے۔"

"یعنی تم بلیک میل کر رہے تھے؟"

"انصاف مانگنا بلیک میلنگ نہیں ہے۔"

ایک اسپیکر سے ٹوں ٹوں کی آوازیں سنائی دیں۔ سب نے اس آواز کی سمت دیکھا
پھر ایک نے کہا۔ "ہمیں حکم دیا جا رہا ہے کہ ہم وقت ضائع نہ کریں۔ صرف مطلوبہ ب
کا سوال جواب حاصل کریں۔ مکان کا نمبر اور پورا پتا بتاؤ گے یا نہیں؟"
"میں جس بات کو گناہ سمجھتا ہوں' اس گناہ کی طرف نہ خود جاؤں گا' نہ کسی کو جا
دوں گا۔"

خیرالدین شاہ کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ پڑا۔ وہ کرسی پر سے نیچے گرا پھر ہر طرف
اس پر لات جوتے گھونسے پڑنے لگے۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ انہ
نے اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھایا پھر ایک نے پوچھا "اب تمہارا کیا جواب ہے؟"

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس نے انکار میں سر ہلا کر
"میرا خدا ایک' میرا جواب ایک۔"

اب دو اشخاص کے ہاتھ میں دو ڈنڈے تھے۔ وہ دونوں باری باری اس کے گھٹنوں
ڈنڈے مارنے لگے۔ یہ ایسا تکلیف دہ ظلم تھا کہ شاہ اپنی چیخیں نہ روک سکا۔ پھر پیچھے
گردن پر بھی ضربیں پڑنے لگیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اب سوال نہیں کریں گے۔ وہ
ہی نیم مُردہ ہوتے ہوتے جواب دے دے گا۔

اسے میز پر لٹا کر رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ اس کے پاؤں کے تلووں پر ڈنڈے مار
گئے۔ اس کی شرٹ کو پھاڑ کر اوپر سے ننگا کیا گیا۔ پھر سب کے سب سگریٹ پینے لگے
سگریٹ سے اس کے بدن کے ایک ایک حصے کو داغنے لگے۔ وہ چیخ رہا تھا اور انہیں ا
رسول ؐ کا واسطہ دے رہا تھا۔ کیونکہ وہ سب مسلمان تھے۔ وہ کلمہ پڑھنا جانتے تھے۔
کی نماز بھی پڑھتے تھے۔ صرف گناہ' ظلم اور بربریت کے وقت اندھے بہرے ہو جاتے
کیونکہ یہ ان کا پیشہ تھا اور اسلام ان کا مذہب تھا۔ اگر ایسا کرنے والے دو چار یا
ہوتے تو شاید ان پر کافر ہونے کا فتویٰ صادر ہو جاتا لیکن کراچی سے لے کر اسلام آباد
خیبر تک فتوے صادر کیے جاتے تو پاکستان میں خیرالدین شاہ جیسے چند ہی مسلمان رہ جاتے
پھر وہ غریب رہ جاتے جو پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہونے کے خواب دیکھتے دیکھتے
رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔

ایک نے شاہ پر تھوک کر کہا "سالا' بڑا ڈھیٹ ہے۔ اب اس کے ناخنوں کی خبر لو۔"
انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ پھر اس کے ناخنوں اور گوشت
درمیان سوئیاں چبھونے لگے۔ ایک نے ہاتھ میں پلاس لے کر اس کی ایک انگلی کے ناخن
کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا تو وہ ناقابلِ برداشت تکلیف سے چیخیں مارتے مارتے ایک

سے چپ ہو گیا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ ایک نے گھبرا کر پوچھا "ارے یہ مر تو
نہیں گیا۔ ہمیں سختی سے تاکید کر دی گئی ہے کہ وہ تمام تصویریں اور ویڈیو کیسٹ ہاتھ آنے
تک اسے مرنے نہ دیا جائے۔" دوسرے نے اس کی نبض ٹٹولی۔ تیسرے نے اس کے
سینے پر کان رکھ کر دھڑکنیں سنیں۔ وہ بے ہوش ہو رہا تھا اور اس سے پہلے بے ہوشی میں
بڑبڑا رہا تھا۔ "میرا خدا ایک.......... میرا جواب ایک.........."

☆=========☆=========☆
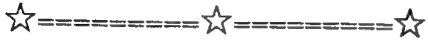
بات صرف اتنی سی ہوتی کہ چند رئیس زادوں نے چند شریف زادیوں کو کھلونا بنایا
ہے تو یہ کوئی اتنی بڑی خبر نہ ہوتی۔ بڑی خبر اور بڑی بدنامی یہ تھی کہ ان رئیس زادوں کے
تفریحی شغل کے باعث ان کے والد اور ان کے دوسرے بزرگوں کے سیاسی کردار مٹی میں
ملنے والے تھے۔

اپنے سیاسی کیریئر کو بچانے کے لیے وہ اپنے چاروں چہیتے بیٹوں کو عاق نہیں کر سکتے
تھے۔ کسی ہیرا پھیری سے اپنی اولاد کا گناہ دوسروں کے سر نہیں ڈال سکتے تھے۔ ان کے
خلاف بڑے ٹھوس ثبوت موجود تھے۔ پھر شادو کے ساتھ چند صحافی حضرات بھی تھے۔

صحافی حضرات کی تنقید سے بچنے کے لیے یہ چال چلی گئی تھی کہ خیرالدین شاہ کو
کراچی پہنچا کر اغوا کرایا گیا تھا اور موجودہ دور میں کراچی ایک ایسا شہر بن چکا تھا' جہاں
لاقانونیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ہر روز چوری' ڈکیتی اور قتل کی واردات ایک
معمول سا بن گیا تھا۔ روز پانچ دس بندے قتل کر دیئے جاتے تھے یا اغوا کر لیے جاتے
تھے۔ ثبوت اور گواہوں کے بغیر تمام صحافی حضرات یہ الزام نہیں دے سکتے تھے کہ
خیرالدین شاہ کو گہری سازش کے تحت سیاسی کیریئر بچانے کے لیے اغوا کرایا گیا ہے۔

خیرالدین شاہ کے جو ہمدرد اور دوست صحافی تھے' ان کے پاس ان رئیس زادوں کی
بدمعاشیوں کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ثبوت پیش کرنے والے صرف شادو اور شاہ تھے لیکن
ایک سیاسی پارٹی نے شادو کو اور دوسری نے شاہ کو منظر عام سے اوجھل کر دیا تھا۔

ایک عام سی کہاوت ہے کہ ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔
گوہر علی نے اس کہاوت پر عمل کرتے ہوئے عام لوگوں اور صحافیوں کے سامنے شادو کو
بیٹی بنا لیا تھا۔ جب تین دنوں میں یہ معلوم ہوا کہ وہ تمام مطلوبہ چیزیں جہاں ہیں' وہاں کی
چابیاں شادو کے پاس ہیں تو گوہر علی نے مختلف حیلوں بہانوں اور بڑی سیاست سے شادو کو
ان چابیوں اور ان مطلوبہ چیزوں تک لے جانا چاہا مگر ناکام رہا۔ اس ناکامی کے بعد وہ اپنے
اصلی رنگ میں آ گیا۔ اس نے شادو کو اپنی کوٹھی سے ایک خفیہ گودام میں پہنچا کر وہاں قید

کر دیا اور جس طرح مجرموں کے پیچھے خونخوار کتے چھوڑے جاتے ہیں' اسی طرح اس ر
پندرہ ہٹے کٹے جوان شادو پر چھوڑ دیئے۔ پھر اس نے پولیس کے اعلیٰ افسران اور
اخبارات تک شادو کی تصویروں کے ساتھ یہ خبر عام کر دی کہ خیرالدین شاہ کے اغوا کی
سنتے ہی شادو اپوزیشن لیڈر گوہر علی کی کوٹھی سے فرار ہو گئی ہے۔ وہ ضرور شاہ کو تلا
کرنے کراچی گئی ہو گی۔

اب وہی ہونے والا تھا' جو اس ملک میں ہوتا آیا ہے۔ مجرم تو اپنے عیش کدوں
رہیں گے اور ان کے خلاف ثبوت پیش کرنے والوں کو پولیس قیامت تک ڈھونڈتی ر
گی۔ اپوزیشن حکومت پر اور حکومت اپوزیشن پر الزامات دھرتی رہے گی۔ مگر
معاملے میں دونوں پارٹیوں کے لیے یہ بات تشویش ناک تھی کہ آخر وہ مطلوبہ شرمنا
چیزیں کہاں ہیں۔ ایک پارٹی یہ نہیں چاہتی تھی کہ اپوزیشن کے ہاتھ وہ چیزیں لگ جائیں
ورنہ بلیک میلنگ ہو گی اور اپوزیشن کے خلاف ہونے والے مقدمات کو واپس لینا ہو
جبکہ اپوزیشن کے لیے لازمی ہو گیا تھا کہ اپنے خلاف تمام مقدمات کو ٹھنڈا کرنے کے
وہ تمام تصویریں اور ثبوت حاصل کئے جائیں۔ یعنی شادو اور شاہ کو اغوا کرانے' ان
عقوبت خانے پہنچانے اور ان سے غیر انسانی سلوک کرنے کے باوجود دونوں سیاسی پارٹ
کے لیڈر کانٹوں کے بستر پر لوٹ رہے تھے۔

ان پارٹی لیڈروں کے لیے ایک بڑا تشویش ناک مسئلہ یہ تھا کہ آخر وہ مطلوبہ چ
کہاں ہیں' کس مکان میں ہیں۔ اگر عوام میں سے کوئی صحافی' کوئی دانش ور کوئی محب
ان چیزوں تک پہنچ جائے گا تو ان سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کا کس قدر عبرت ناک ا
ہو گا؟

ادھر ان کے کارندے رپورٹ پہنچا رہے تھے کہ خیرالدین شاہ پر اذیتوں کی انتہا
دی گئی ہے۔ ادھر سے شادو کے متعلق رپورٹ مل رہی تھی کہ اس کے بدن کی بو
نوچ لی گئی ہیں۔ پھر بھی وہ راز نہیں کھول رہی ہے۔ کسی کی زبان کھلوانے' اندر کی
اگلوانے کے تین ہی راستے ہیں۔ پہلا راستہ حکمتِ عملی کا ہے۔ گوہر علی نے شادو کو
بنانے کی حکمتِ عملی کر کے دیکھ لی تھی۔ دوسرا راستہ محبت کا ہے۔ شادو کو تین دنوں
بڑی محبت سے کوٹھی میں رکھا گیا تھا اور بڑی محبت سے چابیاں مانگی گئی تھیں اور اس
کا پتہ پوچھا گیا تھا' جہاں مطلوبہ چیزیں رکھی ہوئی تھی۔ تیسرا راستہ نفرت اور تشدد کا
یہ طریقے بھی ان دونوں پر آزمائے جا رہے تھے اور ناکامی ہو رہی تھی۔

جب ہر حال میں ناکامی ہو اور اقتدار اور اختیارات کام نہ آ رہے ہوں تو پھر

دوسرے سے عداوت رکھنے والی پارٹیاں خاموش ڈپلومیسی یا خفیہ سمجھوتے پر مجبور ہو جاتی
ہیں۔ وہ اوپر سے عوام کے سامنے اپنی ٹھوس پالیسیاں رکھتی ہیں اور ٹھوس عزائم کی بولیاں
بولتی ہیں۔ مگر اندر سے ٹوٹ کر دو پارٹیاں پھر ایک دوسرے کی مخالف نہیں رہتیں۔
درپردہ وہ گلے ملتی رہتی ہیں۔

مختلف پارٹیوں کے بڑے لیڈر کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ کوئی اندرونی
معاملہ ہو تو ان کے خاص مشیر اور نمائندے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ جو
حالات پیش آ رہے تھے' ان کے پیشِ نظر ان کی آپس میں ملاقات لازمی تھی اس لیے
دونوں پارٹیوں کے نمائندوں نے ایک جگہ ملاقات کی۔ ایک پارٹی کے مشیر خاص نے کہا
"آپ کے لیڈر نے شادو کو اپنی کوٹھی میں لے جا کر اپنی دانست میں ایک سیاسی چال چلی
تھی۔ پھر اسے کوٹھی سے بھی فرار کرا دیا اور یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ خیرالدین شاہ کی
تلاش میں کراچی گئی ہے۔ مگر یہ ہم خوب سمجھتے ہیں' اس پر ٹارچر کیا جا رہا ہے اور تصاویر
کے سلسلے میں راز اگلوایا جا رہا ہے۔"

دوسری پارٹی کے مشیر خاص نے کہا "ہم بھی خوب سمجھتے ہیں کہ تم لوگوں نے
خیرالدین شاہ کو اغوا کیا ہے اور اغوا کے الزام سے بچنے کے لیے پہلے اسے کراچی پہنچایا گیا
تھا۔ وہ شہر ایسا ہے جہاں قاتلوں اور اغوا کرنے والوں کا صحیح سراغ کبھی نہیں ملتا۔"

"چالیں تو ہم سب چلتے ہیں۔ کسی چال میں کامیابی ہوتی ہے اور کسی میں ناکامی' اور
جب ناکامی ہوتی ہے تو ہمارے تمہارے جیسے سیاسی دشمن مل بیٹھ کر کوئی سمجھوتا کرتے
ہیں۔ شادو اور شاہ گوشت پوست کے انسان ہیں۔ انہیں پلک جھپکتے میں ہلاک کیا جا سکتا
ہے لیکن ہم انہیں زندہ رکھنے پر مجبور ہیں۔ ان کی موت کے بعد کسی تیسرے کو ان
تصاویر تک نہیں پہنچنا چاہیے۔"

دوسرے نے پوچھا "انہیں کب تک عقوبت خانوں میں زندہ رکھا جائے گا؟ ان سے
راز اگلوانے کا کوئی طریقہ' کوئی امید ہونی چاہیے۔"

"اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ کمبخت شاہ آسمان سے اترا ہوا مومن ہے اور اس کا
ایمان متزلزل نہیں ہو گا اور وہ کمینی شادو اس شاہ کے ایمانی جذبوں سے متاثر ہو کر اس
کے نقشِ قدم پر چلے گی تو ہم انہیں عقوبت خانوں میں نہ پہنچاتے اور جب پہنچا ہی دیا ہے
تو انہیں واپس عوام میں جانے کے لیے رہائی نہیں دے سکتے۔"

ایک اور مشیر نے کہا "انہیں آزاد رکھا جاتا اور کسی طرح کا محاسبہ نہ کیا جاتا۔ دور
ہی دور سے ان کی نگرانی کی جاتی تو وہ دونوں کبھی نہ کبھی چھپائی ہوئی چابیاں لے کر اس

نامعلوم مکان میں ضرور جاتے پھر انہیں گرفتار کر کے وہ تمام مطلوبہ چیزیں حاصل کر جاتیں۔"

"ایسا ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوا۔ اس لیے ایسی باتوں میں اور اپنی غلطیوں کے حساب میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں کوئی اور تدبیر آزمانا چاہیے۔"

"اب تو ایک ہی صورت ہے کہ ان دونوں کو عقوبت خانوں سے نکال کر کہیں بند رکھا جائے۔ شادو تمہاری نگرانی میں اور شاہ ہماری نگرانی میں رہے گا کہ شادو اور شاہ کے پاس نہ کوئی تیسرا شخص پہنچے گا اور نہ وہ مطلوبہ چیزیں کسی کے ہاتھ لگیں گی۔"

گوہر علی کے مشیرِ خاص نے کہا "ہم تائید کرتے ہیں کہ فی الحال ان دونوں کو کہیں قید میں رکھا جائے۔ مگر یہ اندیشہ رہے گا کہ جہاں وہ مطلوبہ چیزیں چھپائی گئی ہیں وہاں کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ اس جگہ آگ لگ سکتی ہے یا اس مکان کا کوئی دوسرا ہو گا اور اسے مہینوں کا کرایہ نہیں پہنچے گا وہ تالا توڑ کر اندر جا سکتا ہے اور وہاں رکھی چیزوں کی طرف محلے کے لوگوں کو توجہ دلا سکتا ہے۔"

سب سوچ میں پڑ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مسئلے کا اونٹ کروٹ بیٹھے گا؟ ایک مشیر نے کہا "ہم اور دو دنوں تک اس مسئلے پر غور کریں گے۔ تیسرے دن ہمارا دوسرا اجلاس ہو گا اور تب تک ہم ضرور کسی خاطر خواہ نتیجے تک جائیں گے۔"

مسئلہ ایسا پیچیدہ ہو گیا تھا کہ مزید غور و فکر کے لیے کچھ اور وقت کی ضرورت اس لئے اجلاس برخاست ہو گیا۔ دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو رپورٹ دی گئی کہ ابھی تک نہیں بن رہی ہے۔ شاید تیسرے دن کے اجلاس میں کامیابی کی کوئی صورت آئے۔ ایک پارٹی لیڈر نے کہا "میں نے وہ ریکارڈ کیا ہوا کیسٹ سنا ہے' جس میں خیرالدین شاہ بار بار یہی کہتا رہا کہ اس کا خدا ایک ہے اور اس کا جواب ایک۔"

"جی ہاں' وہ اس ایک بات کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔"

لیڈر نے کہا "اس بات کے پیچھے جو بات ہے اس پر غور کرو۔ اس کی جسمانی اور دماغی صفائی کو سب جانتے ہیں اور اس نے عقوبت خانے میں یہی کہا ہے کہ تصویروں اور ویڈیو کیسٹ میں نظر آنے والی عورتوں کو دوسروں کی نگاہوں میں ننگی نہیں ہونے دے گا۔"

"جی ہاں جناب! وہ نگاہوں کی پاکیزگی کا بھی قائل ہے۔ اس کی پاکیزگی نے پریشان کر رکھا ہے۔"

"ہماری دنیا میں ایسے لوگ ہوتے ہیں' جو تشدد سے نہیں مرتے مگر شرم سے مر جاتے ہیں لہٰذا اب اس پر تشدد نہ کرو۔ اس کی شرم کو بے شرمیوں میں اور اس کی پاکیزگی کو ناپاکیوں میں بدل ڈالو۔ جب وہ خود غلاظت کا ڈھیر بن جائے گا تو پھر وہ مطلوبہ چیزیں دینے سے انکار کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔"

یہ منطق سمجھ میں آنے والی تھی۔ جب آدمی نشے کا عادی ہو جائے تو پھر نشہ بُرا نہیں ہوتا۔ بڑا مرغوب ہوتا ہے۔ خیرالدین شاہ کو جس عقوبت خانے میں رکھا گیا تھا' وہاں کے تشدد کرنے والے غنڈے بدل گئے۔ ان کی جگہ تین نئے بدمعاش آئے۔ ان کے جسموں اور لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نہانے دھونے اور صاف ستھرے رہنے کے عادی نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ تین خوبصورت جوان عورتیں آئیں تھیں۔ ایک بدمعاش نے اس سے کہا۔ "ہم تمہاری پوری ہسٹری سن کر آئے ہیں۔ تم پر صفائی اور پاکیزگی کا بھوت سوار ہے اور ہم یہ بھوت اتارنا جانتے ہیں۔"

دوسرے بدمعاش نے کہا "سنا ہے تم کچھ ننگی تصویریں اور بلیو فلمیں اسی لیے نہیں دینا چاہتے کہ انہیں دیکھنے سے آنکھیں گناہ گار ہو جاتی ہیں۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے کبھی عورت کا بدن نہیں دیکھا ہے۔"

خیرالدین شاہ فرش پہ پڑا ہوا تھا۔ زخموں سے چُور تھا۔ زخموں سے رسنے والا لہو سوکھ کر پپڑی کی طرح جم گیا تھا۔ وہ بولا "ہاں۔ یہ گناہ ہے۔ عورت کی بات نہ کرو۔ اس کا احترام کرو۔ دنیا کے ہر مرد کے پہلے رشتے میں عورت اس کی ماں ہوتی ہے۔ بعد میں دوسرے رشتے بنتے ہیں۔"

انہوں نے شاہ کو فرش پر سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا پھر ایک نے کہا "کرسی پر بیٹھ کر سینما دیکھنے کا مزہ آتا ہے۔ تم بھی دیکھو' ہاں تو نگینہ بائی' پہلے تم لباس اتارو۔ ہم کیا جانیں کہ ماں کیا ہوتی ہے۔ ہم تو مال سمجھ کر دیکھتے ہیں' یہ بھی دیکھے گا۔"

ایک کیسٹ ریکارڈر سے موسیقی آن ہو گئی۔ نگینہ بائی اس میوزک پر کیبرے ڈانس' پیشہ جسم [illegible] ہوئی خود کو ایک ایک کپڑے سے آزاد کرنے لگی۔ ایسے وقت خیرالدین شاہ بھی ایسا کرنا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھوں کے آس پاس جلتے سگریٹ کے چرکے دیئے جاتے تھے۔ پھر مارے تکلیف کے اس کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اس نے نظروں کو پھیرنا چاہا تو ادھر دوسری بائی کیبرے ڈانس شروع کر چکی تھی۔ تیسری سمت تیسری نے بے حیائی کے ہچکے کرنے شروع کر دیئے تھے۔

اب وہ کہاں دیکھتا؟ آنکھیں بند کرنے سے سگریٹ سے داغا جاتا تھا۔ وہ دل ہی دل

میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں پھٹ جائیں۔ وہ اندھا ہو جائے۔ جبکہ وہ ایسا نہیں سکتا تھا لیکن دعائیں کسی حد تک قبول ہو گئیں۔ نگاہوں کے ناپاک ہوتے رہنے اس کی روح ایسے کرب سے گزر رہی تھی کہ شرم اور تکلیف سے آنکھوں میں آنسو بھر گئے نگاہیں دھندلا گئیں۔ اب سامنے جو کچھ بھی ہو رہا تھا' وہ محض ایک دھندلا سا خاکہ تھا کوئی منظر واضح اور نمایاں نہیں تھا اور وہ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ معبود نے آنکھوں میں شرم رکھ لی ہے۔ یہ تماشا بڑی دیر تک ہوتا رہا۔ پھر ایک نے پوچھا۔ "یہ زندہ ناچ گانا کیسا لگا؟"

شاہ نے عاجزی سے کہا۔ "کیوں میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہو؟ ایک مضبوط چٹان کو اس کی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ اسے توڑا جا سکتا ہے۔ مجھے توڑو گے تو میں مر جاؤں گا اور اگر مر جاؤں گا تو تمہارے آقا پھر مجھ سے کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔"

"ہمیں تمہارے انکار کا بنیادی مقصد سمجھا دیا گیا ہے۔ تم پاکیزگی کی خاطر وہ چیزیں ہمارے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ مگر ابھی تمہاری نگاہوں کی پاکیزگی کہاں رہی؟ تم تو بے حیائی دیکھ رہے تھے؟"

"خدا بہتر جانتا ہے' میں آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود نہیں دیکھ رہا تھا۔ تم سب میری طرح مسلمان ہو۔ اپنے دین' ایمان کو سمجھو۔ ہمارے مذہب میں طہارت بھی لازمی ہے اور نظافت بھی۔ طہارت اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے سراپے کو باہر سے اور اندر سے پاک رکھے اور نظافت اسے کہتے ہیں کہ اپنی گندگی سے دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنے۔ میں التجا کرتا ہوں کہ نظافت پر عمل کرو اور اپنی گندی حرکتوں سے مجھے تکلیف نہ پہنچاؤ۔"

"ابے او مولوی! ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں اور مسلمان ہی رہیں گے۔ تو ہمیں دین و ایمان کی باتیں نہ سکھا۔ ابھی تو ہم تیرے ساتھ بہت کچھ کریں گے۔ تجھے آخری بار سمجھاتے ہیں فرشتہ نہ بن۔ انسان بن۔ ہماری طرح تھوڑا اچھا تھوڑا برا' تھوڑا میلا اور تھوڑا صاف ستھرا' تھوڑا گناہ گار اور تھوڑا پارسا۔"

دوسرے نے ایک حسینہ کو بازو میں جکڑ کر کہا۔ "میں اپنی اس روبی، کہا ہے کہ کھا کر کہتا ہوں۔ اگر تو ہمارے بڑے صاحب کا مطالبہ پورا کر دے گا۔ وہ ساری چیزیں ہمیں دے دے گا تو ہم تجھے پارسا اور پاک صاف رہنے دیں گے۔ ورنہ ماں قسم غلاظت کا ڈھیر بنا کر چھوڑیں گے۔"

شاہ نے کہا۔ "مجھے' صرف مجھے غلیظ بنانا چاہتے ہو' صرف ایک شخص کو۔ مگر یہ

سمجھو کہ میں تمام صعوبتیں اور یہ ساری بے ہودگیاں برداشت کر کے کتنی عورتوں کی عزت رکھ رہا ہوں اور کتنی آنکھوں کو شرمناک مناظر سے بچائے رکھنے کے لیے جہاد کر رہا ہوں۔"

ایک نے شاہ کے منہ پر گھونسا مارا پھر کہا۔ "اب تو ہم تجھے کتے اور سؤر سے بھی زیادہ ناپاک بنا کر رہیں گے۔ اے صمد! یار' وہسکی اور سوڈے کی بوتلیں کھول۔ ذرا موج مستی کریں گے۔"

بوتلیں کھلنے لگیں۔ شاہ نے گڑگڑا کر کہا۔ "خدا کے لیے یہ حرام چیز میرے سامنے نہ لاؤ۔"

وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا ایک حسینہ اس کی گود میں آکر بیٹھ گئی' پھر بولی "میں تو حرام نہیں ہوں۔ یہ میرے تین یار ہیں۔ یہ ہمارا نکاح پڑھا دیں گے پھر میں حلال ہو جاؤں گی۔"

سب کے سب قہقہے لگانے لگے۔ خیرالدین شاہ اس بے لباس عورت کو دھکا دے کر اپنے اوپر سے ہٹانا چاہتا تھا مگر دو اشخاص نے اس کے دونوں ہاتھوں کو جکڑ لیا تھا۔ پہلے صرف دیکھنے کی بے حیائی تھی جنہیں آنسوؤں نے دھندلا دیا تھا۔ اب بدن سے بدن کالمس تھا پھر شراب کی بو پھیلنے لگی۔ ایک نے کہا۔ "میں تیری ناک بند کروں گا تو سانس لینے کے لیے منہ کھولنا پڑے گا اور منہ کھولے گا تو شراب اندر جائے گی اور حلق سے اترے گی۔"

دوسرے نے کہا۔ "اب بھی وقت ہے۔ ابھی صرف تیری آنکھیں اور چھونے کی حس ناپاک ہوئی ہے۔ اب ناپاکی کو زبان سے چکھے گا حلق سے بھی اتارے گا۔ باہر سے اور اندر سے تیرا وجود غلاظت اور تعفن سے بھرتا رہے گا۔"

بعض مراحل ایسے ہوتے ہیں' جہاں جان دینا آسان ہوتا ہے لیکن روح کی ناپاکی گوارا نہیں ہوتی مگر شاہ کے ذہن میں ایک ہی جذبہ نقش تھا کہ ایک کے ناپاک ہونے سے سیکڑوں پاکیزگی برقرار رکھ سکتے ہیں تو اسے اسی طرح قربان ہو جانا چاہیے۔

وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو چکا تھا۔ پچھلے دو دنوں سے اتنی مار کھاتا رہا تھا اور اذیتیں برداشت کرتا رہا تھا کہ بالکل نڈھال سا ہو گیا تھا۔ بدن کی تمام ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ اگر وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوتا تو چلنے سے زیادہ ڈگمگانے لگتا۔ ایسے میں وہاں خرمستیاں شروع ہو گئی تھیں۔ شراب پی جا رہی تھی اور مردوں عورتوں کی ایسی بے حیائیاں ہو رہی تھیں کہ وہ آنکھیں پھیر لینا چاہتا تھا۔ ایسے وقت اسے دھمکی دی جاتی کہ

دیکھتے رہو گے تو ہم تمہیں شراب نہیں پلائیں گے ورنہ منہ میں جبراً ٹھونس دیں گے۔

وہ باطنی پاکی قائم رکھنے کے لیے مجبوراً دیکھ رہا تھا اور توبہ توبہ کر رہا تھا۔ توبہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہاں جو ناپاکی ہو رہی تھی' وہ اس کے بدن سے بھی لگائی جا رہی تھی اور وہ ایسے چیخ رہا تھا جیسے بدن سے انگارے لگائے جا رہے ہوں۔

پھر اس نے دیکھا کہ ایک بدمعاش شراب کی خالی بوتل میں قارورہ بھر رہا ہے اور ہنستے ہوئے کہہ رہا ہے "کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جاؤ تو وہ کہتا ہے کہ اپنا خون اور پیشاب ٹیسٹ کراؤ اور قارورہ لے آؤ۔ یہ دیکھو' میں قارورہ لے آیا ہوں۔"

وہ بھری بوتل لے کر شاہ کے پاس آ گیا۔ دائیں بائیں سے دو بدمعاشوں نے اسے جکڑ لیا۔ دو عورتوں نے پیچھے سے اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں لے لیا۔ وہ ہر طرف سے شکنجے میں آ گیا تھا اور جو شخص ایک ہاتھ میں قارورہ لے کر آیا تھا' اس نے دوسرے ہاتھ سے شاہ کی ناک دبائی۔ پھر وہی ہوا جو ذہنی اذیت رسانی کے انتہائی آخری مرحلے میں ہوتا ہے۔ وہ چیخ رہا تھا مگر ناک بند تھی۔ چیخنے کے لیے حلق سے سانس لینا ضروری تھا اور سانس کے ساتھ ہی وہ رقیق مادہ حلق سے اتر رہا تھا' جو انسانیت کے لیے سب سے بڑی توہین اور تہذیب کے لیے ماں بہن کی گالیوں سے بھی بدتر تھا۔

اس نے دو چار گھونٹ کے بعد ہی سانس روک لی۔ بس اب مرجانا چاہیے تھا۔ ناپاکی کی انتہا ہو چکی تھی۔ اب وہ جینا نہیں چاہتا تھا مگر مرنا بھی تو اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ خودکشی اس لیے حرام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ' وہ خالقِ حقیقی ہی زندگی دیتا ہے اور وہی زندگی لے کر موت دیتا ہے۔

وہ ایمان والا سب کچھ جانتا تھا مگر تشدد اور تعفن کے اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا' جہاں زندگی بے جان ہو جاتی ہے اور آپ ہی آپ ایمان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس لیے اس نے سانس روک لی تھی۔ نہ سانس لے گا' نہ دنیا کی کوئی غلاظت اس کے اندر جائے گی۔

یہ سانس ہے جو مصفا زندگی کو یا آلودگی کو انسان کے اندر پہنچاتی ہے۔ قارورہ بوتل اس کے منہ میں ٹھونسنے والے نے کہا۔

"ابے اور حرام کی اولاد! تو نے سانس روک لی ہے؟ ابے سانس لے۔ میں کہہ رہا ہوں' سانس لے۔ ابے ہمارا نشہ بھنگ نہ کر۔ آخری بار کہتا ہوں سانس لے۔"

شاہ اتنی دیر سے سانس روکنے کے باعث کسمسا رہا تھا۔ نہ جی رہا تھا' نہ مر رہا تھا جب تک جان رہتی ہے' آدمی سانس لینے پر مجبور ہوتا رہتا ہے۔ مگر وہ مجبوری سے لڑ تھا یونہی سانس لیے بغیر تڑپ تڑپ کر مرجانا چاہتا تھا۔ تب منہ میں بوتل ٹھونسنے والے

نے کہا۔ "ذلیل! کتے! میں تجھے بتاتا ہوں کہ سانس کیسے لیتے ہیں۔"

اس نے شاہ کے پیٹ میں ایک گھونسا مارا۔ ایسا زبردست گھونسا تھا کہ تکلیف کی شدت سے "اونک" کی آواز اس کے منہ سے نکلی۔ سانسیں پھر آنے جانے لگیں۔ اس پر نیم غشی یا جنونی غفلت سی طاری ہو رہی تھی۔

تشدد کرنے والے اس کے پورے وجود کو اندر سے غلاظت خانہ بنا رہے تھے اور وہ ایسی حالت میں اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔

مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

پورے شہر میں اذان کی مقدس آوازیں گونج رہی تھیں۔ اذان کی ابتدا اس وقت ہوئی' جب اسلامی تہذیب کی ابتدا ہوئی۔ اذان کا مقصد یوں تو عبادت اور انسانوں کو ان کی اپنی فلاح کے لیے پکارنا ہے لیکن عبادت کرنا اور فلاح پانا تقدس اور پاکی ہے پھر دعوت عبادت ہے۔

یہ اسلامی تہذیب کہتی ہے کہ مسلمان پیدا ہونے کے بعد جب سے شعوری زندگی شروع کرتا ہے' تب سے اسے اپنی موت تک پاکیزگی کو برقرار رکھنا چاہیے اور خیرالدین شاہ اسے ہر حال میں برقرار رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس وقت اُس کی عجیب سی حالت تھی۔ اس کا سر سامنے کو ڈھلک گیا تھا۔ اذان کے بعد وہ سر رکوع میں تھا یا سجدے میں' ہوش میں تھا' یا غفلت میں؟

ہوش میں ہوتا تو وہ کبھی سجدہ نہ کرتا کیونکہ اب پاک نہیں رہا تھا۔ کچھ سننے کے قابل ہوتا تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا مگر اذان کے تقدس کو مجروح نہ ہونے دیتا۔ وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ اس کے ڈھلکے ہوئے سر کو دیکھ کر اسے کرسی سے جکڑ کر رکھنے والوں نے چھوڑ دیا۔ اپنے اطراف کوئی سہارا نہ پا کر وہ اپنے جھکے ہوئے سر کے ساتھ کرسی پر سے آگے کو ڈھلک گیا۔ پھر اسی طرح اوندھا ہو کر فرش پر آ گرا اور کراہتے ہوئے کروٹ بدل کر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بالکل ہی غافل ہو گیا۔ خود اپنی خبر نہ رہی کہ زندہ بھی ہے کہ مرچکا ہے؟

بھئی زندہ ہو گا۔ دنیا کے سارے مسلمان زندہ ہیں۔ پاکیزگی کو مار مار کر زندہ ہیں۔ وہ بھی زندہ ہو گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب وہ کس طور سے زندہ رہے گا؟

☆========☆========☆

پتا نہیں وہ کون سی جگہ تھی؟ شاید کوئی تہہ خانہ تھا۔ وہاں ایک منجی پر بستر بچھا ہوا تھا جس پر شاہو لیٹی ہوئی تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایک ننگی کھسوٹی ہوئی لاش کی طرح پڑی

ہوئی تھی۔ درندوں نے اس کے چہرے اور بدن کو جگہ جگہ دانتوں سے کاٹا تھا۔ نوچا
اور وہ کئی درندے اس کے بدن کو گورکنوں کی طرح کھودتے رہے تھے۔ اب وہ ایسی م
سی ہو گئی تھی کہ اپنے ہاتھ پاؤں تک نہیں ہلا سکتی تھی۔ کبھی کبھی بڑی مشکل سے گرد
گھما کر دائیں یا بائیں دیکھ لیتی تھی۔ ورنہ چاروں شانے چت پڑی رہتی تھی۔ ایک ڈا
اپنے دو ماتحتوں کے ساتھ آتا تھا۔ اس کی مرہم پٹی کرتا تھا۔ ایک نرس اسے دوائیں کھلا
اور انجکشن وغیرہ لگاتی تھی۔ ایک بوڑھی عورت اسے چمچ کے ذریعے جوس وغیرہ پلاتی
اور کچھ نہ کچھ کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ شادو مرنے نہ پائے۔ اسے
حال میں زندہ رکھا جائے لیکن موت کے اتنے قریب پہنچا دیا جائے کہ وہ چھپائی ہو
چابیوں اور اس مکان کے متعلق بتانے پر مجبور ہو جائے' جہاں وہ مطلوبہ چیزیں رکھی ہو
تھیں۔

پچھلے دو دنوں سے باری باری ایک درندہ آتا تھا اور اس پر حیاسوز ظلم کرتے ہو
پوچھتا تھا "بتا وہ چابیاں اور وہ مکان کہاں ہیں؟ نہیں بتائے گی تو تیرے بدن کی دھجیا
ہوتی جائیں گی۔"

اور وہ جواباً کہتی تھی "جب آبرو نہ رہی تو جی کر کیا کروں گی۔ ایک عورت عز
چاہتی ہے یا موت چاہتی ہے۔ درندگی سے مل رہی ہے مگر موت تو مل رہی ہے۔"

وہ مطالبہ کرتے تھے اور وہ جواب دیتی تھی "اب تو میں مشین بن گئی ہوں۔ اب
بے زبان لوہے کی مشین کو ہتھوڑوں سے توڑتے رہو' وہ ٹوٹ جائے گی مگر شکایت نہ
کرے گی' بے زبان جو ٹھہری۔"

پھر وہ سچ مچ بے زبان ہوتی گئی۔ اتنے مظالم برداشت کئے کہ بولنے کی سکت
رہی۔ زبان ذرا ہلتی تو آواز نہ نکلتی اور آواز نکالتی تو محض کراہ نکل کر رہ جاتی تھی۔

یہ کیا حماقت تھی؟ وہ چابیاں گوہر علی کے حوالے کر کے زندہ سلامت اور عیش
عشرت سے رہ سکتی تھی یوں رفتہ رفتہ اپنی ایک بار ملنے والی زندگی کو خوشحال بنائے رکھ
انسان کا حق ہے۔ اس لئے انسان ہر اچھے اور برے طریقے سے اپنی سلامتی کا خاص
رکھتا ہے۔ وہ جینا چاہتا ہے۔ ہر حال میں جینا چاہتا ہے۔

اور وہ مرنا چاہتے ہیں.......... ہر حال میں مرنا چاہتے ہیں' جن سے ایمان چھ
ہے۔ شادو بھی اس ایمان اور پاکیزگی کے بغیر جینا نہیں چاہتی تھی' جو اس نے شا
دیکھی تھی۔ ایسے شرم والے مومن کم ہوتے ہیں' جو بیمار مگر جوان عورت کا لباس
وقت بھی اس کے بدن کو نہیں دیکھتے۔ ایسی شرافت شادو نادر ہی دیکھنے میں آتی

رائی عورتوں کی بے لباسی کو چھپانے کے لیے وہ شادو جیسی عورت سے ہی ماچس مانگتا ہے
تاکہ بے حیائی کو جلا کر راکھ کر دے۔

عورت کے دل میں محبت اور جذبہ ہو تو وہ کسی ایک مرد کامل سے ضرور متاثر ہوتی
ہے۔ شادو نے کتنے ہی مرد دیکھے تھے اور بھگتے تھے مگر وہ شاہ کے لئے جان دینے کی حد تک
متاثر تھی۔ اس لیے جب تک شاہ اسے اجازت نہ دیتا' اس وقت تک وہ کبھی دشمنوں کو
ان مطلوبہ چیزوں تک نہ پہنچنے دیتی اور وہ پورے ایمان کے ساتھ سمجھتی تھی کہ شاہ مر
جائے گا مگر اسے اجازت نہیں دے گا۔

دونوں سیاسی پارٹیوں کے نمائندے اور مشیر پھر ایک اجلاس میں غور کرنے لگے۔
ایک نے کہا۔ "ان دونوں پر ظلم و تشدد کی انتہا کر دی گئی ہے لیکن وہ راز نہیں کھول
رہے ہیں۔"

دوسری پارٹی کے مشیر نے کہا۔ "ان دونوں کی شرم اور شرافت ظاہر کرتی ہے کہ وہ
ہمارے سامنے تو کیا دنیا والوں کے سامنے بھی ان تصاویر اور ویڈیو کیسٹس کو کبھی ظاہر
نہیں ہونے دیں گے۔ ابھی تک یہی اطمینان ہے کہ وہ راز ان کی آخری سانسوں تک
راز ہی رہے گا۔"

"لیکن اندیشہ تو یہ ہے کہ ان کی زندگی میں یا ان کی موت کے بعد وہ چیزیں
دوسروں کے ہاتھ لگ سکتی ہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟ ان دونوں کی حالت ایسی کر دی گئی ہے کہ صرف انہیں جان سے
مارنا باقی رہ گیا ہے اور ہم انہیں مار نہیں سکتے۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "میری عقل کہتی ہے کہ ان دونوں کو ایک جگہ قید میں رکھا
جائے۔ جہاں رکھا جائے' وہاں ایسے انتظامات کئے جائیں کہ ان کی ہر بات ریکارڈ ہو کر ہم
تک پہنچتی رہے۔ وہ کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی دن ان چابیوں کی اور اس مکان کی باتیں
کریں گے تو ہمیں ان کی باتوں سے کوئی سراغ ضرور ملے گا۔"

یہ مشورہ کچھ معقول سا تھا کہ خیرالدین شاہ کو کراچی سے واپس لا کر لاہور میں ہی
شادو کے ساتھ کسی ایسی جگہ قید کیا جائے جہاں دونوں سیاسی پارٹیاں ان قیدیوں کی ریکارڈ
شدہ گفتگو سنتی رہا کریں۔ اس طرح کوئی پارٹی دوسری کو دھوکا نہیں دے سکے گی۔ اب
دونوں کو ایک جگہ قید رکھنے کے لئے دونوں سیاسی پارٹیوں کو ایک دوسرے پر بھروسا کرنا
تھا اور وہ بھروسا کرنے سے کترا رہے تھے۔ کیونکہ جس پارٹی کو بھی مطلوبہ چیزوں کا علم
ہوتا وہ پہلے اس جگہ پہنچ کر وہ چیزیں حاصل کر لیتی۔ وہ چیزیں ان پارٹیوں کا مقدر بن گئی

تھیں، پارٹی لیڈر میں سے جو پہلے وہ چیزیں حاصل کر لیتا، وہ ملک کا یعنی مقدر کا بادشاہ
جاتا۔

اِس سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ظالموں کو ان کے ظلم کی سزائیں ملتی ہیں
نہیں؟ جواب تو یہی ہے کہ سزائیں ملتی ہیں مگر ملک کے اکابرین پر اس کا اثر نہیں ہوتا
کیونکہ ملک میں سیلاب آتا ہے تو عوام ڈوبتے ہیں۔ ملکی خزانہ لوٹ کر خالی کیا جاتا ہے
معاشی اور اقتصادی بدحالی عروج کو پہنچتی ہے تو سزا کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ ہاتھوں میں
کشکول پکڑنے سے ورلڈ بینک کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ جمعرات بھری مراد اور سیاہ
کاروبار چمکانے والوں کی مرادیں پوری ہوتی رہتی تھیں۔ ملک کو تو گروی رکھا جا چکا ہے
صرف نمائش کے طور پر سیاسی بازی گری رہ گئی ہے کہ ایک بار تم حکومت کرتے رہو
ایک بار ہم حکومت کرتے رہیں اور عوام کو یہ تسلی دیتے رہیں کہ دنیا کے نقشے میں پاکستان
موجود ہے۔ جبکہ وجود ایمان سے قائم رہتا ہے اور بے ایمانی سے محض وجود کا بھرم رہا کرتا
ہے۔

پھر دستِ قدرت حرکت میں آیا۔ ہوا یوں کہ عظیم پاشا پچھلے چند مہینوں سے پریشان
تھا۔ اسے اپنے بیٹے اکبر پاشا کی بیماری نے پریشان کر رکھا تھا۔ باپ نے بڑی رازداری سے
میڈیکل چیک اپ کرایا۔ اسے ایک ہفتے کے لئے ملک سے باہر بھی بھیجا۔ اس کا خیال تھا
کہ پاکستانی ڈاکٹروں سے غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ یہاں بیماریاں کچھ ہوتی ہیں اور ڈاکٹر اپنے
اناڑی پن سے کچھ اور ظاہر کر دیتے ہیں لیکن ایک ہفتے بعد اکبر پاشا بیرونِ ملک سے واپس
آیا تو تصدیق ہو گئی کہ وہ ایڈز کا مریض ہے۔

اکبر پاشا کی شادی ہونے والی تھی۔ ایسے وقت یہ اتنی بڑی سزا تھی کہ شادی کے بعد
کیا ہوگا؟ یہ بیماری ہونے والی بیوی سے ہونے والے بچوں تک پہنچ سکتی تھی۔ اس طرح
سیاسی خاندان کی آئندہ نسلیں ایڈز میں مبتلا ہونے والی تھیں۔ فی الوقت سیاسی مصروفیات
کا بہانہ کر کے وہ شادی ملتوی کر دی گئی۔ باپ نے غصے سے پوچھا۔ "یہ بلا تم کہاں سے
لے آئے ہو۔ یہ رپورٹ ہمارے پاس ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی بازاروں میں نہیں
جاتے تھے اور نہ ہی ہماری عزت پر کیچڑ اچھالنے کے لئے بازار والیوں کو اپنی کسی کوٹھی
میں بلاتے تھے۔ تم سب شریف گھرانے والیوں سے وابستہ رہے۔ پھر تم نے یہ روگ کیسے
لگا لیا؟"

اکبر پاشا سر جھکائے باپ کی ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا۔ مگر کوئی جواب نہ دے سکا
حقیقت یہ تھی کہ رمی کھیلنے میں اناڑی تھا اور چار ماہ کے لئے آنے والی کسی بھی حسینہ

وہی جیت لیتا تھا جو رمی میں زیادہ پوائنٹ حاصل کرتا تھا۔ یہ بڑا ہی معیاری عیاشی کا مشغلہ
تھا مگر اکبر پاشا ہمیشہ ہار جاتا تھا اور اسے آنے والی ہر حسینہ آخری چوتھے مہینے میں ملتی تھی۔
اس مایوسی اور ناکامی کے باعث وہ چوری چوری عیاشی کی طرف مائل ہو گیا۔ اس کی خبر
دوستوں کو بھی ہونے نہیں دی۔ نتیجہ اب اس کے سامنے تھا۔ پتا نہیں کس حسین بلا سے
واسطہ پڑ گیا تھا جو اسے یہ بیماری دے گئی تھی۔

جس ڈاکٹر نے اکبر پاشا کا طبی معائنہ کیا تھا۔ اس نے ایک محفل میں شاہنواز کے
باپ رب نواز سے کہا۔ "میں آپ کا پرانا خادم ہوں۔ ایک خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔
آپ اپنے بیٹے شاہنواز کو اکبر پاشا سے دور رکھیں۔ وہ نوجوان ایڈز کا مریض ہے۔ یہ
صرف میری ہی نہیں بیرونی ملک کے ڈاکٹر کی بھی رپورٹ ہے۔"

رب نواز کا سر گھوم گیا۔ ان بڑوں کو اپنے جوان بچوں کے مشاغل کا علم تھا۔ چونکہ
وہ معیاری عیش و عشرت کے لمحات گزارا کرتے تھے اس لئے وہ بزرگ انجان بن کر رہتے
تھے لیکن ایڈز والی بات تو دھماکہ تھی۔ رب نواز نے اکمل شریف اور جمال شہزاد کے
بزرگوں کے علاوہ اکبر پاشا کے والد وغیرہ کو اپنے ہاں بلایا۔ پھر ان کے سامنے اکبر پاشا کے
باپ سے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ تمہارا بیٹا ایڈز کا شکار ہو گیا ہے؟"

عظیم پاشا نے ذرا جھجک کر کہا۔ "ہاں۔ مگر میں بڑی توجہ سے علاج کرا رہا ہوں۔"

"کیا خاک علاج کرا رہے ہو؟ جبکہ یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے چاروں جوان
بیٹے ایک ہی دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ اس طرح ایک کی بیماری دوسرے کو بھی تیسرے کو
اور پھر چوتھے کو لگ چکی ہوگی۔"

جمال شہزاد کے باپ نے پریشان ہو کر کہا۔ "عظیم پاشا! اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم
ہم سے چھپاتے رہے۔ اگر ہمیں بتا دیتے تو ہم بھی اب تک بیٹوں کا میڈیکل چیک اپ نہ
کرا لیتے؟"

عظیم پاشا نے کہا۔ "میں تم لوگوں کا دشمن نہیں ہوں۔ دوست ہوں۔ پہلے میں
یقین کرنا چاہتا تھا کہ میرے بیٹے کو واقعی یہ مرض ہے یا نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو تم سب
کو ہراساں کرنا حماقت ہوتی۔"

"حماقت تو تم نے پہلے ہی دن سے کی ہے۔ جب ہمارے چاروں بیٹے ہم نوالہ و ہم
پیالہ رہے ہیں تو ان کا میڈیکل چیک اپ بھی ایک ساتھ ہونا چاہئے تھے۔"

وہ سب عظیم پاشا سے ناراضی ظاہر کرتے رہے لیکن اسے ناراض نہیں ہونے دیا
کیونکہ وہ ایسا بیوروکریٹ تھا جسے کوئی سیاست دان ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر یہ طے

پایا کہ وہ سب اپنے جوان بیٹوں کا طبی معائنہ کرائیں گے۔ اکمل شریف، جمال شہزاد اور شاہنواز نے اکبر پاشا سے پوچھا۔ "یہ کیا چکر ہے؟ تم یہ بیماری کہاں سے لائے ہو؟"

وہ بولا "یار! میں خود پریشان ہوں کہ یہ مرض کہاں سے لاحق ہو گیا؟ ویسے میری کوئی بیماری تم لوگوں کو نہیں لگ سکتی۔"

ایک نے پوچھا۔ "کیوں نہیں لگ سکتی؟"

"اس لئے کہ چار ماہ کے لئے جتنی حسینائیں آیا کرتی تھیں ان کے لئے میرا نمبر سب سے آخر میں آتا تھا۔ اگر میرا پہلا، دوسرا یا تیسرا نمبر ہوتا تو میرا جھوٹا کھانے والے کو بیماری لگتی۔"

اکمل شریف نے کہا۔ "واقعی یہ اہم نکتہ ہے۔ اکبر پاشا ہمارے مشغلوں میں ضرور شریک رہا ہے مگر اسے ہماری جھوٹی ڈش کھانے کو ملی ہے۔ ہم میں کسی نے اکبر پاشا کی چھوڑی ہوئی ڈش نہیں کھائی۔"

جمال شہزاد نے کہا۔ "تھینکس گاڈ! ہم محفوظ ہیں اور محفوظ رہیں گے۔"

شاہنواز نے کہا۔ "ایڈز کے پھیلنے کی یہی ایک وجہ نہیں ہے اور بھی کئی وجوہات ہیں۔ مختلف ڈاکٹر معائنہ کر چکے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ رپورٹس کیا آتی ہیں؟"

پھر رپورٹس آگئیں۔ اکبر پاشا کے سلسلے میں تو تصدیق ہو گئی تھی باقی تینوں ساتھیوں میں بھی ایڈز کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اُن چاروں خاندانوں میں جیسے زلزلہ آگیا۔ ہر ایک کی ماں نے اپنے اپنے بیٹے کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگیں اور یہ منت بھی مانی کہ ان کے صحت یاب ہوتے ہی داتا دربار میں سو سو دیگیں پکوائیں گی اور بھوکوں کو کھلائیں گی۔ ان ماؤں کو نہ جانے یہ معلوم تھا یا نہیں کہ چار جوانوں کے لئے چار سو دیگیں جو پکوائی جائیں گی ان کی رقم سرکاری خزانے سے یا اوپری آمدنی سے آئے گی۔

ان میں سے ہر نوجوانوں کا باپ یہ تحقیق کرنے لگا کہ ان کے بچوں کا جوان مشغلہ کتنے برسوں سے جاری ہے اور اب تک کتنی شریف زادیاں ان کی کوٹھیوں میں آکر اور چار ماہ کی مدت گزار کر جا چکی ہیں۔ مکمل تحقیقات ممکن نہیں تھیں۔ پھر یہ کہ ان میں سے جو عورتیں شریفانہ گھریلو زندگی گزار رہی تھیں، ان کا وہ طبی معائنہ نہیں کرا سکتے تھے۔ اگر ان عورتوں کا پردہ نہ رکھا جاتا تو پھر وہ عورتیں بھی انتقاماً ان کے بیٹوں کو بدنام کر سکتی تھیں۔

رب نواز نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں۔ یہ سارے فساد کی جڑ شادو ہے۔ یہ پہلے ہمارے بیٹوں پر اور اب ہماری آئندہ نسلوں پر کم بختی لا رہی ہے۔ آخر یہ کہاں سے لائی

گئی ہے؟"

اکمل شریف کے باپ نے کہا۔ "میرا بیٹا اسے زمیندار ملک نعیم کے پنڈ سے لایا تھا۔ وہ زمیندار زرعی بینک سے لاکھوں روپے قرض لینا چاہتا ہے۔ وہ زمیندار ہی بتا سکتا ہے کہ شادو کون ہے اور اس کے خاندان میں کتنے افراد کو کتنے قسم کی بیماریاں لگتی رہی ہیں؟"

یہ معلوم کرنے کے لئے ایک اعلیٰ پولیس افسر کو حکم دیا گیا کہ وہ پنڈ جائے اور شادو کے متعلق مکمل معلومات حاصل کر کے زمیندار کو شہر لے آئے۔ اعلیٰ افسر نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ دوسرے دن زمیندار ملک نعیم کو لے کر رب نواز وغیرہ کے سامنے حاضر ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "سر! پنڈ میں شادو کی رپورٹ اچھی ہے۔ سب اسے چاہتے ہیں اور یہ سب ہی کہتے ہیں کہ سنگدل زمیندار بھی اسے بچپن سے بیٹی کہتا رہا ہے اور عید بقرعید کے علاوہ بھی اُس کے لئے نئے جوڑے سلواتا رہا ہے اور ہر ماہ اسے سو یا پچاس روپے دیتا رہا ہے۔"

رب نواز نے زمیندار سے پوچھا۔ "تم شادو پر اتنے مہربان کیوں تھے؟"

اس نے جواب دیا۔ "جناب؟ میں نے دو شادیاں کیں لیکن دس برس گزرنے کے بعد بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے شادو کو بیٹی بنا لیا تھا۔"

"پنڈ میں اور بھی لڑکیاں تھیں۔ تم نے انہیں بیٹی کیوں نہیں بنایا؟ بیٹی بنایا جائے تو پھر ایک نہیں ہوتی، سب ہی ہوتی ہیں۔"

"آپ جانتے حضور! وہاں اپنا رعب اور دبدبہ رکھنا پڑتا ہے۔ سب ہی کو سر پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔"

"مگر تمہارے جیسے زمیندار حویلی میں کام کرنے والی جوان لڑکیوں کو سر چڑھاتے ہیں انہیں رات کو حویلی میں روک لیا کرتے ہیں۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ شادو جیسی حسین لڑکی کو تم نے بیٹی بنا لیا؟ تم زیادہ سے زیادہ چالیس برس کے ہو۔ بوڑھے نہیں ہو۔ خاصے صحت مند عمر رسیدہ جوان لگتے ہو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "جناب عالی! سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کی اس بات کا کیا جواب دوں۔ بس جناب! میرے ضمیر نے کہا، میں نے اسے ہمیشہ کے لئے بیٹی مان لیا۔"

"ضمیر کیا ہوتا ہے؟ ضمیر کسی دلال کا نام نہیں ہے۔ یہ دلال کسی کو داشتہ اور کسی کو بیٹی نہیں بناتا۔ جب بناتا ہے تو سب کو بہن اور بیٹی ہی بناتا ہے۔ ضمیر کبھی دوغلا نہیں ہوتا۔ یہ یا تو ہوتا ہے یا پھر سرے سے نہیں ہوتا ہے۔"

زمیندار ملک نعیم کوئی جواب نہیں دے سکا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ رب نواز نے

کہا۔ ”زرعی بینک سے قرضہ منظور ہو گیا ہے۔ یہاں سے جاتے وقت تم رقم لیتے جاؤ گے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم سے کچھ نہ چھپاؤ۔ شادو ہمارے لئے ایک پہاڑ جیسا مسئلہ بن گئی ہے۔ اس کے بارے میں جو بھی سچ ہے' اسے نہ چھپاؤ۔ چھپاؤ گے تو رقم بھی نہیں ملے گی اور نئی مصیبتوں میں بھی پڑ جاؤ گے۔“

وہ بولا ”جناب عالی! آپ سے نہیں چھپاؤں گا۔ مجھے بلو نامی ایک لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ میری حویلی میں کام کرنے آتی تھی۔ میں اس کا ایسا دیوانہ تھا کہ وہ کسی زمیندار کے گھرانے سے ہوتی تو شادی کر لیتا مگر وہ ایک گوالے کی بیٹی تھی۔ وہ بھی مجھے چاہتی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اس کی شادی کسی اور سے نہ ہو۔ وہ ہمیشہ میری حویلی میں داشتہ بن کر رہے۔ تب میں نے ایک غریب کسان پر پانچ ہزار روپے چوری کا الزام لگایا اور کہا اگر آئندہ تم وفادار رہو گے تو تھانے والے تمہاری پٹائی نہیں کریں گے۔ تم جیل بھی نہیں جاؤ گے۔ وہ میرے قدموں میں گر پڑا۔ میں نے کہا' میں جو کہوں اس پر عمل کرو۔ بلو سے شادی کر لو مگر خبردار کبھی اُسے بیوی سمجھ کر ہاتھ نہ لگانا۔ وہ تمہارے پاس میری امانت رہے گی۔ جب بلایا کروں گا' وہ حویلی میں آجایا کرے گی۔ وہ غریب تھا' میرا محتاج تھا۔ اس پر چوری کا الزام بھی تھا لہٰذا اس نے میری وفاداری قبول کرلی۔ یہ جو شادو ہے' سچ مچ میری اور بلو کی بیٹی ہے۔ بلو کی موت کے بعد بھی میں شادو کو بیٹی کی طرح چاہتا رہا ہوں۔“

اکمل شریف کے باپ نے کہا ”تم نے میرے بیٹے کو اسی لیے پھانسا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان میں بہو بن کر رہے گی۔“

زمیندار نے کہا ”میں یہاں زرعی بینک آیا تھا۔ وہاں اکمل شریف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے خود ہی کہا کہ میرے پنڈ میں کوئی انتہائی حسین لڑکی ہو تو وہ شادی کریں گے اور اس کے عوض بینک کا قرضہ منظور کرادیں گے۔ میں نے کہا۔ آپ پنڈ آکر دیکھ لیں۔ لڑکی پسند ہو تو بیاہ کر لے جائیں۔ میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ میری بیٹی شادو ایک بڑے صاحب کی دلہن بن جائے۔“

رب نواز نے کہا ”اچھا یہ بتاؤ شادو یا اس کی ماں بلو کو ایڈز کی بیماری تھی؟“

”جناب عالی! میں نہیں جانتا' یہ کیا بیماری ہوتی ہے۔ میں پہلی بار اس کا نام سن رہا ہوں۔“

رب نواز نے سوچتی ہوئی نظروں سے زمیندار کو دیکھا پھر پولیس افسر سے کہا۔ ”اسے ہمارے فیملی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو ایڈز کے سلسلے میں اس کا اچھی طرح معائنہ کرے اور تمام ضروری ٹیسٹ کی رپورٹ پیش کرے۔“

افسر اس زمیندار ملک نعیم کو وہاں سے لے گیا۔ اکمل شریف نے کہا۔ ”اصل معائنہ تو شادو کا ہونا چاہئے۔“

رب نواز نے کہا۔ ”شادو کی ماں بلو کا بھی معائنہ ہونا چاہئے تھا مگر وہ مر چکی ہے۔ شادو گوہر علی کے قبضے میں ہے۔ اپوزیشن پارٹی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ ہمارے چاروں لڑکے ایڈز کا شکار ہو رہے ہیں۔“

پارٹی کے وہ تمام اکابرین خاموش رہے۔ سر جھکا کر سوچتے رہے۔ اب اندیشہ یہ نہیں رہا تھا کہ وہ تصاویر اور ویڈیو کیسٹس مخالف پارٹی کے لیڈر گوہر علی کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ اب تو یہ فکر بھی لاحق ہو گئی تھی کہ چاروں لڑکوں کو ایڈز کا معاملہ اپوزیشن تک پہنچے گا تو یہ بات اچھالی جائے گی کہ حکمران اپنے پاکستان میں صرف مہنگائی اور کرپشن نہیں پھیلا رہے ہیں بلکہ اپنے عیاش لڑکوں کے ذریعے ایڈز کو بھی امریکی ایڈ کی طرح فراخ دلی سے تقسیم کر رہے ہیں۔

☆========☆========☆

خیرالدین شاہ پر سکتہ سا طاری تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر جیسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ سانس لے رہا تھا لیکن جیسے زندہ نہیں تھا۔ ڈھول کا پول تھا۔ اندر سے خالی ہو گیا تھا۔ دو آدمیوں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ پھر اسے کبھی چلاتے ہوئے اور کبھی گھسیٹتے ہوئے اس عقوبت خانے سے باہر لے آئے۔

باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جس کا پچھلا حصہ جیل خانے کی گاڑی جیسا تھا۔ اس حصے میں ایک آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ خیرالدین شاہ کو کراچی سے لاہور بڑے آرام سے پہنچایا جائے اور اس سلسلے میں بڑی رازداری سے کام لیا جائے۔

شاہ کے بارے میں اپنے آقاؤں کو یہ رپورٹ پہنچائی گئی تھی کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے۔ کسی کھانے پینے کی چیز کو منہ میں رکھنا یا حلق سے اتارنا نہیں چاہتا ہے۔ مگر اسے زندہ رکھنے کا حکم تھا اس لئے جبراً اسے اس طرح کھلایا پلایا جاتا تھا' جس طرح غلاظت اس کے حلق سے اتاری گئی تھی۔ یعنی جب کھانے سے انکار کرتا تو اسے ہر طرف سے جکڑ لیا جاتا۔ ایک چٹکی سے اس کی ناک بند کر دی جاتی۔ تب وہ سانس لینے کے لئے منہ کھولتا تو منہ میں پھلوں کا جوس یا کھانے کا کوئی رقیق مادہ ڈالا جاتا تھا اور یوں اس کے اندر خوراک پہنچا کر اسے زندہ رکھا جاتا تھا۔

انسان صرف خوراک سے زندہ نہیں رہتا۔ وہ تو کھاتے کھاتے بھی مر جاتا ہے اور

آدمی زندہ رہنے کے لئے سانسوں کا محتاج بھی نہیں ہے۔ وہ سانس لیتا رہتا ہے کہ اچانک کوئی صدمہ یا دھچکا پہنچتا ہے اور وہ بقیہ سانسیں چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ اسے زندہ رکھنے والے یہ نہیں جانتے تھے کہ ایک احساس اسے مار رہا ہے اور وہ شعوری زندگی کی ابتدا سے اب تک کی پاکیزگی کا شدید احساس تھا۔ اس پاکیزگی کو اس کے اندر قتل کر دیا گیا تھا ایک ناپاکی کو اس کے گلے کے اندر سے گزار کر پاکیزگی کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ اب وہ سانسیں لیتے وقت صرف ایک ہی فقرہ کہتا تھا۔ "میں اس کا نام کیسے لوں؟"

اس فقرے میں "اُس" کہتے وقت وہ کلمے کی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتا تھا۔ یوں وضاحت ہو جاتی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب اشارہ کر رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پاک نام کیسے لے؟ قلب سے، حلق کی نالی سے اور زبان سے جو اللہ اور رسولؐ کے اسمائے پاک نکلتے ہیں، اس حلق کی نالی کو اور قلب کو گٹر بنا دیا گیا تھا۔ لہٰذا اسمائے پاک کی پاکیزگی وہاں سے نکل کر زبان تک کیسے آئے گی؟ وہ کیسے اپنے اللہ کا نام لے؟

عقوبت خانے میں اسے بولنے پر مجبور کیا گیا۔ "اے بولو۔ خاموش کیوں ہو؟ ادھر دیوار کو کیا تک رہے ہو؟"

وہ تکتا رہا۔ جیسے کچھ سنائی نہ دے رہا ہو اور جب سنے گا نہیں تو بولے گا کیا۔ اسے جھنجوڑا گیا۔ بار بار پٹائی کی گئی۔ مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ زبان سے جس کا پاک نام لینا چاہئے وہ لے نہیں سکتا تھا۔ پیدا ہونے کے بعد کانوں نے اذان میں "اللہ اکبر" سنا تھا۔ عقوبت خانے میں گٹر بننے سے پہلے وہ اللہ اکبر کہا کرتا تھا مگر اب وہ پہلے والی طہارت، پاکیزگی نہیں رہی تھی۔ اس لئے زبان بند ہو گئی تھی۔ وہ اپنی زبان سے ایک ہی فقرہ ادا کرتے وقت آسمان کی سمت انگلی اٹھاتا تھا۔ "آہ۔ میں اس کا نام کیسے لوں؟"

وہ اسمِ اعظم گلوں کی خوشبو میں تھا۔ بلبلوں کی چہکار میں تھا مگر اس کے گلے میں نہیں تھا۔ اسے لاہور لے جاتے وقت گاڑی کے اندر آرام سے بستر پر لٹا کر اس سے کہا گیا۔ "کچھ نہ بولو۔ اپنا نام تو بولو۔"

وہ اپنا نام کیسے بولتا؟ خیرالدین کے معنی ہیں دین ایمان کی خیر، سلامتی، پائیداری، لیکن یہ سب کچھ کہاں رہا تھا؟ اس نے نام پوچھنے والے کو ایسے دیکھا جیسے کسی پاگل کو دیکھ رہا ہو۔

وہ لوگ گاڑی کے پچھلے حصے میں اتر کر اس کے بستر کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے ساتھی سے کہا۔ "یار! ان ٹارچر سیل والوں نے یقین سے کہا تھا کہ یہ پاگل ہو چکا ہے اور تم پاگل سے نام پوچھ رہے ہو۔"

پھر اس نے شاہ سے پوچھا۔ "نام سمجھتے ہو نا؟"

وہ گاڑی کی چھت کو تکتے ہوئے بولا۔ "نام تو بس ایک ہی ہے مگر میں کیسے لوں؟"

"اچھا تو یہی بتا دے تُو ابھی کہاں سے آ رہا ہے؟"

وہ چھت کو تک رہا تھا مگر انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔ "وہاں سے۔ سب اسی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف جائیں گے۔"

ایک نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ یہ ابھی کہاں سے آیا ہے؟"

اس کے ساتھی نے جواب دیا۔ "بہت ضروری ہے۔ یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اسے وہ جگہ اور ٹارچر سیل جیسا نام یاد ہے یا نہیں؟"

"بھئی، یہ سو فیصد پاگل ہو چکا ہے۔ اگر اس کے پاگل ہونے میں شبہ ہے تو پھر اسے مجذوب سمجھو۔ جب کوئی ساری دنیا سے بے خبر ہو جائے اور اس کی توجہ ایک ہی مرکز پر ٹھہر جائے اور وہ صرف آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر ہر سوال کا ناقابلِ فہم جواب دے تو سمجھو، وہ زمین کو بھول چکا ہے اور صرف آسمان اسے دکھائی دیتا ہے۔ یہ جو بار بار انگلی اٹھا رہا ہے تو سمجھو اوپر جانے کی بات کر رہا ہے۔"

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔ اُدھر دونوں سیاسی پارٹیوں کو رپورٹ مل چکی تھی کہ خیرالدین شاہ پاگل ہو گیا ہے اور شادو بھی اپنے حواس میں نہیں رہتی ہے۔ وہ پارٹیاں اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ شادو اور شاہ کو ایک جگہ قید رکھا جائے۔ وہ دونوں تنہا رہیں گے تو شاید تنہائی میں ہوشمندی کی باتیں کریں اور اگر واقعی وقتی طور پر ٹارچر کے باعث ان کے ذہنوں کو شاک پہنچا ہے اور وہ وقتی طور پر پاگل ہوئے ہیں تو ایک دوسرے کی قربت سے رفتہ رفتہ نارمل ہو جائیں گے۔ پھر ان چابیوں اور تصاویر کی باتیں ضرور کریں گے۔

اُن کے لئے شہر سے بہت دور ایک کوٹھی کا انتظام کیا گیا تھا اور یہ طے پایا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے پندرہ پندرہ مسلح بندے وہاں باری باری پہرہ دیں گے۔ انتظامات ایسے تھے کہ شادو اور شاہ تنہائی میں جو بھی باتیں کرتے وہ سب دوسری جگہ ریکارڈ ہوتی رہتیں۔ ان مطلوبہ چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلی جا رہی تھیں اور اس مقصد کے لئے خیرالدین شاہ کو کراچی سے واپس لایا جا رہا تھا لیکن اس کے لاہور پہنچنے سے پہلے ہی اپوزیشن کا لیڈر گوہر علی اس فیصلے سے مکر گیا کہ شادو اور شاہ کو ایک ساتھ رکھا جائے۔ اس نے کہا۔ "اگر ان دونوں کے یکجا رہنے سے اس جگہ کا علم ہو جائے

گا جہاں وہ مطلوبہ چیزیں ہیں تو اپوزیشن کے وہاں پہنچنے سے پہلے حکمران پارٹی اس علاقے
میں عارضی کرفیو لگا دے گی۔ پولیس اور انتظامیہ کے ذریعے اپوزیشن کے کسی بندے
اس مکان میں تو کیا اس علاقے میں گھسنے نہیں دے گی۔ آخر میں یہ سمجھوتا اپوزیشن
نقصان پہنچائے گا۔"

حکمران پارٹی والے جھنجلا گئے تھے۔ ایک تو گوہر علی پریشان کر رہا تھا۔ دوسرے
طبی رپورٹ آگئی تھی کہ زمیندار ملک نعیم کے خون میں ایڈز کے جراثیم پائے گئے تھے
یہ تو ان چاروں کے جوان بچوں کے لئے موت کی اطلاع تھی۔ وہ مرض زمیندار کو بلو
لگا ہو گا یا بلو کو زمیندار سے ملا ہو گا اور شادو اسے ورثے میں لے کر ان چاروں مشغلہ باز
نواز جوانوں کی کوٹھی میں پہنچی تھی۔ اب کیا کیا جا سکتا تھا؟ اپنی اولادوں کو اور اپنے خاندان
کو اور اپنے سیاسی کیریئر کو بچانے کے لئے انہوں نے شاہ جیسے مومن پر ظلم و ستم کی انتہا
کرا دی تھی۔ اس کے روحانی سرمائے "پاکیزگی" کو اس سے چھین کر اس کے اندر ناپاکی
انڈیل دی تھی۔ مگر ایڈز کا مرض ان کی اولاد کو جھنڈی دکھا رہا تھا۔ ٹرین آخری اسٹیشن کی
طرف چل پڑی تھی اور ان سب کے پاس ایسے سیاسی بے لگام اختیارات نہیں تھے کہ اپنی
اولاد کو موت سے بچا لیتے۔

رب نواز نے غصے میں آ کر زمیندار ملک نعیم کو ایک لات ماری۔ پھر پولیس کے
اعلیٰ افسر سے کہا۔ "اسے لے جا کر اندر کرو۔ اس نے زرعی قرضوں کے فارم میں تمام
کسانوں سے انگوٹھے لگوائے ہیں۔ دستخط کرائے ہیں۔ اِس کے خلاف مقدمہ قائم کرو کہ
اس نے جاہل گنوار کسانوں کو ملنے والے مجموعی لاکھوں روپے زرعی بینک سے وصول کئے
اور خود ہی خرچ کر ڈالے۔ اسے ایسی سزا دلاؤ اور ایسی پٹائی کرتے رہو کہ اس کی لاش ہی
جیل سے باہر آئے۔"

زمیندار رونے لگا اور گڑگڑانے لگا مگر دو سپاہی اسے کھینچ کر وہاں سے لے گئے۔
اس زمیندار کو تو بیماری یوں ہی اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ اس کے خلاف انتقامی کارروائی
محض نادانی تھی۔ ان سب کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ جوانوں کے مشاغل نے شادو کو
کوٹھی میں لا کر جو بویا تھا' اسے اب کاٹ رہے تھے۔ قدرت کی طرف سے ملنے والی
سزائیں انسان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ وہ ایسی سزاؤں کو اعمال کا نتیجہ نہیں' محض تقدیر
کی گردش سمجھتے ہیں۔

انہوں نے حکم دیا کہ ابھی خیرالدین شاہ کو اسی گاڑی میں رکھا جائے۔ دو چار گھنٹے بعد
جب موبائل فون پر حکم دیا جائے تو خیرالدین شاہ کو رہا کر دیا جائے۔ یہ حکم دے کر انہوں

اپنے چند پالتو صحافیوں کو بلایا۔ انہیں بڑے بڑے نوٹوں سے بھرے ہوئے لفافے دیئے
کہا "آپ لوگوں کو ایک گاڑی دی جا رہی ہے۔ اس کے شیشے کلرڈ ہیں۔ باہر والوں کو
ر بیٹھے ہوئے لوگ نظر نہیں آتے ہیں۔ آپ اس گاڑی میں صحافی خیرالدین شاہ کو
آئیں گے تاکہ غیر جانبدار صحافی اور اپوزیشن کے بندے اس شاہ کو نہ دیکھ سکیں۔ وہ
بنت ایماندار صحافی شاید پاگل ہو گیا ہے یا پھر خوامخواہ پاگل بن رہا ہے۔ آپ حضرات
ہمدردی کریں گے اور اس کی تائید کریں گے کہ جتنی شرمناک تصویریں اور
کیسٹس ہیں' ان سب کو فوراً جلا دیا جائے تاکہ آنکھوں کی شرم اور ضمیر کی پاکیزگی
قرار رہے۔ وہ خیرالدین شاہ یہی چاہتا ہے۔ آپ کی باتوں میں آ کر وہ آپ کو ان مطلوبہ
وں تک ضرور پہنچائے گا۔ اس کے بعد ہمارے خفیہ جاسوس اس سے نمٹ لیں گے اور
پ حضرات کا کام ختم ہو جائے گا۔ جب ہم وہ سب کچھ جلا دیں گے تو آپ اپنے اپنے
بارات کے ذریعے یہ دعوے کر سکیں گے کہ آپ جیسے معتبر صحافیوں نے بڑی تلاش کے
خیرالدین شاہ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ آپ حضرات دونوں طرف سے فائدے میں رہیں
ے۔"

اس ملک میں جتنی حکومتیں آئیں۔ انہوں نے یہ دعوے کئے کہ ان کے پاس
عنوان صحافیوں کی فہرست ہے لیکن کسی حکومت نے ایسے کسی صحافی کا نام ظاہر نہیں کیا۔
ا کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی بھی صحافی بدعنوان نہیں ہے یا پھر ہر
مت کو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ حزبِ اختلاف بھی حکومت کے مراعات یافتہ صحافیوں کو
بے نقاب کر دے گی۔

دوسری طرف گوہر علی نے بھی کچھ ایسی ہی چال چلنے کا ارادہ کیا۔ اس نے اپنے
ڈوں سے کہا۔ "شادو کو کلرڈ شیشے والی گاڑی میں بٹھا کر لاہور کے ایک ایک محلے اور
یوں میں جاؤ۔ وہ اپنے حواس میں نہیں رہتی ہے۔ اس کے دماغ میں خیرالدین شاہ کی یہ
ت ٹھونستے رہو کہ تم لوگوں کو شاہ ملا تھا۔ اس نے کہا ہے جب شادو ان شرمناک چیزوں
جلا دے گی تو پھر وہ اپنی شادو سے آ کر ملے گا۔ اس نیم پاگل عورت کو کسی طرح شیشے
ا اتارو۔"

تمام سیاسی چالیں تقریباً ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مگر حالات کے مطابق چالیں چلنے کے
ریقے مختلف ہو جاتے ہیں۔ موجودہ حالات میں دونوں سیاسی پارٹیوں کے سامنے یہی راستہ
گیا تھا کہ شادو اور شاہ کے پاگل پن یا نیم پاگل پن سے فائدہ اٹھا کر اس مکان تک پہنچا
ئے جو نہ معلوم کس محلے اور کس گلی میں تھا۔ وہ دونوں ہی اس کی نشاندہی کر سکتے تھے۔

دونوں پارٹیوں کے لیڈروں نے اپنے لوگوں کو سختی سے تاکید کی تھی کہ
صحافی ملک جاوید حیات اور رانا حمید جیسے جتنے غیر جانبدار' سچے اور معتبر صحافی ہیں
نظروں میں شادو اور شاہ کو نہ آنے دیا جائے۔ اسی لئے ان دونوں کو کلرڈ شیشوں
گاڑیوں میں بٹھایا جانے والا تھا۔

کراچی سے آنے والوں نے خیرالدین شاہ کو کوٹ لکھپت کے ایک
اتارا۔ پھر گاڑی لے کر چلے گئے۔ خیرالدین شاہ نے اس شہر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ
اس شہر میں اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور ایک معتبر اور نیک نام صحافی کی حیثیت
بڑی مقبولیت حاصل کی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑا بے حد کمزوری کے باعث
تھا۔ اس میں زیادہ دور پیدل چلنے کا بھی حوصلہ نہیں رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک گا
کے قریب آ کر رک گئی۔ اس کے دروازے کھلے پھر تین صحافیوں نے نکل کر
قریب آ کر اسے تھام لیا۔ ایک نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ.......... شاہ صاحب
یہاں اس حال میں ہیں؟"

دوسرے نے کہا۔ "انہیں تو بخار ہے اور ذرا دیکھو' جسم پر زخم ہی زخم نظر
ہیں۔"

وہ شاہ کو سہارا دے کر پچھلی سیٹ پر لے آئے۔ ایک نے کہا "انہیں فوراً
لے چلو۔ پتا نہیں کن ظالموں نے ان کا یہ حال کیا ہے؟ کراچی شہر اب انسانوں
درندوں کا شہر بن گیا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "بات صرف کراچی شہر کی نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے
ٹھوس ثبوت ہیں' ان کے پیشِ نظر کیا لاہور کی سیاسی پارٹی کا لیڈر برداشت کرے
نہیں' وہ بھی شاہ صاحب کو منظرِ عام پر دیکھنا نہیں چاہے گا اور نہ ہی یہ برداشت
کہ شاہ صاحب کوئی بیان دیں۔"

تیسرے نے کہا۔ "پھر تو ہم انہیں کسی اسپتال میں نہیں لے جائیں گے۔
چھپا کر اپنے چند قابلِ اعتماد ڈاکٹروں سے ان کا علاج کرائیں گے۔ لاہور میں
جانبدار معتبر صحافی ہیں اور شاہ صاحب کا احترام کرتے ہیں' پہلے ان کے سامنے
سے شاہ صاحب کا بیان لیا جائے گا اور تصویریں اتاری جائیں گی۔"

انہوں نے ڈرائیور سے کہا کہ راستہ بدل دے اور شاہدرہ کی طرف چلے۔
نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ پھر گاڑی کو نہر کے ایک پل کی طرف موڑ لیا۔

☆========☆========☆

رب نواز کے ڈرائنگ روم میں عظیم پاشا اور دوسرے اہم سیاسی لوگ بیٹھے ہوئے
انہیں پورا یقین تھا کہ ان کے روانہ کردہ صحافی حضرات خیرالدین شاہ کو شرم اور
کا حوالہ دے کر مطلوبہ چیزوں تک لے جائیں گے۔ وہ انتظار کر رہے تھے۔ اسی
فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رب نواز نے اسپیکر اٹھا کر کہا۔ "ہیلو' میں بول رہا ہوں۔"
دوسری طرف سے آواز آئی۔ "جناب عالی! میں صحافی قمرالدین بول رہا ہوں۔ ہم
لکھپت کے ریلوے گیٹ کے پاس آدھے گھنٹے سے کھڑے ہیں۔ وہ کراچی والے
شاہ کو لے کر نہیں آئے ہیں۔"

رب نواز نے کہا۔ "کیا فضول باتیں کرتے ہو۔ تقریباً پون گھنٹا پہلے مجھے فون پر بتایا
ہے کہ انہوں نے خیرالدین کو ٹھیک اسی جگہ سڑک کے کنارے اتار دیا تھا تم لوگ دیر
پہنچے ہو؟"

"جناب عالی! راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ پھر وہ درست ہوئی تو ٹریفک
سے نکلنا دشوار ہو گیا تھا۔"

وہ گرج کر بولا۔ "باتیں بنانے میں وقت ضائع نہ کرو۔ شاہ پاگل ہے وہ آس پاس
بھٹک رہا ہو گا۔ اسے تلاش کرو۔ اگر وہ اپوزیشن والوں کے ہاتھ لگے گا تو مجھ سے برا
نہیں ہو گا۔ اسے فوراً تلاش کرو۔"

وہ ریسیور کو ایک طرف غصے سے پھینک کر اپنی سیاسی پارٹی کے اہم ساتھیوں سے
"یہ سب کتے ہیں۔ ان کے سامنے ہڈیاں بوٹیاں پھینکتے رہو تو دم ہلاتے ہیں۔ مگر کام
کے بجائے بگاڑتے رہتے ہیں۔"

عظیم پاشا نے پوچھا۔ "کیا شاہ کہیں گم ہو گیا ہے؟"

"ہاں۔ ہماری شامت آ رہی ہے۔ مصیبت پر مصیبت آ رہی ہے۔ ہماری اولاد نے
کارنامے کئے ہیں کہ انہیں طبعی عمر سے پہلے مرنا ہی مرنا ہے۔ لعنت ہے ایسی اولاد پر
وہ مرتی ہے تو مرے۔ مگر ہمارا سیاسی کیریئر خاک میں ملنے والا ہے۔"

ایک سیاسی لیڈر نے پولیس افسر کو بلا کر کہا۔ "وہ خیرالدین شاہ لاہور پہنچا ہوا ہے۔
تمام پولیس کو الرٹ کر دو۔ تمام تھانے داروں سے کہو کہ سارے کام چھوڑ کر اس
شاہ کو تلاش کریں اور یہ تلاش اتنی رازداری سے ہو کہ اپوزیشن والوں کو خبر نہ
"

افسر سلیوٹ کر کے جانے لگا۔ رب نواز نے کہا۔ "اور سنو۔ وہ پاگل ہے' بیمار لگتا
اس کے جسم پر زخموں کے نشانات ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس پر ترس

کھا کر اسے کسی اسپتال میں پہنچا دیں۔ لہٰذا شہر کے ہر چھوٹے بڑے اسپتال اور کلینک وغیرہ میں جا کر دیکھو۔ وہ ہمارے ہاتھ نہ لگا تو میں تمہاری وردی اتروا دوں گا
افسر دوبارہ سلیوٹ کر کے چلا گیا۔ دوسری سیاسی پارٹی کا قصہ یہ تھا کہ شادو ا
شیشوں والی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ درندوں نے اسے نوچ کھسوٹ کر اس بیمار اور کمزور بنا دیا تھا کہ وہ بھی ڈگمگاتی ہوئی اور لنگڑاتی ہوئی چلتی تھی۔ اس گا اس کے آس پاس مسلح غنڈے بیٹھے تھے۔ اسے سمجھا رہے تھے کہ خیرالدین شاہ چھپا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ شادو چابیاں لے جا کر وہ شرمناک چیزیں جلا ڈالے گی شادو سے آ کر ملے گا۔

ایک غنڈے نے ایک علاقے سے گزرتے ہوئے کہا۔ "شادو! یہ جگہ دیکھ مکان اسی علاقے کی کسی گلی میں ہے؟"

شادو کلرڈ شیشے کے پار اس علاقے کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ گاڑی رک تھی۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی' جس میں مسلح افراد کے ساتھ ماہرین بیٹھے تھے' جو مضبوط ترین اور مشکل سے مشکل تالوں کو کھول سکتے تھے۔

منصوبہ یہ تھا کہ شادو جس مقفل مکان کے پاس جائے گی' وہاں سے شادو کو کر واپس گاڑی میں بٹھایا جائے گا پھر تالا کھولنے والا ایک ماہر وہاں جا کر اس مقفل کے قفل کو اپنے ہنر سے کھولے گا۔ ایسے وقت محلے والے گڑبڑ کریں گے تو پیچھ کے مسلح افراد پولیس کی وردی میں تھے۔ وہ معاملہ رفع دفع کریں گے اور محلے سمجھائیں گے کہ ایک مجرم کی تلاش میں ایسا کیا جا رہا ہے۔ مقفل مکان کی تلاش مجرم کی موجودگی کے آثار نہیں ملیں گے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں وہ تصاویر ا کیسٹس نہیں ملیں گے تو وہ وہاں سے واپس آ کر شادو کو کسی دوسرے علاقے جائیں گے اس طرح امید تھی کہ کسی نہ کسی مقفل مکان سے وہ مطلوبہ چیز ہو جائیں گی۔

ایک مسلح شخص نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تاکہ شادو اس مخصوص علاقے کر جا سکے۔ وہ گاڑی سے اتر گئی پھر ڈگمگاتی ہوئی' لنگڑاتی ہوئی ایک گلی میں جا ایک شخص نے اسے چلتے وقت سہارا دیا ہوا تھا۔ اگر کوئی پوچھتا تو وہ کہتا "یہ میری ہے۔ آگے پھوپھی' ماموں یا تایا کے گھر جا رہا ہوں۔"

ویسے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ لوگ سوالیہ نظروں سے دیکھ کر گز شادو اس گلی سے گزرتی رہی۔ وہاں کوئی مقفل مکان نہیں تھا۔ دوسری گلی کے

پر تالا پڑا ہوا تھا۔ وہ اس بند دروازے کے سامنے تھکے ہوئے انداز میں بیٹھنے لگی۔ اسے سہارا دینے والے نے کہا "میری پیاری بہنا! یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔ وہ دیکھو' ہماری گاڑی گلی میں آ رہی ہے چلو اس میں بیٹھو۔"

گاڑی قریب آ گئی۔ اس میں شادو کو بٹھا دیا گیا۔ پھر ڈرائیور گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے تیسری گلی سے گھما کر سڑک پر آ گیا۔ ایک تالا کھولنے والا ہنرمند اس دروازے کے پاس پہنچ گیا جہاں شادو ٹھہرنا چاہتی تھی۔ وہ تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ سامنے والے مکان سے ایک شخص نے نکل کر تین سپاہی اور ایک افسر کو دیکھا' پھر پوچھا "جناب! یہ تالا کیوں کھول رہے ہیں؟ میں اس کا مالک ہوں۔ مجھ سے چابی مانگنا چاہیے۔"

پولیس افسر بن کر آنے والے نے پوچھا "تمہارا یہ مکان کب سے خالی ہے؟ اگر خالی نہیں ہے تو کون رہتا ہے۔ کرایہ دار کا نام کیا ہے؟"

اس شخص نے آگے بڑھ کر اپنی چابی سے تالا کھولا پھر کہا "آپ دیکھ لیں۔ مکان خالی ہے۔ ایک بھی سامان نہیں ہے' پچھلا کرایہ دار دو دن پہلے یہ مکان چھوڑ کر گیا ہے۔"

انہوں نے اندر جا کر دیکھا۔ واقعی وہاں کوئی سامان نہیں تھا۔ افسر بن کر آنے والے نے کہا "ہمیں ایک مجرم کی تلاش ہے۔ ایک مخبر نے یہاں کا پتا بتایا تھا۔ ٹھیک ہے اپنا مکان بند کر لو۔"

وہ سب وہاں سے ناکام لوٹ گئے۔ شادو گاڑی میں بیٹھی' اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ رہی تھی۔ کبھی سر کھجا رہی تھی اور کبھی ہنس رہی تھی۔ ایک مسلح شخص نے کہا "پتا نہیں گوہر علی صاحب نے کس پگلی کے ساتھ ہمیں لگا دیا ہے۔ اسے تو وہ مکان بھی یاد نہیں ہے۔"

وہ گاڑی چلتی ہوئی دوسرے علاقے میں رکی۔ شادو وہاں بھی گاڑی سے اتری اور گلیوں میں گھومنے لگی۔ اس کے ساتھ گھومنے والے پریشان ہو گئے۔ اتفاق سے وہاں کوئی مکان ایسا نہیں تھا' جس کے دروازے پر تالا پڑا ہو۔ وہ لوگ بڑبڑاتے ہوئے اسے پھر گاڑی میں لے گئے۔ پھر تیسرے علاقے میں پہنچے۔ اس بار وہ کسی گلی میں نہیں گئی۔ سڑک کے کنارے ایک مقفل دروازے کے سامنے ٹھہر گئی۔ اس دروازے پر لکھا ہوا تھا "یہ ٹائلٹ قابل استعمال نہیں ہے' زیر مرمت ہے۔"

شادو کو سہارا دینے والے نے اسے وہاں سے اٹھا کر زیر لب کہا "پاگل کی بچی یہ کوئی مکان نہیں ہے۔ چل یہاں سے۔"

اسے لے کر پھرنے والوں میں ایک کے پاس موبائل فون تھا۔ وہ برابر گوہر علی سے

رابطہ کر رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ شادو کی دماغی حالت سچ مچ درست نہیں ہے۔ وہ ج
مکان کے دروازے پر تالا دیکھتی ہے۔ وہاں بیٹھ جاتی ہے۔

گوہر علی نے کہا ”دماغی حالت درست نہ ہونے کے باوجود مقفل دروازہ اس کے
ذہن میں نقش ہے۔ اسے ایسی حرکتیں کرنے دو۔ وہ جلد ہی اس طرح ہمیں مطلوبہ مکا
تک پہنچا دے گی۔“

وہ لوگ حکم کی تعمیل کرنے لگے اور شادو کو گاڑی میں لیے شہر کے ایک ایک م
میں جانے لگے۔

☆=========☆=========☆

صحافی رانا حمید کا مکان خالی تھا۔ اس کی بیوی اپنے بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی
تھی۔ اس لئے رانا حمید، ملک جاوید اور صحافی شمس الزماں نے خیرالدین شاہ کو اس مکا
میں رکھا۔ ایک نے ڈاکٹر کو بلایا۔ دوسرے نے تمام معتبر صحافیوں کو فون پر رانا حمید کے
مکان میں آنے کے لئے کہا۔ تیسرے نے شاہ کو آرام سے بستر پر لٹانے کے بعد پوچھا۔ ”کیا
تم ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتانے کے قابل ہو؟“

خیرالدین شاہ چاروں شانے چت پڑا چھت کو تک رہا تھا۔ اُس نے آسمان کی طرف
کلمے کی انگلی اٹھا کر کہا۔ ”آہ! میں اس کا نام کیسے لوں؟“

ملک جاوید حیات نے انگلی کے اشارے کو کسی حد تک سمجھا پھر بھی وضاحت کے
لئے پوچھا۔ ”تم کس کا نام لینا چاہتے ہو؟“

شاہ نے پھر انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ملک جاوید حیات نے پوچھا۔ ”کیا
اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی بات کر رہے ہو؟ بھلا خداوند کریم کا نام لینے کے لئے پوچھنے کی
ضرورت ہے؟ کیا ہمیں ہمارے خدا کا نام لینے سے کوئی روک سکتا ہے؟“

اُس نے ہاں کے انداز میں جواب دیا۔ پھر اپنا ایک ہاتھ حلق پر رکھا اور اس ہاتھ
آہستہ آہستہ اپنے دل کی طرف لایا۔ اس کے بعد کہا۔ ”یہ حلق سے قلب تک گٹر ہو
ہے۔ میرے پورے وجود کے اندر گندگی بھری ہوئی ہے۔ میں اس کا نام کیسے لوں؟“

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نک
پڑے تھے۔ ملک جاوید حیات نے اسے آواز دی مگر اس نے آنکھ نہیں کھولی۔ اس کا
بخار سے تپنے لگا تھا۔ زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس پر نیم بے ہوشی کی سی حال
طاری ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر نے آکر معائنہ کیا پھر کہا۔ ”اسے بری طرح اذیتیں پہنچائی گئی ہیں۔ یہ پولی

کیس ہے۔ آپ تمام صحافی حضرات قانون کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔“

وہاں ایک ایک کر کے صحافی اور فوٹو گرافر پہنچ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”ہم یہ بھی
سمجھتے ہیں کہ قانون کے محافظ کس طرح قانون سے کھیلتے ہیں۔ ہم تمام صحافیوں کی ضمانت
پر آپ شاہ صاحب کا علاج کریں۔ ہم آپ کو کسی مسئلے میں نہیں الجھائیں گے۔“

ڈاکٹر نے علاج کیا۔ انجکشن لگایا۔ کھانے پینے کے لئے دوائیں دیں۔ خیرالدین شاہ
نے آنکھیں کھول کر اپنے صحافی دوستوں کی بھیڑ دیکھی۔ ایک صحافی نے کہا۔ ”شاہ
صاحب! آپ کی طرح ہم بھی غیر جانبدار ہو کر سچ لکھتے ہیں لیکن آپ سچ کو چھپا کر خود اپنی
جان کے دشمن بن رہے ہیں۔“

ملک جاوید حیات نے کہا۔ ”اس موضوع پر میری شاہ صاحب سے بہت پہلے بحث ہو
چکی ہے اور میں نے یہاں آپ جیسے کتنے ہی ساتھیوں کو بتایا ہے کہ شاہ صاحب آنکھوں کی
شرم رکھیں گے۔ ایسے مناظر کسی کو نہیں دیکھنے دیں گے جسے دیکھنے سے شیطان ورغلاتا
ہے، یا اپنے اندر ہیجان پیدا ہوتا ہے۔“

”ہم شاہ صاحب کے اس ایمانی جذبے کو سمجھتے ہیں لیکن اس طرح ظالموں کو چھوٹ
ملے گی۔“

”ظالموں کو کب چھوٹ نہیں مل رہی ہے۔ وہ ہر معاملے میں بے لگام ہیں لیکن
ویڈیو کیسٹس میں نظر آنے والی وہ عورتیں جو اب شریفانہ گھریلو زندگی گزار رہی ہیں،
انہیں اب پردے میں رکھنا چاہئے۔ شاہ صاحب ان تمام شرمناک چیزوں کو جلا ڈالنا چاہتے
تھے مگر شادو نے ایسا کرنے نہیں دیا۔ پتا نہیں اب وہ بے چاری بھی کہاں گم ہو گئی ہے۔
بعض اوقات شرم، شرافت اور ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ایسی ہی آزمائشوں
سے گزرنا پڑتا ہے، جن سے یہ ہمارے شاہ صاحب گزر رہے ہیں۔“

رانا حمید نے دوا کی بوتل کھولتے ہوئے کہا۔ ”شاہ صاحب! یہ دوا پئیں۔ ذرا جلدی
سے صحت یاب ہو کر انہیں اپنی روداد سنائیں۔“

شاہ نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”دوا رہنے دو۔ میں تو کچھ کھانا پینا اور حلق سے اتارنا
ہی نہیں چاہتا تھا مگر وہ لوگ مجھے جکڑ لیتے تھے اور ناک بند کر دیتے تھے۔ میں سانس لینے
کے لئے منہ کھولتا تھا تو وہ مجھے رقیق مادے کی صورت میں دودھ اور جوس وغیرہ پلا دیتے
تھے۔ مگر اب ایسا نہیں ہو گا۔ تم سب میرے دوست ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

”لیکن یہ کیا ضد ہے؟ تم کوئی چیز اپنے حلق سے اتارنا کیوں نہیں چاہتے؟“

وہ تھوڑی دیر چپ رہا پھر کہا۔ ”ظلم کی انتہا یہ کہ مظلوم زندہ رہے اور ہر لمحہ مرتا

رہے۔ اگر کوئی تمہیں پانی پیش کرے اور ادب سے کہے کہ نوش فرمائیے۔ یہ پیش آ
ہے۔"

ایک نے کہا۔ "ہاں' یہ معنوی اعتبار سے درست ہے۔ مگر کانوں کو ناگوار گز
ہے۔ پیش آب کا مطلب پانی پیش کرنا ہے۔ مگر ان دو الفاظ کی ترکیب سے پیش آب
گندگی کا احساس ہوتا ہے۔"

شاہ نے کہا۔ "ان ٹارچر کرنے والوں نے وہی گندگی جبراً میرے حلق میں ا
دی۔"

وہ تقریباً بیس صحافی تھے۔ سب کے ذہنوں کو جھٹکا سا لگا۔ کسی نے بے یقینی
پوچھا۔ "کیا سچ کہہ رہے ہو؟"

کسی نے کہا۔ "کیا ہمارے شاہ صاحب نے کبھی جھوٹ کہا ہے اور وہ بھی ا
گھناؤنی بات؟"

کتنے ہی ساتھیوں نے صدمے اور کراہت سے اپنے چہروں کو دونوں ہاتھوں
چھپا لیا۔ رانا حمید بڑے مضبوط دل کا آدمی تھا۔ وہ شاہ کے دونوں پاؤں پکڑ کر رونے لگ
ان صحافیوں میں دو خواتین تھیں' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ ایک رو رو کر ک
رہی تھی۔ "یہ ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ اسلامی ملک ہے۔ میں ابھی اپنے بچے
اپنا دودھ پلا کر آ رہی ہوں۔ مگر شاہ صاحب کو کیا پلایا گیا ہے؟"

ایک نے کہا۔ "جو کچھ ہوا ہے ہم حالات کا مقابلہ کریں گے مگر ابھی شاہ کو دوا پلا
ضروری ہے۔"

وہ سب لوگ شاہ کو سمجھانے لگے مگر وہ انکار کر رہا تھا۔ صرف دوا سے ہی نہیں
کسی بھی چیز کو حلق سے اتارنے پر راضی نہیں تھا۔ ایک نے کہا۔ "شاہ صاحب! ہم آپ
کو ہر حال میں زندہ رکھیں گے۔ آپ کو عوام کے سامنے پیش کر کے ایمان اور انصاف
برقرار رکھیں گے۔"

شاہ نے کہا۔ "میرے حلق سے کوئی چیز اترتی ہے تو زہر لگتی ہے۔ مجھے زہر نہ پلاؤ
دوست ہو' دوست بن کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

مگر وہ تمام ساتھی چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ظالموں سے ظلم کا حساب لینے
لئے انہوں نے بھی جبر کیا۔ اسے ہر طرف سے جکڑ لیا۔ اس کی ناک بند کر کے ا
دوائیں کھانے پینے پر مجبور کر دیا۔ پھر اسے آزاد چھوڑ دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک گہر
سانسیں لیتا رہا پھر بولا۔ "تم سب اپنی مرضی سے دوائیں اور غذائیں اس گٹر میں ڈال

ہو مگر اس غلاظت سے جبراً اس کا نام کیسے نکال سکتے ہو؟ آہ! میں اس کا نام کیسے لوں؟"

چند صحافی ایک جگہ بیٹھ کر مشورے کرنے لگے۔ رانا حمید نے کہا۔ "ہم شاہ صاحب
کو برسوں سے جانتے ہیں۔ وہ صرف ظاہری نہیں' باطنی پاکیزگی کے قائل ہیں اور ہمیشہ
کہتے ہیں' جب تک انسان کا ظاہر اور باطن پاک نہ ہو' طہارت مکمل نہیں ہوتی۔"

ایک نے کہا۔ "پاک صاف رہنے کے اصول ہیں۔ غسل کے ذریعے جسم کے ہر حصے
کو اچھی طرح صاف کیا جاتا ہے۔ وضو کرتے وقت دانت مسوڑھے صاف کئے جاتے ہیں۔
کُلی کی جاتی ہے۔ غرغرہ کر کے حلق صاف کیا جاتا ہے اور کسی ایسی چیز کو کھایا پیا نہیں جاتا'
جسے دینِ اسلام نے منع کیا ہو۔ اس طرح انسان اندر سے بھی پاک صاف رہتا ہے۔ شاہ
صاحب کے ساتھ ایک ظلم ہوا' اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟"

"تلافی کیسے ہو گی؟"

"انہیں سمجھانا چاہئے' وہ خود بھی سمجھتے ہوں گے کہ اسلام میں پاک صاف رہنے
کے جتنے طریقے ہیں ان پر عمل کیا جائے تو ایک بار مزاج کے خلاف جبراً گندگی ہو گئی ہے'
وہ دھل سکتی ہے۔ دانت' مسوڑھے' زبان' حلق اور قلب دوبارہ پاک ہو سکتے ہیں۔"

ملک جاوید حیات نے کہا۔ "ہم آج ہی ایک بڑے عالم دین کو لائیں گے۔ وہ پاکی اور
ناپاکی کے سلسلے میں فتوے دیں گے اور وضاحت سے سمجھائیں گے تو شاہ صاحب نارمل ہو
کر اللہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لینے لگیں گے۔"

وہ آپس میں مشورے کر رہے تھے۔ اپنے ملک کی سیاسی غلاظتوں کے خلاف جہاد
کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور اپنے ساتھی صحافی خیرالدین شاہ کو غلاظت اور تعفن
کے کرب سے نکالنے پر غور کر رہے تھے۔

☆==========☆==========☆

دوسرے دن کئی اخبارات نے شاہ کی تصویر کے ساتھ اس کی مختصر سی روداد بھی
شائع کی۔ رب نواز اور اس کی پارٹی ان اخبارات کو پڑھ کر تلملا گئی۔ ان کی توقع کے
خلاف صحافی خیرالدین شاہ غیر جانبدار اور معتبر صحافیوں کے محفوظ ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔
ابھی تک خیریت یہ تھی' کہ شاہ کے کیس کے سلسلے میں چار عیاش جوانوں اور ان کے'
سیاسی کیریئر کو بلند رکھنے والے والد وغیرہ کے بارے میں کوئی بات شائع نہیں ہوئی تھی۔

ایک بے قصور اللہ والے صحافی پر انتہائی گھناؤنا ظلم کرانے کے بعد بھی رب نواز
اور اس کی پارٹی کے لوگ تسلیم کر رہے تھے کہ خیرالدین شاہ کسی بھی عورت ذات پر کیچڑ
اچھالنے کے لئے ٹھوس ثبوت ہونے کے باوجود وہ تمام ثبوت منظر عام پر نہیں لائے گا۔

انہیں اپوزیشن لیڈر گوہر علی سے خطرہ تھا۔

اور گوہر علی اس روز کے اخبارات پڑھ کر خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ جس خیرالد
شاہ کو مخالف پارٹی نے اغوا کرایا تھا' وہ خیرالدین شاہ جانبدار اور معتبر صحافیوں کی پناہ میں پہ
گیا تھا۔ اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ حکمران پارٹی کی بڑی بڑی کمزوریاں عوام کے سا
آئیں گی۔

گوہر علی نے رانا حمید جیسے صحافیوں سے فون پر رابطہ کر کے شاہ کی حالتِ زار
افسوس کا اظہار کیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ شاہ کی حمایت کرنے اور اسے ہر طرح
تعاون کا یقین دلانے کے لئے اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ رانا حمید نے کہا۔ "ڈاکٹر
ابھی شاہ کی بیماری کے پیشِ نظر لوگوں سے ملاقات کرنے سے منع کیا ہے تاہم گوہر عل
دوسرے دن ملاقات کے لئے آ سکتا ہے۔"

یہ بڑا اچھا موقع تھا وہ خیرالدین شاہ کو حمایت میں لے کر رب نواز کے خلاف محا
قائم کر سکتا تھا۔ ایسے وقت ایک کارندے نے فون پر کہا۔ "جناب عالی! آج دوسرا دن
اور شادو ہمیں پورے شہر کی گلیوں میں گھما رہی ہے اور مقفل دروازوں کے پاس لے
رہی ہے لیکن کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی یادداشت کھ
بیٹھی ہے۔"

گوہر علی کو شاہ جیسا بڑا مہرہ ملنے والا تھا۔ اُس نے کہا۔ "شادو پر لعنت بھیجو۔ میرے
عقوبت خانے میں اس پر اتنا زیادہ ٹارچر کیا گیا ہے کہ واقعی اب وہ ہمارے کام کی نہیں رہ
ہے۔ اس سے پیچھا چھڑا لو۔ کہیں لے جا کر اسے ختم کر دو۔"

جس وقت وہ کارندہ فون پر باتیں کر رہا تھا' اس وقت شادو ایک مسلح شخص کے
ساتھ اسی گنجان آبادی کی اسی گلی میں پہنچی ہوئی تھی لیکن وہ مقفل دروازے کے قریب
نہیں گئی۔ اس سے پہلے ہی وہ پانی پینے کے بہانے ایک مکان میں گھس گئی۔ اس کے ساتھ
آنے والا باہر انتظار کرنے لگا۔

اُس مکان کے اندر ایک عورت منجی پر سو رہی تھی اور ایک بوڑھی عورت نلکے
کے پاس برتن مانجھ رہی تھی۔ شادو دبے پاؤں آنگن سے گزر کر سیڑھیاں چڑھ کر چھت
پہنچ گئی۔ لاہور کے بیشتر محلوں میں ایک چھت دوسری چھت سے ملی ہوئی ہے اور ان کی
منڈیریں اتنی نیچی ہوتی ہیں کہ ایک چھت سے دوسری چھت پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اس
طرح وہ نورے کے مقفل مکان کی چھت پر پہنچ گئی۔ پھر سیڑھیوں سے اتر کر اس مکان
کے آنگن میں آ گئی۔ دروازے پر تالا تھا۔ وہ چھت پر سے ایک بڑا پتھر اٹھا کر لے آئی

تھی۔ اس پتھر سے تالے پر ضربیں لگانے لگی۔

تھوڑی دیر محنت کرتے رہنے کے بعد وہ تالا ٹوٹ گیا۔ وہ پچھلے ہی دن سے ایک
ماچس کی ڈبیا گریبان کے اندر چھپائے کلرڈ شیشوں والی گاڑی میں گھومتی رہی تھی اور ہر
ممکن طریقے سے خود کو پاگل ثابت کر رہی تھی۔ اس نے پہلے ڈارک روم سے تمام تصاویر
نکال کر جلائیں پھر الماری سے ایک ایک ویڈیو کیسٹ نکال کر جلانے لگی۔ اس مکان کے
اندر اگرچہ آگ محدود تھی مگر رہ رہ کر اس طرح بھڑک رہی تھی کہ اس کی روشنی اور
دھواں باہر گلی تک جانے لگا تھا۔

پھر گلی میں شور اٹھا کہ ایک عرصے سے مقفل رہنے والے مکان کے اندر آگ جل
رہی ہے۔ باہر آنے والا دھواں بھی یہی ثابت کر رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے
کہ تالا توڑ کر اندر جانا اور آگ بجھانا چاہئے لیکن وہ اس بات سے بھی ڈر رہے تھے کہ
پرانے مکان کا تالا توڑ کر اندر جانے سے چوری کا الزام نہ لگے اور پولیس کیس نہ بن
جائے لیکن گوہر علی کے جو کارندے پولیس کی وردی میں آئے تھے' انہوں نے باہر کا تالا
توڑ دیا۔ پھر اندر گھستے چلے آئے۔ وہاں پہنچ کر شادو کو دیکھتے ہی ٹھٹک گئے۔

وہ آگ کے لپکتے شعلوں کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ تمام تصاویر اور ویڈیو کیسٹس
جل کر راکھ ہو رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر بولی۔ "میرا شاہ صحافی جیوے۔ میں اس کے
نقشِ قدم پر چل کر یہاں تمام بے شرمی کو جلا چکی ہوں۔ مجھے اپنا بھی انجام معلوم ہے۔
میں نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے؟ اب اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں؟ مگر میں اس شرم والے
کو سلام کرتی ہوں' جو عورتوں کی شرم رکھنے کے لئے سیاست کی بے شرمیوں کو بے نقاب
کر چکا ہے۔"

کارندوں کو حکم مل چکا تھا کہ وہ پگلی ایک بے کار مہرہ ہے' اسے بساط سے ہٹا دیا
جائے۔ چنانچہ پولیس افسر بن کر آنے والے نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اسے گولی مار
دی۔ اُس کے حلق سے آخری چیخ نکلی پھر وہ جلتی ہوئی آگ کے پاس گر پڑی۔ وہ نقلی افسر
اپنے نقلی ساتھیوں کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا مکان سے باہر آیا پھر کلرڈ شیشوں والی گاڑی
میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس وقت تک انجان محلے والے اسے پولیس کی کوئی کارروائی سمجھ
رہے تھے۔ وہ محلے والے ہوں یا پورے ملک کے عوام ہوں۔ وہ پہلے کچھ نہیں سمجھ
پاتے۔ پھر رفتہ رفتہ سمجھتے ہیں تو کچھ کر نہیں پاتے۔

☆========☆========☆

وہ آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ بڑے سے کمرے میں کئی صحافی حضرات تھے۔ بستر کے

ایک سرے پر شہر کے بڑے معتبر اور مستند عالم دین بیٹھے تھے۔ اسے سمجھا رہے تھے۔
"برادرم! تمہارے اِن ساتھیوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم صحیح معنوں میں اللہ والے ہو۔ ایمان کی جس پختگی کے ساتھ تم طہارت اور نظافت کو اپنی زندگی میں برتتے آ رہے ہو، ہماری دعا ہے کہ ایمان کی ایسی پختگی دنیا کے ہر مسلمان میں ہو۔ جب مجھے بتایا گیا کہ تمہارے ساتھ کیسی شیطانی حرکتیں کی گئی ہیں اور کیسی گندگی نوش کرائی گئی ہے تو یہ سنتے ہی میرا سر شرم سے جھک گیا۔"

اس وقت رب نواز اور اس کی پارٹی کے دوسرے سیاست دان' شاہ کی مزاج پرسی کے لئے آئے۔ انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ ایک مکان میں شادو کو گولی مار دی گئی ہے اور وہاں تشویش پیدا کرنے والا جتنا سامان تھا' وہ سب جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ ان تمام سیاست دانوں کو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ اگرچہ ان کے جوان بیٹے ایڈز کا شکار ہو گئے تھے اور وہ بھی شادو کی طرح طبعی عمر سے پہلے مرنے والے تھے' اِس کے باوجود یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ان بڑوں کے سیاسی کرداروں پر کوئی داغ نہیں لگے گا۔ رہی جوان بیٹوں کے مرنے کی بات تو بیٹے اور بھی پیدا ہو جائیں گے مگر اقتدار کی کرسی بار بار آسانی سے پیدا نہیں ہوتی۔

رب نواز اور اس کے بااختیار ساتھیوں نے شاہ کو دیکھا۔ اس کے زخم بھی دکھائی دیئے۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی بتا رہی تھی کہ وہ مردہ ہوتا جا رہا ہے۔ رب نواز نے ہمدردی میں کچھ کہنا چاہا' ایک صحافی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پلیز خاموش رہیں۔ عالم صاحب ہدایات فرما رہے ہیں۔"

عالم صاحب فرما رہے تھے۔ "برادرم شاہ! میں مفتی ہوں اور فتوے دینے کا حق استعمال کرتے ہوئے سمجھاتا ہوں کہ دین اسلام میں پاک و صاف رہنے کے لئے جو طریقے بتائے گئے ہیں' ان پر عمل کرو۔ غسل کے ذریعے جسم کو صاف کرو اور غرغرہ کر کے حلق کی صفائی کرو۔ وضو کا عمل مسلمان کو پاک کر دیتا ہے۔ میں اپنے علم کے مطابق کہتا ہوں کہ تمہارے حلق کی ناپاکی ختم ہو جائے گی' تم پھر پاکیزگی سے اللہ تعالیٰ جل جلالہ جل شانہ کے اسمائے پاک اپنے حلق سے اور زبان سے ادا کر سکو گے۔"

خیرالدین شاہ نے کمزور اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کا فتویٰ سر آنکھوں پر مگر میں کیا کروں؟ کھانے پینے کی ہر چیز حلق سے اتر رہی ہے مگر وہ تعفن رکھنے والا احساس ختم نہیں ہو رہا ہے۔ گلے میں ہڈی کی طرح اٹکا ہوا ہے۔"

عالم صاحب نے کہا۔ "تمہارے اندر محسوس کرنے کی قوت بہت شدید ہے۔ ایمان

والوں کے اندر ناپاکی کے باعث جو بے یقینی ہوتی ہے' اسے دوسرے سمجھ نہیں پاتے۔"

ان باتوں کے دوران اپوزیشن پارٹی کا لیڈر گوہر علی اپنے اہم سیاست دان ساتھیوں کے ساتھ آ گیا۔ اس کے حواریوں نے اسے بتا دیا تھا کہ مخالف پارٹی کے خلاف جتنے ثبوت تھے' شادو نے وہ سب جلا دیئے ہیں۔ اب وہ حکمران پارٹی کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے خلاف جو مقدمات ہیں وہ واپس لئے جائیں۔ اس کے باوجود ابھی موقع تھا۔ وہ وہاں خیرالدین شاہ اور اس کے صحافی ساتھیوں کو کس طرح اپنا حمایتی بنا کر حکمران پارٹی کے خلاف پھر ایک مضبوط محاذ قائم کر سکتا تھا۔

اس نے خیرالدین شاہ کی مردہ سی حالت دیکھ کر جذباتی انداز میں مخالفوں کے خلاف کچھ کہنا چاہا۔ ایک صحافی نے اس کے منہ کے سامنے ہاتھ لا کر کہا۔ "خاموش رہیں اور ان کی گفتگو سنیں۔"

شاہ ڈوبتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "ہاں۔ دوسرے نہیں سمجھ پاتے۔ میں چاہتا ہوں' مسلمان سمجھیں۔ ایمانی قوتِ احساس کی انتہا یہ ہے کہ حلق سے زہر اتر جاتا ہے مگر گندگی نہیں اترتی اور گندگی وہ ہوتی ہے' جس کا احساس چین نہیں لینے دیتا۔ پھر اس گندگی کی حالت میں وہ پاک نام کیسے لوں؟ آہ! میں اس کا نام کیسے لوں؟"

شاہ کی ڈوبتی ہوئی آواز اور ڈوب گئی۔ عالم صاحب مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ گئے۔ پھر صحافیوں اور سیاست دانوں کے قریب آ کر بولے۔ "پاکیزگی دراصل ایمان کی روح ہے۔"

"اور روح کیا ہے؟"

"اطبا کی اصطلاح میں روح وہ بھاپ ہے' جو دل میں پیدا ہو کر باعثِ حیات و حس و حرکت ہوتی ہے۔"

"روح کی پاکیزگی انسان کا اندرونی جوہر ہے اور وہ ایسا جوہر ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام کو کبھی کسی ناپاکی سے نہیں گزارتا۔"

وہ عالم صاحب ان سب کے درمیان سے سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔ تمام صحافی گھور گھور کر ان تمام سیاست دانوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی خونخوار نظریں پوچھ رہی تھیں کہ تم سب کون ہو؟ کیا انسان ہو؟ کیا پاکستانی ہو؟ کیا وہ مسلمان ہو جو مومنوں کو گندگی نوش کراتے ہیں؟ عقوبت خانوں میں اس حلق کی بے حرمتی کرتے ہیں' جہاں سے اسمائے پاک ادا ہوتے ہیں؟

ایک صحافی نے کہا۔ "شاہ صاحب کو دیکھو۔ یہ ٹھنڈے پڑ رہے ہیں۔"

کسی صحافی نے شاہ کی نبض تھام لی۔ کسی نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ سب مایوس ہو چکے تھے۔ آخری وقت آ گیا تھا۔ ایک نے جھک کر شاہ کو کلمے کی تلقین کی۔

مگر وہ کیسے پڑھے؟ جو اللہ کا نام ادا نہیں کر سکتا' وہ پورا کلمہ کیسے پڑھ سکتا تھا؟

ارے او خیرالدین شاہ! تُو پاکستان میں ہے یا پلید سیاست دانوں کے ملک میں ہے جہاں مسلمانوں کی زبان سے کلمہ طیبہ بھی چھین لیا جاتا ہے؟

اوئے خیر دینا! دین کی خیر ہو۔ تُو بولتا کیوں نہیں؟

کلمہ' کلام سے ہے اور وہ کلام کرنے کی سکت سے گزر چکا تھا۔

=================

گھوڑا نامہ

ایک ڈاکو زادی کا عجیب قصہ۔
اس نے اپنے خاوند کو گھوڑا بنا دیا تھا۔
پھر ان کا بچہ پیدا ہوا تو......

اگر ایک قلم کار کوئی بات محض قلم کے ذریعے کہے تو وہ بات کاغذ پر پھیلی ہوئی سیاہی ہو گی لیکن وہ قلم پکڑ کر جو کہتا ہے دل سے کہتا ہے' اس لئے اس کی بات دلوں میں اترتی جاتی ہے۔

پڑھنے والا جانچتا ہے' پرکھتا ہے کہ لکھنے والے کی ذہنی رسائی کہاں تک ہے اور وہ کتنی دور کی کوڑی لاتا ہے؟ اگر وہ لفظوں میں میٹھا بولتا ہے مگر کڑوا سمجھاتا ہے' ایک پیرائے سے دلچسپی پیدا کرتا ہے لیکن دلچسپی کے پیچھے تلخ حقائق کے نشتر چبھوتا ہے تو یقیناً وہ لکھنے کا حق ادا کرتا ہے۔

یہ لکھنا بچپن سے سکھایا جاتا ہے۔ اسکول ماسٹر کہتا ہے گائے پر مضمون لکھو۔ مستقبل میں ایک مصنف بننے والا بچہ سیدھے سادے انداز میں لکھتا ہے۔ "گائے کے چار پاؤں' دو سینگ اور دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ گائے دودھ دیتی ہے۔ دودھ سے دہی اور مکھن تیار کیا جاتا ہے.........."

پھر تحریری مشق کرنے کے لئے کہا جاتا ہے' گھوڑے پر مضمون لکھو۔ بچہ لکھتا ہے۔ "گھوڑا ایک چوپایہ ہے۔ اس کے چار پاؤں اور ایک دم ہوتی ہے۔ وہ گائے کی طرح دودھ نہیں دیتا لیکن سواری اور باربرداری کے کام آتا ہے۔"

پھر وہی بچہ پاکستان بننے کے پینتالیس سال بعد لکھتا ہے۔ گھوڑا چوپایہ نہیں دوپایہ ہوتا ہے کبھی اس کی دُم رہی ہو گی لیکن ڈارون کی تھیوری کے مطابق صدیوں کی تراش خراش نے جس طرح بندر کو آدمی بنا دیا' اسی طرح سیاسی ضروریات نے گھوڑے کی دُم کاٹ دی اور اسے دو پیروں پر سیدھا کھڑا کر دیا۔

گھوڑا بے انتہا طاقتور ہوتا ہے۔ بڑی بڑی گاڑیوں اور مشینوں کے انجنوں کو ہارس پاور کے حوالے سے سمجھایا جاتا ہے کہ فلاں گاڑی کا انجن دس ہارس پاور کا اور فلاں مشین کا انجن پچیس ہارس پاور کا حامل ہے۔ ابھی تک یہ سروے نہیں کیا گیا کہ بڑے ممالک کتنے ہارس خریدنے کے بعد کتنے ہارس پاور کے حامل ہو کر سپر پاور کہلاتے ہیں۔

پاکستان کے گھوڑے ذرا کم فہم ہوتے ہیں۔ اپنی طاقت کا محدود اندازہ کرتے ہیں اور

خریدار کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اس کی طاقت بڑھا دیتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں گھوڑوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ میدانِ جنگ میں سپاہی ہتھیار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ گھوڑے کبھی نہیں بھاگتے تھے۔ جب تک ان کی لگامیں نہ موڑی جائیں۔ کار اور ہوائی جہازوں سے پہلے دنیا میں جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں' وہ گھوڑوں کی ثابت قدمی اور جی داری سے لڑی گئیں۔ تاریخ میں جتنے عظیم فاتح اور حکمران گزرے ہیں' انہیں گھوڑوں نے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر میدانِ جنگ سے گزار کر اقتدار کی مسند پر پہنچایا ہے۔

یہ باتیں سننے والے "واہ وا" کہہ کر سر دھننے لگے۔ ایک اخباری رپورٹر نے کہا۔ "مس آرزو! آپ کی باتوں میں طنز بھی ہے اور مزاح کی چاشنی بھی لیکن ہمارے یہ غیر ملکی مہمان چار پاؤں والے گھوڑوں کو دیکھنے آئے ہیں۔"

ایک انگریز نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ہنری سلاپر ہے۔ ہمارے بابا نے بتایا ہے کہ تمہیں دنیا کے بہترین' صحت مند' تیز رفتار اور مہنگے گھوڑے پالنے کا شوق ہے۔ میرا بھی یہی شوق ہے۔"

آرزو جہاں نے ہنری سلاپر کے مصافحے کے لئے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا پھر اپنا ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔ "سوری! جب میں کسی پالتو گھوڑے کو چابک مارنے جاتی ہوں تو دوستی کے موڈ میں نہیں ہوتی اور جب دوستی کا موڈ نہیں ہوتا تو پھر مصافحہ بھی نہیں کرتی۔"

وہ بولا۔ "میں آپ کے لئے ایسا عمدہ عربی گھوڑا لایا ہوں' جسے دیکھ کر آپ خوش ہو جائیں گی اور یہ خوشی آپ کو دوستانہ موڈ میں لے آئے گی۔"

وہ گھوڑوں سے جیسے عشق کرتی تھی۔ کوئی نیا گھوڑا آنے والا ہوتا تو اسے ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے اس کی زندگی میں ایک نیا دولہا آ رہا ہو حالانکہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ کنواری اس لئے تھی کہ ابھی تک اسے کوئی گھوڑے جیسا آئیڈیل نہیں مل سکا تھا' جسے وہ اپنا دولہا بناتی۔

تحفے کے طور پر آنے والے عربی گھوڑے کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی وہ بولی۔ "شکریہ مسٹر سلاپر! وہ گھوڑا کہاں ہے؟"

"ابھی ایک گھنٹے میں پہنچنے والا ہے۔ ہائی وے پر ہے۔ ایک ٹرک پر لایا جا رہا ہے۔"

"وہاٹ؟" وہ یکبارگی غصے سے چیخ پڑی۔ پھر اس نے اپنے باڈی گارڈ کو آواز دی۔ "جابر خان!"

جابر خان ہاتھوں میں کلاشنکوف لئے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے سامنے آیا پھر سر جھکا کر بولا۔ "حکم بی بی جی!"

وہ ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی بولی۔ "ہائی وے پر ایک گھوڑا ٹرک پر لایا جارہا ہے اس گھوڑے کو ٹرک سمیت جلا دو۔ ڈرائیور مداخلت کرے تو اسے گولی مار دو اور اگر ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے خاموش رہے تو اسے ٹرک سے ڈگنی قیمت ادا کر دو۔"

جابر خان وہاں سے پلٹ گیا۔ دوڑتا ہوا اپنے گھوڑے کی طرف گیا۔ پھر اچھل کر اس پر سوار ہو کر آواز دی۔ بگھو! خیرو! مستان! پیٹرول کے کین لے کر چلو۔"

ہنری سلاپر نے حیرانی و پریشانی سے پوچھا۔ "مس آرزو! بات کیا ہے؟ آپ میرا ٹرک دیکھے بغیر غصہ کیوں دکھا رہی ہیں؟"

وہ کڑک کر بولی۔ "میں دور دور تک گھوڑوں کی شہزادی کہلاتی ہوں۔ دیکھے بغیر کہتی ہوں کہ تم گھوڑا نہیں گدھا لا رہے ہو' یا بیل یا بکریاں لا رہے ہو۔ گھوڑا وہ ہوتا ہے' جو اپنے پیروں سے دوڑتا ہوا سینکڑوں ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہوا اپنے تھان پر آتا ہے۔ اصل نسل کے گھوڑے کبھی ٹرک پر مویشیوں کی طرح نہیں لائے جاتے۔"

اس کے پیچھے ایک سائیس ایک گھوڑے کی لگام پکڑے کھڑا تھا۔ آرزو نے پلٹ کر گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں لی۔ پھر گھوڑے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر سلاپر! تم نے تحفہ دینے کے بہانے میری انسلٹ کی ہے اور میں انسلٹ کرنے والے کو ضرور سزا دیتی ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے ایک چابک رسید کی۔ گھوڑا مار کھا کر ہنہناتے ہوئے اِدھر اُدھر ہو گیا۔ ہنری سلاپر کو یوں لگا جیسے اس آرزو کہلانے والی نامراد بلا نے گھوڑے کو نہیں اسے چابک سے مارا ہے۔ وہ پھر چابک رسید کرتے ہوئے بولی۔ "تم خوش نصیب ہو مہمان بن کر آئے ہو۔ جتنی جلدی ہو سکے میرے ہارس فارم سے باہر چلے جاؤ۔"

وہ بول رہی تھی اور چابک مار رہی تھی۔ گھوڑا چابک سے بچنے کے لئے اچھل رہا تھا۔ جگہ بدل رہا تھا وہ لگام تھامے ہوئے اسے مارتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔ "دیکھو' یہ ہے اصلی نسل کا وفادار گھوڑا۔ جس کے ہاتھ بک جاتا ہے' ہزار چابک کھانے کے بعد بھی مالک سے لگام نہیں چھڑاتا۔ ورنہ یہ مجھ سے زیادہ شہ زور ہے۔ لگام چھڑا کر بھاگ سکتا ہے لیکن جب میں ہارس ٹریڈنگ کرتی ہوں تو گھوڑوں کی نسل اور ان کی لگن کی سچائی کو اچھی طرح پرکھ لیتی ہوں۔"

اخباری رپورٹر نے سہم کر دھیمی آواز میں کہا۔ "کم آن مسٹر سلاپر! یہاں سے نکل

چلو۔ آندھی کا رخ بدل سکتا ہے۔"

ہنری سلاپر کے ساتھ دو اور غیر ملکی تھے۔ وہ سب تیزی سے آ کر اس کار میں بیٹھ گئے جس میں آئے تھے اور جس راستے سے آئے تھے' اسی راستے پر کار بھگانے لگے۔ گھوڑوں کا وہ فارم تقریباً ڈیڑھ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک دو دو' چار چار اصطبل کی سہ دیواریاں بنی ہوئی تھیں۔ اصطبل کی چوتھی سمت آہنی جنگلے اور گھوڑوں کے داخلے کے لئے گیٹ بنے ہوئے تھے۔

اس فارم میں تقریباً دو سو گھوڑے تھے۔ درمیان میں ایک وسیع و عریض دائرہ نما میدان تھا' جہاں گھوڑوں کو سدھایا جاتا تھا۔ آرزو ایک ماہر ٹرینر سے اڑیل گھوڑوں کو مار مار کر انہیں لگام دینا اور ان پر زین کسنا سیکھتی رہتی تھی۔ یہ اس کی بچپن سے عادت تھی کہ اپنے سے زیادہ اڑیل اور ضدی پر اور اپنے سے زیادہ طاقت ور پر قابو پانے کے لئے ایسی درندگی کا مظاہرہ کرتی تھی کہ اگلے کے لئے بلائے جان بن جاتی تھی۔ گھوڑے ایسے زیر ہوتے تھے کہ اس کی آہٹ پر ہنہنانا بھول جاتے تھے۔ تابعداری سے سر ہلاتے تھے اور اپنی اگلی ایک ٹانگ اٹھا کر بار بار زمین پر آہنی کھر بجاتے تھے۔ زمین پر سوکھی گھاس کے باعث کھر بجاتے وقت کھر۔ کھر۔ کھر کی آوازیں آتی تھیں۔ اگر زمین پر تھوڑا سا پانی جمع ہو تو آہنی کھر کی رگڑ سے کھرل' کھرل کی آوازیں ابھرتی تھیں۔ یہ آوازیں اس بات کی پہچان تھیں کہ وہ گھوڑے اپنی مالکن کے وفادار بن چکے ہیں۔

ہنری سلاپر کار میں بیٹھا' وہاں سے گزرتا ہوا دور تک پھیلے ہوئے فارم کو دیکھ رہا تھا۔ دور فاصلوں پر بنے ہوئے ہر اصطبل میں ہر گھوڑے کے ساتھ ایک سائیس تھا اور ہر اصطبل کی چھت پر دو گن مین نظر آ رہے تھے۔ پھر ڈیڑھ میل تک پھیلے ہوئے فارم کے احاطے کی اونچی دیواروں کے ساتھ اونچی اونچی مچانیں بنی ہوئی تھیں۔ وہاں بھی ہر مچان پر دو گن مین دکھائی دے رہے تھے۔ اگر ان کا شمار کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ اس ہارس فارم میں ایک مسلح فوج بھی رہتی ہے۔

یہ بظاہر کوئی جاسوسی یا فلمی منظر دکھائی دیتا تھا اور جنہوں نے پاکستان کے اندرونی علاقوں میں پہنچ کر ایسے ہارس فارم' خونخوار کتوں کے رہائشی کٹہرے اور جاگیرداروں اور وڈیروں کی بنائی ہوئی نجی جیلیں اور عقوبت خانے نہیں دیکھے ہیں' وہ شبہ کریں گے اور سوچیں گے کہ زیرِ نظر کہانی میں کہاں تک صداقت ہے؟ میں ایسی کہانیاں کبھی نہیں لکھتا جن کی بنیاد میں سیاسی' سماجی اور معاشرتی حقائق پوشیدہ نہ ہوں۔ کرداروں کے نام اور مقام فرضی ہوتے ہیں لیکن موضوعات کے مطابق جو حقائق ہوتے ہیں' وہ کبھی قارئین

کے ذہن میں سرگوشیاں کرتے ہیں، کبھی وہ حقائق کھل کر بیان کئے جاتے ہیں اور
خوفِ فسادِ خلق کے باعث ناگفتہ رہ جاتے ہیں۔

کھلی ہوئی حقیقت یہ ہے جام صادق علی مرحوم کے دور میں ڈاکوؤں نے صوبے
اضلاع کو آپس میں بانٹ لیا تھا اور وہاں ان ہی کی حکومت چلتی تھی۔ دیدہ دلیری کی
تھی کہ ان ڈاکوؤں کی رسم تاج پوشی ہوا کرتی تھی۔ تختہ سیاہ پر سفید چاک سے لکھ
مٹایا جاسکتا ہے لیکن پاکستان کی تاریخ میں جو مضحکہ خیز جرائم رقم پذیر ہو چکے ہیں ان
انکار ممکن نہیں ہے۔

ٹنڈوالہ یار میں ایک بڑے ڈاکو کی تاج پوشی ہوئی تھی، جس میں سینکڑوں مہمان
کئے گئے تھے۔ اس دعوت میں ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ہاتھوں میں لوٹا (اصل
کا) لے کر اس ڈاکو کے ہاتھ دھلائے تھے اور ایک تلخ تاریخی سچائی یہ بھی ہے کہ پا
کی ایک بڑی شخصیت نے ایک بڑے ڈاکو کو بڑی عزت اور توقیر سے عمرہ کرنے کے
بھیجا تھا۔

یوں تو ہمارا ملک ڈاکوؤں کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ یہ جنگلوں میں ہی
شہروں میں بھی ہیں۔ مالیاتی اداروں میں ان کا شمار نہیں ہے لیکن زیرِ نظر کہانی میں
دو بڑے ڈاکوؤں کا ذکر کیا جا رہا ہے، جن کی حکمرانی صوبے کے مختلف اضلاع میں
ایک بڑے ڈاکو کا نام مصری خان کھچی تھا، جس کی بیٹی آرزو جہاں کو گھوڑے خرید
انہیں سدھانے، انہیں قابو میں کرنے اور ان پر سواری کرنے کا شوق تھا۔

دوسرے بڑے ڈاکو کا نام جمال خان سوہو تھا۔ اس کی بھی ایک بیٹی تھی۔ نام
ارمانہ تھا اور اسے مرسڈیز کاریں خریدنے کا اتنا شوق تھا کہ اس شوق میں اس نے
دیگرے تین شادیاں کی تھیں پھر تین بار طلاقیں لی تھیں۔

پہلا شوہر اسمبلی کا ایک رکن اور برسرِ اقتدار پارٹی کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس
ارمانہ کا شوق پورا کرنے کے لئے بینک سے ایک کروڑ روپے قرض لئے۔ ارمانہ
رقم اپنے اکاؤنٹ میں رکھی اور جب بھی نئے ماڈل کی مرسڈیز آتی رہی، اسے خر
رہی۔

پھر دوسری حکومت آ گئی۔ پہلا شوہر ساجد احمد اپنی سیاسی پارٹی کے ساتھ اپوزیشن
تاریکی میں چلا آیا۔ کسی اپوزیشن پارٹی کے ممبر کو قومی خزانے سے قرضہ تو کیا بھیک
نہیں ملتی۔ ارمانہ نے کہا۔ "نئے ماڈل کی مرسڈیز آ رہی ہے۔ بینک سے کچھ رقم اور
لاؤ۔"

"تم اب تک چار گاڑیاں خرید چکی ہو۔ کیا اخبارات میں مرسڈیز کے جمعہ بازار کی
تصویریں چھپوانے کا ارادہ ہے۔"

"مجھے طعنہ نہ دو۔ رقم دو۔"

"رقم کہاں سے لاؤں؟ میں اپوزیشن میں ہوں۔ حکمران پارٹی میں ہوتا تو پھر بینک
سے قرض لے آتا۔"

"تو پھر اپوزیشن کو چھوڑو اور حکمران پارٹی میں چلے جاؤ۔ ابھی صدر کے انتخاب کے
لئے تمہارا ایک ووٹ بہت اہم ہو گا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں آدمی ہوں۔ گھوڑا نہیں ہوں۔ حکمراں پارٹی مجھے منہ مانگی
رقم دے گی لیکن اخبار والے مجھے گھوڑا، لوٹا اور تھالی کا بینگن لکھیں گے۔ پھر میں اپنی
پارٹی کا سب سے وفادار ممبر سمجھا جاتا ہوں۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گی۔ مجھے نئی مرسڈیز خریدنے کے لئے کہیں سے بھی
رقم لا کر دو یا پھر طلاق دو۔"

"یہ کیا بکواس ہے، کیا تم شادی اور ازدواجی زندگی کو کھیل تماشہ سمجھتی ہو۔"

"دیکھو، جو پرانی مرسڈیز نہیں چلتی اور اس میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، اسے میں
گیراج سے باہر نکال دیتی ہوں۔ تم شوہر رہو۔ پرانی مرسڈیز نہ بنو۔"

"میں اپوزیشن میں ہوں تو کیا، سیاسی دنیا کا اہم شخص ہوں۔ کوئی معمولی آدمی نہیں
ہوں کہ مجھے کسی طرح کی دھمکی دے کر یا کسی طرح کا دباؤ ڈال کر طلاق لے لو گی اور
سوسائٹی میں انسلٹ کرو گی۔ ایک وفادار بیوی کی طرح صبر کرو۔ ہم حکمران پارٹی کو پانچ
سال کی مدت پوری کرنے نہیں دیں گے۔ شاید اگلے چار چھ ماہ میں حکومت بدل جائے پھر
تمہیں نئی مرسڈیز مل جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شام کو گھر واپس آیا تو وہاں ارمانہ کا باپ جمال خان سوہو اپنی
رائفل لئے موجود تھا۔ اس نے پوچھا۔ "داماد جی! تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ میری بیٹی کو رقم
دے رہے ہو یا طلاق؟"

ساجد احمد نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ بھی ایسی ہی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا آپ باپ
ہو کر بیٹی کو طلاق دلانا چاہیں گے؟"

"میں ہرگز ہمیشہ کے لئے طلاق دلانا نہیں چاہتا۔ عارضی طلاق دے دو۔"

اس نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ "یہ عارضی طلاق کیا ہوتی ہے؟"

"یہی کہ ارمانہ طلاق لے کر پھر تم سے شادی کرنا چاہے گی۔ اس کے لئے حلالہ کی

شرط پوری کرنا ہو گی۔ یہ شرط پوری کرنے کے لئے یہ حکمران پارٹی کے ایک رکن
عارضی شادی کرے گی۔ وہ رکن ارمانہ کے لئے بینک سے بھاری قرضہ لے گا۔ ارمانہ
مرسڈیز خرید کر ارمان پورے کرے گی پھر اس سے طلاق لے کر تم سے نکاح پڑھا
گی۔"

"لیکن سسر صاحب! یہ بے حیائی ہے کہ یہ مجھے چھوڑ کر دوسرے کے
جائے۔"

"بے حیائی تب ہو گی جب یہ دوسرے کے پاس نکاح کے بغیر جائے گی۔ پھر یہ
تمہاری ہی اسمبلی کے ایک رکن کے پاس رہے گی۔ جب اسمبلی میں گھوڑے بک سکتے
تو کیا گھوڑی نہیں بک سکتی؟"

"آں؟ ہاں۔ مگر میں ہارس ٹریڈنگ کے خلاف ہوں۔ اسی لئے اپنی پارٹی سے
وفائی کر کے حکمران پارٹی میں نہیں جا رہا ہوں۔"

"یہی غلطی کر رہے ہو۔ ہارس ٹریڈنگ تو ضرور ہو گی۔ گھوڑا نہیں بکے گا تو گھو
بکے گی۔"

"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اپنی پارٹی کا وفادار ہوں۔ نہ اپنی قیمت لگاؤں گا نہ
بیوی کو بکنے دوں گا۔"

جمال خان سوہنو نے اسے غرا کر دیکھا۔ ایک ایک قدم بڑھاتا ہوا اس کے پاس آیا
رائفل کی نال داماد کے سینے پر رکھ کر کہا۔ "شادی کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے تھ
اس ملک کے دو بڑے ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو کی بیٹی سے شادی کر رہے ہو۔ اور بڑ
ڈاکو' مذہبی' قانونی اور اخلاقی پابندیوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ جدھر تجوری کا منہ کھلا
ہیں' اُدھر جاتے ہیں۔ میری بیٹی نے کہا تھا' رقم لاؤ یا طلاق دو۔ میں کہتا ہوں اپنی جان
یا طلاق دو۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "آپ مجھے قتل کر کے بیٹی کے ساتھ سزائے موت پائیں
میری پارٹی کے لوگ آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں نے ڈاکو بننے سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ایک دن پولیس کی گولی سے یا عد
سے سزائے موت پا کر مرنا ہی ہو گا۔ رفتہ رفتہ پتا چلا کہ پرانے زمانے کے ڈاکو اس
مرتے تھے۔ پہلے میں نے پولیس سے دوستی کی پھر اپنے علاقوں میں سیاسی پارٹیوں کے
ووٹ بینک بنائے۔ اب ہر آنے والی حکومت ہماری احسان مند رہتی ہے۔ جو
حکومت بنانے کے بعد احسان فراموش بن جاتی ہے' ہم ہارس ٹریڈنگ کے ذریعے

حکومت کے تخت کا تختہ کر دیتے ہیں۔"

ساجد احمد نے کہا۔ "میں آپ کی بیٹی کو طلاق دے دوں گا لیکن گھوڑا نہیں بنوں
گا۔"

"تو پھر طلاق دو اور وقت برباد نہ کرو۔"

ساجد نے رائفل کی نال کو اپنے سینے پر دیکھا۔ اگر اسے گولی مار کر اس کی لاش کسی
دور افتادہ مقام پر لے جا کر پھینک دی جاتی تو یہ کوئی تسلیم نہیں کرتا کہ ایک باپ نے اپنی
بیٹی کو بیوہ بنانے کے لئے داماد کو قتل کیا ہے۔

اس نے بڑی محبت سے ارمانہ کو دیکھ کر کہا۔ "میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں
لیکن خدا سے ڈرتا ہوں۔ تمہیں طلاق دوں گا مگر آئندہ تم سے شادی کرنے کے لئے مذہبی
قانون کو مذاق نہیں بناؤں گا اس لئے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "ابھی دو طلاقیں باقی ہیں اس سے پہلے سمجھاتا ہوں کہ
ہمارے دین میں مطلقہ عورت سے یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ وہ پہلے شوہر سے رجوع کرنے
کے لئے دوسرے سے عارضی شادی کرے۔ پھر اس سے طلاق لے کر پہلے کے پاس آ
جائے۔

"دینِ اسلام پر قائم رہنے کی بنیاد نیت ہے اگر خدا کی خوشنودی حاصل کرنے اور
اطاعت گزاری کی نیت سے نماز پڑھی جائے تو وہ درست نماز ہے۔ اگر کوئی منافع حاصل
کرنا چاہے اور محض جنت میں پلاٹ حاصل کرنے کی نیت کر کے نماز پڑھے تو وہ نماز نہیں
سودے بازی ہو گی۔

"اسی طرح مطلقہ عورت دوسرے شخص کو دل سے مجازی خدا اور جیون ساتھی سمجھ
کر نکاح قبول کرے تو وہ نکاح ہو گا اور اگر دوسرے شخص سے آئندہ طلاق لینے کی نیت
سے نکاح قبول کرے تو وہ نکاح نہیں فراڈ ہو گا۔ میں تمہیں دوسری طلاق دیتا ہوں۔

"میں تمہارے بابا کا یہ نکتہ تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مرد وفاداری بدلے تو گھوڑا اور
عورت ایک مرد کو چھوڑ کر دوسرے کے پاس جائے تو گھوڑی کہلاتی ہے۔ مجھے وفا شعار
بیوی چاہئے گھوڑی نہیں للذا تیسری طلاق دیتا ہوں۔"

وہ طلاق دینے کے بعد ارمانہ کی زندگی سے نکل گیا۔ پارٹی لیڈر کو معلوم ہوا کہ اس
نے گن پوائنٹ پر بیوی کو طلاق دی ہے تو اس نے ساجد کو گلے لگا کر کہا۔ "تم واقعی پارٹی
کے وفادار ہو۔ تم نے ہماری خاطر ایک حسین اور نوجوان بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔ ابھی اپنی
پسند کے صدر کو منتخب کرنے کے لئے ہماری پارٹی کا ایک ایک اسمبلی ممبر اہم ہے۔ ہم

اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی سے دو چار بندے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہ بڑی سے بڑی رقم دینے اور ان کے دوسرے مطالبات پورے کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں اگر چار بندے ہماری طرف آ جائیں تو ہماری پسند کا صدر حکومتی پارٹی کے اعصاب پر سو ہو گا۔"

ساجد نے کہا۔ "آپ میری وفاداری سے خوش ہیں لیکن دوسری پارٹی وفاداروں کو بڑی سے بڑی قیمت پر خرید رہے ہیں۔ اخلاق اور ضمیر کا تقاضا یہ ہے کہ انہ ان کی پارٹی کا وفادار رہنے دیا جائے۔"

لیڈر نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "منافع حاصل کرنے یا دوسرے سے سبقت لے جانے سلسلے میں جو بات دوسرے کے لئے بری ہوتی ہے' وہ ہمارے لئے اچھی اور منافع بخ ہوتی ہے۔ تم دیکھتے جاؤ میں کل تک اس پارٹی کے تین بندوں کی وفاداری خرید لوں گا چوتھا بندہ ابھی نئے اور اڑیل گھوڑے کی طرح بدک رہا ہے۔ مگر اسے بھی قابو میں کرلو گا۔"

ساجد سر جھکائے سنتا اور اندر ہی اندر کچھ بے چین سا ہوتا رہا۔ رات کو بستر پر لیٹا نیند نہیں آئی۔ ارمانہ کروٹ کروٹ اسے بلاتی رہی۔ اس کا حسن و شباب اور اس ادائیں یاد آتی رہیں اور اسے تڑپاتی رہیں۔ بعض حسینائیں بیوی بن کر بھی پرانی نہ لگتیں۔ ان میں کچھ ایسی قدرتی اور نامعلوم کشش ہوتی ہے' جو جدائی کے لمحات میں ا طرف کھینچتی ہے۔

وہ سیاست کے میدان میں تھا۔ بالکل اناڑی نہیں تھا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ ڈاکو کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ جمال خان سوہو جن علاقوں پر چھایا ہوا تھا وہاں کے تق ساٹھ ہزار ووٹر اس سے دہشت زدہ رہتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق کسی پارٹی امیدوار کو ووٹ دے کر اسمبلی میں پہنچاتے تھے۔

جمال خان سوہو اور مصری خان کھچی جیسے بڑے ڈاکو روایتی انداز میں بادشاہوں نئے دور کے ڈاکو تھے۔ الیکشن سے پہلے کسی بھی سیاسی پارٹی کے لئے بڑی تعداد میں ووٹ بینک تیار رکھتے تھے۔

تقریباً پندرہ بیس برس پہلے شاذو نادر ہی کوئی کار چوری ہوا کرتی تھی۔ اب دو بڑ کے ماتحت ڈاکو پجیرو اور لینڈ کروزر چھین لیتے ہیں۔ کیونکہ ایسی گاڑیاں ملک کے اندر کچے راستوں پر خوب چلتی ہیں۔ ان چوری کی گاڑیوں کے خریدار وڈیرے اور جاگیردا ہوتے ہیں۔ پولیس اگرچہ سرکاری ہوتی ہے لیکن ان وڈیروں اور جاگیرداروں کی وفادا

ہوتی ہے اور انہیں سستی گاڑیاں خریدنے پر مبارک باد دیتی ہے۔

اب گھروں میں گھس کر ڈاکے ڈالنے کے زمانے گئے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ بڑے ڈاکوؤں کی نظروں میں ایک حقیر چور ہوتا ہے۔ مال و دولت لوٹنے کا ایک معیار اور باوقار طریقہ ہوتا ہے۔ صاحبانِ ثروت اور صاحبانِ اقتدار کو اغوا کر کے تاوان کے طور پر لاکھوں روپے حاصل کر لئے جاتے ہیں۔ اس طرح بیٹھے بٹھائے دولت آتی ہے۔ کیونکہ اغوا کرنے اور تاوان وصول کرنے کا کام ان کے ماتحت کرتے ہیں۔

غنڈا ٹیکس وصول کرنے کے لئے ہائی وے پر ان کے اڈے ہوتے ہیں۔ وہاں سے گزرنے والے منشیات اور اسلحہ سے بھرے ہوئے پانچ ٹرکوں میں سے ایک ٹرک وہ بڑے ڈاکو لے جاتے ہیں۔

اگر اپوزیشن کو بدنام کرنے کے لئے امن و امان کا مسئلہ پیدا کرنا ہو تو ان بڑے ڈاکوؤں کو بھاری معاوضے دیئے جاتے ہیں۔ پھر یہ ڈاکو اپنے نقاب پوش دہشت گرد شہروں میں بھیج کر تخریبی کارروائیاں کراتے ہیں۔ پھر کرتا کوئی ہے' بھرتا کوئی ہے کے مصداق تخریب کاری کے جرم میں اپوزیشن کے اہم بندوں کو گرفتار کر کے مقدمے قائم کئے جاتے ہیں۔

جمال خان سوہو اور مصری خان کھچی کی الگ الگ سلطنت میں آمدنی کے ایسے بہتیرے ذرائع تھے۔ اتفاق سے دونوں کی بیٹیاں تھیں۔ ساجد احمد نے سوچا اگر وہ دیانتداری اور وفاداری کے نیک جذبات کو کچل دیتا تو ابھی ارمانہ کی قربت سے محروم نہ ہوتا۔ پھر ڈاکو باپ کی سلطنت اور اس کی تمام آمدنی بیٹی اور داماد کے یعنی ساجد کے حصے میں آنے والی تھی۔ وہ ایک حسین بیوی اور سسر کی موت کے بعد ملنے والی سلطنت سے محروم ہو گیا تھا۔

تیسرے دن جمال خان سوہو نے اسے فون پر کہا۔ "اب تو تم میرے داماد نہیں رہے۔ وہ جو میری بیٹی کے مہر کی رقم پانچ لاکھ روپے واجب الادا ہے' اسے بھیج دو۔"

وہ بولا۔ "طلاق میں نے نہیں دی ہے۔ میں نے گن پوائنٹ پر تین بار طلاق کہہ دی اور طلاق نامہ لکھ دیا۔ یہ آپ کی بیٹی کی مرضی سے ہوا تھا اور اس وقت مہر کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ بیوی خود چھوڑ کر جائے تو وہ مہر کی رقم کی حق دار نہیں ہوتی۔"

"برخوردار! طلاق نامے پر یہ نہیں لکھا ہے کہ میری بیٹی نے گن پوائنٹ پر طلاق حاصل کی ہے۔ میں زیادہ نہیں بولتا۔ جو کرنا ہوتا ہے' وہ کر گزرتا ہوں۔ ایک ہفتے بعد صدارت کے عہدے کے لئے ووٹنگ ہو گی۔ پانچ لاکھ نہ ملے تو تم ووٹ دینے کے قابل

نہیں رہو گے۔ میرا یہ چیلنج اپنے لیڈر تک پہنچا دو۔"

ساجد نے اسی شام اپنے لیڈر سے ملاقات کی۔ اسے جمال خان سوہو کا چیلنج سنایا پھر کہا۔ "مجھے یہ سوچ کر دکھ ہو رہا ہے کہ ایک ڈاکو نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر جبراً اپنی بات منوائی لیکن آپ نے اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا۔ کیا ہم اقتدار میں نہ رہیں تو اپوزیشن میں بیٹھ کر اس قدر اختیارات سے خالی ہو جاتے ہیں کہ ایک ڈاکو بھی ہماری توہین کرنے لگتا ہے؟"

لیڈر نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ سیاست یہ ہے کہ عوام ہمارے پیروں کی جوتیاں ہوتے ہیں۔ مگر ہم ان کے احتجاجی جلوس دیکھ کر' ان کی توہین آمیز باتیں سن کر بھی ان پر حکومت کرتے ہیں۔ جب اپوزیشن میں رہتے ہیں تو پولیس والوں سے مار کھا کر جیل جاتے ہیں اور جب اقتدار میں ہوتے ہیں تو اسی پولیس سے اپوزیشن والوں کی پٹائی کراتے ہیں اور انہیں جیل بھیجتے ہیں۔"

وہ ساجد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "کامیاب سیاست یہ ہے کہ پولیس اور ڈاکوؤں کو اپنا بنا کر رکھا جائے۔ اقتدار میں رہ کر پولیس والوں کو عوام سے کھانے کمانے کی چھوٹ دی جائے اور ڈاکوؤں کو واردات کرنے کے لئے بے لگام چھوڑ دیا جائے اور اپوزیشن میں رہ کر ان کے مطالبات پورے کئے جائیں۔ تم فکر نہ کرو' میں جمال خان سوہو کو پانچ لاکھ روپے ادا کروں گا۔"

ساجد وہاں سے چلا گیا۔ لیڈر نے اپنے مشیرِ خاص سے پوچھا۔ "مسٹر صدیقی! تم کیا کہتے ہو؟"

مشیر منیر صدیقی نے کہا۔ "ہماری پوزیشن کمزور ہے ہارس ٹریڈنگ کے نتیجے میں ہمیں مخالف پارٹی کے دو بندے مل سکیں گے جبکہ ہمیں جیتنے کے لئے ان کے چار بندوں کو توڑنا ہو گا؟"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ ہماری پوزیشن کس طرح مضبوط ہو سکتی ہے؟"

"یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنی پسند کے صدر کو کامیاب نہیں بنا سکیں گے۔ ہمارے مخالفین کامیاب رہیں گے۔ ایسے میں عوام کو یہ بتانا ہو گا کہ ہمارے ساتھ دھوکا اور زیادتی ہوئی ہے اور مخالفین نے اپنی پسند کا صدر لانے کے لئے زبردست فراڈ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر فراڈ کا پروپیگنڈا ایسا کیا جائے کہ مخالف جماعت پر ہمارے الزامات سچ ثابت ہوتے جائیں۔"

مشیر نے کہا۔ "ایسا ہی ہو گا۔ آپ جمال خان سوہو کو کل رات کھانے پر بلائیں۔

اسے ساجد کی طرف سے پانچ لاکھ روپے ادا کر دیں۔ پھر اس سے سودا کر لیں کہ وہ اپنے سابقہ داماد کو اغوا کرائے اس سلسلے میں وہ پس پردہ رہے اور اس کے زیر اثر رہنے والوں میں سے کوئی ڈاکو ساجد کی واپسی کے لئے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کرے۔"

لیڈر نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ ہم مخالف پارٹی پر یہ الزام دھریں گے کہ وہ لوگ ہمارے ووٹ کم کرنے کے لئے ہمارے اسمبلی کے ممبران اغوا کرا رہے ہیں۔"

"انہوں نے کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہماری پارٹی کے دو ممبروں کو خرید لیا ہے' یہ بات اخبارات میں آ چکی ہے۔ اس کے بعد آپ بیان دیں گے کہ ساجد احمد نہایت دیانت دار اور پارٹی کا وفادار ہے۔ چونکہ وہ ضمیر فروش نہیں ہے اس لئے اسے اغوا کر کے کہیں چھپا دیا گیا ہے۔"

لیڈر نے کہا۔ "بہت اچھا مشورہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ساجد بکنے والا بندہ نہیں ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ کہیں روپوش ہو جائے اور ہم اس کے اغوا کی جھوٹی رپورٹ درج کرائیں گے تو وہ یہ فراڈ نہیں کرے گا۔ خدا سے ڈرتا ہے اس لئے ہماری بات نہیں مانے گا۔ لہٰذا اسے اغوا کرایا جائے گا تو ایک خاطر خواہ سیاسی ڈراما پلے ہوتا رہے گا۔"

پارٹی لیڈر ریسیور اٹھا کر جمال خان سوہو کے موبائل فون پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اگرچہ اسے ساجد جیسے پارٹی کے وفادار کو اغوا نہیں کرانا چاہئے تھا لیکن اس کی وفاداری اور دیانت داری والی خصوصیات سے پارٹی کی پوزیشن ہارنے کے بعد بھی عوام کی نظروں میں مضبوط رہ سکتی تھی۔ سیاست میں ایمانداری نہیں چلتی لیکن دو چار ایماندار بندے رکھے جاتے ہیں' جو اپنی لاعلمی میں بڑی بے ایمانی سے پارٹی کی گرتی ہوئی پوزیشن کو سنبھالتے ہیں۔

اس روز ساجد اپنی کوٹھی میں آیا تو بہت بے چین اور پریشان تھا۔ مہر کے پانچ لاکھ روپے کی ادائیگی کی فکر نہیں تھی۔ وہ تو پارٹی لیڈر ادا کرنے والا تھا لیکن لیڈر کا عمل بتا رہا تھا کہ وہ ابن الوقت ہے۔ اس کی وفاداری پر اسے شاباش بھی دیتا ہے اور اس کی بے عزتی کرنے والے ڈاکو سے اچھے تعلقات بھی رکھتا ہے۔ ڈاکو کے خلاف قدم اٹھانے کے بجائے اسے پانچ لاکھ کی رقم بھی ادا کر رہا ہے۔ اپنی پارٹی میں ضمیر فروشی کو برا سمجھتا ہے مگر مخالف پارٹی کے کسی بھی رکن اسمبلی کی بے وفائی کی قدر کرتا ہے اور اس کی قیمت ادا کرتا ہے اور یہ درس دیتا ہے کہ سیاست میں دوغلے ہتھکنڈوں سے ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

ساجد کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہمارے ہاں اخلاقی قدروں کا تعین نہ کلام پاک سے
ہوتا ہے' نہ درسی کتابوں سے' ہماری اخلاقی قدریں سیاستدانوں کے اعمال سے بنتی بگڑتی
رہتی ہیں۔

ساجد کے دل میں اگرچہ خوفِ خدا تھا لیکن مال و دولت حاصل کرنے کا بھی شوق تھا
اس لئے اس نے مالدار ڈاکو کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ ایک دن اس ڈاکو کی سلطنت اسے
ملنے والی تھی۔ اس کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ چوری ڈکیتی کی سلطنت اگر ملے گی تو اس کا
اپنا ایمان سلامت رہے گا کیونکہ اس نے کبھی چوری نہیں کی تھی اور کہیں ڈاکا نہیں ڈالا
تھا۔ اس کے سسر کی کمائی اس کی بیوی کو ملنے والی تھی اور بیوی کا مال اپنا ہی مال ہوتا
ہے۔ وہ کسی پہلو سے خطاوار یا مجرم نہ کہلاتا۔

وہ ارمانہ کو کبھی طلاق نہ دیتا۔ اس کی مرسڈیز کی خاطر نئے قرضے لینے کے لئے
گھوڑا بن کر دوسری پارٹی میں چلا جاتا لیکن وہ ابھی پکا سیاستداں نہیں بنا تھا۔ اس کے
اندازے کی غلطی ہو گئی۔ اس نے پہلی بات یہ سوچی کہ اس کے پارٹی لیڈر کے سامنے ڈالر
پیروں کی جوتی ہیں۔ وہ اپنی پارٹی نہیں چھوڑے گا۔ وفادار رہے گا تو پارٹی لیڈر خوش
ہو کر کہے گا۔ "گن پوائنٹ پر طلاق نہیں ہوتی۔ ارمانہ تمہاری شریکِ حیات ہے اور رہے
گی۔ تمہارے جیسے عظیم اور وفادار پارٹی رکن کی بے عزتی کے جرم میں ڈاکو کو ہمارے
بندے گولی مار دیں گے پھر اس کی بیٹی اور اس کی سلطنت ہمیشہ تمہاری رہے گی۔"

لیکن وہ سلطنت اور بیوی ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ پارٹی لیڈر اس وفادار کو شاباش
بھی دے رہا تھا۔ دوسرے بے وفا ضمیر فروشوں کو منہ مانگے داموں خرید کر انہیں اپنے
پر بٹھا رہا تھا اور ڈاکو سے آئندہ اچھے مراسم رکھنے کے لئے پانچ لاکھ روپے بھی ادا کر
تھا۔

اس ڈاکو کی سلطنت کے مقابلے میں پانچ لاکھ روپے کی کیا اہمیت تھی؟ وہ بہت بڑی
سلطنت ہار کر پارٹی لیڈر کے پانچ لاکھ روپے کا احسان اٹھا رہا تھا۔

زندگی میں ٹھوکر کھانے سے ہی عقل آتی ہے اور تجربات بڑھتے رہتے ہیں۔ اس
نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ قائم ہونے پر دوسری طرف کی آواز سن کر کہا

"ہیلو ارمانہ! میں ہوں ساجد احمد......."

"اچھا تو یہ تم ہو؟ اگرچہ تم اچھے مواقع کو سمجھ کر عمل نہیں کرتے۔ مگر ابھی اچھے
موقع پر فون کیا ہے۔ تقریباً چھ گھنٹے بعد صدیار خان سے میرا نکاح پڑھایا جانے والا ہے۔"

"کیوں مذاق کر رہی ہو؟ پلیز سنجیدہ ہو کر مجھ سے گفتگو کرو۔"

"میں تمہاری سالی نہیں ہوں کہ مذاق کروں گی۔ میں شادی کر رہی ہوں' کھیل
میں رہی ہوں۔"

"یہ کھیل نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ ابھی تمہیں طلاق دیئے ہوئے تین دن ہی ہوئے
ہیں۔ تم نے عدت کے تین ماہ نہیں گزارے۔ پھر تمہاری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہو رہی ہے۔ عدت کے تین ماہ گزر چکے ہیں۔ یاد ہے تمہیں طلاق نامہ پر تاریخ
لکھنے نہیں دی گئی تھی۔ جو جگہ تم نے چھوڑی تھی اس جگہ ہم نے چار ماہ پہلے کی تاریخ
لکھ دی ہے۔ اس تاریخ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ تم نے چار ماہ پہلے مجھے طلاق دی تھی
اور میں عدت کے دن گزار چکی ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ ساجد حیرانی اور بے یقینی سے منہ کھولے گونگے
ریسیور کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ "طلاق کو تین دن ہوئے اور اس تین دن کے اندر چار ماہ
گزر گئے۔ کیا سیاست ہے کہ میں دم نہیں مار سکتا۔ دراصل سیاست اسی کو کہتے ہیں کہ
عوام حکمرانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور مجھ جیسا شخص........ ہار کر بھی جیتنے والے کا گریبان
نہ پکڑ سکے۔"

وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اپنی ڈائری کھول کر مطلوبہ ٹیلی
فون نمبر تلاش کرنے لگا۔ برسرِ اقتدار پارٹی کے لیڈر کے چار عدد فون نمبر تھے۔ ایک نمبر پر
لیڈر کے سیکرٹری سے رابطہ ہوا۔ اس نے کہا۔ "اپنے صاحب سے بولو۔ میں ساجد
احمد ہوں۔"

چند لمحوں کے بعد ہی لیڈر کی آواز سنائی دی ساجد نے کہا۔ "میں ہوں آپ کا خادم
ساجد احمد۔ وہی ساجد احمد' جس کی ایمانداری اور وفاداری مشہور ہے اور جس نے نہ بکنے
کے لیے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔"

"ہاں' مجھے جمال خان نے بتایا تھا اور میں نے اس سے کہا تھا کہ بیٹی کو طلاق دلاؤ'
میرا چھوٹا بھائی صمدیار خان اس سے شادی کرے گا۔ پھر مرسڈیز تو کیا ارمانہ کو ایک سے
ایک مہنگی گاڑی خرید کر دے گا۔ تمہیں شاید یہ پتا چل گیا ہو گا کہ آج رات یہ شادی
ہونے والی ہے۔"

"جی ہاں۔ مگر میں نے مبارک باد دینے کے لئے نہیں' یہ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے
کہ آپ نے کیا ہارس ٹریڈنگ کا سلسلہ بند کر دیا ہے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں ساجد صاحب! پاکستان میں جب ایک سلسلہ چل پڑتا ہے تو پھر
وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بائی دی وے' آپ کیا آنا چاہتے ہیں؟"

"کیا آپ ویلکم کہیں گے؟"

لیڈر نے خوش ہو کر کہا۔ "صرف ویلکم نہیں کہیں گے' آپ کی آمد پر جشن منا
گے۔ آپ ہماری جیت کو مستحکم کر رہے ہیں۔ آپ فرمائیں کہ ہم کس طرح آپ کو خ
کر سکتے ہیں۔"

"میری دو خواہشیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ارمانہ بدستور میری بیوی رہے۔ دوسر
کہ مجھے بینک سے ایک کروڑ روپے کا قرضہ دلایا جائے۔"

"نو پرابلم ساجد صاحب! ارمانہ آپ ہی کی شریکِ حیات رہے گی۔ اگر آپ چھ
کے اندر ارمانہ کے ذاتی بنگلے پر پہنچ جائیں تو ہم بھی چھوٹے بھائی صمد یار خان کو لے کر
آرہے ہیں۔ وہاں آپ ہماری پارٹی کی وفاداری کے کاغذات پر سائن کریں گے تو
میرے بھائی کا نکاح ارمانہ سے نہیں پڑھایا جائے گا۔ دوسرے دن آپ قرضے
درخواست دیں گے' تیسرے دن ایک کروڑ کا چیک مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چھ گھنٹے کے اندر وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر الماری کے پاس آیا پھر پہننے کے لئے بہترین سوٹ کا انتخاب کر
لگا۔ طوائف بکنے سے پہلے خوب بنتی سنورتی ہے لیکن اس کے ذہن میں بکنے کا معا
ثانوی اہمیت رکھتا تھا۔ اول اہمیت ارمانہ کی تھی۔ وہ بہترین سوٹ پہن کر خوشبوؤں
بس کر تین دن پہلے ہاری اُس دلہن کو جیتنے جا رہا تھا' جس کے پیچھے ایک ڈاکو کی سلط
تھی اور کسی دن اس کی سلطنت میں اس داماد صاحب کی بھی تاج پوشی ہو سکتی تھی۔

برسرِ اقتدار پارٹی کے لیڈر نے جمال خان سوہو سے فون پر رابطہ کیا۔ اسے بتایا
ساجد احمد جیسا نیک نام شخص پارٹی بدل رہا ہے۔ اس کے آنے سے یہ بات پھیلائی جا
گی کہ اپوزیشن میں سب ہی کرپٹ لوگ ہیں۔ اسی لئے ساجد جیسا شریف اور نیک
اسمبلی کا رکن وہ پارٹی چھوڑ کر ہمارے پاس آگیا ہے۔

جمال خان نے کہا۔ "جناب عالی! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے لیکن میں حیران
کہ وہ میری بیٹی کو چھوڑنے کے بعد وفاداری کیوں بدل رہا ہے؟"

"اس نے جو شرائط پیش کی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی کو دل
جان سے چاہتا ہے اور وہ بدستور اسے اپنی شریکِ حیات بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ تم نے
بتایا تھا کہ تمہاری بیٹی نئے ماڈل کی مرسڈیز خریدنے کے لئے ساجد سے رقم کا مطالبہ کر
تھی۔ اس پر بات بگڑ گئی اور طلاق جبراً دلائی گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ارمانہ کو خوش کر
کے لئے ہمارے ذریعے ایک کروڑ روپے کا قرضہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"جناب عالی! کیا آپ نہیں چاہتے کہ ارمانہ کی شادی آپ کے چھوٹے بھائی سے
ہو؟"

"ہم شادی نہیں' سیاست کرتے ہیں۔ ہم ارمانہ کے بنگلے میں آ رہے ہیں۔ وہاں
ساجد کا انتظار کریں گے۔ اگر وہ وہاں آ کر ہماری پارٹی کا وفادار رہنے کے سلسلے میں تحریری
بیان دے گا تو اس کا لکھا ہوا طلاق نامہ تم اس کے سامنے جلا دو گے۔ اس کا مطلب ہو گا
کہ نہ کبھی ساجد سے تم باپ بیٹی کا جھگڑا ہوا تھا اور نہ طلاق ہوئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح
ساجد کی شریکِ حیات رہے گی۔"

"آپ جو حکم کریں گے' وہی ہو گا لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپ کے چھوٹے بھائی
بھی ارمانہ کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ جب سے آپ اقتدار میں آئے ہیں' تب سے وہ
مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں ساجد کو ارمانہ کی زندگی سے نکال دوں۔"

"تم میرے بھائی کی فکر نہ کرو۔ اقتدار میں وہ نہیں ہے' میں ہوں۔ اس کی غنڈا
گردی میرے دم سے ہے۔ اگر وہ تمہیں کسی طرح کی دھمکی دے گا تو میں اس سے غنڈا
گردی کے تمام اختیارات چھین لوں گا۔"

"آپ مائی باپ ہیں۔ میں اپنی بیٹی کے بنگلے میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

جمال خان نے ریسیور رکھ کر سوچا' میری بیٹی کو واقعی دل سے چاہنے والا میرا داماد
ساجد ہی ہے۔ پہلے اس نے بکنے سے انکار کیا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اب وہ اپنی غلطی کو
سمجھنے کے بعد بک کر واپس آ رہا ہے۔ اس طرح میری بیٹی مطلقہ نہیں کہلائے گی۔ ایک ہی
شوہر کی ہو کر رہے گی۔

پھر اس نے سوچا۔ "مجھے زیادہ سے زیادہ چھ لاکھ کا نقصان ہو گا اپوزیشن پارٹی کے
لیڈر نے پانچ لاکھ کی رقم ارمانہ کے مہر کے طور پر ادا کی تھی۔ اب تو طلاق کی کوئی بات
نہیں ہے اور ایک لاکھ روپے ساجد کو اغوا کرانے کے لئے دیئے تھے۔ یہ ایک لاکھ بھی
اس پانچ لاکھ کے ساتھ واپس کر دوں گا۔ میری بیٹی کے ہاتھوں میں ایک زبردست گھوڑے
کی لگام ہے۔ وہ ایک کروڑ لے کر اپنے تھان میں واپس آ رہا ہے۔"

اس نے بیٹی کے پاس کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا پھر پوچھا۔ "تم کیا چاہتی
ہو؟"

وہ بولی۔ "مجھے خوشی ہے کہ ساجد میری خاطر اپنی پارٹی چھوڑ رہا ہے۔ وفاداری
تبدیل کر رہا ہے اور میرے لئے ایک کروڑ روپے کا قرضہ حاصل کر رہا ہے۔ میں اس کی
منکوحہ ہوں۔ آپ صمد خان کی بارات واپس کر دیں۔"

بارات وقتِ مقررہ پر آ گئی۔ صمد یار خان نے کہا۔ ”میں اپنے بھائی جان کے حکم
بندہ ہوں۔ ساجد صاحب آئیں گے تو میں خالی ہاتھ چلا جاؤں گا۔“

ساجد نہیں آیا۔ چھ گھنٹے کے بعد ساتواں گھنٹا بھی گزر گیا۔ پھر آٹھواں گھنٹا بھی
گزرنے لگا۔ صمد یار خان نے پوچھا۔ ”بھائی جان! رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔
گھوڑا بدک گیا ہے شاید نہیں بکے گا۔“

جمال خان نے کہا۔ ”وہ میرا داماد ہے۔ زبان کا دھنی ہے۔ جب آپ کے بھائی جا
کو زبان دے چکا ہے تو اسے ضرور آنا چاہئے۔“

صمد یار خان نے کہا۔ ”تو پھر اب تک کیوں نہیں آیا؟ پھر یہ کہ تم اسے داماد نہ کہو۔
اگر وہ داماد ہوتا تو ہم ان چار چھ معزز افراد کو باراتی بنا کر نہ لاتے۔“

بارات کے ایک شخص نے کہا۔ ”ساجد وعدے کے مطابق نہیں آیا۔ لہٰذا ہمار
صمد یار خان سے اپنی بیٹی کا نکاح پڑھا دو۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اگر بارات دلہن کے بغیر جائے گی تو ہماری بڑی بے عزتی ہو
گی۔“

ایک اور شخص نے کہا۔ ”ہم سب محض امیر کبیر شریف خاندان کے لوگ ہی نہیں ہیں
حکمران پارٹی کے لوگ بھی کہلاتے ہیں۔ دلہن ساتھ نہ گئی تو ہم اپنی توہین برداشت نہیں
کریں گے۔“

جمال خان سوہو نے برسرِ اقتدار پارٹی کے لیڈر سے کہا۔ ”جناب عالی! میں آپ سے
تنہائی میں دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ دونوں ایک کمرے میں آئے۔ جمال خان نے کہا۔ ”جناب عالی! آپ ساجد جیسے
نیک بندے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ زبان کا سچا اور وقت کا پابند ہے۔ اس کے ساتھ
ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ اسے یہاں آنے سے روکا گیا ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں
ہے۔“

لیڈر نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کسی نے اسے اغوا
کیا ہو؟“

”آپ ناراض نہ ہوں تو کہوں کہ ساجد کے یہاں نہ آنے سے صرف آپ کے بھائی
کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ اپنی برسوں کی ضد پوری کرنے کے لئے ساجد کو جان سے بھی
سکتا ہے۔ یا اسے کہیں غائب کر سکتا ہے۔“

”میرا بھائی بعض اوقات بدمعاشی کی انتہا کر دیتا ہے۔ پھر بھی کسی ثبوت کے بغیر ا

سختی نہیں کروں گا۔“

”آپ اپنے بھائی کی زندگی چاہتے ہیں تو اس پر سختی کریں اور حقیقت معلوم کریں۔
ورنہ میں بھی ڈاکو ہوں۔ اقتدار میں رہنے والی پارٹی سے فائدے پہنچتے ہیں۔ اس لئے آپ
کے سامنے ادب سے جھکتا ہوں لیکن میں نے اگر اپنے داماد کو ڈھونڈ نکالا اور وہ مجھے بری
حالت میں ملا تو پھر آپ کو صمد یار خان کبھی زندہ نہیں ملے گا۔“

”دیکھو جمال خان! تمہاری اس دھمکی سے مجھے توہین کا احساس ہو رہا ہے۔ میں
نہیں چاہتا کہ ان علاقوں میں تمہاری جگہ کسی دوسرے ڈاکو کو لے آؤں۔ اس لئے اپنی
اوقات میں رہ کر باتیں کرو۔“

”اپنی اوقات میں رہ کر بول رہا ہوں۔ آپ ڈاکو بدل سکتے ہیں اور ہم ڈاکو اسمبلی
میں آپ کی اکثریت کو اقلیت میں بدل سکتے ہیں۔ آپ کے بھائی نے صرف ایک ساجد کو
غائب کیا ہے۔ میں آپ کے کتنے ہی جیتے اسمبلی کے ممبران کو مٹی میں دبا سکتا ہوں۔“

لیڈر سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ جمال خان نے کہا۔ ”میرا چہرہ اگر کتاب ہے
تو اسے دیکھیں، پڑھیں اور سوچیں۔ آپ کے سامنے ابھی صدارت کے عہدے کا مسئلہ
ہے۔ اس کے بعد سینٹ کے انتخابات ہوں گے۔ ہر مرحلے پر ہماری ضرورت ہو گی۔ اگر
آپ ڈاکو بدلنے کے پھیر میں رہیں گے تو آپ کی حکومت بدل جائے گی۔“

پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ لوگوں کی حکومت یا تو امریکا کے آشیرواد سے چلتی
ہے یا پھر یہ حکومت ہم ڈاکوؤں کی رہین منت ہوتی ہے۔ میں آپ کو نیک مشورہ دے رہا
ہوں۔ اسمبلی میں آپ کے بھائی سے نہیں، ساجد کے اضافے سے آپ کی پوزیشن مضبوط
ہو گی۔“

وہ سوچتے ہوئے جانے لگا۔ اس نے اپنے بھائی صمد یار خان کو پچھلی بار الیکشن میں
کھڑا کیا تھا لیکن وہ اپنی بدمعاشیوں کے باعث ہار گیا تھا اور وہاں کی سیٹ اپوزیشن والوں
نے جیت لی تھی۔ وہ شکست یوں فتح میں بدل سکتی تھی کہ ساجد جیسے دو چار اپوزیشن کے
ممبران اپنی طرف چلے آتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بھائی سے زیادہ ساجد اہم تھا۔

اس نے باہر آ کر صمد یار خان سے کہا۔ ”یہاں سے واپس چلو۔“

وہ بولا۔ ”بھائی جان! یہ ہماری انسلٹ ہے۔ ہم دلہن کو ساتھ لے کر جائیں گے۔“

وہ گرج کر بولا۔ ”بکواس مت کرو۔ یہاں سے فوراً چلو۔“

لیڈر کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ سب اپنی گاڑیوں میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ تین
گاڑیاں تھیں۔ درمیان والی پجیرو میں صمد یار خان اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بیٹھا ہوا

تھا۔ بھائی نے غرا کر پوچھا۔ "ساجد کہاں ہے؟"

صمد یار خان نے پلٹ کر گاڑی کے شیشے کے پار دیکھا۔ ارمانہ کا بنگلا دور نظروں او جھل ہو رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "بھائی جان! آپ نے آج تک میری کوئی خواہش نہیں کی۔ ارمانہ کا حصول میری آن کا مسئلہ بن گیا ہے۔ جب ہماری بد معاشی کمزور ہوتی ہے تو پھر ہماری طاقت' رعب اور دبدبہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔"

"مجھے صرف میرے سوال کا جواب دو۔ ساجد کہاں ہے؟"

"میرے بندے اسے کہیں لے گئے ہیں۔ میں نے تاکید کی ہے' اسے جان مارا جائے۔ وہ اچھی شہرت والا بندہ ہے۔ کبھی ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

"جب اتنی عقل ہے تو تمہیں سوچنا چاہئے کہ تین دنوں کے بعد ہمیں صد انتخاب کے لئے اس کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے لئے ابھی ایک ایک ووٹ قیمتی ہے۔"

"اپوزیشن کے لئے بھی ایک ایک ووٹ قیمتی ہے۔ اگر ان کی طرف سے ایک ووٹ کم پڑے گا تو وہ لوگ پہلے ہی اپنی کم تعداد سے پریشان ہیں۔ ہمارے بند توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس آپ نے ان کے دو بندے خرید ہیں۔ ساجد کی کمی ان کی کمر توڑ دے گی۔"

لیڈر سوچنے لگا۔ "ہماری پوزیشن پہلے سے مضبوط ہے۔ میں صرف طاقت بڑھا کے لئے ساجد کو خرید رہا تھا۔ اب اسے نہیں خرید رہا ہوں' تب بھی اپوزیشن کمزو ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہارس ٹریڈنگ میں گھوڑے خریدے جائیں۔ بعض حالات کوئی قیمت ادا کئے بغیر ایک دو گھوڑے چرائے جاتے ہیں یا کسی دوسرے کے کاندھے بندوق رکھ کر انہیں گولی مار دی جاتی ہے۔ گھوڑے پھر گھوڑے ہوتے ہیں۔ انہیں بھی برے انجام تک پہنچایا جا سکتا ہے اور انہیں خریدنے والی رقم بچائی جا سکتی ہے۔"

اس نے کہا۔ "بھائی یار خان! اس میں شبہ نہیں کہ تو نے بڑی عقل سے کام لیا لیکن وہ دو ٹکے کا ڈاکو بہت سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کہہ رہا تھا اگر ساجد تیرے قبضے بری حالت میں ملے گا تو وہ تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اور آپ نے اتنی بڑی بات خاموشی سے سن لی؟"

"اور کیا کرتا؟ کیا تمہاری طرح طیش میں آ کر ہتھیار اٹھا لیتا؟ کیا یہ بھول جاتا کہ علاقوں میں جمال خان سوہو کی حکمرانی ہے؟ اگرچہ پورے ملک کے حکمران ہم ہیں چھوٹے بڑے وڈیروں' جاگیرداروں اور ڈاکوؤں کو ان کے علاقوں پر حکومت کرنے اختیارات دینے کے بعد ہی حکومت کی کرسی کو مضبوط رکھا جاتا ہے۔"

"آپ اجازت دیں' میں جمال خان کو ٹھکانے لگا دوں گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہماری تابعداری کرنے والا ڈاکو آ ے۔ چونکہ اب میں ساجد کو نہیں خریدوں گا' اسے ایک کروڑ کا قرضہ نہیں دلاؤں گا تو ل خان بڑے خسارے میں رہے گا اور اسی غصے میں تمہارے خلاف انتقامی کارروائی ے گا۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میں یوں بھی ارمانہ کو اٹھا کر لے جانے کے لئے جمال ان کو راستے سے ہٹاؤں گا۔"

"بھائی یار خان! میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ یہ کام اپنے حواریوں ے کراؤ۔ میں سوچ رہا ہوں تم اپنی گرم مزاجی کے باعث سیاست میں کبھی کامیاب نہیں وگے۔ تمہارے لئے بہتر ہو گا کہ جمال خان کو راستے سے ہٹا کر اس کی جگہ لے لو۔ ل پیٹھ پیچھے ڈاکو کہیں گے مگر عزت دیں گے اور ہر آنے والی حکومت تمہاری تاج پوشی ے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "بھائی جان! آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ جب ہ آپ اقتدار میں آئے ہیں' اِدھر کے کئی چھوٹے بڑے ڈاکوؤں نے مجھے دعوتیں دی ہ اور میرے لئے عیش و طرب کی محفلیں سجائی ہیں۔ جمال خان سوہو کا سب سے بڑا یف ڈاکو مصری خان کھچی ہے۔ اس سے میرا بڑا دوستانہ ہے۔ بس آپ یوں سمجھیں کہ ل خان کے آخری دن آ گئے ہیں۔"

ان کی پجیرو اور دو گاڑیاں جیکب آباد کی سمت جا رہی تھیں۔ صمد یار خان جیکب میں قیام کرنے والا تھا۔ ارادہ تھا کہ وہاں رہ کر اپنے حواریوں کی مدد سے جمال خان کو نے لگائے گا۔ اس کا لیڈر بھائی ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسلام آباد جانے والا تھا۔

دواپور سے جیکب آباد' وہاں سے جنوب میں شکار پور اور پھر وہاں سے لاڑکانہ کے جنگلات تک جمال خان سوہو کی حکمرانی تھی اور لوگوں پر اس کے نام کی دہشت طاری تی تھی۔

دوسرا بڑا ڈاکو مصری خان کھچی سندھ اور بلوچستان صوبوں کے سنگم پر تھا۔ جیکب ے ریلوے لائن اور ایک پختہ سڑک صوبہ سندھ کی سرحد عبور کر کے بلوچستان تی تھی یہاں کے پہلے ریلوے اسٹیشن کا نام جھٹ پٹ ہے۔ مصری خان کھچی کی حکمرانی ٹ پٹ سے شمال کی سمت ڈیرا مراد جمالی سے آگے طاہر کوٹ تک تھی اور مغرب میں وں میل دور پنجوک تک اس کے نام کا رعب و دبدبہ تھا۔

دراصل حکومت شخصی رعب اور دبدبے سے قائم رہتی ہے۔ شہروں،
قصبوں اور دیہاتوں میں وڈیروں اور زمینداروں کی دہشت عوام پر رہتی ہے۔
وڈیرے اور زمیندار حکومتِ وقت سے طرح طرح کی مراعات حاصل کرنے کے
اپنے علاقوں کے ڈاکوؤں کے دباؤ میں رہتے ہیں۔ جس طرح سندھ کے بڑے شہر
امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو تو فوج کو بلایا جاتا ہے اسی طرح اسمبلی میں پہنچنے والے
حکومت سے زیادہ اختیارات کا مطالبہ کرتے ہیں یا کسی اور طرح بلیک میل کرنا چا
تو حکومت ان پر ڈاکو مسلط کر دیتی ہے۔ حکمرانوں اور حکمرانی کے لئے یہ پرانا مقولہ
جو کام حکمت سے نکلتا ہے' وہ حکومت سے نہیں نکلتا۔

☆=========☆=========☆

ارمانہ اپنی نئی مرسڈیز میں لانگ ڈرائیو کے لئے نکلی تھی۔ راستے میں ایک
سے ملاقات کی تھی۔ پھر اس کی نجی جیل کے اندر جا کر دیکھا تھا۔ وہاں ایسے کسا
حویلی میں بیگار کرنے والے قیدی تھے' جو شہروں میں ملازمت کرنے کے لئے اس
سے گئے تھے اور وڈیرے کی اجازت کے بغیر گئے تھے۔ یہی ان کا جرم تھا۔ سا
وڈیرے اور جاگیردار اس معاملے میں ہم خیال تھے کہ ان کے علاقوں سے لوگ
میں مزدوری کرنے جائیں گے تو پھر ان کی غلامی کرنے کے لئے کوئی نہیں رہے گا۔

اس جیل کے ایک عقوبت خانے میں ایک نوجوان کو شہتیر سے الٹا لٹکایا گیا
اس پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ پتا چلا کہ اس جوان کا نام امداد جمالی ہے۔ وہ بلوچستان
بستی جاگیرانی سے اپنی بہن لالی کے ساتھ آیا تھا۔ استہ گوٹھ میں اس کے نانا نانی تھے
بہن نے اپنے ننھیال میں قیام کیا تھا۔ پچھلے روز اس علاقے کا تھانیدار ٹرانسفر ہو
آباد کے قریب شری داتا کے تھانے جا رہا تھا۔ وڈیرے نے اس کی الوداعی دعوت
تھانیدار نے کہا۔ "دعوت کو رہنے دو۔ تمہارے اس بوڑھے جمن ہاری کے ہاں
غضب کی لڑکی ہے۔ اسے میرے کوارٹر میں پہنچا دو۔ وہ کوارٹر چھوڑنے سے
حسینہ سے اسے آباد کر لوں گا۔"

وڈیرے کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنے دو آدمیوں کو بھیج
جمن ہاری اور اس لڑکی کو لے آئیں۔ وہ دو آدمی گئے پھر بری طرح زخمی ہو کر
انہوں نے بتایا کہ لڑکی کا بھائی باڈی بلڈر ہے۔ اس نے یہ سن کر ہی وڈیرے اور
کو گالیاں دیں کہ وہ اس کی بہن کو بلا رہے ہیں۔ وڈیرے اور تھانیدار تو بے
ہوتے ہیں۔ یہ سن کر طیش میں آ گئے کہ ایک ذلیل ہاری کے گھر سے کسی

کیڑے نے گالیاں دی ہیں۔

وہ تھانے کے تمام مسلح سپاہیوں کو لے کر جمن کے گھر آئے پھر اس گھر میں گھس کر
جبراً امداد جمالی اور لالی کو باہر لے آئے۔ امداد جمالی سپاہیوں کی پٹائی کر رہا تھا۔ ایسا مضبوط
اور پھرتیلا تھا کہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ تھانیدار نے اپنا ریوالور نکال کر ایک
ہوائی فائر کیا۔ پھر جمن کو نشانے پر رکھ کر بولا۔ "جوان! ہمارے سامنے کسی کی طاقت نہیں
چلتی۔ چپ چاپ ہتھکڑیاں پہن لو۔ ورنہ پہلے اس بڈھے کو پھر اس جوان چھوکری کو گولی
ماروں گا۔"

امداد جمالی نے بے بسی سے اپنے نانا کو دیکھا۔ دوسرے سپاہیوں نے بھی اپنی
رائفلیں سیدھی کر لی تھیں۔ وہ انہیں گولیاں مار کر چلے جاتے تو اس ظلم اور بربریت کے
خلاف آواز اٹھانے کی کوئی جرأت نہ کرتا۔

امداد جمالی کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر بے بس کر دیا گیا۔ اسے عقوبت خانے میں لا
کر اس کے پیروں کو باندھ کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ پھر پچھلی شام سے اس کی پٹائی ہو رہی تھی
لیکن اس کا جسم پہاڑ جیسا تھا۔ سینہ چٹان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ کھال اتنی موٹی اور مضبوط
تھی کہ تین ڈنڈے اور پانچ لاٹھیاں اس کے بدن پر پڑتے پڑتے ٹوٹ گئی تھیں۔ اسے
مارنے والے سپاہی اور وڈیرے کے درجنوں ملازم تھک گئے تھے۔ اسے مار مار کر لہولہان
کر دیا تھا پھر بھی اس کی آواز میں توانائی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر وڈیرے اور تھانیدار کو گالیاں
دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میری بہن کو کسی نے ہاتھ بھی لگایا تو میں اسے زندہ نہیں
چھوڑوں گا۔"

ارمانہ اس عقوبت خانے سے باہر آ گئی۔ اس باڈی بلڈر جوان کو اچھی طرح دیکھ نہ
سکی۔ شرم کی بات یہ تھی کہ اسے مارتے مارتے' اس کا لباس پھاڑتے پھاڑتے اسے ننگا کر
دیا گیا تھا۔

باہر آ کر وڈیرے نے پوچھا۔ "میڈم! آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟ ہم کیا خدمت کر
سکتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "پچھلی رات سے میرا شوہر ساجد احمد لاپتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اسے اغوا
کر کے ایسی ہی کسی جیل میں چھپایا گیا ہے۔"

"آپ ہم پر شبہ نہ کریں۔ آپ کے بابا جمال خان سے ہمارا دوستانہ ہے۔ اس دوستی
کے ناتے میں ساجد کو اپنا داماد سمجھتا ہوں۔"

"تو پھر دوستی نبھاؤ اور اپنے آدمیوں کو ساجد کی تلاش میں بھیج دو۔"

"میڈم! میں زیادہ سے زیادہ دو ہی آدمیوں کو اس کی تلاش میں بھیج سکتا ہوں
آپ نے دیکھا ہے کہ یہ امداد جمالی کیسا ڈھیٹ ہے۔ کوئی دوسرا اتنی مار کھاتا تو اب تک
چکا ہوتا۔ میرے تمام ملازم اس کی نگرانی میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر یہ کسی طرح رسیاں
کر نکلے گا تو ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"یہ ایسا ہی جی دار لگتا ہے۔ میرا مشورہ ہے اس کا غصہ ٹھنڈا کرو۔ اس کی
واپس کر کے اسے جانے دو۔"

"بہن کہاں سے واپس کریں۔ اس نے تھانیدار کے کمرے میں جاتے ہی خودکشی
لی تھی۔ وہاں ایک بلیڈ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بلیڈ سے اپنی کلائی کی نس کاٹ لی تھی۔"

"یہ بہت برا ہوا۔ اس جوان کو کپڑے پہناؤ۔ میں اس سے بات کروں گی۔ وہ عیا
تھانیدار کہاں ہے؟"

"وہ تو نئی ڈیوٹی سنبھالنے شری داتا چلا گیا ہے۔ میرے لئے یہ مصیبت چھوڑ
ہے۔"

"اب تم اس کے سامنے نہ جاؤ۔ کہیں چھپ جاؤ۔ میں کہہ دوں گی کہ تم تھانید
کے ساتھ شری داتا چلے گئے ہو۔"

"ہاں......... یہ ٹھیک ہے وہ ہماری تلاش میں اُدھر جائے گا تو اِدھر میری جان
رہے گی۔"

پھر اس نے اپنے ایک کامگار سے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ میرے پیچھے میڈم جو
دیں گی اس کی تعمیل کرو۔"

وڈیرا وہاں سے چلا گیا۔ ارمانہ نے کامگار سے کہا۔ "جمالی کے پاس جاؤ اور
کپڑے پہناؤ۔"

کام گار عقوبت خانے کے اندر گیا۔ تھوڑی دیر بعد امداد جمالی کی غراتی ہوئی
سنائی دی۔ "چلے جاؤ' بھاگ جاؤ یہاں سے۔ جب تک مجھے معلوم نہیں ہوگا کہ میری
کس حال میں ہے' تب تک میں کپڑے نہیں پہنوں گا۔"

ارمانہ نے باہر سے کہا۔ "امداد جمالی! میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ جب
لباس نہیں پہنو گے میں سامنے نہیں آسکوں گی۔"

اس کی آواز آئی۔ "میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ اگر ہمدرد ہو تو پہلے میری
بات کرو۔"

"تم غصے میں پاگل ہو رہے ہو۔ میں تمہیں دشمنوں سے انتقام لینے کا موقع دوں

تم پہلے دماغ ٹھنڈا رکھو۔ تھانیدار اپنی نئی ڈیوٹی سنبھالنے شری داتا گیا ہے۔ وڈیرا بھی اس
کے ساتھ جا چکا ہے۔ تمہاری بہن شرم والی تھی۔ اس نے آبرو پر آنچ آنے سے پہلے ہی
خودکشی کر لی۔"

"نہیں!" اس کی گرج دار آوازیں عقوبت خانے میں گونجنے لگیں۔ وڈیرے کے
ملازم اور دو سپاہی سہمے سہمے' دوڑتے ہوئے باہر آئے پھر بولے۔ "وہ غضب ناک ہو گیا
ہے۔ اسے لوہے کی سلاخیں مارو تب بھی وہ تکلیف سے چیخنے کے باوجود کمر کی طرف سے
مڑ کر اوپر کی طرف اٹھ گیا ہے اور پیروں سے اور شہتیر سے بندھی ہوئی رسّی کو دانتوں
سے کاٹ رہا ہے۔"

ارمانہ اپنے دو مسلح باڈی گارڈز کے ساتھ جیل کے باہر آئی۔ اس وقت تک لوگوں کا
شور سنائی دینے لگا تھا۔ وڈیرے کے ملازم اور سپاہی جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ امداد جمالی
نے ایک سپاہی سے رائفل چھین لی تھی۔ اس میں دو کارتوس تھے۔ اس سے دو سپاہیوں کو
مارا تھا۔ پھر رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کر لاٹھی کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ ظلم کرنے
والے ملازموں اور سپاہیوں کو دوڑا دوڑا کر مار رہا تھا۔

ارمانہ اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے دور امداد جمالی الف ننگا تھا مگر
اسے اپنا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وڈیرے کی حویلی قریب ہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اس حویلی میں
گھس گیا۔ اور اب اندر بہت سی عورتوں اور مردوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں کئی عورتیں اور ملازمین حویلی کے اندر سے بھاگتے ہوئے باہر آئے۔
ارمانہ دھیمی رفتار میں ڈرائیو کرتی ہوئی حویلی کے سامنے سے گزرنے لگی۔ اب وڈیرے
کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کار روک کر باہر نکل کر دیکھنے لگی۔ حویلی کی چھت پر
منڈیر کے پاس وڈیرا لہو لہان دکھائی دے رہا تھا۔ امداد جمالی کا ایک اور بھرپور ہاتھ کھا کر
تکلیف سے چیخ رہا تھا۔ جمالی نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر منڈیر پر پٹخ دیا۔ اس بار
وڈیرے میں چیخنے کی سکت نہ رہی۔ جمالی نے اسے دوسری بار دونوں ہاتھوں سے اٹھایا پھر
اسے منڈیر پر پٹخ دیا۔ اب نہ اس کی چیخ سنائی دی اور نہ وہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔

شاید بے ہوش ہو گیا تھا یا نصف موت واقع ہو چکی تھی۔ جمالی نے تیسری بار اسے
دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے سر سے بلند کیا پھر اسے حویلی کی بلندی سے نیچے پھینک دیا۔

ارمانہ پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے
سوچنے لگی۔ اب یہ درندہ بن گیا ہے یا تو پولیس کی گولیوں سے مارا جائے گا یا پھر وڈیرے
کی طرح اس عیاش تھانیدار کو بھی ختم کرنے کے لئے شری داتا کی طرف جائے گا۔

وہ ڈرائیو کرتی ہوئی اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں گارڈز سے بولی۔ ”آگے گڑھی
کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ تم دونوں وہاں سے ٹرین کے ذریعے شہداد کوٹ‘ کبر اور لا
کی طرف جاؤ اور اپنے ساجد صاحب کو تلاش کرو۔“

اس نے گڑھی خیرو پہنچ کر ان گارڈز کو دو ہزار روپے دیئے۔ پھر تنہا ڈرائیو کرتی
خانپور کی سمت جانے لگی۔ ایک خان پور پنجاب میں ہے۔ اسی نام کا ایک چھوٹا سا
بلوچستان میں بھی ہے۔ وہ کیسٹ ریکارڈر آن کر کے موسیقی سنتی ہوئی اطمینان سے ڈ
کر رہی تھی۔ خانپور پہنچنے سے پہلے ہی اس نے کار روک دی۔ سامنے سے ایک گھڑ
آ رہی تھی۔ اس کی سواری کا جارحانہ انداز اور گھوڑے کی تیز رفتاری دیکھ کر ہی وہ
گئی کہ گھوڑوں کی شہزادی اور بلائے جاں آرزو جاں آ رہی ہے۔

وہ برق رفتاری سے آتی ہوئی کار کے قریب سے گزر گئی۔ پھر لگام کھینچتی ہوئی
دور تک گئی۔ گھوڑا رکتے رکتے پکی سڑک پر اپنے آہنی نعلوں سے چنگاریاں اڑاتا ہوا
گیا۔ اس کے گھوڑے بھی اس کی شخصیت میں رعب اور دبدبے کا اضافہ کرتے
یوں لگتا تھا جیسے وہ لڑکی آتش پا ہے۔ چلتے ہوئے بھی اور رکتے رکتے بھی چنگاریاں ا
ہے اور شعلے بھڑکاتی ہے۔

اس نے لگام موڑ دی۔ گھوڑا اس کے ایک ایک اشارے کو سمجھتا تھا۔ اس
اطمینان سے ڈلکی چلتا ہوا مرسڈیز کے قریب آ کر رک گیا۔ ارمانہ نے کہا۔ ”ہیلو آر
میں تمہارے علاقے میں آئی ہوں اور تم شاید میرے علاقے میں جا رہی ہو۔“

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”کل تم نے اپنی دوسری شادی کی دعوت نہیں دی۔
نے سوچا چل کر تمہیں شادی نہ ہونے کی مبارک باد دے دوں۔“

”تم زہر میں بجھی ہوئی باتیں کرتی ہو۔ کیا شادی نہ ہونے کی مبارک باد دی
ہے۔“

”بے شک عورت تنہا رہے‘ مرد ساتھ نہ رہے تو زیادہ پُرکشش اور ان ٹچڈ
ہے۔ میں تمہیں اچھوتی اور پُرکشش نظر آنے کی مبارک باد دے رہی تھی مگر بات تم
سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لئے کہ تم مرد کے پیچھے بھاگنے والی عورت ہو۔“

”میں مرد کے پیچھے نہیں‘ مرد میرے پیچھے بھاگتے ہیں۔ افسوس کہ تمہیں یہ
حاصل نہیں ہے۔ آج تک کسی مرد نے تمہیں لفٹ نہیں دی۔ اس لئے رشتے کے ا
میں بوڑھی ہو رہی ہو۔“

اس نے لگام کا اشارہ دیا۔ گھوڑا پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو کر اگلی دو ٹانگیں ا

ہنہنانے لگا۔ وہ ہنہناہٹ کے ساتھ قہقہے لگا کر بولی۔ ”کنواری سدا بہار رہتی ہے۔ کبھی
بوڑھی نہیں ہوتی۔ بوڑھی وہ ہوتی ہے جسے پہلا شوہر ٹھکرا دیتا ہے اور دوسرا دولہا بارات
واپس واپس لے جاتا ہے۔ تجھے دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے۔

نہ خدا ہی ملا‘ نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

”بکواس مت کر۔ میں کسی دوسرے پر تھوکتی ہوں۔ میرا پہلا شوہر ہی میرے لئے
آخری ہے۔ میں اسے تلاش کرنے اس علاقے میں آئی ہوں۔“

”ہم مہمان نواز ہیں۔ اپنے علاقے میں آنے والے کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے۔
میں تجھے یہاں کے تمام خفیہ اڈوں تک لے جا سکتی ہوں لیکن تیری مرسڈیز میرے
گھوڑے کے ساتھ نہیں دوڑ سکے گی۔“

”کیوں نہیں دوڑ سکے گی؟ یہ تو ایسے دوڑے گی کہ تیرا گھوڑا ہانپنے لگے گا۔“

”تو پھر ہو جائے شرط۔ اگر تیری مرسڈیز میرے گھوڑے کے ساتھ دوڑے گی تو میں
تیرے ساجد کو ڈھونڈ کر لے آؤں گی اور اگر تو پیچھے رہ جائے گی اور میرے گھوڑے کی
گرد کو بھی نہ پا سکے گی تو اس علاقے سے تجھے ساجد کبھی نہیں ملے گا۔“

وہ کار اسٹارٹ کرتی ہوئی بولی۔ ”مجھے منظور ہے۔ اپنا گھوڑا بڑھاؤ۔“

دونوں ایک ساتھ آگے بڑھیں۔ دونوں کی رفتار تیز تر ہونے لگی۔ مرسڈیز کے
ڈیش بورڈ پر رفتار کا کانٹا پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار بتاتے ہوئے سو میل اور ایک سو بیس
میل فی گھنٹے کی رفتار پر پہنچ گیا۔ گھوڑا کیا خوب سدھایا ہوا تھا۔ بڑی برق رفتاری سے کار
کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ارمانہ کو کبھی کبھی رفتار کم کرنی پڑتی تھی۔ راستہ پختہ ہونے کے
باوجود ہموار نہیں تھا۔ کہیں کہیں شکستہ تھا۔ کہیں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ ایسی جگہ گھوڑا
بہت آگے نکل جاتا تھا۔

اور ایسی ہی ایک جگہ گھوڑا آگے جا کر کہیں گم ہو گیا۔ ارمانہ نے بہت دور تک جا کر
دیکھا‘ آرزو نظر نہیں آئی۔ وہ جھنجلا گئی کہ ساجد کو تلاش کرنے کے لئے آرزو کے
گھوڑے کے پیچھے کیوں دوڑ رہی ہے۔ وہ یہاں اس نک چڑھی مغرور لڑکی کا سہارا لینے
نہیں آئی تھی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اب آرزو آئے گی تب بھی وہ اس کے پیچھے نہیں جائے گی۔
اسی وقت گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ پھر راستے کے موڑ پر سامنے وہ گھڑسوار آتی دکھائی
دی۔ وہ کار سے بہت آگے نکل جانے کے بعد واپس آ رہی تھی۔ کار کے قریب آ کر

گھوڑے کو روکتے ہوئے بولی۔ "گھوڑے اور مرسڈیز میں یہی فرق ہے۔ مرسڈیز کا پٹرول
ختم ہو جاتا ہے۔ گھوڑا کبھی خالی نہیں ہوتا۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "کار کی ٹنکی فل ہے۔ فاضل پٹرول بھی ہے مگر میں ساجد کو
تلاش کرنے کے لئے تیرا احسان نہیں لوں گی۔"

وہ سینہ تان کر بولی۔ "میرا احسان تو لینا ہو گا۔ ورنہ ہمارے علاقے میں بھٹک کر ناکام
واپس جاؤ گی۔"

یہ کہہ کر اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک آڈیو کیسٹ نکالا۔ پھر اس کی طرف
کار کے اندر پھینکتی ہوئی بولی۔ "اس کیسٹ کو سنو۔ تمہارا بھلا ہو گا۔"

وہ لگام موڑ کر گھوڑے کو آرام سے چلاتی ہوئی واپس اُدھر جانے لگی جدھر ارمانہ کا
علاقہ تھا۔ ارمانہ نے کیسٹ کو ریکارڈر میں لگا کر اسے آن کیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ساجد کی
آواز ابھری تو وہ چونک گئی۔ چابک مارنے کی آواز کے ساتھ ساجد کی کراہیں سنائی دے
رہی تھیں۔ وہ تکلیف سے اور نقاہت سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے جانور سمجھ کر اس طرح نہ
مارو۔ تم کون ہو؟ مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

پھر چابک کی آواز کے ساتھ ساجد کی کراہ سنائی دی۔ اس کے بعد کیسٹ خاموش ہو
گیا۔ ارمانہ نے اسے آف کیا پھر فوراً ہی کار سے اتر کر دور جانے والی آرزو کو دیکھا
اسے آواز دی۔ "اے! تم بہت چالاک بنتی ہو۔ رک جاؤ۔ واپس آؤ۔ میرے ساجد کے
پاس مجھے لے چلو۔"

لیکن وہ رک نہیں رہی تھی۔ گڑھی خیرو کی سمت ارمانہ کے علاقے کی طرف اس
گھوڑا آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ وہ پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے واپسی
کے لئے موڑنے کے بعد رفتار تیز کر دی۔ آرزو نے پلٹ کر دیکھا کہ مرسڈیز تیز رفتار
سے آ رہی ہے تو اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ وہ آگے بڑھ کر چابک کھاتے ہوئے اپنی
رفتار کو تیز سے تیز کرنے لگا۔

اس کے تعاقب میں آنے والی ارمانہ کار کی کھڑکی سے سر نکال کر کہہ رہی تھی
"میں سمجھ گئی ہوں کہ تم نے ساجد کو اپنے ہارس فارم میں قید کر رکھا ہے لیکن تم ادھر
راستہ بدل کر مجھے میرے علاقے کی طرف لے جا رہی ہو۔ میں کہتی ہوں' رک جاؤ۔ مجھ
سے سودا کرو۔ بولو ساجد کی واپسی کی کیا قیمت لو گی۔"

وہ جواب نہیں دے رہی تھی۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑائے جا رہی تھی۔ کار کے
ساتھ وہی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ راستہ پختہ ہونے کے باوجود ہموار نہیں تھا۔ گ

بلکہ سے کولتار اکھڑا ہوا تھا۔ اس روز اسے گھوڑے کے مقابلے میں مرسڈیز کمتر لگ رہی
تھی۔ وہ اب تک اسمبلی میں ساجد کو کیش کرا کے مرسڈیز خریدتی آئی تھی۔ اس روز وہی
مرسڈیز اسے ساجد جیسے گھوڑے تک پہنچانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ اگر وہ گھوڑا واپس
مل جاتا اور برسرِ اقتدار پارٹی کی منڈی میں فروخت ہو جاتا تو اسے ایک کروڑ روپے کا
معاوضہ مل جاتا۔

اس کامیابی کا انحصار گھوڑے پر تھا اور وہ گھوڑوں کی شہزادی اسے اپنے پیچھے دوڑا
رہی تھی۔ پھر اس نے گھوڑے کی لگام جنگل کی طرف موڑ لی۔ گھوڑا پختہ سڑک سے اتر
کر گھنے درختوں کے درمیان جانے لگا۔ ارمانہ نے بھی کار سڑک سے اتاری۔ اسے
درختوں کے درمیان گھاس پر دوڑانے لگی لیکن رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ جنگل کی زمین
سڑک سے زیادہ ناہموار تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں سے کترا کر آگے بڑھنے میں وقت
ضائع ہوتا تھا۔

اس نے کار روک دی۔ گھوڑا برق رفتاری سے دوڑتا ہوا جنگل میں کہیں گم ہو گیا
تھا۔ وہ دل ہی دل میں گالیاں دینے لگی کہ آرزو کو زندہ نہیں چھوڑے گی اور اس کے
ہارس فارم میں جا کر وہاں سے ساجد کو رہائی دلا کر لائے گی۔

وہ قسمیں کھانے کے باوجود یہ جانتی تھی کہ اس کے ہارس فارم میں بے شمار مسلح
افراد رہتے ہیں۔ پولیس والے اور دوسرے سرکاری افسران بھی پہلے سے اطلاع دیئے بغیر
وہاں قدم نہیں رکھتے تھے۔ اس نے سوچا۔ وہ پہلے اپنے باپ جمال خان سوہو کو بتائے گی
کہ ساجد کو کہاں قید کیا گیا ہے۔ وہ آرزو کے باپ مصری خان کھچی سے اس کی واپسی کے
معاملات طے کر سکتا تھا۔

ایک کروڑ کا گھوڑا آرزو کے فارم میں چلا گیا تھا۔ ارمانہ اسے جلد سے جلد رہائی دلا
کر کیش کرانے کے لئے اپنے باپ کے پاس اپنے علاقے کی طرف جانے لگی۔

آرزو گھنے جنگل میں گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے ایک جگہ رک گئی تھی۔ وہ سمجھ
رہی تھی کہ ارمانہ کی کار اس گھنے جنگل میں نہیں آ سکے گی۔ اب وہ ساجد کو حاصل کرنے
کے لئے بے چین رہے گی اور اسے اپنے پیچھے دوڑاتے رہنے کے باعث تلملاتی رہے گی۔
اسے ارمانہ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی لیکن اسے نیچا دکھانے میں مزہ آتا تھا۔ اپنی
برتری کا احساس ہوتا تھا۔ ارمانہ بھی اسے کمتری کا احساس دلانے کے لئے کہتی تھی کہ
مصری خان کی بیٹی گھوڑوں میں رہ کر خود گھوڑی بن گئی ہے۔ دقیانوسی خیالات رکھنے والی'
پرانے زمانے کی گھڑسواری کرتی ہے۔ بیچاری انسان ہوتی تو مرسڈیز میں بیٹھ کر انسانی ترقی

اور بلند مرتبے کو سمجھ پاتی۔
ان کی ملاقات کبھی کبھی ہوتی تھی۔ اکثر موبائل پر دونوں کی جھڑپیں ہوتی تھیں۔ آرزو اسے جواب دیتی تھی۔ "تم مرسڈیز پر بیٹھنے کے لئے گھوڑے کی محتاج ہو۔ جب تک اپنے مردا سمبلی کو گھوڑا بنا کر فروخت نہیں کرو گی، تمہیں مرسڈیز کا ایک پہیہ بھی نہیں ملے گا۔ یاد رکھو مرسڈیز جتنی پرانی ہوتی ہے' کھٹارا بنتی جاتی ہے۔ سیاست داں جتنا بوڑھا ہوتا ہے' اتنا ہی اس کے گھوڑا بننے کی صلاحیت جوان ہوتی ہے۔"
اس نے موبائل فون کے ذریعے رابطہ قائم کر کے کہا۔ "ہیلو ارمانہ! تم مجھے نہ پاسکیں' میں جنگل میں ہوں مگر تمہاری مرسڈیز ادھر نہیں آسکتی۔ یہی گھوڑے کا کمال ہے۔ یہ سڑکوں سے دلدلی جنگلوں تک اور اسمبلی سے امریکہ تک پہنچ جاتا ہے۔"
ارمانہ چیخ کر بولی۔ "یو شٹ اپ! تم نے ساجد کو کیوں قید کیا ہے؟"
"تمہاری بھلائی کے لئے۔ ایک بار میں نے کہا تھا کہ سیاست دان جتنا بوڑھا ہوتا ہے اتنا ہی اس کے گھوڑا بننے کی صلاحیت جوان ہوتی ہے۔ لہٰذا میں تمہارے گھوڑے کو باندھ کر' چابک مار مار کر اسے مصائب میں مبتلا کر کے بوڑھے گھوڑوں کی طرح تجربہ کار بنا رہی ہوں۔"
"فضول باتیں نہ کرو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ساجد کی خاطر ہمارے درمیان خون خرابا شروع ہو جائے؟"
"ساجد کی خاطر ہمارے بزرگ کیوں لڑیں گے؟ لڑائی سے پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ساجد میری قید میں ہے۔"
"ثبوت کے لئے یہ کیسٹ کافی ہے۔"
"کیسٹ کو پھر ایک بار سنو' کیا چابک کی آواز سے اور ساجد کی باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں نے اسے قید کیا ہے؟ کیا اس نے میرا نام لیا ہے؟ اس میں میری آواز سنائی دے رہی ہے۔"
"پلیز آرزو! تاوان کی منہ مانگی رقم لو اور اسے واپس کر دو۔"
آرزو جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی مگر چونک کر دور ایک گھنی جھاڑی کی سمت دیکھنے لگی۔ اس نے موبائل فون کو آف کر دیا۔ کوئی شخص ایک درخت کے پیچھے سے چھلانگ لگا کر جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ حیرانی سے ادھر اس لئے دیکھ رہی تھی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چھپنے والا بالکل بے لباس تھا یا شاید ایک پتلا سا لنگوٹ باندھے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ اور تمام جسم لہو میں نہایا ہوا تھا۔ وہ قد آور پہاڑ جیسے چٹانی بدن کی جھلک دکھا کر چھپا

ے آرزو کو وہ گھوڑا لگا۔ کیونکہ گھوڑے ننگے ہوتے ہیں اور ایسے جی دار ہوتے ہیں کہ یدانِ جنگ میں لہولہان ہو کر بھی چھلانگیں لگانے کی توانائی رکھتے ہیں۔
پھر اس نے ایک سمت دیکھا۔ دور سے ایک جیپ اور ایک لینڈ کروزر آرہی تھیں۔ ں میں مسلح سپاہی تھے۔ وہ گاڑیاں آرزو کے قریب آکر رک گئیں۔ لینڈ کروزر سے دو پکٹر باہر آئے۔ دونوں نے آرزو کو سلام کیا۔ ایک نے کہا۔ "مس صاحبہ! ہماری بستی ے ایک ننگ دھڑنگ آدمی بھاگتا ہوا ادھر آیا ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے۔ کیا آپ نے ے دیکھا ہے؟"
"ہاں۔ وہ زخموں سے چُور ہے۔ اپنے لہو میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا ہے۔ جبکہ ب تعاقب کرنے والوں نے ایک زخم بھی نہیں کھایا ہے۔ زخم دینے والے خطرناک تے ہیں اور زخم کھانے والا مظلوم۔ پھر اسے خطرناک کیسے کہہ رہے ہو؟"
دوسرے انسپکٹر نے کہا۔ "میں نے کل ہی استہ گوٹھ کا چارج سنبھالا ہے۔ میں قسم ھا کر کہتا ہوں کہ آج تک ایسا خطرناک' ضدی اور طاقت ور شخص میں نے نہیں دیکھا۔ ہ سے پہلے والے تھانیدار نے اسے وڈیرے سائیں کے ٹارچر سیل میں الٹا لٹکایا تھا۔ پھر یرے کے ملازموں اور ہمارے سپاہیوں نے اس کی جیسی پٹائی کی تھی' اس کے نتیجے میں ے مرجانا چاہیے لیکن اسے مارنے والے تھک گئے۔ ان کے تین ڈنڈے اور پانچ ٹھیاں ٹوٹ گئیں۔ لوہے کی سلاخوں سے مارو تو وہ پہلے تکلیف سے چیختا تھا پھر قہقہے لگا کر لتا تھا کہ تھانیدار اور وڈیرے سائیں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"
آرزو کی آنکھوں میں مسرتوں کی چمک تھی۔ دل اس خوشی سے دھڑک رہا تھا کہ ے انتظار کے بعد گھوڑے جیسا آئیڈیل شخص ملنے والا تھا۔ انسپکٹر بتا رہا تھا کہ وہ کس لرح رسیاں توڑ کر فرار ہوا تھا۔ اس نے دو سپاہیوں کو گولیوں سے ہلاک کیا تھا۔ باقی قابلے پر آنے والوں کے ہاتھ پاؤں توڑے تھے پھر حویلی میں جا کر وڈیرے کو مار مار کر ے حویلی کی چھت سے نیچے پھینک دیا تھا۔ اب وہ تھانیدار کو ہلاک کرنے شری داتا کی لرف جا رہا ہے۔
پھر انسپکٹر نے پوچھا۔ "آپ نے اسے دیکھا تھا۔ وہ کدھر گیا ہے؟"
آرزو نے ایک سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ادھر کچے راستے کی لرف گیا ہے۔"
وہ دونوں انسپکٹر شکریہ ادا کر کے جانا چاہتے تھے۔ آرزو نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ اس کے رن پر کپڑا کیوں نہیں ہے؟"

ایک انسپکٹر نے کہا۔ ادھر وڈیرے کی نجی جیل میں میڈم ارمانہ اپنے شوہر کو
کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے اسے کپڑے پہننے کے لئے کہا تھا ان کے کہنے پر اس
ایک چھوٹا سا لنگوٹ باندھ لیا ورنہ اس درندے نے قسم کھائی ہے کہ اپنی بہن کی عزت
ہاتھ ڈالنے والوں کو جب تک ہلاک نہیں کرے گا' تب تک لباس نہیں پہنے گا اور نہ
پیٹ بھر کر کھانا کھائے گا اور یہ کہ ننگے پاؤں ہی تھانیدار کے تعاقب میں دوڑتا رہے گا

آرزو نے دل ہی دل میں کہا۔ "واہ! کیا شہ زور اور کیسا زبردست مردانہ خصلت
گھوڑا ہے۔ اصیل کی پہچان یہی ہے کہ وہ خریدے ہوئے گھوڑے کی طرح ٹرک پر سفر
کرے۔ پورے ہارس پاور کے ساتھ میلوں دور تک اپنے پیروں پر دوڑتا جائے۔"

دونوں انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ گاڑیوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔ جب وہ دور جا
نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس نے گھوڑے کو لگام سے اشارہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ
ہوا گھنی جھاڑیوں کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ بولی۔ "تمہارے دشمن جا چکے ہیں۔
خاردار جھاڑیوں سے نکل آؤ۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر وہ بولی۔ "مجھے دوست سمجھو۔ میں تمہارے کام
چاہتی ہوں۔"

جھاڑیوں سے اس کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔ "تمہاری جیسی ایک عورت
عقوبت خانے کے باہر سے کہا تھا کہ میں کپڑے پہن لوں۔ تھانیدار اور وڈیرا وہاں
شری داتا چلے گئے ہیں اور میری بہن کی آبرو سلامت رہی تھی۔ بہن کو دشمنوں نے نہ
مارا اس نے خود کشی کی ہے۔ مگر یہ سب جھوٹ تھا۔"

"ایک عورت نے جھوٹ کہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سب ہی جھوٹی ہیں
ایک بار مجھے آزماؤ۔ میں تمہاری راہنمائی کروں گی اور تمہیں اس عیاش تھانیدار تک
پہنچاؤں گی۔"

جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ وہ ہل رہی تھیں۔ پھر وہ سر سے پیٹ تک
نظر آیا۔ لہو سے سرخ ہو رہا تھا۔ قد کی اونچائی' بدن کی چوڑائی اور سختی بتا رہی تھی
زبردست باڈی بلڈر ہے۔ گھوڑے کے ننگے بدن کی طرح اس پر بھی موسموں کے سرد
گرم کا اثر نہیں ہوتا ہو گا۔ آرزو کی آنکھیں خوابناک سی ہو گئی تھیں۔

وہ بولا۔ "میں دیکھ رہا تھا' تم نے پولیس کو دوسری طرف بھٹکا دیا ہے۔ ان
تعاقب کرنے کی وجہ سے میں بھی بھٹک گیا ہوں۔ راستہ بھول گیا ہوں۔ مجھے بتاؤ
سمت جانا ہو گا؟"

وہ بولی۔ "شری داتا یہاں سے دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ کیا اتنی دور پیدل جاؤ
گے؟"

"تم سن چکی ہو کہ میں ننگے پاؤں اس کمینے کا تعاقب کروں گا۔ حویلی کے آدمیوں
نے مجھ سے خوفزدہ ہو کر بتایا کہ اس ذلیل بدمعاش نے میری بہن کو بے لباس کیا تھا۔ اب
میری کیا عزت اور غیرت رہ گئی ہے کہ میں لباس پہنوں۔ صدیوں پہلے انسان بھی جانوروں
کی طرح ننگا رہتا تھا۔ پھر اسے تہذیب نے اور شرم نے لباس پہننا سکھایا۔ یہی تہذیب
والے بہت زیادہ بااختیار ہو کر لباس اتار دیتے ہیں۔ ہماری بہنوں اور بیٹیوں کی شرم نہیں
رکھتے ایسے میں اب میرے لئے شرمانے کو کیا رہ گیا ہے۔"

وہ بولی۔ "میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں۔ تمہیں لباس نہیں پہننا چاہئے۔
دیکھو میرا گھوڑا بھی ایسا ہی ہے۔ تم ایسی حالت میں بدلتے موسموں کا مقابلہ کرتے رہو
گے تو سخت جان بن جاؤ گے۔"

"تم موسموں کی بات کرتی ہو۔ میں آج رات تک وہاں پہنچ کر اسے قتل کر دوں گا۔
اسے بھی بے لباس کر دوں گا۔ پھر کفن کے بغیر زمین میں گاڑ دوں گا۔ جب انتقام پورا ہو
جائے گا تو میں پورا لباس پہنوں گا۔ پھر ننگے پاؤں بھی نہیں رہوں گا۔"

آرزو نے دل ہی دل میں کہا۔ "انتقام پورا نہیں ہونا چاہئے۔ میں اس گھوڑے کو
دوڑاتی رہوں گی۔ تھانیدار کو اس کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گی۔"

پھر وہ بولی۔ "تم اس حالت میں انسانی آبادی سے گزرو گے تو تماشا بن جاؤ گے۔
تمہارا چرچا ہو گا تو وہ تلاش کرنے والے انسپکٹر اور سپاہی تمہیں پا لیں گے۔ چونکہ وہ تم
سے خوفزدہ ہیں اس لئے دور ہی سے تمہیں گولی مار دیں گے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا ان جنگلات سے گزر کر وہاں تک پہنچنے کا راستہ ہے؟"

"ہاں' میں تمہیں جنگلوں اور ویرانوں سے لے چلوں گی۔ میرے پیچھے آؤ۔"

اس نے لگام ایک طرف موڑی۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ وہ دھیمی رفتار سے دوڑنے
لگا۔ اس کے پیچھے امداد جمالی بھی دوڑ رہا تھا۔

یہ آرزو کا خواب تھا جو تعبیر بن کر پیچھے آ رہا تھا۔ وہ یہی سوچتی تھی کہ کوئی گھوڑے
جیسی موٹی کھال والا شہ زور اور اڑیل جوان ملے گا تو وہ شادی کرے گی اور بالکل گھوڑے
کی طرح اس کی پرورش کرے گی۔ اگر وہ تابعدار رہے گا تو اسے اپنی کوٹھی میں لائے گی۔
ورنہ اسے اصطبل میں رکھے گی اور گھوڑوں کی طرح اسے چنے اور بیسن کی روٹیاں کھلایا
کرے گی۔ یہی اس کے لئے کافی ہو گا کیونکہ گھوڑے کا اصلی چارا ایک انسانی گھوڑا نامہ کھا

سکے گا' نہ ہضم کر سکے گا۔

وہ کبھی کبھی گھوڑے کو تیز دوڑاتی تھی۔ پیچھے آنے والا بھی تیز رفتار سے دوڑنے لگتا تھا۔ اگرچہ گھوڑے کی رفتار کو نہیں پہنچ سکتا تھا پھر بھی زخموں سے چُور ہونے کے باوجود بڑی قوتِ ارادی سے دوڑ لگا رہا تھا۔ ایک بار آرزو نے اس سے کافی دور نکل کر موبائل فون کے ذریعے اپنے باڈی گارڈ جابر خان کو مخاطب کیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "حکم بی بی جی؟"

"میں اپنے پیچھے ایک زخمی شخص کو دوڑاتی ہوئی لا رہی ہوں۔ ہمارے فارم کے اندر داخل ہوتے ہی آہنی گیٹ بند کر دینا۔ اگر میرے ساتھ آنے والا کوئی اعتراض نہ کرے اور میرے مشوروں پر عمل کرتا رہے تو اس سے دور ہی رہنا۔ اگر وہ فارم میں رہنے سے انکار کرے اور احاطے سے باہر جانا چاہئے تو اس پر جال پھینک کر اسے اصطبل میں باندھ دینا۔ یاد رکھو' وہ بہت اڑیل اور شہ زور ہے۔ دو چار کے بس کا نہیں ہے۔ اسے قیدی بنانے کے لئے اپنے ایک درجن شہ زوروں کا انتخاب کرو۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچنے والی ہوں۔"

"آپ کے احکامات کی تعمیل ہوگی۔ اور حکم بی بی جی؟"

"میں ابھی تھوڑی دیر میں فون کروں گی۔ تم سے پوچھوں گی کہ شری داتا کا تھانیدار اپنے تھانے اور علاقے میں موجود ہے یا نہیں؟ تم جواب دو گے کہ تم نے فون کر کے معلوم کیا تھا' وہ تھانیدار کہیں روپوش ہو گیا ہے اور اس چھوٹے سے شہر میں بے شمار مسلح سپاہی اور کئی پولیس افسران نے ناکہ بندی کی ہے اور اپنی گاڑیوں میں گشت کر رہے ہیں۔ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ایک شخص جو زخموں سے چُور اور مادر زاد ننگا ہے کہیں دکھائی دے تو اس کے بارے میں فوراً پولیس کو اطلاع دی جائے۔ وہ بہت خطرناک مجرم ہے جو اسے گولی مارے گا اسے دس ہزار روپے نقد انعام دیئے جائیں گے۔"

اس نے ہدایات دے کر رابطہ ختم کیا پھر لگام کھینچ کر گھوڑے کو روکا۔ اسے پیچھے کی طرف موڑا' وہ دو پاؤں کا زخمی گھوڑا دوڑتا آ رہا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو وہ گھوڑے کو اس کے ساتھ دوڑاتی ہوئی بولی۔ "میں نے فون کے ذریعے اپنے خاص آدمیوں نے کو حکم دیا ہے کہ وہ شری داتا کے نئے تھانے دار کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ اگر وہ اپنے علاقے میں موجود ہو تو فوراً وہاں جا کر دور ہی دور سے اس کی نگرانی کریں۔ اسے کہیں چھپنے اور بھاگنے کا موقع نہ دیں۔"

وہ دوڑتے دوڑتے ہانپتے ہوئے بولا۔ "تم بہت اچھی ہو۔ اگر تھانیدار کو دوسرے

لیس والوں نے میری آمد کے متعلق اور میرے ارادوں کے متعلق نہیں بتایا ہوگا تو وہ رور وہاں میرے ہاتھوں مرنے کے لئے موجود رہے گا۔"

وہ بولی۔ "تم نے طیش میں آ کر اسے جان سے مار دینے کا اعلان کر کے غلطی کی ہے۔ اسے ضرور اطلاع مل گئی ہوگی اور پولیس والے اس کے لئے حفاظتی انتظامات کر رہے ہوں گے۔ ویسے تمہارا کیا نام ہے؟"

وہ اپنا نام بتا کر بولا۔ "کیا میں اپنی محسنہ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میں مصری خان کچھی کی بیٹی آرزو جہاں ہوں۔"

اس نے دوڑتے ہوئے اسے دیکھا اور کہا۔ "میں جاگیرانی کا رہنے والا ہوں اور یہ نتا ہوں کہ ڈاکو مصری خان کا رعب اور دبدبہ یہاں سے اسلام آباد تک ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "جو بھی شخص اسلام آباد تک اپنی اہمیت منوالے' وہ پھر قاتل' نگر اور ڈاکو نہیں رہتا ہے۔ حکومتِ وقت اسے وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیتی ہے۔ اسے راعات اور بہت سے اختیارات دیتی ہے۔ صرف اپوزیشن والے میرے بابا کو ڈاکو کہتے ں اور اخبارات والے انہیں ڈاکو لکھتے ہیں۔ اس سے ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں تا۔"

وہ بولا۔ "ہاں میں نے جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر دیکھا تھا۔ پولیس کے دونوں سران تمہیں سلام کر رہے تھے۔ سلام کے معنی ہیں سلامتی۔ ہمارے ملک کے پولیس لے ڈاکوؤں پر سلامتی بھیجتے رہتے ہیں۔"

"اگر تم دوست بن جاؤ' میرے ساتھ رہو تو یہ لوگ تمہیں بھی سلام کریں گے۔"

"میں نے دو سپاہیوں اور ایک وڈیرے کو قتل کیا ہے۔ اب تھانیدار کو حرام موت نے والا ہوں۔ یہ لوگ کبھی مجھے سلام نہیں کریں گے۔ میرا کام تمام کر دیں گے۔"

"تمہاری طرف قانون کے ہاتھ کبھی نہیں بڑھیں گے۔ سزائیں صرف کمزوروں کو رو وسیع اختیارات سے محروم رہنے والوں کو ملتی ہیں۔ تم جوان ہو' بہت لمبی زندگی جی تے ہو۔ اگر جینا چاہو تو میرے ساتھ رہو۔ میں تمہارے لئے قانون کے فیصلے بدل دوں ی۔"

"تم ایک خطرناک قاتل کو سزائے موت سے کیسے بچاؤ گی؟"

"جیسے ایک خطرناک مگر حکومتِ وقت کے وفادار ڈاکو کو بچایا جاتا ہے۔ میرے بابا لیس اور انتظامیہ کو مجبور کر دیں گے۔ پھر تمہاری لاش کی تصاویر اخبارات میں شائع کرا ا جائیں گی کہ تم پولیس مقابلے میں مارے گئے ہو۔ ایسی اخباری موت بعد کے تمہیں

نئی زندگی مل جائے گی۔"

اس نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے سوچتا رہا۔ آرزو موبائل فون سے پھر رابطہ کیا۔ پھر گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی جابر خان کی رپو سننے لگی۔ اس کے بعد بولی۔ "جابر خان! تم یہ رپورٹ میرے ایک دلیر دوست امداد کو سناؤ۔"

وہ موبائل لے کر کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ "ہیلو جابر خان! میں امداد جمالی بول ہوں۔"

جابر خان کی آواز آئی۔ "آپ بی بی جی کے دوست ہیں۔ اس تعلق سے ہمارے ہیں۔ میں نے ابھی شری داتا کے نئے تھانیدار کے بارے میں معلومات حاصل کی ہ وہاں شہر میں بے شمار پولیس کے افسران اور سپاہی پھیلے ہوئے ہیں۔ تمام اہم راستو ناکہ بندی کی گئی ہے۔ گشت کرنے والے افسران اعلان کرتے پھر رہے ہیں کہ جو بالکل بے لباس اور زخموں سے چُور نظر آئے' اس کی اطلاع پولیس کو دی جائے یا دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔ جو پولیس کو اس کے متعلق اطلاع دے گا یا اسے ہلاک ک گا اسے دس ہزار روپے نقد انعام دیئے جائیں گے۔"

"میں سمجھ رہا تھا کہ پولیس والے میرے خون کے پیاسے ہوں گے۔ یہ بتاؤ تھ دار کہاں ہے؟"

جابر خان نے کہا۔ "بی بی جی کے نمک خوار تمام تھانوں میں رہتے ہیں۔ ان میں ایک نے بتایا ہے کہ تھانے دار کو وہاں سے تھانے کا چارج لینے سے روک دیا گیا تھا ایک افسر اور چند سپاہی اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر کہیں لے گئے ہیں۔"

"کچھ تو معلوم کرو کہ اسے کہاں لے جا کر چھپایا گیا ہے؟"

"بی بی جی کے کئی نمک خوار اس کوشش میں ہیں۔ پولیس والے اتنی رازداری کام لے رہے ہیں کہ اس تھانیدار کی پناہ گاہ تک پہنچنے میں دو چار دن لگ سکتے ہیں۔"

"کیا میں دو چار دن تک اسی حالت میں بھٹکتا رہوں گا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب عالی! آپ اس سلسلے میں بی بی سے بات کریں۔"

امداد جمالی نے آرزو کو فون دے دیا۔ وہ جابر خان سے باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی بعد فون بند کر کے بولی۔ "امداد جمالی! میں نے تمہیں دوست کہا ہے۔ اس لئے شری داتا نہیں جانے دوں گی وہاں جا کر بے موت مرو گے۔ تھانے دار سے انتقام لے سکو گے۔"

وہ گھوڑے کے ساتھ دوڑتا ہوا بولا۔ "تم درست کہتی ہو۔ وہ اپنے لئے حفاظتی انتظامات کر چکا ہے اور کہیں روپوش ہو گیا ہے؟"

وہ دوڑتے دوڑتے رک گیا۔ پھر بولا۔ "اب میں کیا کروں؟ اسے کہاں ڈھونڈنے جاؤں؟"

وہ گھوڑے کو روک کر اس کی طرف پلٹ گئی پھر بولی۔ "مایوس کیوں ہوتے ہو؟ میرے ساتھ چلو۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آج رات ہی تم اس کا کام تمام کرو۔ مجھے موقع دو۔ میں اسے ضرور کسی طرح ڈھونڈ نکالوں گی۔"

وہ اس سے جھوٹ بول کر اور اسے ناموافق حالات کا یقین دلا کر اپنے فارم میں لے جا رہی تھی۔ جبکہ یہ بالکل جھوٹ بھی نہیں تھا۔ اس تھانیدار کو اطلاع مل چکی تھی کہ وہ زخمی شیر' وڈیرے کو چیرنے پھاڑنے کے بعد اس کی طرف آ رہا ہے اور اب تک کئی علاقوں کے پولیس والے اسے گرفتار کرنے یا گولی مارنے میں ناکام رہے ہیں۔

اور وہ سوچ رہا تھا۔ "مجھے دوڑنے کے لئے راستہ مل رہا ہے' منزل نہیں مل رہی ہے۔ میرے پاس حوصلہ ہے اور قوت ہے لیکن اس قوت کا استعمال کرنے کے لئے ٹارگٹ نہیں ہے۔ اس ٹارگٹ کو مجھ سے چھپا دیا گیا ہے۔ مجرم اور گناہ گار وہ ہے مگر پولیس میرے پیچھے پڑی ہے۔ میں ان حالات میں اس ڈاکو کی بیٹی کی مدد کے بغیر اس بدمعاش تک نہیں پہنچ سکوں گا۔"

وہ حالات سے مجبور ہو کر اس کے پیچھے دوڑتا ہوا فارم کی طرف چلا آیا۔ مچان پر بیٹھے ہوئے مسلح افراد نے آقا زادی آرزو کو دور سے دیکھ کر آہنی گیٹ کھولنے کا سگنل دیا۔ گیٹ کے پیچھے جابر خان کے شہ زور ماتحت ایک بڑا سا جال لئے کھڑے تھے تاکہ آنے والا نیا گھوڑا سرکشی کرے تو اسے قابو میں کیا جا سکے۔

فارم کے تمام گن مین' سائیس اور ٹرینز وغیرہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ سر پھری آقا زادی کسی نیم برہنہ شخص کو اپنے پیچھے دوڑاتی لائے گی۔ وہ دیکھنے میں قد آور درندہ لگ رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک لہو میں ایسا ڈوبا ہوا تھا جیسے اپنے شکار کے لہو میں نہا کر آ رہا ہو۔

وہ دوڑتا ہوا فارم کے اندر آ گیا۔ بڑا سا آہنی گیٹ دوبارہ بند ہو گیا۔ اس پر جال پھینکنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ اپنی مرضی سے ان کی مالکہ کے پیچھے دوڑتا جا رہا تھا۔ جابر خان نے مالکہ کے اشارے پر اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"حکم بی بی جی؟"

وہ بولی۔ "اسے یہاں گھوڑے کی طرح رکھو۔ پہننے کے لئے مزید کوئی لباس نہ
کھانے کے لئے بیسن کی روٹیاں اور چھولے دیا کرو اور اس کے زخموں کی مرہم پٹی
لئے گھوڑوں کے ڈاکٹر کو لے آؤ۔"

اس فارم میں گھوڑوں کے لئے اسپتال قایم کیا گیا تھا۔ اس اسپتال میں ایک سینئر
دو جونیئر ڈاکٹر تھے۔ گھوڑوں کو دوائیں دینے، مرہم پٹی کرنے اور تیمار داری کرنے کے
تمام مطلوبہ کمپاؤنڈر اور وارڈ بوائز وغیرہ دن رات وہاں رہا کرتے تھے۔ آرزو اسے
اصطبل میں لے آئی۔ وہاں فرش پر سوکھی گھاس بکھری ہوئی تھی۔ ایک ناند میں
گھوڑے کا چھوڑا ہوا کمس چارا تھا۔ وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر ہانپنے لگا۔ آرزو گھوڑ
سوار تھی یہ دیکھ کر اس پر ہزار جان سے قربان ہو رہی تھی کہ واقعی وہ ایک گھوڑ
طرح بلا کا جاندار تھا۔ دو سو کلو میٹر تک، کبھی تیز رفتاری سے اور کبھی دھیمی رفتار
دوڑتا آیا تھا۔ اب گویا اپنے تھان پر پہنچ کر ہانپ رہا تھا۔

وہ اپنے گھوڑے کو تھپکتے ہوئے بولی۔ "امداد! تم اس گھوڑے کی طرح طاقتو
حوصلہ مند ہو۔ تمہیں اسی اصطبل میں رہنا چاہئے۔ میں نے تمہارے لئے کھانے کا
دیا ہے۔"

وہ بولا۔ "میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اب بھی کچھ صبر کرنا چاہتا ہ
شاید رات ہونے تک اس تھانیدار کی لاش پر بیٹھ کر کھانے کی قسم پوری ہو جائے۔"

"تمہاری قسم پوری ہو گی لیکن ذرا دیر سے ہو گی۔ تمہیں انتقام لینے کے لئے
رہنا ہو گا اور زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کھانا ہو گا۔ میرا مشورہ ہے کہ تھانید
گردن ہاتھ میں آنے تک تم صرف چنے اور بیسن کی روٹیاں کھانے کا عہد کرو او
خوراک کو ہاتھ نہ لگاؤ۔"

"تم مجھ سے تعاون کر رہی ہو۔ ایک اچھے دوست کی طرح کام آ رہی ہو۔ تھا
تک پہنچنے کے لئے تم جو کہو گی، وہی کروں گا۔"

"ابھی ڈاکٹر آ رہا ہے۔ وہ تمہارے زخموں کی مرہم پٹی کرے گا۔"

"نہیں، میرے زخم ایسے ہی رہنے دو۔ ان سے ٹیسیں اٹھتی رہیں گی تو میرا
گرم رہے گا۔"

"دماغی گرمی نقصان پہنچاتی ہے۔ گھوڑوں سے خاموشی، سنجیدگی اور صبر و تحمل
وہ میدانِ جنگ سے زخمی ہو کر آتے ہیں۔ ان کی مرہم پٹی کی جائے تو وہ اعتراض
کرتے۔ علاج کے بعد تازہ دم ہو کر پھر میدانِ جنگ میں جاتے ہیں۔ تم نے ابھی

کہ جو کہوں گی، وہی تم کرو گے۔"

اس نے ہاں کے انداز میں اوپر نیچے یوں سر ہلایا جیسے گھوڑے تابعداری سے ہلاتے
ہیں۔ آرزو نے دور دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر آ رہا ہے۔ میں اسے یہاں بھیجتی ہوں۔"

وہ گھوڑے کو دوڑاتی ہوئی اصطبل سے نکلی۔ پھر ذرا دور ڈاکٹر اور جابر خان کے پاس
آ کر رک گئی اور بولی۔ "ڈاکٹر! میں اس زخمی درندے کو گھوڑوں کی خوراک کا کچھ حصہ
دے رہی ہوں۔ تم سے بھی پوچھتی ہوں گھوڑوں کو جو انجکشن اور دوائیں دیتے ہو کیا
وہی اسے نہیں دے سکتے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "بی بی جی! گھوڑے اور انسان کی قوتِ برداشت اور ہاضمے وغیرہ میں
بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ زخمی شخص گھوڑوں کی دوائیں برداشت نہیں کر پائے گا۔"

"میں یہ نہیں کہتی کہ اسے مکمل دوائیں دو۔ انسانوں کو دی جانے والی دواؤں میں
گھوڑوں کو دی جانے والی دوائیوں کا تھوڑا تھوڑا سا حصہ ملا کر تجربہ کرو۔"

"آپ کا حکم ہے، میں ضرور ایسا کروں گا۔ مگر ایسی ملاوٹی دواؤں کا اس پر ری ایکشن
ہو گا۔"

"ہونے دو۔ اس ملک کے کروڑوں باشندے ملاوٹی اور جعلی دوائیں استعمال کرتے
ہیں۔ ان میں سے کچھ مر جاتے ہیں۔ باقی بروقت علاج سے رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔
اسے بھی کچھ ہو گا تو تم بروقت ری ایکشن کا توڑ کر سکتے ہو۔"

موبائل فون پر اشارہ موصول ہوا۔ اس نے بٹن آن کر کے "ہیلو" کہا اسے دوسری
طرف اپنے باپ مصری خان کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو بابا کی جان! کیا کر رہی ہو؟"

"اوہ بابا! ایک فنٹاسٹک گھوڑا پکڑ کر لائی ہوں۔ دو پیروں کا انسانی گھوڑا ہے۔ پہاڑ
جیسا قد ہے۔ فولادی جسم رکھتا ہے۔ گھوڑے کی طرح موٹی کھال ہے۔ زخموں سے چُور ہو
کر بھی میلوں دور تک دوڑتا جاتا ہے۔ میں نے اسے اصطبل میں رکھا ہے۔ اسے مکمل
گھوڑا بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"بیٹی! تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ گھوڑے جیسی طاقت رکھتا ہے۔ پھر وہ
تمہارے قابو میں کیسے آ گیا؟"

وہ باپ کو امداد جمالی کے مختصر حالات بتانے لگی۔ مصری خان نے تمام حالات سننے
کے بعد کہا۔ "اس نے دو سپاہیوں کو اور ایک وڈیرے کو ہلاک کیا۔ مقابلے پر آنے والوں
کے ہاتھ پاؤں توڑے۔ پھر تو وہ ہمارے بڑے کام کا بندہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے
چابک سے اسے تابعدار بنا لو گی۔"

"میں مصری خان کی بیٹی ہوں۔ چابک سوار کہلاتی ہوں۔ جب تک ہاتھوں میں کوڑا رہتا ہے' میرے قدموں میں گھوڑا رہتا ہے۔"

ویسے چابک کمزوروں کو مارنے کے لیے نہیں ہوتا۔ کمزور تو ایک ذرا ڈانٹ ڈپٹ پر سر جھکا لیتے ہیں۔ یہ دراصل شہ زور اور سرکش انسانوں اور جانوروں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ بولی۔ "بابا! میں فی الحال اس سرکش کے لئے چابک استعمال نہیں کر رہی ہوں لیکن ایسے چابک سے مار رہی ہوں' جو اسے نظر نہیں آئے گا۔ آپ ہی نے ایک بار کہا تھا' شیر بھوکا رہے تو اور زیادہ خونخوار درندہ بن جاتا ہے۔ آدمی کو بھوکا رکھو یا اپنے حساب سے تھوڑی تھوڑی سی خوراک دیتے رہو تو وہ لاغر ہونے لگتا ہے۔ اونچی آواز میں بولنے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر اس سے جو کام لینا چاہو' وہ سر جھکا کر کرنے لگتا ہے۔"

"مجھے فخر ہے کہ تم میری ایک ایک بات یاد رکھتی ہو اور اس پر عمل کرتی ہو۔ میرا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ بھی تمہارے جیسا زبردست نہ ہوتا۔ ویسے میں نے اس لئے فون کیا ہے کہ میرے جوڑ توڑ کا بندہ جمال خان سوہو میرے دروازے پر آیا ہے۔ کیا تم نے اس کی بیٹی ارمانہ کو ساجد کی آواز کا کیسٹ سنایا تھا؟"

"جی ہاں۔ میں ارمانہ کو ستانا' جلانا اور کڑھانا چاہتی تھی۔ آج مجھے برسوں کی خواہش کے بعد ایک گھوڑا ملا ہے۔ میں بہت خوش ہوں اور آپ جانتے ہیں' جب میں بہت خوش ہوتی ہوں تو ایک قیدی کو رہا کر دیتی ہوں۔ پلیز' آپ ساجد کو رہا کر دیں۔"

"ہاں' یہ اس کی رہائی کا بہت مناسب موقع ہے۔ میرے برابر کا ڈاکو میرے گھر آیا ہے۔ میں ساجد کو تحفے کے یا خیر سگالی کے طور پر پیش کر دوں گا۔"

مصری خان نے ریسیور رکھ کر ملازم کو آواز دی۔ ملازم نے آ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر پوچھا۔ "حکم آقا سائیں؟"

مصری خان نے مسکرا کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔ "مہمان کے لئے کھانا لگایا کہ نہیں؟"

"میز پر لگا دیا گیا ہے۔ آپ کا انتظار ہے آقا سائیں؟"

وہ اٹھ کر اس کمرے سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں ڈاکو جمال خان سوہو ایک صوفہ پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے اس کا ایک باڈی گارڈ کلاشنکوف لئے کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بیٹی سے باتیں ہو گئیں؟"

"ہاں باتیں بھی ہو گئیں اور کھانا بھی لگا دیا گیا ہے۔"

"کھانے کا تکلف نہ کرو۔ ساجد کی رہائی کی بات کرو۔ میں تمہارے گھر کی ایک پیالی

چائے پی کر چلا جاؤں گا۔"

"ایسی جلدی نہ کرو۔ باتیں بہت اہم ہیں اور یہ کھانے کی میز پر ہوں گی۔ میرے گھر تک چلے آئے ہو تو پھر تکلف نہ کرو۔ مجھے میزبانی کا موقع دو۔"

وہ اس کے ساتھ کھانے کی میز پر آیا۔ دونوں میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ مصری خان نے کھانے کی ڈش مہمان کے سامنے بڑھاتے ہوئے اپنے خاص ماتحت سے کہا۔ "تم ابھی جاؤ۔ ساجد احمد کو قید سے رہا کر کے اسے آرام سے گاڑی میں بٹھا کر ہماری ارمانہ بیٹی کے گھر چھوڑ کر آؤ۔"

ماتحت حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ جمال خان نے کہا۔ "تم نے میرے داماد کو چھوڑ دیا لیکن تاوان کی رقم نہیں بتائی۔"

"تم میرے برابر کے آدمی ہو۔ ہمارا پیشہ بھی ایک ہے۔ میں نے تمہارے داماد کو اغوا کر کے دشمنی بڑھانے کی حماقت نہ کی ہے نہ کبھی کروں گا۔ صمد یار خان اپنے اوپر یہ الزام نہیں لینا چاہتا تھا اس لئے وہ مجھے راز دار بنا کر پچاس ہزار روپے دے کر ساجد کو میرے پاس امانت کے طور پر چھوڑ گیا ہے۔"

جمال خان کھاتے کھاتے رک گیا۔ آدھا لقمہ حلق سے نیچے اترا تھا باقی آدھا منہ میں رہ گیا تھا۔ پھر وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ "میں نے برسر اقتدار پارٹی کے لیڈر سے کہا تھا کہ میرے داماد کو اس کے بھائی صمد یار خان نے ہی اغوا کیا ہو گا اور اگر یہ ثابت ہو جائے گا تو میں اس کے بھائی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اور وہ دونوں بھائی تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ایک قاتل سے تمہارے سر کا سودا کر لیا ہے۔"

"کیا سچ کہہ رہے ہو؟ انہوں نے میرے سر کا سودا کیا ہے' یہ بات تم کیسے جانتے ہو؟"

مصری خان نے لقمہ نگل کر گلاس کو اٹھایا۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ پھر گلاس کو زوردار آواز کے ساتھ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "جس قاتل کو تمہارے سر کی قیمت دس لاکھ روپے دی گئی ہے' وہ میں ہوں۔"

جمال خان دوسرا لقمہ نگل رہا تھا۔ اسے زور کا ٹھسکا لگا۔ وہ کھانسنے لگا۔ بڑے اچھے وقت ٹھسکا لگا تھا۔ اسے کھانسنے کے دوران سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملا کہ وہ پوری طرح حالات کا تجزیہ کئے بغیر تاوان کی رقم ادا کر کے داماد کو لے جانے کے لئے آیا ہے۔ اس پہلو کو نظر انداز کر دیا کہ مصری خان سے دیگر کئی معاملات میں جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔

اور وہ اسے قتل کرنے کی اجرت دس لاکھ روپے لے سکتا ہے۔

مصری خان نے اس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا وہ گلاس لے کر بہت آہستہ آہستہ پانی پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ “میرا باڈی گارڈ کلاشنکوف لئے ڈرائنگ روم میں میری واپسی کا منتظر ہے اور میں یہاں نہتا ہوں۔ اس کے نمک خوار فوراً ہی یہاں آکر مجھے گولیوں سے چھلنی کر سکتے ہیں۔”

وہ پانی پی کر بولا۔ “کیا مجھ سے سودا کرو گے؟ میں پندرہ لاکھ دوں گا۔”

“میں گھر آئے ہوئے مہمان سے نہ رقم لوں گا' نہ اس کی جان لوں گا۔ آرام سے کھاتے رہو اور میرے سوال کا جواب دو کہ میں تم پر بھروسا کر کے تمہارے گھر آؤں تو کیا تم اپنے مہمان کو گولی مار دو گے؟”

“ہرگز نہیں۔ ہم ڈاکوؤں کے بھی کچھ ایسے اصول ہیں' جن پر ہم سختی سے عمل کرتے ہیں۔ اصول بدلنے والے سیاستدانوں سے ہمارے تعلقات اس وقت تک رہتے ہیں' جب تک ہمارے اصولوں پر کوئی آنچ نہیں آتی۔”

“تو پھر تم پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اب یہ سنو کہ وہ تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں۔”

“میں کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔ صدیار خان نے میری ارمانہ کے حصول کو اپنا مسئلہ بنا لیا ہے۔ مجھے راستے سے ہٹا کر اسے اٹھا لے جانا چاہتا ہے۔”

“صرف اتنی سی بات نہیں ہے۔ ایک اور اہم معاملہ ہے مگر تم نے ہاتھ روک لیا ہے۔ بھئی کھاتے بھی رہو اور باتیں بھی کرتے رہو۔”

وہ کھانے لگا۔ مصری خان نے کہا۔ “صدیار خان شہری ڈاکو ہے۔ اپنے انتخابی حلقے میں اس قدر بدنام ہے کہ اسے ووٹ نہیں ملتے۔ وہ پارٹی لیڈر بھائی کی ہزار کوششوں کے باوجود اسمبلی میں نہ پہنچ سکا۔”

وہ دو گھونٹ پانی پینے کے بعد بولا۔ “پارٹی لیڈر اب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کا بھائی صدیار خان سیاستدان نہیں بن سکے گا۔ اس لئے تمہیں قتل کر کے تمہارے علاقے کا سب سے بڑا ڈاکو اسے بنا دیا جائے۔”

“ہوں' اب پوری طرح بات سمجھ میں آگئی۔ عوام کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی صرف پانچ برس کے لئے ڈاکو بنتا ہے۔ جبکہ ہم ڈاکوؤں کی حکمرانی تمام عمر رہتی ہے۔ وہ یار خان ووٹ لے کر ڈاکو نہیں بن سکتا۔ اس لئے نوٹوں سے بننے کے لئے تمہیں لاکھ روپے دے رہا ہے۔”

دے چکا ہے۔ تمہارے لئے دس لاکھ اور ساجد کو قیدی بنا کر رکھنے کے پچاس ہزار روپے یعنی میں اس سے دس لاکھ پچاس ہزار روپے وصول کر چکا ہوں۔”

“ہمارا اصول یہ بھی ہے کہ ہم کسی کو قتل کرنے کا معاوضہ لینے کے بعد اسے ضرور قتل کرتے ہیں یا پھر اس کی رقم واپس کر دیتے ہیں۔”

“بے شک یہ رقم واپس کر دی جائے گی۔”

جمال خان نے حیرانی سے کہا۔ “ہمارے درمیان بعض معاملات متنازعہ رہتے ہیں۔ ہم کبھی کبھی لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ یہ ایسا موقع ہے کہ تم مجھ جیسے دشمن کو مار کر بہت بڑی رقم بھی رکھ سکتے ہو اور مجھ سے نجات بھی حاصل کر سکتے ہو۔ پھر اتنی بڑی رقم کیوں واپس کر رہے ہو؟”

مصری خان نے بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ “ہمارے ملک میں صرف دو بڑے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے خوب لڑتے ہیں لیکن کسی تیسرے کو اقتدار کی کرسی تک پہنچنے نہیں دیتے۔ ہم بھی اس ملک کے دو بڑے ڈاکو ہیں۔ ہمیں اپنے سیاستدانوں سے یہ سبق سیکھنا چاہئے کہ ہم دو ہی رہیں۔ کوئی تیسرا نہ آئے۔”

تیسرا آگیا۔ مصری خان کے ایک باڈی گارڈ نے آکر کہا۔ “آقا سائیں! ابھی فون پر اطلاع ملی ہے کہ صدیار خان اپنے چار حواریوں کے ساتھ آرہا ہے۔”

“آنے دو۔ اسے مہمان خانے میں بٹھاؤ۔ اس کے حواریوں کو ریسٹ ہاؤس میں جانے کے لئے کہہ دو۔ یار خان اعتراض کرے تو کہہ دینا کہ تمہارا یہ آقا کسی حواری کی موجودگی میں اہم معاملات پر گفتگو نہیں کرے گا۔”

“جو حکم سائیں! میں ابھی جا کر ان کا انتظام کرتا ہوں۔”

وہ چلا گیا۔ مصری خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ “سائیں ایک عقیدات مندانہ خطاب ہے۔ کسی معزز شخص کو یا کسی اللہ والے کو سائیں کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کا باوا آدم نرالا ہے۔ ہم ڈاکو صوبے سے وفاق تک سائیں کہلاتے ہیں۔”

جمال خان نے آگے سے پلیٹ ہٹا کر کہا۔ “میرا پیٹ بھر گیا ہے۔ اب اور کھانے کے لئے نہ کہنا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید کھا لیتا لیکن دشمن کی آمد پر خون کھول رہا ہے۔ تم ابھی اس کی رقم واپس کر دو تو مہربانی ہو گی تم سے ہونے والا سودا ختم ہو جائے گا۔ تم اس معاملے سے نکل جاؤ گے تب میں یہاں سے اس کا تعاقب کروں گا پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔”

“صبر کرو۔ کھانے کے بعد پانی پیتے ہیں۔ یہ لو۔”

مصری خان نے ایک گلاس پانی اسے پیش کیا۔ اس نے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پانی پیا۔ پھر خالی گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ مصری خان نے کرسی سے اٹھ کر کہا "آؤ ہم ڈاکو بننے والے امیدوار کا استقبال کریں۔"

جمال خان فوراً کرسی سے اٹھ گیا۔ اپنے میزبان کے ساتھ اس کمرے سے باہر آیا۔ پھر اسے کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزارتا ہوا باہر پائیں باغ میں آگیا۔ وہاں کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا خوبصورت کاٹیج بنا ہوا تھا۔ مصری خان نے اس میں داخل ہو کر کہا۔ "یہ انیکسی ہے یعنی کہ مہمان خانہ لیکن کوئی شیطان آ جائے تو یہ شیطان خانہ بن جاتا ہے۔ کیا تمہارے پاس ہتھیار ہے؟"

اس نے لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک بھرا ہوا ریوالور نکالا۔ مصری خان نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "صمد یار خان آ رہا ہے۔ میں اس کی کار پہچانتا ہوں۔"

وہ کار انیکسی کے سامنے رک گئی۔ صمد یار خان اسٹیئرنگ سیٹ والا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ مصری خان نے برآمدے میں آ کر پوچھا۔ "خیریت تو ہے۔ کسی اطلاع کے بغیر اچانک آئے ہو۔"

وہ برآمدے کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "میں نے دو گھنٹے پہلے فون کیا تھا مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ شاید تم کسی سے اس فون پر لمبی گفتگو کر رہے تھے۔ بہرحال مجھے تمہارے چند ہوشیار آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

"بات کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟"

"آج رات ارمانہ کو اغوا کیا جائے گا۔ میرے ساتھ زیادہ گن مین رہیں گے تو اس کے ڈھال بننے والے باپ کو گولی مار دی جائے گی۔"

وہ بولا۔ "اگر تم خود ہی جمال خان سوہو کو گولی مار دو تو اچھی بات ہے میں تمہارے دس لاکھ روپے واپس کر دوں گا۔ آؤ اندر چل کر بات کریں۔"

وہ دونوں برآمدے سے چلتے ہوئے کمرے میں آئے۔ پھر صمد یار خان ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ نگاہوں کے سامنے کچھ فاصلے پر جمال خان دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھامے اسے نشانے پر رکھے کھڑا تھا۔

پھر صمد یار خان نے پھرتی دکھانے کی کوشش کی۔ وہ وہاں سے پلٹ کر بھاگتے ہوئے اپنے لباس کے اندر سے ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔ مگر پلٹتے ہی پھر ایک بار اس کے ہوش اڑ گئے۔ پیچھے مصری خان اپنے ریوالور سے نشانے پر اسے رکھتے ہوئے بولا۔ "دونوں ہاتھ اپنے سر کے پیچھے رکھو اور کوئی چالاکی نہ دکھاؤ۔"

وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھتے ہوئے بولا۔ "تم پوری رقم پیشگی لے کر دغا کر رہے ہو۔"

مصری خان نے اس کے لباس کی تلاشی لی۔ ایک ریوالور ہاتھ آیا وہ اسے دھکا دے کر بولا۔ "اندر چلو۔ میں دغا باز نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے تمہیں قتل کرنے لئے جمال خان سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا ہے اور تمہاری رقم بھی لوٹانے والا ہوں۔"

وہ دھکا کھا کر اندر آیا۔ جمال خان نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم میری بیٹی کو اغوا کرو گے اور مجھے قتل کرو گے؟"

وہ پیچھے جا کر ایک دیوار سے لگ گیا۔ پھر دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم......... تم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ پھر اچانک ایک کیسے ہو گئے؟"

"تمہارا بھائی برسرِ اقتدار پارٹی کا لیڈر ہے اور اپوزیشن کے لیڈر کا بدترین دشمن ہے۔ وہ بینک سے اربوں ڈالر لوٹ کھسوٹ کا الزام اس پر عائد کرتا ہے لیکن دستاویزی ثبوت کے ساتھ اسے عدالت میں کیوں نہیں پہنچاتا؟"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "اس لیے کہ اپوزیشن کے لیڈر کے پاس بھی تمہارے بھائی اور اس کی پارٹی کے خلاف دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ وہ بھی تمہارے بھائی کو عدالت میں گھسیٹے گا۔ اگر دونوں کو سزا ہو گی تو دونوں کو نااہل اور مجرم حکمران قرار دیا جائے گا۔ پھر کوئی تیسرا حکومت کرنے آئے گا اور وہ دونوں کسی تیسرے کو برسرِ اقتدار دیکھنا گوارا نہیں کریں گے۔ اس لئے وہ عوام کے سامنے ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہوئے بھی اندرونی معاملات میں دوست ہیں۔"

مصری خان کہا۔ "اسی طرح ہم دونوں ڈاکو دشمن بھی ہیں اور دوست بھی ہیں۔ ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کے خلاف ثبوت ہیں کہ ہم نے کون کون سی تاریخ کو کون کون سے بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم دونوں میں سے کوئی کسی کو قتل کرے اور اس کے بعد تمہارے جیسا تیسرا ڈاکو آ کر ہمارا رازدار بنے اور ہمیں وراثت میں ملنے والوں علاقوں کا مالک مختار بنے۔ ہم اور سیاستداں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ وہ بینکوں کو اندر سے اختیارات کے ذریعے لوٹتے ہیں اور ہم باہر سے فائرنگ کرتے ہوئے جا کر انہی بینکوں سے نقدی لوٹ کر لے آتے ہیں۔"

جمال خان نے پھر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "وفاق میں دو بڑے اور صوبوں میں دو بڑے اس وقت تک قانونی گرفت سے محفوظ رہیں گے، جب تک کہ کسی تیسرے کو آنے سے روکتے رہیں گے۔ للذا تیسرا نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں آئے گا۔"

یہ کہتے ہی جمال خان نے ٹھائیں کی زور دار آواز کے ساتھ گولی چلا دی۔ صم
خان ایک چیخ مار کر اچھلا۔ پھر فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسری گولی نے اسے تڑپنے
نجات دلا کر ہمیشہ کے لئے ساکت کر دیا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں
گولیاں پیوست ہوئی تھیں۔ وہاں سے خون ابل کر جسم پر اور فرش پر پھیل رہا تھا۔ مص
خان نے اپنے خاص ماتحت کو آواز دی پھر اس کے حاضر ہونے پر کہا۔ ”یہ لاش اس
گاڑی میں ڈال دو۔ دو بھنگیوں کو بلا کر خون کے دھبے مٹاؤ اور کمرے سے باہر تک اچھ
طرح صفائی کراؤ۔“

خاص ماتحت کے حکم پر دوسرے ملازم یہ تمام کام کرنے لگے۔ مصری خان
ماتحت سے کہا۔ ”اپنے جگری بندوں کو حکم دو کہ ریسٹ ہاؤس کا محاصرہ کر کے یار خان
چاروں حواریوں سے اسلحہ چھین لیں۔ اگر وہ مقابلہ کریں تو ان میں سے کسی ایک یا دو
گولی ماری جائے۔ کوشش کرو کہ صمد یار خان کی لاش لے جانے والے حواری زند
رہیں۔ فی الحال لاش انیکسی کے سامنے گاڑی میں رہے گی۔ تم ان حواریوں کو قابو میں
کرنے کے بعد یہاں آؤ۔ میں کوٹھی میں رہوں گا۔“

وہ جمال خان کے ساتھ انیکسی سے نکل کر کوٹھی میں آ گیا۔ وہاں اس نے تجوری
کھول کر دس لاکھ پچاس ہزار روپے نکالے۔ پھر اپنے مہمان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں
آ کر بیٹھ گیا۔ نوٹوں کی گڈیاں سامنے سنٹر ٹیبل پر رکھ دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد خاص
ماتحت نے آ کر کہا۔ ”آقا سائیں! کام ہو گیا ہے۔ وہ چاروں حواری ریسٹ ہاؤس سے باہر
نہیں نکل رہے تھے۔ پھر وہ ہتھیار پھینک کر ہمارے قابو میں آ گئے۔“

مصری خان نے کہا۔ ”یہ نوٹوں کی گڈیاں اٹھاؤ اور پچھلی سیٹ پر لاش کے پاس رکھ
دو۔ اپنے دو فوٹو گرافر کے ساتھ لاش کو ریسٹ ہاؤس میں لے جاؤ اور اسے حواریوں کے
حوالے کر کے کہو، یار خان کے پاس پورے دس لاکھ پچاس ہزار روپے پڑے ہوئے ہیں۔
وہ حواری تمہارے سامنے ان نوٹوں کی گنتی کریں تو ان سب کی جتنی تصویریں اتاری ج
سکتی ہیں، اتاری جائیں۔ اس کے بعد یہ تمام رقم واپس لے آؤ۔“

خاص ماتحت نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر لے گیا۔ جمال خان نے کہا۔ ”یہ تم اچھا کر رہے
ہو۔ وہ چاروں حواری لاش کے پاس سے گڈیاں اٹھا کر نوٹ گنتے رہیں گے تو ان کی
تصویروں سے ثابت ہو جائے گا کہ تم نے رقم واپس کر دی ہے۔“

”جمال خان! تم کسی حد تک ایک شریف ڈاکو ہو۔ واردات کرنا تو خوب جانتے ہو

لیکن سیاست کو بالکل نہیں سمجھتے۔ دراصل وہ تصویریں یہ ثابت کریں گی کہ ان چار
حواریوں نے صمد یار خان کو دولت کے لالچ میں قتل کیا اور اس کی لاش کے پاس بیٹھ کر رقم
گن رہے ہیں تاکہ چاروں وہ رقم آپس میں برابر تقسیم کر سکیں۔ میں زبان کا دھنی ہوں۔
میرا ماتحت وہ رقم واپس لائے گا۔ میں بعد میں مُردہ یار خان کی تمام رقم اس کے لیڈر بھائی
تک پہنچا دوں گا۔“

”تم نے آج مجھ پر بہت سے احسانات کئے ہیں۔ میرے داماد کو رہا کر دیا اور جو مجھے
قتل کرنے والا تھا اسے قتل کرنے کا موقع مجھے دیا۔ آئندہ میں خدا سے دعا مانگتا رہوں گا
کہ وہ مجھے بھی تمہارے کسی کام آنے کا موقع دیتا رہے۔ اب مجھے اجازت دو۔“

وہ جانے کے لئے اٹھ گیا۔ مصری خان اسے باہر گاڑی تک رخصت کرنے آیا۔ وہ
اس سے مصافحہ کر کے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگلی سیٹ پر باڈی گارڈ اور ڈرائیور
بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ جب گاڑی نظروں سے
اوجھل ہو گئی تو مصری خان کوٹھی کے اندر ڈرائنگ روم میں آیا۔ آرام سے صوفے پر
بیٹھ کر ریسیور اٹھایا۔ پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

رابطہ قائم ہونے پر آواز آئی۔ ”ہیلو میں محترم جناب اسد یار خان صاحب کا
سیکرٹری بول رہا ہوں۔ آپ فرمائیں۔“

”اپنے صاحب سے بولو، مصری خان کچھی ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔“

اسے ہولڈ آن کے لئے کہا گیا۔ پھر چند سیکنڈ کے بعد برسرِ اقتدار پارٹی کے لیڈر اسد
یار خان کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مصری خان! میں ایک اہم اجلاس میں مصروف ہوں۔ کیا
کوئی ضروری بات ہے؟ اگر ہے تو پھر جلدی بولو۔ یا پھر دو گھنٹے بعد فون کرو۔“

”سائیں! آپ لوگ سیاست میں گھوڑوں کی تجارت کرتے ہیں لیکن آپ نے اپنے
بھائی صمد یار خان کو گھوڑا بنا کر میدان میں اتارا، یہ بہت بڑی غلطی کی۔ وہ گھوڑا میدان
میں اترتے ہی بے موت مارا گیا ہے۔“

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ صاف صاف بتاؤ، میرا بھائی تم سے ملنے گیا تھا۔ وہ خیریت
سے ہے نا؟“

”اس کے صرف دس لاکھ پچاس ہزار روپے خیریت سے ہیں۔ یہ میں آپ کو واپس
کرنا چاہتا ہوں۔ بھائی اس دنیا میں نہیں رہا۔ اسے واپس نہیں کر سکوں گا۔“

”دیکھو مصری خان! گول مول باتیں نہ کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا اسے کسی نے قتل
کیا ہے؟“

"ہاں' دو بڑوں نے مل کر ڈاکو بننے والے تیسرے امیدوار کو ہمیشہ کے لئے
سے ہٹا دیا ہے۔ سیاست کے میدان میں تم دو بڑے ہو۔ ڈکیتی کے میدان میں ہم دو
ہیں۔ نہ تم کسی تیسرے کو اقتدار میں برداشت کر سکتے ہو۔ نہ ہم کسی تیسرے ڈاکو کو
پوشی دیکھ سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے' تم نے اور جمال خان نے مل کر میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔"

"سائیں! ہم سے فون پر اقبالِ جرم نہ کراؤ۔ آپ کے پاس چند تصویریں پہنچ رہی
ہیں۔ ان تصویروں سے قاتلوں کے چہرے سامنے آ جائیں گے۔"

"یعنی تم نے دوسروں کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر چلائی ہے۔"

"سائیں! بندوق تو چل چکی۔ اب نہ گولی واپس آئے گی اور نہ گھوڑا۔ اسے میدان
میں اتارنے سے پہلے یہ سوچنا تھا کہ شطرنج کی بساط کا گھوڑا ڈھائی گھر چلتا ہے اور سیاست
کی بساط میں صرف دو بڑے گھر ہوتے ہیں۔ گھوڑا ان دو گھروں کو پھلانگنا چاہے گا تو
موت مارا جائے گا۔ خدا آپ کو صبر دے آمین۔ تمہارے بھائی کے حواری اس کی لاش
لے کر آ رہے ہیں۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ پارٹی لیڈر اسدیار خان نے ریسیور رکھ دیا۔ میز کے اطراف پارٹی
کے کئی اہم کارکن بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ "کیا مصری خان نے آپ کے بھائی
کو قتل کیا ہے؟"

"ہاں۔ لیکن اس کے پاس جو تصویریں ہیں ان کے مطابق قاتل کچھ دوسرے لوگ
ہیں۔"

دوسرے کارکن نے کہا۔ "بھائی کی موت سے آپ کو جو صدمہ پہنچ رہا ہے اسے
ہم محسوس کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے آج کا یہ اجلاس ختم کیا جائے۔"

اسدیار خان نے کہا۔ "نہیں ہم سیاست داں ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ بھائی
اور ماں باپ کی لاشوں پر بھی سیاست کی جاتی ہے۔ اپوزیشن والوں نے ایک پریس کانفرنس
میں ہم پر الزام لگایا ہے کہ ہم نے ان کے ایک اہم کارکن ساجد احمد کو اغوا کیا ہے۔
ہم بھی جواباً دعویٰ کریں گے کہ حزبِ اختلاف کے لیڈر نے میرے بھائی کو قتل کیا
ہے۔"

"مصری خان کے پاس جو تصویریں ہیں' ان میں کیا اپوزیشن کے بندے قاتل کی
حیثیت سے نظر آ رہے ہیں؟"

"پتا نہیں وہ کن لوگوں کی تصویریں ہیں' میں ابھی اس سے فون پر بات کروں

میری پلاننگ یہ ہے کہ مقتول صمدیار خان کی گاڑی کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہوں اور اس کی
لاش آدھی گاڑی کے اندر اور آدھی باہر ہو۔ ایسی تصاویر اتار کر ہم اخبار والوں کو دیں
گے اور زخمی ڈرائیور سے بیان دلائیں گے کہ وہ اپوزیشن کے پالتو غنڈوں کو جانتا ہے اور
شناختی پریڈ میں ان قاتلوں کی نشان دہی کر سکتا ہے۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "ایسا کرنے سے پہلے مصری خان کو خریدنا ہو گا۔ فی الوقت وہ ڈاکو
ایک گھوڑا ہے جسے اپوزیشن والے خرید لیں گے تو وہ اصل قاتلوں والی تصاویر انہیں
دے گا۔ پھر آپ مقتول بھائی کی جو تصاویر تیار کر کے اخبار والوں کو دینا چاہتے ہیں' وہ
تصاویر کھلی فراڈ سمجھی جائیں گی۔"

اسدیار خان نے مصری خان سے رابطہ کیا پھر اس سے پوچھا۔ "مجھے یہ بتا دو کہ
تصاویر کے ذریعے کون لوگ قاتل ثابت ہو رہے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں جانتا تھا' تم یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین رہو گے۔
ان تصویروں میں تمہارے مقتول بھائی کی لاش کے پاس اس کے چار حواری بیٹھے بڑے
بڑے نوٹ گن رہے ہیں۔ اس طرح صاف ظاہر ہو جائے گا کہ انہوں نے بڑی رقم کے
لالچ میں اسے قتل کیا ہے۔"

"وہ چاروں وفادار ہیں۔ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ سچ کو بدلنے والی تصویریں ہیں۔"

"آپ کی بات پر کون یقین کرے گا۔ آدمی کی زبان ہوتی ہے۔ تصویروں کی زبان
نہیں ہوتی لیکن عدالت میں تصویروں کی بے زبانی کے آگے زبان والا آدمی جھوٹا پڑ جاتا
ہے۔"

"مجھے ان تصاویر کی ضرورت ہے۔"

"ایک نہیں' ایک درجن تصاویر دوں گا۔ آپ کا خادم ہوں سائیں۔"

"صرف تصاویر نہیں' ان کے نیگیٹو بھی۔"

"یہ مشکل ہے۔ نیگیٹو میرے پاس رہیں گے۔ اس کا قتل میرے علاقے میں ہوا
ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے مجھے نیگیٹو حفاظت سے رکھنا چاہئے۔"

"میں تم پر نہیں' اپوزیشن والوں پر اس کے قتل کا الزام عائد کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ ضرور ایسا کریں۔ آپ مجھ سے جیسا تعاون چاہیں گے' میں ویسا ہی کروں گا
لیکن آپ بھی تو ہمارے کام آئیں۔"

"بولو کیا چاہتے ہو؟ اگر تم ان تصویروں کو منظر عام پر آنے نہیں دو گے تو تمہارا
کوئی بھی مطالبہ پورا ہو جائے گا۔"

"میرے علاقے کے ڈی آئی جی پولیس اور ڈی سی کا تبادلہ کرا دیں۔ یہ دونوں سے بڑی افسری دکھانے لگے ہیں۔"

"تمہیں ان سے کیا شکایت ہے؟"

"آج کل منشیات اور اسلحہ کے جو ٹرک ہائی وے سے گزر رہے ہیں' ان پر حملہ کرنے نہیں دیتے اور نہ کمیشن لینے دیتے ہیں۔ حیرانی تو یہ ہے کہ پولیس والے ان سے رشوت نہیں لے رہے ہیں۔ انہیں کسی روک ٹوک کے بغیر ایسے جانے دیتے ہیں' جیسے ان ٹرکوں میں پاک اور متبرک سامان ہو۔"

"جب پولیس والے کچھ نہیں کھا رہے ہیں تو تمہیں کیسے کھانے دیں گے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ آج کل کراچی اور حیدر آباد میں امن و امان کا مسئلہ پیدا کرنا اور اپوزیشن کو بدنام کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے اسلحہ کے وہ ٹرک نقاب پوش دہشت گردوں تک پہنچائے جا رہے ہیں۔ اگرچہ مہنگائی بڑھائی گئی ہے لیکن سفید پاؤڈر کی قیمت گھٹا دی گئی ہے تاکہ لوگ آسانی سے خرید کر اپنے مسائل کا غم غلط کر سکیں۔"

"سائیں! آپ مجھے سیاست سمجھا رہے ہیں۔ ہم بھی تو آپ کے دہشت گرد ہیں۔ اپنے علاقے کے لوگوں کو آپ کے خلاف آواز اٹھانے نہیں دیتے۔ آپ حکم جاری دیں کہ آئندہ دس میں سے ایک ٹرک کا مال ہمیں ملے گا تو پھر میں آپ کی ایک اور مشکل آسان کر دوں گا۔"

"تم کس مشکل کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے ساجد کو رہا کر دیا ہے اور وہ جمال خان کی بیٹی ارمانہ کے پاس پہنچ گیا ہے۔ وہ کل کلاں کو یہ بیان دے کہ آپ کے بھائی نے اسے اغوا کرایا تھا تو آپ کی حکومتی پارٹی بدنام ہو گی۔"

"مصری خان! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ پرسوں صدر کے لئے ووٹنگ ہونے والی ہے۔ ساجد کا بیان ہمیں مشکلات میں ڈال دے گا۔"

"میں نے ابھی کہا ہے کہ آپ کی مشکل میں آسان کر دوں گا۔ اگر آپ گھوڑے کو خرید لیں اور اسے ایک کروڑ کا قرضہ دلا دیں تو اپوزیشن والے بری طرح کھائیں گے۔"

"میرے مقتول بھائی نے ساجد کو اغوا کر کے غلطی کی تھی۔ وہ ہم سے بدظن ہے۔ کیا اب وہ ہماری طرف آئے گا۔"

"آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں صرف دو احکامات جاری کریں۔ ایک تو یہ کہ

میں سے ایک ٹرک کا مال مجھے دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پرسوں ووٹنگ سے پہلے ساجد کا ایک کروڑ کا قرضہ منظور ہو جائے گا۔"

"دونوں کام ہو جائیں گے۔ کل شام تک دونوں مطالبات پورے ہو جائیں گے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ مصری خان ریسیور رکھ کر مسکرانے لگا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد جمال خان سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "تم خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ کبھی میرے کام آسکو۔ تم ابھی گھر نہیں پہنچے ہو راستے میں ہو اور تمہاری دعا قبول ہو گئی ہے۔ تم میرے کام آ سکتے ہو۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ بولو میں کس طرح کام آسکتا ہوں؟"

"میں نے تم سے مشورہ کئے بغیر اسدیار خان کو زبان دی ہے کہ تمہارا داماد وفاداری تبدیل کرے گا اور آئندہ حکومتی پارٹی میں رہے گا۔"

"تم نے زبان دی ہے۔ سمجھو میں نے زبان دی ہے۔ میرا داماد ضرور وفاداری تبدیل کرے گا۔"

"تو پھر ارمانہ بیٹی سے ابھی فون پر رابطہ کرو۔ ساجد وہاں پہنچ گیا ہو گا۔ ارمانہ سے کہو کل شام تک ایک کروڑ کا قرضہ منظور ہو جائے گا۔ وہ ساجد کو یہ بیان دینے کے لیے تیار رکھے کہ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا وہ اپنی مرضی سے پارٹی بدل رہا ہے۔"

"یہ تو میری بیٹی کو فائدہ پہنچانے کا کام کر رہے ہو۔ دیکھا جائے تو میں تمہارے کسی کام نہیں آ رہا ہوں بلکہ تم ایک اور احسان کر رہے ہو۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں۔ اپنی ارمانہ بیٹی کی خواہش پوری کر رہا ہوں۔ اچھا خدا حافظ پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ مونچھوں پر تاؤ دینا' ایک فاتحانہ انداز ہوتا ہے۔ آج اس نے بڑی فتوحات حاصل کی تھیں۔ جس کے بھائی کو قتل کرایا تھا' اسی سے اپنے مطالبات منوائے تھے اور اپنے برابر کے ایک ڈاکو کو اپنا احسان مند بنایا تھا۔ اس کی بیٹی کو ایک کروڑ کا قرضہ اپنی جیب سے نہیں قومی خزانے سے دلا رہا تھا۔ اور یہ تو محض عوام کو خوش کرنے کے لیے "قومی خزانہ" کہا جاتا ہے۔ ورنہ یہ خزانہ بڑوں میں سے اس کے باپ کا ہوتا ہے' جو اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لیتا ہے۔

☆==========☆==========☆

امداد جمالی نے وہ پہلی رات اصطبل میں گزاری۔ ایک بڑے سے مٹی کے برتن میں مکئی کی روٹیاں اور چھولے کھائے۔ گھوڑوں کے ڈاکٹر نے اس کے زخموں پر جو دوائیں

لگائیں' ان میں انسانوں کو دی جانے والی دواؤں کے ساتھ گھوڑوں کو دی جانے
دواؤں کی تھوڑی سی مقدار بھی شامل کی تھی۔ انجکشن میں بھی ملاوٹ کی تھی۔ اگر
کمزور مریض ہوتا تو شاید وہ مرجاتا یا پھر ڈاکٹر کے لیے پرابلم بن جاتا لیکن امداد جمالی
مضبوط قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ قوتِ برداشت بھی غیر معمولی تھی۔ جو یہ حوصلہ کرے
دشمن کو مارنے کے بعد ہی مرے گا تو پھر وہ ایسے حوصلے اور ضد سے طبعی عمر تک جیتا
ملاوٹی دوائیں اور ملاوٹی غذائیں کھا کر بھی اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے زندہ رہتا ہے۔

امداد جمالی بھی اس رات اصطبل کی سوکھی گھاس پر لیٹ کر غیر انسانی معمولات
نتیجے میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ کچھ تکلیف محسوس کرتا رہا۔ پھر تمام دن
سے' سپاہیوں سے لڑنے اور میلوں دور تک دوڑنے کی تھکن نے اسے سلا دیا۔

دوسری صبح اس نے بیدار ہو کر آہنی دروازے کے پاس آ کر آواز دی۔
ہے؟"

آرزو کے حکم کے مطابق اس خاص اصطبل کے اطراف دس مسلح تگڑے جوان
پہرہ تھا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ "ہاں بولو۔ کیا چاہتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں ٹائلٹ جانا چاہتا ہوں۔"

"یہاں کوئی ٹائلٹ نہیں ہے۔ گھوڑے اصطبل میں فارغ ہوتے ہیں۔ تم
جاؤ۔"

"کیا بکواس کرتے ہو؟ میں اصطبل میں ہوں لیکن گھوڑا نہیں ہوں۔"

"جب تک پورا لباس نہیں پہنو گے' گھوڑوں میں شامل رہو گے۔ کیا پورا لباس
گے؟"

"ہرگز نہیں۔ پہلے میں بے لباس کرنے والے تھانیدار کو بے کفن' بے لباس
میں ملاؤں گا پھر لباس پہنوں گا۔ تم اپنی آقازادی آرزو کو بلاؤ۔"

"ہماری آقازادی تمہاری خاطر اس تھانیدار کو تلاش کرنے گئی ہے۔ بی بی
ہے کہ جب تک تمہارا انتقام پورا نہیں ہو گا' تمہیں گھوڑے کی طرح زندہ
چاہیے۔"

اصطبل کے اندر خاموشی رہی۔ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا کہ آرزو
وعدے کے مطابق تھانیدار کا سراغ لگانے گئی ہے۔ حالانکہ وہ اسی وسیع و عریض
اپنے ذاتی کاٹیج کے اندر تھی۔ اس نے صبح اٹھ کر فون کے ذریعے اپنے باپ
تھا کہ عشری داتا کے تھانے کا چارج لینے والا تھانیدار جو کہیں چھپا ہوا ہے اسے

ہے کہ کر کسی دوسرے صوبے میں ٹرانسفر کرا دیا جائے تاکہ امداد جمالی کبھی اسے نہ پا سکے
اور اپنی قسم پوری ہونے کے انتظار میں گھوڑے کی ابتدائی عادتیں اختیار کرتے کرتے انتہا
کو پہنچ جائے۔

پھر اس نے جابر خان کو طلب کیا۔ اس کے حاضر ہونے پر پوچھا۔ "گھوڑے کا کیا
حال ہے؟"

"ابھی تک تابعدار ہے۔ اسے بتایا گیا ہے کہ آپ تھانیدار کی تلاش میں گئی ہیں۔
اس لیے وہ گھوڑے کی طرح اصطبل تک ہی محدود ہے۔ بھنگی نے جا کر اندر کی صفائی کی
تھی۔ سائیس اور کمپاؤنڈر نے اسے نہلایا ہے اور زخم صاف کیے ہیں۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی
کی ہے اور وہی کل والی گھوڑا مکس دوائیں دی ہیں اور انجکشن لگایا ہے۔"

آرزو نے کہا۔ "ایک کہاوت ہے کہ اولاد کو سونے کا نوالہ کھلاؤ مگر اسے شیر کی نظر
سے دیکھو۔ اس کے برعکس جسے غلام بنانا ہو' اسے گھوڑے کی خوراک دو مگر محبت کی
نظروں سے دیکھو۔ ہاں اگر وہ سرکشی دکھائے گا۔ باغیانہ انداز اختیار کرے گا تو پھر ٹریٹز کی
مراعات حاصل کی جائیں گی۔ اسے لگام دے کر چابک سے مار مار کر سدھایا جائے گا۔"

"کل ڈاکٹر کچھ پریشان تھا آج حیران اور مطمئن ہے۔ کہہ رہا تھا کہ ایک انسان کو
گھوڑا بنانے کا تجربہ نہایت دلچسپ ہے اور وہ مزید تجربات کرتا رہے گا۔"

وہ بولی۔ "ہم انسان کو اس کے جسمانی اور ظاہری حالات سے سمجھتے ہیں۔ جبکہ جسم
سے زیادہ ذہن کی اہمیت ہوتی ہے۔ انسان اپنے ذہن سے ہی اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے
وہ اپنے ذہن سے ہی معاشرے میں گھوڑا اور گدھا بن کر رہتا ہے۔ بہرحال جاؤ دوپہر کو
اسے بتانا کہ میرا فون آیا تھا۔ میں اس کے دشمن کا سراغ لگانے میں مصروف ہوں۔ شاید
آج شام تک واپس آؤں گی۔"

جابر خان چلا گیا۔ وہ بیڈ روم میں آ کر بستر پر چاروں شانے چت لیٹ گئی۔ امداد جمالی کا
خیال بار بار آ رہا تھا۔ اس انسانی گھوڑے میں بڑی کشش تھی۔ دل اس کی طرف کھنچا جاتا
تھا لیکن وہ بڑے صبر سے اس دن کا انتظار کر رہی تھی' جب اس کے منہ میں آن دیکھی
لگام ڈالے گی اور اسے لگام کے اشاروں پر چلائے گی۔ اس کے ذہن میں جو ایک آئیڈیل
مرد تھا' وہ دراصل ایک آئیڈیل دو پیروں والا گھوڑا تھا۔ ایسا گھوڑا مل گیا تھا مگر ابھی
وہ رام نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اپنے اعصاب پر سوار ہونے نہیں دے رہا تھا۔ جبکہ آرزو وہ ہوتی ہے'
جو ہر ایک کے اعصاب پر آسانی سے سوار ہو جاتی ہے۔ اس آرزو کا بھی یہی عزم تھا کہ وہ
انسان پر سوار ہو گی.......... ضرور سوار ہو گی۔

امداد جمالی بھی صبح سے آرزو کا منتظر تھا لیکن انتظار کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ
کے پیچھے تھانیدار کا منتظر تھا۔ ویسے دماغ میں یہ سوال ابھرتا تھا کہ وہ تیز طرار دوشیزہ
پر مہربان کیوں ہے؟ اس فارم سے شہری داتا سینکڑوں کلومیٹر کے فاصلے پر ہو گا۔
رات سے گئی ہے اور شام تک واپس آنے والی ہے۔ کتنی محنت اور لگن سے
دشمن کو تلاش کر رہی ہے۔

چونکہ وہ اس کا ممنون اور احسان مند تھا لہٰذا اس کے لیے اپنے دل میں بڑے
جذبات محسوس کر رہا تھا۔ شام کو جابر خان نے اسے اطلاع دی کہ بی بی جان کا فون
وہ ایک گھنٹے میں یہاں پہنچنے والی ہیں۔ اس اطلاع کے بعد اس کی بے چینی بڑھ گئی
نے کبھی کسی لڑکی کا انتظار نہیں کیا تھا لیکن اس کے انتظار میں اپنائیت محسوس کر رہا

پھر ایک گھنٹا بھی گزر گیا۔ گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ اصطبل کا آہنی دروازہ
دیا گیا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتی ہوئی اصطبل میں اس کے قریب آکر رک گئی۔ وہ
سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گھوڑے سے اترتی ہوئی بولی۔ ”میں یہاں سے شہر
اور پھر وہاں سے گنڈاوا گئی تھی۔ میرے ایک نمک خوار سپاہی نے بتایا تھا کہ وہ تھانیدار
گنڈاوا کے ایک تھانے میں ہے لیکن میرے پہنچنے تک وہ وہاں سے بھی جا چکا تھا۔“

وہ احسان مندی سے بولا۔ ”تم میرے لیے سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے آئی ہو
میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟“

”شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں تم اس شیطان سے اپنی بے
عزتی کا بدلہ ضرور لو۔“

”لیکن جس طرح تم میرے کام آرہی ہو‘ اس طرح کوئی اپنا بھی کام نہیں آتا
ہے۔“

”جو دل سے اپنے ہوتے ہیں‘ وہی کام کرتے ہیں۔ کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو؟“

”کل تک غیر تھیں‘ اب نہیں ہو۔ جی چاہتا ہے‘ تمہارے لیے بھی میلوں
دوڑتا رہا کروں۔“

وہ ہنس کر بولی۔ ”کسی مقصد کے بغیر دوڑ کر کیا حاصل کرو گے پھر یہ کہ
میں جہاں سے گزرو گے‘ وہاں لوگ پتھر ماریں گے۔ پولیس والے پکڑیں گے
وغیرہ تمہیں پاگل ثابت کریں گے۔“

”ہاں میں قسم کھا چکا ہوں۔ قسم توڑ نہیں سکتا ورنہ پورا لباس پہن کر
کرنے تمہارے ساتھ جاتا۔ میں نادم ہوں کہ تمہیں تنہا جانا پڑا۔“

”میری فکر نہ کرو۔ اگر میری اپنائیت کا جواب اپنائیت سے دینا چاہتے ہو تو میری
خواہش پوری کرتے رہو۔ جس طرح میں نے تمہیں یہاں رکھا ہے اسی طرح رہو۔ میں
بچپن سے گھوڑوں کے درمیان رہتی آئی ہوں۔ اس لیے تم مجھے اسی حال میں اچھے لگتے
ہو۔“

”میں تمہیں خوش رکھنے کے لیے اسی حال میں رہوں گا۔ یوں بھی تمہاری غیر
موجودگی میں تمہارے ملازموں نے مجھے جس طرح رکھا ہے اور جیسا سلوک کیا ہے‘ اس
کے نتیجے میں میں خود کو گھوڑا سمجھنے لگا ہوں۔“

”اگر تمہارے مزاج کے خلاف کوئی سلوک کیا گیا ہے تو مجھے بتاؤ۔“

وہ قریب ہو کر اس چٹان جیسے جسم پر ہاتھ رکھ کر اس کے زخموں کو دیکھنے لگی۔ وہ
بولا۔ ”کسی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ میرے مزاج کے خلاف کوئی سلوک کرے۔
میں تمہارے مسلح ملازموں کے ہاتھ پاؤں توڑ سکتا ہوں لیکن ایک ملازم نے مجھ سے کہا تھا
کہ یہ تمہارا حکم ہے کہ جب تک انتقام پورا نہ ہو‘ مجھے ایک گھوڑے کی طرح رہنا
چاہیے۔“

”اور تم نے میرے اس حکم کا برا نہیں مانا۔“

”اگر تم گدھے کی طرح رہنے کو کہتیں تو توہین محسوس کرتا۔ گھوڑا تو شہ زور اور
وفادار ہوتا ہے۔ اپنے محسن اور آقا کو پیٹھ پر بٹھا کر آگ اور خون کا دریا پار کراتا ہے۔“

وہ اس کے زخموں کا معائنہ کرنے کے بہانے کبھی کبھی اس سے لگ جاتی تھی۔ اپنے
بدن کا مختصر سا تعارف پیش کر کے پھر الگ ہو جاتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے اپنے بابا
سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے وسیع ذرائع استعمال کر کے اس تھانیدار کو تلاش کریں۔ پھر
کسی بہانے اسے یہاں فارم میں بھیج دیں۔ اس طرح شکار خود قریب چلا آئے گا۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔ تمہیں تنہا اس کی تلاش میں نہیں جانا پڑے گا بلکہ جانا ہی نہیں
چاہیے۔ اپنے ملازموں کو اس بدمعاش کی تلاش میں روانہ کر سکتی ہو۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ کل سے کم از کم پچیس ملازم مختلف شہروں اور بستیوں
میں جائیں اور میں تمہارے پاس اصطبل میں رہوں۔“

”گھوڑے لباس نہیں پہنتے لیکن میں انسانی گھوڑا ہوں۔ میرے پاس آتی رہو گی تو
بدنام ہو جاؤ گی۔“

وہ قریب آئی پھر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”کیا مجھے بدنامی سے
بچاؤ گے؟“

"جان دے کر بھی تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"تو پھر آؤ، ہم شادی کرلیں۔ اس کے بعد کوئی مجھے بے حیا نہیں کہے گا۔"

شادی وہ پریشان ہو کر بولا۔ "مم.......... میں گھر بساؤں گا تو پھر انتقام نہیں لے سکوں گا۔"

"انتقام لینے کی ذمہ داری میری ہے۔ پھر یہ کہ گھر بسانے کے لئے ایک گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھانے پکانے کا سامان اور رہنے سہنے کے لئے فرنیچر اور بیڈ وغیرہ لازمی ہیں۔ لہٰذا تم گھر نہ بساؤ۔ ہم یہ اصطبل بساتے رہیں گے۔ اس فارم کے کتنے ہی گھوڑے اپنے اپنے اصطبل میں اپنی نسل بڑھاتے رہتے ہیں۔"

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دشمن سے انتقام لینے کے راستے میں ایک منزل آئے گی کہ اسے مجبوراً کسی سے نکاح قبول کرنا ہو گا۔ مجبوری یہ تھی کہ شادی کی پیشکش کرنے والی اس کی بہت بڑی محسنہ تھی۔ اسے پولیس اور قانون کے شکنجے سے ... رہی تھی۔ اس کی بہن کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کو دل سے محسوس کرکے اس کے دشمن کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر آخری بات یہ تھی کہ اسے جیون ساتھی بنا کر اس بات کی ضمانت دے رہی تھی کہ جس طرح اس ملک کے بڑے کبھی قانونی گرفت میں نہیں آتے اسی طرح پولیس والے اسے بھی کبھی گرفتار نہیں کریں گے۔

وہ آرزو کے جانے کے بعد سوکھی گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ وہ اچھی ... جوان اور پرکشش ہے لیکن میدانِ جنگ میں اتر کر محبت اور شاعری نہیں کی جاتی۔ حالات ایسے تھے کہ اس کی جنگ آرزو لڑ رہی تھی اور اس نے میدانِ جنگ کے ایک گوشے میں اسے محبت اور شاعری کے لئے بٹھا دیا تھا اور اس کے ایسا کرنے پر وہ اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لئے فارم میں چھپا رکھا تھا۔ بہرحال حالات نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ گھوڑا بن چکا ہے اور آرزو اس کے تمام معاملات پر سوار ہو چکی ہے۔ اب وہ جدھر لگام موڑے گی، اسے ادھر ہی جانا ہو گا۔

آرزو نے اپنے کاٹیج میں آکر فون کے ذریعے باپ سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "بابا! آپ کے لئے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ میں شادی کرنے والی ہوں۔"

دوسری طرف باپ نے صرف ہوں کیا۔ پھر فون پر خاموشی رہی۔ اس نے پوچھا۔ "بابا! یہ صرف "ہوں" کا مطلب کیا ہوا؟ کیا آپ خوش نہیں ہوئے؟"

"بیٹی! میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کل تم اسے جس حالت میں لے کر

تھیں اور جس طرح خوش ہو کر اس کی تعریفیں کر رہی تھیں، اس سے یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ تم میرے سامنے پریسلر ترمیم پیش کرنے والی ہو۔ ایک انسان میں ردوبدل کر کے اسے گھوڑا بنا کر یہ کہنے والی ہو کہ میں اسے گھوڑا نہ سمجھوں، داماد سمجھوں۔"

"بابا! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ترمیم میں نے اپنے مزاج کے مطابق کی ہے۔"

"امریکا کے سینیٹر لیری پریسلر نے بھی اپنے مزاج کے مطابق ترمیم کی۔ اس ترمیم میں بھارت سے انصاف ہوتا اور پاکستان سے ناانصافی ہوتی۔ اگر پاکستان اسے قبول نہ کرتا تو اس کے لئے امریکی امداد بند کر دی جاتی۔

تم نے ایک انسان میں جو ترمیم کی ہے اسے میں قبول نہ کروں تو ایک بیٹی پیار و محبت کا سلسلہ بند کر دے گی۔ ایک گھوڑے کو شوہر بنا کر دنیا والوں کے سامنے میری گردن جھکا دے گی۔ جب انصاف اور انسان میں تبدیلیاں کی جاتی ہیں تو پھر انسانیت نہیں رہتی۔ ہم ڈاکوؤں میں اتنی انسانیت تو ہو کہ ہمارا داماد انسان کہلائے۔"

وہ بولی۔ "کوئی صرف انسان کہلانے سے انسان نہیں بن جاتا۔ وہ اندر سے کچھ اور ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی ذہنی استطاعت ایک گدھے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ چونکہ صورت انسان کی ہوتی ہے اس لئے انسان کہلاتے ہیں۔ میں جسے آپ کا داماد بنانا چاہتی ہوں، وہ بھی صورت اور سراپا میں انسان ہے۔"

"کیا وہ انسانوں کی طرح ملبوس رہے گا؟؟"

"اس کی بہن ملبوس تھی پھر بے لباس کر دی گئی۔ میرے گھوڑے نے احتجاجاً لباس اتارا ہے۔ اس کی بے لباسی پوچھتی ہے کہ نواب پور کی عورتوں کو بازار میں ننگا پھرانے کا دستور کب تک رہے گا؟ قوم مردوں سے بنتی ہے یا عورتوں سے؟ اگر دونوں سے بنتی ہے تو کچھ مردوں کو بھی ضرور ننگا پھرایا جائے اور سروے کیا جائے کہ پوری قوم شرم سے ڈوب مرے گی یا یہ سمجھے گی کہ پریسلر ترمیم کا مفہوم ایک سے انصاف اور دوسرے سے ناانصافی ہے۔ لہٰذا ہمارے ملک میں یہ ترمیم نہیں ہو گی کہ مرد سے انصاف اور عورت سے ناانصافی ہو۔ ہو گا تو دونوں سے انصاف ہی ہو گا۔ ورنہ دونوں میں سے کسی کو بھی بے لباس رکھا جا سکتا ہے۔"

مصری خان نے فون بند کر دیا۔ اس نے اپنی دانست میں پریسلر ترمیم کا حوالہ دے کر اپنی بیٹی کو لاجواب کرنا چاہا تھا مگر وہ بھی اپنے باپ کی بیٹی تھی۔ اس نے واضح طور سے نہ سہی، در پردہ یہ کہہ دیا تھا کہ اس ملک میں ننگا پن کہاں نہیں ہے۔ نیچے سے اوپر تک ہے۔ بھارت نے معائنہ کرنے والی امریکی ٹیم کے لئے اپنے ایٹمی پلانٹ کا دروازہ کھولنے

سے انکار کر دیا تھا۔ حکومتِ پاکستان کو بھی عوامی دباؤ میں آ کر انکار کرنا پڑا۔ تب
جانب سے یہ تجویز پیش گئی کہ معائنہ کرنے والی ٹیم اسلام آباد نہیں آئے گی۔
ایٹمی پلانٹ نہ کھولا جائے لیکن سیٹلائٹ کے ذریعے اس پلانٹ میں جھانکنے کی اجاز
دی جائے۔

یوں سیٹلائٹ کے ذریعے تھوڑی جھلک دکھا دینے پر زیادہ بحث نہیں ہوئی۔
شعبوں کے عہدیداران نے اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔ سمجھنے کی بات یہ
ایٹمی پلانٹ ہے کیا؟ یہ پاکستان کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ یہ پوری قوم کی غ
مسئلہ ہے کہ ان کی کوئی بیٹی بند کمرے میں غسل کر رہی ہو تو کیا وہ کسی سیٹلائٹ
دروازے کے کی ہول سے جھانکنے کی اجازت دیں گے؟

اگر امداد جمالی بے لباس تھا تو یہ ایک احتجاج تھا کہ اس کے ملک میں نیچے
والوں تک بے حجابی کیوں ہے اور یہ کب تک رہے گی؟ اگر اسمبلی میں گھوڑے
پہن کر جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ننگے نہیں ہیں۔ یہ چھوٹی
سمجھنے کی ہے کہ لباس حیا کا اور غیرت کا ہوتا ہے' سوتی دھاگوں کا نہیں ہوتا۔ یا پھر
لیا جائے کہ اسمبلی میں جانے والے ملبوس گھوڑوں کے مقابلے میں آرزو کے فا
گھوڑے حقیقت پسند ہیں۔ جب وہ گھوڑے ہیں تو پھر گھوڑے ہی ہیں' وہ سوتی دھا
فریب نہیں دیتے۔

باپ بیٹی میں ٹھن گئی تھی۔ اس لئے شادی کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ باپ ا
درست تھا۔ ایک ڈاکو کی حیثیت سے پورے علاقے میں اس کی دہشت طاری تھی۔
میں ایک گھوڑے کو داماد بنا کر خود اپنی ہنسی نہیں اڑانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف
فطرت سے مجبور تھی۔ اس کا آئیڈیل وہی گھوڑا تھا۔ وہ اس کے لئے باپ کے ہاتھو
ہو سکتی تھی لیکن اس سے جدا نہیں ہو سکتی تھی۔

باپ بہت سنگدل تھا مگر بیٹی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ شرمندگی سے بچنے
اپنی جان دے سکتا تھا۔ لاڈلی بیٹی کی جان نہیں لے سکتا تھا' وہ بھی باپ کو اتنی ہی
سے چاہتی تھی اس کا خیال تھا کہ آج نہیں تو کل باپ اس کے فیصلے کے سامنے
جائے گا۔

دو ماہ بعد ارمانہ اس سے ملاقات کرنے ایک نئی مرسڈیز میں آئی۔ اس کے لئے
کے احاطے کا بڑا آہنی گیٹ کھول دیا گیا۔ جابر خان نے مرسڈیز کے ساتھ گھوڑا دو
ہوئے آرزو کے کاٹیج تک اس کی راہنمائی کی۔ آرزو نے کاٹیج سے باہر آ کر پوچھا۔

راستہ بھول گئی ہو؟"

وہ مرسڈیز سے نکل کر اس سے مصافحہ کرتی ہوئی بولی۔ "میں شرمندہ ہوں۔ پچھلی
ملاقات میں تمہیں غلط سمجھتی رہی۔ تمہارے بابا نے ہم پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ مجھے
ایک کروڑ روپے مل گئے۔ مجھے شکریہ ادا کرنے کے لئے آنا چاہئے تھا لیکن ساجد وفاداری
بدلنے کے بعد اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ مجھے یہاں آنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔"

"کیا باہر سے باتیں کرو گی؟ اندر آؤ۔"

"میں فرانس اور سوئٹزر لینڈ سے تمہارے لئے بہت سے تحفے لائی ہوں۔ پچھلی سیٹ
اور ڈکی میں ہیں۔ اپنے ملازموں سے یہ ناچیز تحفے اندر لانے کو کہہ دو۔"

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی کاٹیج میں آئیں۔ آرزو نے پوچھا۔ "اچھا تو تم ملک سے
باہر تھیں۔"

"ہاں اسی لئے تو تمہارے پاس نہ آ سکی۔ میں کیا بتاؤں کہ دوسری پارٹی میں ساجد کی
کتنی عزت ہو رہی ہے۔ وہاں کسی کی مجال نہیں ہے کہ ساجد کو گھوڑا کہے' بکنے والے
کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اب تک غلط پارٹی میں تھا۔ صبح کا بھولا تھا' شام کو گھر آ گیا
ہے۔"

"انسان اپنا بھلا برا سمجھ کر ہی ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں اور ایک پارٹی سے
دوسری پارٹی میں جاتا ہے۔ لوگ اسے گھوڑا کہہ کر مذاق اڑاتے ہیں۔"

ارمانہ نے کہا۔ "مذاق اڑا کر ہمارا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔ گھوڑوں کی خرید و فروخت کی
مخالفت تمام سیاسی جماعتیں کرتی ہیں۔ مگر اس تجارت کی حوصلہ شکنی نہیں کرتیں۔ کیونکہ
کسی مرحلہ پر ان میں سے کسی جماعت کو بھی گھوڑا خریدنے کی ضرورت آ پڑتی ہے۔"

ملازم قیمتی تحائف لا کر رکھ رہے تھے۔ ارمانہ نے کہا۔ "میرے بابا کہہ رہے تھے کہ
چاچا مصری خان تم سے ناراض ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے بابا نے بھی فون پر
نصیحتیں کی تھیں۔ وہ یہاں آنے والے تھے لیکن میں ان کی جگہ چلی آئی ہوں۔"

"کیا تم بھی نصیحتیں کرنے آئی ہو؟"

"میں کوئی بزرگ خاتون نہیں ہوں۔ جوان دلوں کی دھڑکنوں کو سمجھتی ہوں۔ ایک
لڑکی جب کسی کو دل و جان سے اپنا سب کچھ مان لیتی ہے تو پھر بوڑھی نصیحتیں بے اثر
ہوئی رہتی ہیں۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ تم جیسا آئیڈیل چاہتی تھیں ویسا تمہیں
مل گیا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"میں کیا بتاؤں' وہ جیسا ہے ویسا کوئی دوسرا نہیں ملے گا اور نہ ہی دوسرے کسی کی

آرزو کروں گی۔ پہلے وہ مجھ میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس کے سر پر صرف انتقام کا بھو
سوار رہتا تھا۔ اب رفتہ رفتہ انتقام کی شدت کم ہو رہی ہے اور میرے لئے اس کی دیوا
بڑھتی جا رہی ہے۔“

”جب تک مرد کی زندگی میں ایک محبوبہ نہیں آتی‘ تب تک وہ بہن کے پیار
پاکیزگی اور اس سے وابستہ غیرت کو اہمیت دیتا ہے۔ جب محبوبہ کا جادو چلتا ہے تو بہن
محبت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔“

”درست کہتی ہو۔ اب وہ میری ہر بات کو اہمیت دیتا ہے۔ جب تک اس سے
نہیں جاتی وہ بے چینی سے میرا انتظار کرتا رہتا ہے۔ میرے مقابلے میں دشمن تک پہنچ
انتظار ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔ صبر آ رہا ہے کہ کبھی نہ کبھی اس سے سامنا ہو گا تو وہ اس
انتقام لے گا۔ یعنی انتقام اب محض ایک ایسی رسم رہ گیا ہے‘ جسے پورا کرنے کے بعد
پوری ہو گی پھر وہ پورا لباس پہن سکے گا۔“

”کیا واقعی وہ تمہارے اشاروں پر گھوڑوں جیسی زندگی گزار رہا ہے۔“

”ہاں۔ اس کے تمام زخم بھر گئے ہیں اور وہ زخم گھوڑوں کو دی جانے والی دوا
سے بھرے ہیں۔ میرا خاص ڈاکٹر کچھ تجربات کر رہا ہے۔ میرے آدمی اسے کھانے کے
گھوڑے کا چارا دیتے ہیں۔ اس چارے میں صرف گھاس بھوسا نہیں ہوتا اور نہ
ہوتے ہیں‘ بیسن اور جو وغیرہ کی آدھی کچی آدھی پکی ہوئی روٹیاں ہوتی ہیں۔ ان دو
میں اس کے اندر بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ایسی تبدیلیاں جسے صرف دوسرے گھوڑے
سکتے ہیں یا اس کی گھوڑی سمجھ سکتی ہے لیکن بیان نہیں کر سکتی۔“

”لیکن آرزو‘ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ تمہیں باقاعدہ اس کی منکوحہ بن
چاہئے۔“

”یہی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ بابا اپنی ضد پر قائم ہیں۔ اپنی لاڈلی بیٹی
لئے وہ اپنے فیصلے میں کوئی لچک پیدا نہیں کر رہے ہیں۔“

”وہ باپ ہیں ایک نہ ایک دن ضرور جھکیں گے۔ مگر پتا نہیں وہ دن کب آئے
میں تمہیں ایک بہن کی طرح مشورہ دیتی ہوں۔ جب تم اس سے چوری چھپے مل رہی
پھر چوری چھپے نکاح پڑھوا لو۔ جب چاچا مصری خان راضی ہو جائیں گے تو ان پر نکاح ظ
کر دینا یا پھر ان کی دلجوئی کے لئے دوسری بار نکاح پڑھوا لینا۔“

”سچ پوچھو تو ایسا خیال میرے ذہن میں کئی بار آیا ہے لیکن میں بابا کے راضی
جانے کے انتظار میں دن گزار رہی ہوں۔ میرا دل کہتا ہے‘ اب وہ زیادہ عرصہ

راضگی برداشت نہیں کریں گے۔“

”اسی انتظار میں کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو پچھتاؤ گی۔ اپنے ساتھ باپ کو بھی کہیں منہ
کھانے کے قابل نہیں چھوڑو گی۔“

ملازم کھانے پینے کی چیزیں لا کر رکھ رہے تھے۔ آرزو نے کہا۔ ”ناشتا کرو اور رات
کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔“

”میں پھر کسی دن ساجد کے ساتھ آ کر کھاؤں گی۔ میرا واپس جانا ضروری ہے۔“

”کیا میرے گھوڑے سے ملاقات نہیں کرو گی؟“

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”توبہ ہے۔ میں تو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکوں گی۔ تم بچپن سے
گھوڑوں کے ساتھ رہتی آئی ہو۔ اس لئے تمہیں تمام گھوڑے ایک جیسے بے لباس دکھائی
دیتے ہیں۔ ویسے تم اس گھوڑے کے لئے بڑی قربانی دے رہی ہو۔ تم اس کے ساتھ کبھی
کسی انسانی سوسائٹی میں نہیں جا سکو گی۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ایسی تمام باتوں کو پہلے ہی سوچ لیا تھا اور
سمجھ لیا تھا۔ ارمانہ وہاں تین گھنٹے گزار کر اپنی مرسڈیز میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے
کے بعد آرزو نے جابر خان کو بلا کر کہا۔ ”میں اپنے ملازموں سے مشورہ نہیں لیتی ہوں۔ تم
میرے وفادار اور جاں نثار ہو۔ پہلی بار تم سے پوچھ رہی ہوں‘ کیا مجھے رازداری سے نکاح
پڑھا لینا چاہئے؟ میں اپنے بابا سے بات چھپانا چاہتی ہوں۔“

”کبھی آقا سائیں کو یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ مجھے گولی مار دیں یا مجھ پر کتے چھوڑ
دیں گے۔ اس کے باوجود میں جائز مشورہ دیتا ہوں کہ آپ نکاح پڑھوا لیں۔“

وہ خوش ہو گئی۔ اس نے ایک چابی اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو۔ سیف کھول کر
پندرہ ہزار روپے لے آؤ۔“

وہ چابی لے کر دوسرے کمرے میں گیا۔ پھر پندرہ ہزار روپے لے آیا۔ آرزو نے
کہا۔ ”یہ تمہیں انعام دے رہی ہوں اور زبان دیتی ہوں کہ بابا تمہیں کوئی نقصان نہیں
پہنچائیں گے۔ تم جاؤ اور کسی قابل اعتماد قاضی سے میرے اور امداد جمالی کے نکاح کی بات
کر کے کل شام کا وقت مقرر کر لو۔“

وہ بولا۔ ”پورے صوبے کے قاضی آپ سے اور آقا سائیں سے واقف ہوں گے
اور نکاح پڑھانے کے سلسلے میں آقا سائیں کی اجازت ضرور چاہیں گے۔ میں آپ کے لئے
جان دے سکتا ہوں مگر کوئی قاضی مرنے کے لئے تیار نہیں ہو گا۔“

”تو پھر تم نے کیا سوچ کر مجھے نکاح پڑھوانے کا مشورہ دیا تھا؟“

"اس سلسلے میں کچھ زور زبردستی کرنی ہوگی۔ کسی قاضی کو جبراً اٹھا کر لانا ہوگا۔ ارمانہ بی بی نے گن پوائنٹ پر طلاق حاصل کی تھی۔ قاضی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر آپ نکاح پڑھوانا ہوگا۔"

"جس طرح بھی کام بنتا ہے جا کر بناؤ۔ کل شام نکاح ہو جانا چاہئے۔"

وہ حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ اس فارم میں جابر خان کی طرح چند اہم افراد تھے۔ ان میں سے ایک فارم کا انچارج تھا۔ دوسرا مسلح گارڈز کا کمانڈر تھا۔ تیسرا اہم شخص وہاں رہنے والے انسانوں اور گھوڑوں کا راشن کئی ٹرکوں میں بھر کر لایا کرتا تھا۔ چوتھا اہم شخص گھوڑوں کے اسپتال کا بوڑھا تجربہ کار ڈاکٹر تھا۔ جابر خان نے ان سب کو بلا کر کہا۔ "کل یہاں ہماری مالکن آرزو بی بی کی شادی ہوگی۔ ہم سب اس شادی کے راز دار رہیں گے۔ اگر کوئی اس کی اطلاع آقا سائیں تک پہنچائے گا تو وہ فارم میں واپس آنے کے لئے زندہ نہیں رہے گا۔"

وہ سب چپ رہے اور دل ہی دل میں ڈرتے رہے کہ مصری خان کبھی کو بیٹی کے خفیہ نکاح کا علم ہوگا تو وہ فارم کے کسی بڑے عہدیدار کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ پھر ایک نے کہا۔ "ہم تو مصیبت میں پڑ جائیں گے مالکن کے حکم پر عمل کرنا ہی ہوگا لیکن یہ بات آقا سائیں سے زیادہ عرصہ چھپی نہیں رہے گی۔"

جابر خان نے کہا۔ "بی بی جی نے وعدہ کیا ہے' جو وفادار اور راز دار رہے گا' اس پر وہ آنچ نہیں آنے دیں گی۔ اگر کسی کے دل میں پھر بھی خوف ہے تو وہ ملازمت چھوڑ کر یہاں سے جا سکتا ہے۔"

مسلح افراد کے کمانڈر نے کہا۔ "یہاں سے ملازمت چھوڑ کر جانے والا ناقابلِ اعتبار ہوگا۔ اس کے بارے میں یہی رائے قائم کی جائے گی کہ وہ آقا سائیں کے قدموں میں جا کر یہاں کا راز بتائے گا۔ لہٰذا بی بی اسے فارم سے تو جانے دیں گی مگر وہ راستے ہی میں موت مارا جائے گا۔"

فارم کے انچارج نے کہا۔ "ہر طرح سے ہماری شامت آئے گی۔ اس لئے میں بی بی جی کا وفادار اور رازدار رہوں گا۔"

سب نے یہی عہد کیا۔ جابر خان نے راشن کے انچارج سے کہا۔ "کل تمام فارم والوں کے لئے اسپیشل کھانے پکواؤ اور کمانڈر' تمہارے لئے حکم ہے کہ اپنے چند گارڈز کو لے جاؤ اور کل شام سے پہلے کسی قاضی کو اس کے رجسٹر اور نکاح نامہ فارموں کے ساتھ اغوا کر کے یہاں لے آؤ۔ اس کے بعد ہم اسے نکاح پڑھانے پر مجبور

نا گے۔"

اسی رات سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دوسری صبح چند مسلح افراد ایک ٹے سے شہر میں گئے۔ پھر وہاں ایک قاضی صاحب سے کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ چلیں آقا سائیں مصری خان کی صاحبزادی کا نکاح پڑھا دیں۔"

قاضی صاحب خوش ہو گئے۔ علاقے کے سب سے بڑے ڈاکو سے بہت زیادہ انعام و اکرام سے نوازے جانے کی توقع تھی۔ وہ ضروری کاغذات کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ پھر کئی کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد اس فارم کے اندر پہنچ گئے۔ انہوں نے راستے میں کئی بار پوچھا کہ لڑکے والے کون ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ لڑکے والے بھی دولت مند ہوں گے انہیں دونوں طرف سے خوب مال ملے گا۔

فارم میں پہنچنے کے بعد جابر خان نے کہا۔ "آپ جس قدر مال چاہتے ہیں' وہ ملے گا لیکن آپ ہماری مرضی کے مطابق نکاح پڑھائیں گے۔"

"بھئی نکاح تو شرعی پڑھایا جائے گا۔ اس میں ہماری تمہاری مرضی بھلا کیا ہوگی؟"

"بات یہ ہے کہ آج تک آپ نے جتنے نکاح پڑھائے ہیں' ان میں دلہنیں پردے میں رہ کر نکاح قبول کرتی ہیں۔ مگر یہاں لڑکا پردے میں رہے گا۔"

قاضی صاحب نے پان چباتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟ لڑکا پردے میں کیوں رہے گا؟"

"اس لیے کہ آپ اسے دیکھ نہیں سکیں گے۔ فوراً آنکھیں بند کر لیں گے۔"

"کیا وہ بہت خوفناک ہے؟"

"جی نہیں کچھ نظارے ایسے ہوتے ہیں' جو حمام کے یا اصطبل کے اندر محدود رہتے ہیں۔ انہیں نہیں دیکھنا چاہیے۔ آپ بھی اس دولہا کو نہ دیکھیں۔ وہ اصطبل میں رہتا ہے۔"

انہوں نے ایک طرف پان کی پیک تھوکتے ہوئے کہا۔ "اصطبل میں تو گھوڑے رہتے ہیں اور یہاں تو اصطبل ہی اصطبل اور گھوڑے ہی گھوڑے ہیں۔ آپ مذاق فرما رہے ہیں۔ بھلا محترم جناب مصری خان کا داماد اصطبل میں کیوں رہے گا۔ آپ مجھے محترم ان صاحب کے پاس لے چلیں۔ میں نے دو برس پہلے دیکھا تھا۔ پھر وہ نظر نہیں آئے۔"

"آج بھی نظر نہیں آئیں گے۔ وہ اس شادی میں شریک نہیں ہو رہے ہیں۔"

"تعجب ہے۔ بیٹی کی شادی میں باپ شریک نہیں ہوگا۔ آخر معاملہ کیا ہے؟؟"

جابر خان انہیں آرزو کے کاٹیج میں لے آیا پھر کہا۔ "بی بی جی.........! یہ قاضی

صاحب آپ کے بابا کو پوچھ رہے ہیں۔"

آرزو نے کہا۔ "قاضی صاحب! شادی میرے باپ کی نہیں، میری ہونے والی
اور میں موجود ہوں۔ آپ نکاح پڑھائیں۔"

"میری کیا مجال ہے کہ آپ کے حکم سے انکار کروں لیکن دولہا دلہن کے بزرگو
اور رشتے داروں میں سے کسی کو گواہ کسی کو وکیل بننا چاہیے۔ پھر یہ صاحب دولہا کا مذ
اڑا رہے ہیں کہ وہ اصطبل میں ہے۔"

آرزو نے کہا۔ "یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ میرا ہونے والا جیون ساتھی اصطب
میں ہے۔ میں نکاح کے بعد اس کاٹیج سے رخصت ہو کر اصطبل میں جاؤں گی۔"

قاضی صاحب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر بولے۔ "بی بی جی! م
آپ کی زبان سے جو کچھ سن رہا ہوں، اس پر یقین نہیں آرہا ہے۔ دیکھیے نکاح تو م
ضرور پڑھاؤں گا۔ کیونکہ مجھے زندہ رہنا ہے لیکن میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ اص
معاملہ مجھے بتادیں۔"

"اصل بات یہ ہے کہ میرے بابا اس شادی کے خلاف ہیں۔ میں بڑی رازدار
سے یہ نکاح پڑھوا رہی ہوں اور یہ وارننگ دیتی ہوں کہ آپ کبھی میرے بابا کے سامن
اس شادی کا ذکر نہیں کریں گے۔ اگر ایسی غلطی کریں گے تو میرے سینکڑوں گھوڑے اپ
آہنی نعلوں تلے آپ کو روند کر کچل کچل کر ہلاک کر دیں گے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کانوں کو پکڑتے ہوئے بولے۔ "میں کبھی ای
غلطی نہیں کروں گا۔ آپ دولہا سے کہیں، بارات لے کر آئے۔ میں ابھی نکاح پڑھا دو
گا۔"

"دولہا اصطبل سے باہر نہیں آئے گا۔ ضروری نہیں ہے کہ بارات آئے۔ آپ م
سے یہاں نکاح قبول کرائیں اور دستخط لیں۔ پھر اصطبل کے بند دروازے کے باہر کھڑے
ہو کر دولہا سے نکاح قبول کرالیں۔"

"جو حکم ہو گا، وہی کروں گا۔ خدا کے لیے اتنا بتادیں کہ اصطبل کے اندر کیا ہے
اگر نکاح قبول کرنے والا انسان ہے تو مجھ سے کیوں اسے چھپایا جا رہا ہے؟"

"اس لیے کہ وہ گھوڑا ہے۔ آدمیوں کی طرح بولتا ہے۔ لہٰذا صاف لفظوں میں نکا
قبول کرے گا۔ آپ سے اس لیے چھپایا جا رہا ہے کہ وہ گھوڑوں کی طرح لباس نہیں پہنت
ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ آپ ایک نہایت شریف ڈاکو کی صاحبزادی ہو کر ایسی باتیں کر رہ

"آپ زیادہ بکواس نہ کریں۔ صرف اپنا فرض انجام دیں اور پانچ ہزار روپے لے کر
لے جائیں۔"

"آپ سخی ہیں۔ پانچ ہزار دے رہی ہیں لیکن میں فرض کیسے ادا کروں؟ کسی بھی
شخص کا نکاح جائز نہیں ہوتا۔"

"سنیے قاضی صاحب! وہ ایک بے لباس قوم کا فرد ہے۔ گھوڑوں کی عالمی منڈی میں
قوم کے بڑے جاتے ہیں۔ وہاں انھیں ٹھونک ٹھونک کر دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے
ن بڑا ایسا ہے جو اپنے آقا کو زیادہ سے زیادہ سیاسی فائدے پہنچانے کے لیے اپنی قوم کو
نے پہلوؤں سے ننگا کر سکتا ہے۔ یہ ننگاپن عالمی منڈی سے تو آتا ہے۔ اس کے بعد قومی
ر صوبائی اسمبلی کی منڈی میں چھوٹی نسل کے گھوڑے آتے ہیں۔ ان تمام گھوڑوں نے
الیس برسوں میں اپنی قوم کو تھوڑے تھوڑے سے کپڑے اتار کر اسے بالکل لباس سے
وم کر دیا ہے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ "اب آپ منطقی تجزیہ کریں کہ وہی قوم بے لباس
تی ہے جو گھوڑا بننا پسند کرتی ہے اور اپنی لاعلمی کے باعث یا ناخواندگی کے باعث چند
وں کو اپنے اوپر سوار کراتی ہے پھر وہ جدھر لگام موڑتے ہیں، ادھر وہ مڑتی جاتی ہے۔ یہ
دولہا ہے، اس کی لگام میرے ہاتھوں میں ہے۔ اگر اس سے نکاح جائز نہیں ہے تو پھر
ی صاحب پچھلے چھیالیس برسوں سے آپ ننگے دولہوں کا نکاح پڑھاتے آئے ہیں۔"

قاضی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بی بی جی! آپ کے دلائل اپنی جگہ درست
۔ ہم سب اپنے ننگے پن کا احساس نہیں کرتے ہیں۔ پھر بھی اپنی شرم رکھنے کے لیے
پہن لیتے ہیں۔ آپ سے درخواست یہ ہے کہ صرف نکاح پڑھائے جانے تک اس
لہا کو لباس پہننے دیں۔"

اس نے کہا۔ "ہمیں سند چاہیے اپنے تعلیم یافتہ ہونے کی۔ اس لیے اسکول اور
لجوں کی جعلی اسناد دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ہمیں لاکھوں کروڑوں کے قرضے چاہئیں۔ اس
لیے جعلی جائیداد کی ضمانتی دستاویزات تیار ہو جاتی ہیں۔ جعلی نکاح نامے بھی تیار ہو
تے ہیں۔ میرا اور اس دولہا کا رشتہ سچا اور فریب سے پاک ہو گا۔ اس لئے آپ زبان
ے نکاح نہ پڑھائیں نکاح نامہ پُر کریں، اس پر میرے اور دولہا کے دستخط لیں۔ پھر
جسٹرار آفس جا کر اس پر تصدیقی مہر لگوا کر کل شام تک لے آئیں۔"

قاضی صاحب نے ان احکامات کی تعمیل کی۔ نکاح باقاعدہ نہیں ہوا۔ بے قاعدہ نکاح

نامہ ایک سند کے طور پر تیار ہو گیا۔ آرزو نے جابر خان سے کہا۔ "اپنا ایک مسلح آدمی کل شام تک قاضی صاحب پر مسلط رکھو اور نکاح نامہ تصدیقی مہر کے ساتھ حاصل کرو۔"

یہ حکم دینے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں آئی۔ پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر میک اپ کرنے اور دلہن کی طرح سنگھار کرنے لگی۔ وہ بیڈروم قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ ائرکنڈیشنر تھا۔ فوم کا ملائم لچک دار بستر تھا۔ اس کے باوجود وہ دلہن بن کر اپنے دولہا کے پاس اصطبل کے موسمِ گرما میں آ گئی۔

☆==========☆==========☆

وقت گزرنے لگا۔ مصری خان کو یقین تھا کہ بیٹی کو رفتہ رفتہ اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ اس انتظار میں دو ماہ گزر گئے۔ پھر چار ماہ گزر گئے۔ بیٹی کی مسلسل خاموشی نے سمجھایا کہ وہ غلطی کو سمجھ رہی ہے۔ اس لیے اب باپ سے بحث نہیں کر رہی ہے۔ وہ ہر دوسرے دن فون کے ذریعے گفتگو کرتی تھی۔ مختلف معاملات پر باتیں کرتی تھی لیکن اپنے گھوڑے اور شادی کی کوئی بات نہیں کرتی تھی۔

پھر چھ ماہ گزر گئے۔ مصری خان پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ یہ جانتا تھا کہ وہ گھوڑا ایک اصطبل میں موجود ہے۔ کیا بیٹی اس کا خاص خیال نہیں رکھتی ہو گی؟ کیا اس کے روبرو نہیں جاتی ہو گی؟ اور اگر جاتی ہو گی تو شادی کے جذبات دب جاتے ہوں گے یا اور شدت سے ابھر آتے ہوں گے؟

بیٹی نے چھ ماہ تک اس گھوڑے کا کبھی ذکر نہیں کیا تو ایک دن خود باپ نے پوچھا۔ "امداد جمالی کا کیا حال ہے؟ کیا وہ نیم برہنہ رہنے والی قسم پر قائم ہے؟"

"جی ہاں! نہ اسے وہ دشمن تھانے دار ملے گا اور نہ ہی وہ کبھی گھوڑے سے انسان بنے گا۔"

"بیٹی! ایسے دو پاؤں کے گھوڑے سینکڑوں ہزاروں ملیں گے۔ کہو تو میں ایسے گھوڑوں کے لیے تمہارے فارم کا رقبہ مزید میلوں دور تک پھیلا دوں؟"

"نہیں بابا! دو پاؤں کا ایک ہی گھوڑا یہاں رہے گا۔ ہم اس موضوع پر بات نہ کریں تو بہتر ہے۔ یہ موضوع باپ بیٹی کو ایک دوسرے سے دور کر دیتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں کسی دن فارم میں آؤں گا۔ میری تمام دعائیں تمہارے لیے ہیں۔ خدا حافظ!"

باپ نے ریسیور رکھ دیا۔ بڑی تجربہ کاری سے باتیں بنا کر یہ معلوم کر لیا کہ بیٹی ابھی تک اسی ایک گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو پھر وہ کسی کو

دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ بیٹی کو گمراہی سے بچانے کے لئے اور اپنی شرم رکھنے کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ اب وہ گھوڑا نہ رہے۔ گھوڑا بیمار ہو جائے یا دشمن حالات کو پیٹھ پر بٹھا کر لائے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔

آخری راستہ یہی تھا لیکن وہ بیٹی سے اتنی زیادہ محبت کرتا تھا کہ اس کا دل نہیں نا چاہتا تھا۔ یہ بھی یقینی طور پر جانتا تھا کہ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے وہ باپ سے نفرت رنے لگے گی لیکن ایک طویل عرصے بعد عقل سمجھا رہی تھی کہ اب بیٹی کے راہِ راست آنے کی خوش فہمی کو ختم کر دینا چاہیے۔ کوئی اور راستہ سجھائی نہ دیا تو اکلوتی اولاد کی راضگی اور نفرت مول لینی ہو گی۔

اس نے فون کے ذریعے جمال خان سوہو سے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "تم سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ تم نے بھی آرزو کو اپنے طور پر سمجھایا ہے اور ارمانہ بیٹی بھی اسے سمجھانے گئی تھی۔ اتنی نصیحتوں کے نتیجے میں اس نے خاموشی اختیار کی ہوئی ہے اور یہ خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔"

جمال خان نے کہا۔ "میں آرزو بیٹی کے معاملے میں تم سے زیادہ پریشان ہوں۔ جب بھی سوچتا ہوں تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس گھوڑے کو ختم کر دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"ایسا تو میں بھی سوچتا ہوں لیکن بیٹی پھر ہمیشہ کے لئے مجھ سے بدظن ہو جائے گی۔ اس کے سوا اتنی بڑی دنیا میں میرا اور کون ہے؟ جیسا تم نے ایک معقول داماد پایا ہے' ویسا ہی میرے نصیب میں ہوتا تو میرے بعد اس علاقے میں اس کی تاج پوشی ہوتی۔"

"تم بیٹی کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ اس کا ایک راستہ اور ہے' کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ وہ گھوڑا کسی وجہ سے مجبور ہو کر خود ہی اصطبل اور فارم سے نکل بھاگے۔ اس طرح وہ تمہیں الزام نہیں دے سکے گی۔"

"واہ میرے یار! تم نے بڑی اچھی طرح صلاح دی ہے۔ اس گھوڑے کو وہاں سے تنہا بھاگ جانے پر کسی طرح مجبور کیا جا سکتا ہے؟"

"لیکن تمہاری بیٹی بڑے سخت انتظامات کے ساتھ وہاں رہتی ہے۔ اس فارم کو ایک مضبوط قلعہ بنا رکھا ہے۔ احاطے کا بڑا آہنی گیٹ کوئی کھول نہیں سکتا۔ مچانوں پر مسلح افراد عمارات موجود رہتے ہیں۔ فارم کے اندر بھی مسلح گارڈز کافی تعداد میں ہیں۔"

"میری بیٹی نے واقعی اس فارم کو ایک مضبوط قلعہ بنا رکھا ہے لیکن یہ بات میرے دل کو لگی ہے کہ وہ امداد جمالی خود ہی وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو جائے۔ میرے یار! کوئی

تدبیر سوچو۔ میں بھی سوچ رہا ہوں۔ تمہارا داماد ساجد بہت ذہین ہے۔ اس سے بھی ا
سلسلے میں مشورہ کرو۔ میں پھر رابطہ کروں گا۔"

جمال خان نے ریسیور رکھ کر سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے بیٹی داماد کو دیکھا پھر ک
"مصری خان بہت پریشان ہے۔ میں اس کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔ ساجد! ا
تدبیر سوچو کہ وہ امداد جمالی کسی طرح اس فارم سے نکل بھاگے۔"

ساجد نے کہا۔ "آپ فون پر چاچا مصری خان کو یہی مشورہ دے رہے تھے۔ ا
ہزاروں تدبیریں سوچی جا سکتی ہیں لیکن فلمی قسم کی تدابیر پر ڈرامائی انداز میں عمل کرنا م
ہوتا ہے بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔"

"تم کوئی سی بھی فلمی یا ڈرامائی تدبیر سوچو۔ ہم اس پر عمل کرنے کا کوئی راستہ نک
لیں گے۔"

ارمانہ نے کہا۔ "بابا! آپ باپ کا بدلہ چکانے کے لئے بیٹی پر ظلم کرنا چاہتے ہیں
آرزو' امداد جمالی کو دل و جان سے چاہتی ہے۔ آپ انہیں اسی فارم میں رہنے دیں۔"

باپ نے کہا۔ "ارمانہ! اس معاملے میں نہ بولو۔ تم لڑکیوں میں حسد اور جلاپا پایا
ہے۔ وہ دنیا کے مشہور اور مہنگے گھوڑے خریدتی ہے تو تم اس کے مقابلے میں مرسڈ
خریدا کرتی ہو۔ وہ کروڑوں روپے کا زرمبادلہ خرچ کر کے اپنے کچن کے لئے باہر
کراکری منگواتی ہے تو تم غیر ممالک سے کروڑوں روپے کا میک اپ کا سامان اور آرا
چیزیں منگواتی ہو۔"

ساجد نے کہا۔ "انہیں آپس میں مقابلہ کرنے دیں۔ دونوں ایک دوسرے سے
ماننے والی نہیں ہیں۔ ایک دوسری کو گلے بھی لگاتی ہیں اور گلا بھی کاٹتی ہیں۔ آپ
مصری خان سے دوستی ضرور نبھائیں۔"

جمال خان نے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ فارم کے اندر کوئی زبردست گڑ
پیدا ہو۔ وہاں سب لوگ بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان کے ساتھ امداد جمالی بھی بھاگ ک
ہو۔"

"ان حالات میں آرزو برابر اس کے ساتھ رہے گی۔ اسے بھاگنے نہیں دے گی یا
خود اس کے ساتھ بھاگ جائے گی۔"

ارمانہ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے شوہر کو پھر باپ کو دیکھا اور کہا۔ "آرزو کو
گڑبڑ کے وقت امداد جمالی سے دور رکھا جا سکتا ہے۔ چاچا مصری خان پہلے بیٹی کو فون پ
کہے کہ وہ بہت بیمار ہے۔ بیماری اور تنہائی میں بیٹی کی کمی محسوس کر رہا ہے۔ باپ کی بیا

نتے ہی وہ ضرور اس سے ملنے جائے گی۔"

باپ نے کہا۔ "ابھی تم نے آرزو اور امداد جمالی کو جدا نہ کرنے والی بات کہی تھی
اب اتنی جلدی اسے امداد جمالی سے دور باپ کے پاس پہنچانے کی بات کر رہی ہو؟"

"میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آرزو کو ضرور نیچا دکھانا چاہتی ہوں لیکن آپ کو ان کے
انات کے بوجھ سے ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔"

ساجد نے کہا۔ "ارمانہ درست کہہ رہی ہے۔ آرزو کو اس طرح کم از کم ایک دن
لئے امداد جمالی سے دور رکھا جا سکتا ہے۔"

جمال خان نے پوچھا۔ "اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ فارم کے اندر گڑبڑ کیسے پیدا کی
ے؟ قلعہ بند ہو تو حملہ کرنے والوں کو محاصرہ کرنا پڑتا ہے۔ کسی طرح بڑے آہنی گیٹ
وڑ کر اندر گھسنا پڑتا ہے۔ حملہ کرنے کے لئے ہمارے پاس مسلح افراد کی کمی نہیں ہے
ن اس میں کافی وقت لگے گا۔"

ساجد نے کہا۔ "آپ پرانے زمانے کا طریقہ کار سوچ رہے ہیں۔ یہ فضائی حملوں کا
ہے۔ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے حملے کئے جا سکتے ہیں۔ میں برسرِ اقتدار پارٹی میں ہوں۔
ے لئے دو تین ہیلی کاپٹرز حاصل کرنا مشکل نہ ہو گا۔"

وہ باتیں کرتے رہے۔ ذہن کھلتا رہا۔ عمل کے راستے واضح ہوتے رہے۔ ساجد نے
ا۔ "میں آج رات کی فلائٹ سے اسلام آباد جاؤں گا۔ وہاں پارٹی لیڈر اسد یار خان سے
ی کاپٹرز کے سلسلے میں بات کروں گا۔ پھر فون کے ذریعے بتاؤں گا کہ کتنے ہیلی کاپٹرز یہاں
ن دن پہنچنے والے ہیں۔ اسی کے مطابق آپ اپنے مسلح آدمیوں کو تیار رکھیں۔"

جمال خان خوش ہو رہا تھا۔ بڑے دنوں کے بعد اسے مصری خان کے کام آنے کا
قع مل رہا تھا۔ اس نے فون پر اسے مخاطب کیا اور تمام پلاننگ سمجھائی۔ اس نے کہا۔
مال خان! واقعی تم دوستی نباہ رہے ہو۔ میں دعا کروں گا کہ ساجد بیٹا ہیلی کاپٹرز حاصل
نے میں کامیاب ہو جائے۔ میں اسی کے مطابق بیٹی کو فون پر اپنی بیماری کی اطلاع دوں
وہ اتنی دور اس نیم برہنہ کمبخت کو ساتھ نہیں لائے گی۔ یہ بڑی شرم کی بات ہو گی۔
ہ امداد جمالی کو اپنے فارم کے اندر اصطبل میں چھوڑ کر آئے گی۔ تم ساجد سے رابطہ
و۔ میں بے چینی سے تمہارے دوسرے فون کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

دو بڑے ڈاکو خوش تھے۔ ان کے منصوبے پر کامیابی سے عمل ہونے والا تھا۔ جمال
نے اپنے مسلح آدمیوں کو سمجھا رہا تھا کہ کس طرح دو یا تین ہیلی کاپٹرز میں بیٹھ کر فارم کے
ار گولہ باری کرنی ہے۔ وہاں طویل حملہ ضروری نہیں ہو گا۔ تمام دو سو اصطبل میں سے

کم از کم پچاس اصطبل پر بم پھینکے جائیں گے تو پورے فارم میں آگ پھیل جائے گی، وہاں کے تمام افراد کو فارم سے باہر بھاگنا پڑے گا۔

دوسرے دن ارمانہ نے فون پر آرزو سے کہا۔ "میں تمہیں ایک راز کی بات بتانا چاہتی ہوں مگر ڈرتی ہوں چاچا مصری خان کو معلوم ہو گا کہ میں نے مخبری کی ہے تو ہمارے بزرگوں کی دوستی دشمنی میں بدل جائے گی۔"

آرزو نے کہا۔ "میں تمہیں زبان دیتی ہوں' تم پر کسی طرح کی آنچ نہیں آئے گی اور نہ ہی ہمارے بزرگوں کی دوستی میں فرق آئے گا۔ مجھے بتاؤ' وہ راز کیا ہے؟"

"چاچا مصری خان' امداد جمالی کو گولی مار کر تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتے۔ لہٰذا انہوں نے ایسا منصوبہ بنایا ہے کہ امداد جمالی خود ہی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائے۔"

"ارمانہ! وہ میرا گھوڑا ہے۔ مجھے چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔"

"تمہارے بابا بڑی گہری چال چل رہے ہیں۔ آج یا کل وہ تمہیں فون پر اطلاع دیں گے کہ سخت بیمار ہیں۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم باپ کی بیماری کا سن کے تڑپ کر ان سے ملنے جاؤ گی پھر تمہاری غیر موجودگی میں فارم پر ہوائی حملے ہوں گے۔ سوکھی گھاس کے ذخیروں کے باعث آگ اس پورے فارم میں پھیلے گی۔ اس طرح امداد جمالی کو بھی دوسروں کے ساتھ بھاگنا پڑے گا۔ اس طرح تم اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤ گی اور اپنے باپ کو بھی کوئی الزام نہیں دے سکو گی۔"

"اوہ خدایا! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بابا مجھ سے ایسی دشمنی کریں۔ تمہیں یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"میرے اور تمہارے بابا فون پر گفتگو کر رہے تھے۔ میرے بابا کا خیال ہے کہ میں تم سے جلتی ہوں' حسد کرتی ہوں اس لئے تمہیں محبوب سے جدا ہوتے اور سوگ مناتے دیکھ خوش ہوتی رہوں گی۔ وہ نہیں جانتے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔ تم نے محبت سے مشورہ دیا' میں نے امداد سے شادی کر لی۔ تمہاری محبت بھی ہے احسان بھی ہے کہ تم نے وقت سے پہلے ہی میرے بابا کی تمام ؟ مجھے بتا دی ہیں۔"

"میں نے تو ایک سہیلی کی حیثیت سے دوستی کا فرض ادا کیا ہے۔ مگر سوچتی ہوں تم امداد کو کسی بھی طرح چاچا کی سازش سے بچانے کی کوشش کرو گی تو یہ بھید کھل جائے گا کہ یہ راز صرف مجھے' ساجد کو اور بابا کو معلوم تھا۔ لہٰذا میں نے ہی تمہیں ان کی سازش سے آگاہ کیا ہے۔"

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ میں مصری خان کی بیٹی ہوں اور اپنے باپ کی طرح چالیں چلنا جانتی ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ اس معاملے میں تم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔"

"تم مصری خان کی بیٹی ہونے پر فخر کرتی ہو' کرنا بھی چاہیے لیکن برا نہ ماننا' باپ کو بیٹی سے محبت نہیں ہے۔ چاچا تمہارا سہاگ اجاڑنا چاہتے ہیں۔ وہ تمہاری محبت کے دشمن ہیں۔"

وہ اپنی باتوں سے آرزو کے ذہن میں باپ کے خلاف زہر گھولتی رہی پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ ادھر آرزو کو ابھی پوری طرح یقین نہیں تھا کہ اس کا باپ محض امداد کو اس سے دور کر دینے کے لیے اس کے فارم پر ہوائی حملے کرا سکتا ہے اور کئی کروڑ روپے کے فارم کو ایسے حملوں سے کھنڈر بنا سکتا ہے۔

وہ باپ کے فون کا انتظار کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ارمانہ کی رپورٹ درست ہوئی تو اس کی یہ بات بھی درست ہوگی کہ باپ اپنی بیٹی کا بد ترین دشمن ہو گیا ہے۔ محض ایک گھوڑے کو بھگانے کے لیے فارم کو بھی تباہ کر رہا ہے اور بیٹی کو بھی فریب دے کر اس کے محبوب سے دور کر رہا ہے۔

وہ دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن دس بجے موبائل فون نے متوجہ کیا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے آن کیا تو اسے باپ کی کمزور سی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "بیٹی! میں کل رات موت سے لڑتا رہا اور تمہیں یاد کرتا رہا۔ میرا خاص ملازم تمہیں اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔"

آرزو کا دل یہ سوچ کر ڈوب رہا تھا کہ باپ کا فراڈ شروع ہو رہا ہے۔ اب وہ اپنی بیماری کا ذکر کرنے والا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "بابا! ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ آپ تنہا موت سے لڑتے رہے۔ پھر آپ نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ مجھ پر دل کا دورہ پڑا ہے تو تم کل رات کو ہی فارم سے چل پڑتیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ تم رات کو سفر کرو۔"

"اوہ بابا! آپ وہاں زندگی اور موت کی کشمکش میں رہے اور میں یہاں آرام سے سوتی رہی۔ اب آپ کیسے ہیں؟"

"ڈاکٹروں نے بڑی توجہ دی مجھے بچا لیا۔ یہاں تنہا بستر پر پڑا ہوں۔ خدمت کرنے والے بہت ہیں لیکن محبت کرنے والی بیٹی کی کمی محسوس کر رہا ہوں اگر تم ابھی چل دو تو شام تک میرے پاس پہنچ جاؤ گی۔"

"اوہ بابا! میرا تو جی چاہتا ہے کہ میرے پر نکل آئیں اور میں اڑ کر آپ کے پاس آ

جاؤ۔"

"تو پھر بابا کی جان! چلی آؤ۔ ابھی فارم سے نکل پڑو۔"

"ہاں۔ مگر کل سے میں نے بھی اپنی بیماری آپ سے چھپائی ہے۔ ڈاکٹر نے
مکمل طور سے آرام کرنے کی تاکید کی ہے۔"

"تم بیمار ہو اور تم نے بتایا نہیں؟ کیا باپ سے دکھ درد کو چھپایا جاتا ہے؟"

"آپ نے بھی تو کل سے اپنا دکھ درد چھپایا ہوا ہے۔ حقیقتاً ہم ایک دوسرے
اتنی محبت کرتے ہیں کہ اپنی کسی پریشانی سے ایک دوسرے کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔"

"اچھا اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ فوراً یہاں چلی آؤ۔ میں بڑے ڈاکٹروں سے تم
علاج کراؤں گا۔"

"لیکن بابا! میں نہیں آ سکتی۔ ڈاکٹر نے لمبا سفر کرنے سے منع کیا ہے۔ آپ جا
ہیں کہ میں ہمیشہ گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرتی ہوں۔ ابھی کچھ عرصے تک گھڑ سواری
ممانعت کی گئی ہے۔"

"یہ کس ڈاکٹر نے تمہیں منع کیا ہے؟ آخر تمہیں بیماری کیا ہے؟"

"وہ بات یہ ہے بابا! کہ میں نے آپ سے بہت کچھ چھپایا۔ مگر یہ بیماری نہیں
سکوں گی۔ آپ کو سن کر تکلیف تو ہو گی لیکن یہ بتانا ہی ہو گا کہ آ.......... آپ.....
آپ نانا بننے والے ہیں۔"

فون پر جیسے ایک دم سے زلزلہ آ گیا۔ مصری خان گرجنے لگا۔ "کیا بکواس کر رہی
"کیا......... کیا تم میرے لئے یہ بات کہہ رہی ہو کہ میں۔ یعنی کہ میں........."

"جی ہاں! آپ۔ یعنی آپ نانا بننے والے ہیں۔"

"کیا تمہیں ذرا سی بھی شرم ہے کہ تم یہ بات کتنی بے شرمی سے کہہ رہی ہو؟"

"میں نے کوئی گناہ' کوئی بے شرمی نہیں کی ہے۔ میں باقاعدہ امداد جمالی کی منک
ہوں اور میرے پاس نکاح نامہ موجود ہے۔"

دوسری طرف تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی پھر باپ نے غرا کر پوچھا۔ "کیا
سچ کہہ رہی ہو؟"

"جی ہاں' میں اس نکاح نامے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھیج سکتی ہوں یا آپ یہاں آ
دیکھ سکتے ہیں۔"

"میں اسے ضرور دیکھوں گا لیکن کیا دنیا والوں کے سامنے فخر سے کہہ سکوں گا
میرا داماد ایک نیم انسان اور نیم گھوڑا ہے؟"

"فی الحال آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا داماد ملک سے باہر رہتا ہے۔ لندن یا پیرس
میں فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک ہے۔ میں بھی وہاں جاتی ہوں اور کبھی یہاں رہتی ہوں۔"

"یعنی۔ مجھے اپنے لوگوں میں یہ کہنا ہو گا کہ میری بیٹی نے ملک سے باہر جا کر لو میرج
کی تھی۔ اب تم جو کہو گی' مجھے اس پر سر جھکا کر عمل کرنا ہو گا۔ میں تمہارا باپ نہیں رہا۔
ایک تابعدار بن گیا۔"

"بابا! آپ جذباتی انداز میں بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہیں۔ میں آپ کے
قدموں کی خاک ہوں۔ آپ اپنا غصہ دور کرنے کے لئے یہاں آئیں اور مجھے خاک میں ملا
دیں۔"

وہ غرا کر بولا۔ "ہوں۔ ضرور آؤں گا۔ آج رات تک کسی وقت بھی پہنچوں گا اور
نہیں بتاؤں گا کہ تم میری ماں نہیں ہو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔"

ادھر سے فون بند ہو گیا۔ آرزو نے اپنے موبائل فون کو سوچتی ہوئی نظروں سے
دیکھا۔ پھر اسے آف کر کے جابر خان کو بلایا۔ اس نے حاضر ہو کر پوچھا۔ "حکم بی بی جی؟"

وہ بولی۔ "آج شام کے بعد کسی وقت بھی تمہارے آقا سائیں یہاں آنے والے
ہیں۔"

جابر خان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ آرزو نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں اپنے کسی وفادار پر
آنچ نہیں آنے دوں گی۔ یہاں کا انچارج' کمانڈر اور ڈاکٹر وغیرہ جتنے وفادار ہیں' تم ان
سب کو ساتھ لے کر آج شام چار بجے سے پہلے کہیں چلے جاؤ۔ کل صبح تک کے لئے فارم
چھوڑ دو۔"

"بی بی جی! یہ ہم وفاداروں کی توہین ہے کہ آپ کو یہاں تنہا چھوڑ جائیں۔ ہم آپ
کے تابعدار ہیں' جو حکم دیں گی' اس کی تعمیل کریں گے لیکن آپ سے التجا ہے کہ ہمیں
یہاں سے جانے کا حکم نہ دیں۔"

"میں نے جو کہہ دیا' وہ پتھر کی لکیر ہے۔ چار بجے کے بعد تم میں سے یہاں کوئی نہ
رہے۔ مسلح گارڈز بھی چلے جائیں۔ بڑا آہنی گیٹ کھولنے اور بند کرنے کے لئے صرف دو
چوکیدار رہیں گے اور گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے سائیس اپنے اپنے اصطبل میں
کام کرتے رہیں گے۔ تم آدھی رات کے بعد بھی مجھ سے فون پر رابطہ کر سکتے ہو۔ اب
جاؤ یہاں سے۔"

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ شام کے چار بجنے تک اس فارم کے تمام بڑے وفادار اور مسلح
گارڈز باہر چلے گئے۔ صرف گھوڑوں کی رکھوالی کرنے والے ملازم رہ گئے۔ آرزو نے ان

کے جانے کے بعد چوکیداروں سے کہا۔ "گیٹ بند کردو۔ تم میں سے ایک مچان پر رہے گا۔ جب آقا سائیں اور ان کا قافلہ نظر آئے تو یہ گیٹ کھول دینا۔"

پھر وہ وہاں سے چلتی ہوئی اپنے سسرالی اصطبل میں آئی۔ دروازے پر دستک دے کر بولی۔ "میں ہوں دروازہ کھولو۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ آرزو نے اندر آکر اسے بند کیا پھر پلٹ کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "جان! تم مجھے کتنا چاہتے ہو؟"

"یہ سوال تم پہلے بھی کر چکی ہو اور میں نے دل سے جواب دیا ہے کہ ایک گھوڑا صرف اپنے سوار سے اتنی زیادہ محبت کرتا ہے کہ اسے اپنی پیٹھ سے گرنے نہیں دیتا اور اسے ساتھ لے کر آگ اور خون کا دریا پار کرتا ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ دریا پار نہ کرو۔ ایسے دریا میں میرے ساتھ ڈوب مرو تو کیا کرو گے؟"

"میں تمہارے ساتھ ڈوب مروں گا۔ تمہاری سنجیدگی بتا رہی ہے کہ ایسی کوئی بات ہونے والی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے وفادار اور مسلح گارڈز تمہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

"وہ میرے حکم سے مجبور ہو کر گئے ہیں کیونکہ میرے بابا آ رہے ہیں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے اور میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

"پھر تو وہ مجھے گولی مارنے آ رہے ہیں۔"

"پہلی گولی میں کھاؤں گی۔ اس کے بعد بابا کو تم تک پہنچنے دوں گی۔"

"نہیں آرزو! تمہیں زندہ رہنا ہو گا کیونکہ تمہارے بابا کی نظروں میں ہم نے غلطی کی ہے۔ ہمارا بچہ بے قصور ہے اسے دنیا میں آنے سے پہلے ہی کیوں سزا ملے؟ نہیں اس کی خاطر تمہیں زندہ رہنا ہو گا۔"

"تم نہیں جانتے، بابا کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"اور کیا تم نہیں جانتیں؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں بزدلوں کی طرح سر جھکا کر نہیں مر سکتا۔ میرے ہونے والے بچے پر آنچ آئے گی تو میں تمہارے بابا کو زندہ نہیں.........."

آرزو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آگے میرے بابا کی شان میں گستاخی نہیں کرنا۔ میں جانتی ہوں تم دوسروں کے لئے بے لگام گھوڑے ہو۔ مرتے مرتے بھی درجنوں کو مار کر مرو گے لیکن تم کیا مجھ سے بھی لگام چھڑاؤ گے؟ میری بات نہیں مانو

گے؟"

"تمہاری بات کیسے نہیں مانوں گا۔ چھ ماہ سے میری رگوں میں جو خون بن رہا ہے، وہ تمہاری دی ہوئی گھوڑوں کی خوراک سے بن رہا ہے۔ میرے جسم میں گھوڑوں کو دی جانے والی دوائیں انجکٹ کی گئی ہیں۔ میں اس اصطبل میں ایک سو اسی دنوں سے ایک گھوڑے کی زندگی گزار رہا ہوں اور اپنی مالکن کے مزاج کو اور ایک ایک اشارے کو سمجھنے لگا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ سر جھکا کر تمہارے بابا کے ہاتھوں مر جاؤں۔ ٹھیک ہے، تمہارے ساتھ مرنا ہی ٹھہرا تو اسی طرح تمہیں گلے لگا کر مر جاؤں گا۔"

زندگی کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔ اس لئے آرزو اس کے ساتھ اصطبل میں رہی۔ آخری جتنی سانسیں رہ گئی تھیں، اس کے ساتھ گزارتی رہی۔ پھر رات کو نو بجے ایک ملازم نے دروازے پر دستک دے کر کہا۔ "مالکن! آقا سائیں تشریف لا رہے ہیں۔ باہر والا بڑا گیٹ کھولا جا رہا ہے۔"

وہ اصطبل سے باہر آ گئی پھر بولی۔ "جاؤ، آقا سائیں کو ادھر لے آؤ۔"

ملازم چلا گیا۔ فارم کے اس حصے میں اچھی خاصی روشنی تھی۔ پھر ایک مچان سے سرچ لائٹ کی روشنی کو بھی ادھر فکس کر دیا گیا تھا۔ آرزو کا خیال تھا کہ اس کا باپ اپنے مسلح ملازمین کی پوری فوج کے ساتھ آئے گا لیکن وہ اسے تنہا دیکھ کر حیران ہوئی۔ وہ تنہا ایک کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور تھا۔ وہ اپنی سیٹ سے نکل کر آقا سائیں کے لئے پچھلا دروازہ کھول رہا تھا۔

باپ نے کار سے باہر آ کر بیٹی کو حیران حیران سا دیکھا پھر کہا۔ "تم جانتی ہو ہمارے ڈاکا ڈالنے والے گروہ میں ایک سے بڑھ کر ایک گن مین ہے لیکن ہم جانتے تھے، یہاں ایک بھی شکار نہیں ملے گا۔ ہماری بیٹی اپنے وفاداروں کو مرنے نہیں دے گی۔ مان لو کہ ہم تمہارے باپ ہیں۔ تم نے میدان خالی رکھا، ہم بھی تنہا اور نہتے آئے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار ہم نے اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ بھی نہیں رکھا۔"

وہ آگے بڑھ کر بولی۔ "آپ بھی مان لیں کہ میں بھی شیر کی بچی ہوں اور یہ پہلے سے جانتی ہوں کہ میرے فارم میں کوئی ڈاکو نہیں آئے گا۔ ایک غیرت مند باپ آئے گا جو زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ بیٹی اور داماد کو گولی مار دے گا۔ میں آپ کے سامنے ہوں اور داماد اس اصطبل میں ہے۔"

باپ نے بھی آگے بڑھ کر قریب آ کر پھر اس کی طرف بانہیں پھیلا کر کہا۔ "تم دیکھ رہی ہو کہ گولی مارنے کے لئے ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ یہ خالی ہاتھ تمہارے

لئے پھیلے ہیں۔ کیا باپ کے سینے سے نہیں لگو گی۔"

وہ بابا کہہ کر سینے سے لگ گئی۔ شیرنی کی آنکھ سے کبھی آنسو نہیں نکلا تھا لیکن وہ باپ کو پاکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مصری خان نے اسے کچھ دیر روتے دیا پھر تھپک کر کہا۔ "تم نے جو جی میں آیا وہ کیا اور یہ نہیں سوچا کہ باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اولاد اتنی خودغرض کیوں ہوتی ہے۔ کچھ کر گزرتے وقت والدین کو دودھ کی مکھی کی طرح کیوں نکال پھینکتی ہے؟ وہ جوان ہو کر ایسی دانائی سے کیوں بھر جاتی ہے کہ والدین نادان' دقیانوسی اور پاگل دکھائی دینے لگتے ہیں؟"

وہ باپ سے الگ ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "بس کریں بابا! مجھے اور شرمندہ نہ کریں۔"

"تو پھر تم ہمارے علاقے کے لوگوں کے سامنے ہمیں شرمندہ نہ کرو۔"

اس نے سر اٹھا کر بھیگی آنکھوں سے باپ کو دیکھا پھر پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہمارے خاص آدمی پرسوں ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس تقریب میں بڑی بڑی سماجی اور سیاسی شخصیتوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ ہم ان سب کے سامنے اپنے داماد کو پیش کریں گے۔"

وہ حیرانی سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں۔ وہ اصطبل سے اور فارم سے باہر نہیں جا سکے گا۔"

باپ نے پوچھا۔ "اور اگر آ جائے گا تو ہماری گردن جھک جائے گی؟ کیا اس اصطبل کا دروازہ اندر سے بند ہے؟ اگر بند ہے تو اسے کہو' اندر سے کھلا رکھے۔"

اندر سے آواز آئی۔ "میں سن رہا ہوں۔ دروازہ اندر سے کھلا ہے۔"

مصری خان نے ڈرائیور سے کہا۔ "ڈکی کھولو۔ ہم داماد کے لئے جو تحفہ لائے ہیں' اسے پیش کر دو۔"

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ کار کے پیچھے جا کر ڈکی کو کھولا۔ وہاں اندر ایک صحت مند شخص سکڑا پڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر باہر کھینچا۔ وہ باہر آ کر مٹی میں گرا اور گڑگڑانے لگا۔ "مجھے معاف کر دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔"

ڈرائیور نے اسے ٹھوکریں ماریں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ڈرائیور کے دھکے کھاتا ہوا اصطبل کے دروازے تک پہنچ گیا۔ مصری خان نے آگے بڑھ کر اسے ایک لات ماری۔ وہ لات کھا کر دروازے سے ٹکرایا۔ چونکہ دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ اس لئے

ٹکراتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ دروازہ کھل کر پھر بند ہو گیا۔

آرزو حیرانی سے منظر دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ رہی تھی اور کچھ سمجھنا چاہتی تھی۔ پھر اصطبل کے اندر سے امداد جمالی کی گرج دار آواز نے سمجھا دیا کہ اس کی بہن کو بے آبرو کرنے والا تھانیدار اندر پہنچا دیا گیا ہے۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "بابا! یہ........ یہ آپ کو کہاں مل گیا تھا؟"

مصری خان نے کہا۔ "پولیس والوں سے ڈاکو اور ڈاکوؤں سے پولیس والے چھپ نہیں سکتے۔ یہ تھانیدار بدنام زمانہ ہے۔ ہم نے صرف دو گھنٹوں میں اس کا علاقہ معلوم کیا۔ پھر ہمارے آدمیوں نے اسے اٹھا کر کار کی ڈکی میں پہنچا دیا۔"

آرزو نے اصطبل کی طرف دیکھا۔ اندر سے تھانیدار کے رونے اور گڑگڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ آوازیں رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی بری طرح پٹائی ہو رہی ہے۔ وہ زخم کھا رہا ہے اور لہولہان ہو رہا ہے۔ صرف پندرہ منٹ تک اصطبل میں ہلچل سی رہی' پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد دروازہ کھل کر بند ہو گیا۔ اسی کھلنے اور بند ہونے کے درمیان تھانیدار کو باہر پھینک دیا گیا۔ وہ زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ وہ سر سے پیروں تک اپنے لہو میں بھیگا ہوا تھا۔ دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے تھے اور یہ بتا رہے تھے کہ اس کی سانسیں تمام ہو چکی ہیں اور امداد جمالی نے اپنی قسم پوری کر لی ہے۔

مصری خان نے ڈرائیور سے کہا۔ "لباس کے تمام پیکٹس گاڑی سے نکال کر اصطبل میں پہنچا دو۔ ان میں مختلف سائز کے لباس ہیں۔ ہم اپنے داماد سے کہتے ہیں' جو لباس بدن پر پورا آئے اسے پہن لے۔ اس کی قسم پوری ہو چکی ہے۔"

ڈرائیور حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ باپ نے بیٹی سے کہا۔ "ہم یہ کام اس دن بھی کر سکتے تھے' جب تم نے ایک بے لباس شخص کو ہمارا داماد بنانے کی ضد کی تھی لیکن باپ کا دل ڈرتا رہا کہ ہم نے اسے گھوڑے سے انسان بنایا تو بیٹی کا دل ٹوٹ جائے گا۔ تم ہماری اکلوتی اولاد ہو۔ تمہارے لئے اس بے رحم ڈاکو کا دل موم ہو جاتا تھا اور ہم محبت سے مجبور ہو کر تمہیں ڈھیل دیتے رہے تھے لیکن جب تم نے بتایا کہ ماں بننے والی ہو' تب اس غلطی کا احساس ہوا کہ باپ کمزور بن کر اولاد سے محبت کرے تو اولاد جوان ہو کر اس کے سر پر جوتے مارتی ہے۔"

وہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ باپ نے کہا۔ "اکثر کہا جاتا ہے۔ 'اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے' خدا کا شکر ہے کہ ہم نے آگ بجھانے کے لئے پانی کا انتظام کر

رکھا تھا۔ اب ہماری گردن نہیں جھکے گی۔ ہم پرسوں کی تقریب میں فخر سے اپنے داماد کو
بڑے لوگوں سے متعارف کرا سکیں گے۔"

اصطبل کا دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے پر ایک پہاڑ جیسی جسامت والا تن
آور جوان شلوار قمیض پہنے کھڑا تھا۔ آرزو نے سر اٹھا کر دیکھا پھر فوراً ہی سر جھکا لیا۔ ا
دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ یہ ایک ماتم تھا۔ اس کا گھوڑا مر
چکا تھا۔

مصری خان نے اب بیٹی کا دل ٹوٹنے کی پروا نہیں کی۔ آگے بڑھ کر داماد کو گلے لگا
لیا۔

☆=========☆=========☆

ایک باپ نے حکمتِ عملی سے پیش آنے والی بدناموں اور شرمندگیوں کو حرفِ غلط
کی طرح مٹا دیا۔ آرزو کو حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا۔ اس نے امداد جمالی نام کے ایک
انسان کو اپنا شوہر تسلیم کیا۔ وہ شوہر قسم پوری کرنے کے بعد انسانی غذائیں کھانے لگا تھا او
انسانوں کی طرح ملبوس رہنے لگا تھا لیکن پچھلے چھ ماہ میں کچھ خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں' ج
دور نہیں ہو رہی تھیں۔ مثلاً وہ ایک بار گھڑسواری کے دوران گر کر زخمی ہوا تو انسا
استعمال میں آنے والی دواؤں نے اس پر اثر نہیں کیا۔ گھوڑوں کی دی جانے والی دواؤ
سے زخم بھر گیا۔ وہ دن میں ایک بار چنے' بیسن اور جو کی کچی پکی روٹی ضرور کھاتا تھا۔ ن
کھائے تو پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ ایسی کچھ خرابیاں اس کے لہو میں رچ بس گئی تھیں۔

امداد جمالی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا' وہ کوئی انوکھی اور ناقابلِ فہم بات نہیں تھی۔
دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ہر چیز خالص ملتی تھی۔ دودھ' گھی' تیل' مسالہ' اور بیماروں کی
دواؤں میں ایک ذرا ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ ذخیرہ اندوزی اور ناجائز منافع خور
نے ملاوٹ کی لعنت شروع کی۔ خالص دور کے بچے تھوڑی تھوڑی ملاوٹ کے عادی ہو کر
جوان ہوئے۔ ان جوانوں کے بچے زیادہ ملاوٹی خوراک اور دواؤں کے عادی ہوتے گئے۔
آج کے جوان کو خالص گھی کھلاؤ تو وہ ہضم نہیں کر سکے گا۔ خالص دودھ پلاؤ تو دست
شروع ہو جائیں گے۔ اب ان پر جعلی دواؤں کا ری ایکشن بھی شاید ہی کبھی ہوتا ہے۔
ملاوٹ سابقہ اور موجودہ نسل کی رگوں میں رچ بس گئی ہے اور امداد جمالی کا تعلق بھ
موجودہ نسل سے تھا۔

کوئی مانے یا نہ مانے ملاوٹ کی انتہا یہ ہے کہ انسان میں گھوڑے کی ملاوٹ ہو گ
ہے اور گھوڑے میں انسان کی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ پنجاب کے لوگ مسرتوں کا اظہار کرنے

کے لئے بھنگڑا ڈالتے ہیں۔ گھوڑوں نے بھی یہ سیکھ لیا ہے۔ لاہور کے ہارس اینڈ کیٹل شو
تما بے زبان گھوڑے ڈھول اور گھنگھروؤں کے سُر تال پر خوب بھنگڑا ڈالتے ہیں اور
[illegible] عبرت کو ملاوٹ کا اشارہ دیتے ہیں۔

آرزو کو شہر کے ایک بڑے اسپتال میں پہنچایا گیا۔ زچگی کا وقت قریب تھا اور اس کی
حالت غیر ہو رہی تھی۔ لیبر روم میں یہ کیس کچھ بگڑ گیا۔ اسے آپریشن تھیٹر میں پہنچایا گیا۔
مصری خان اور امداد جمالی اسپتال کے برآمدے میں بے چینی اور پریشانی سے ٹہلتے رہے۔
زچہ اور بچہ کی سلامتی کی اور دعائیں مانگتے رہے۔ آخر میجر آپریشن کے ذریعے بچے کی
ولادت ہوئی۔ ایک نرس نے باہر آ کر خوش خبری سنائی کہ بیٹا ہوا ہے۔ بڑا خوبرو اور صحت
مند ہے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں بچہ دکھایا جائے گا۔

مصری خان نے اس نرس کو پانچ سو روپے دیئے۔ تھوڑی دیر بعد دوسری نرس نے
آ کر کہا۔ "بچہ صحت مند ہے۔ نارمل ہے مگر عجیب طرح سے رو رہا ہے۔"

امداد جمالی نے پوچھا۔ "عجیب طرح سے تمہاری مراد کیا ہے؟ وہ کیسے رو رہا ہے؟"

"میں اب اس طرح رو کر نہیں بتا سکتی۔ مگر ایسا لگتا ہے' جیسے ہنہنا رہا ہے۔"

امداد جمالی اور مصری خان نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر مصری خان ذرا
جھینپ سا گیا۔ کیونکہ اس کی بیٹی کا پالتو گھوڑا سامنے کھڑا تھا۔ اسے لباس پہنا کر سوسائٹی میں
انسان کی حیثیت دینے سے کیا ہوتا ہے؟ جو جراثیم خون میں شامل ہو جاتے ہیں وہ ایک
نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ آج کے بچے اگر ملاوٹی خوراک بہ
آسانی ہضم کر لیتے ہیں تو یہ قوتِ ہاضمہ انہیں باپ کے خون سے ملی ہے۔

آرزو آپریشن کے نتیجے میں بے ہوش پڑی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد لیڈی ڈاکٹر نے
مصری اور امداد جمالی کو بلایا۔ اس کمرے میں ایک صحت مند بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا۔
رونے کی آواز انسانی تھی لیکن وہ رک رک کر آواز نکالتا تھا اور ننھے ہونٹوں سے پھرکی
بجاتا تھا۔ انداز ویسا ہی تھا جیسا کہ گھوڑے ہنہناتے وقت کرتے ہیں۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "بچہ کچھ عجیب سا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ جب اسے
صفائی کے لئے نہلانے لے جایا گیا تو یہ نہانے کے دوران خاموش اور پُرسکون تھا۔ پھر جب
اسے صاف ستھرا کر کے تولئے میں لپیٹا گیا تو یہ رونے لگا۔ ہم نے سوچا یہ بھوکا ہے۔ اسے
دودھ پلایا گیا تب بھی یہ روتا رہا۔ پھر ہم نے سوچا اس کے بدن میں کوئی تکلیف ہے یا کوئی
چیونٹی کاٹ رہی ہے۔ ہم نے تولیہ ہٹا دیا۔ اسے ننگا کر کے دیکھا تو یہ روتے روتے ایک دم
سے چپ ہو گیا۔"

مصری خان کا سر جھکا ہوا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "دوسری بار ہم نے تولیہ بدل دیا۔ اس میں بچے کو لپیٹا تو یہ پھر رونے لگا۔ ہم آدھے گھنٹے سے اسے بہلانے اور چپ کرانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ مگر یہ مسلسل رو رہا ہے۔ یہاں فرسٹ فلور پر ایک چائلڈ اسپیشلسٹ ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ بچے کو ابھی ان کے پاس لے جائیں۔ وہ ضرور بچے کے پرابلم کو سمجھ لیں گے۔"

امداد جمالی چند قدم چل کر پالنے کے پاس آیا۔ اس نے اپنے نوزائیدہ بیٹے کے بدن سے تولئے کو ہٹایا تو وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ اس نے بیٹے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چوما پھر کہا۔ "ڈاکٹر! جب تک اس کی ماں ہوش میں نہ آئے' آپ اسے تولئے میں نہ لپیٹ کر رکھیں اور نہ ہی کوئی کپڑا پہنائیں۔ ہوش میں آنے کے بعد ماں اپنے بچے کو سنبھال لے گی۔"

ڈاکٹر اور نرسیں حیرانی سے بچے کو دیکھ رہی تھیں اور یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ بدن سے کپڑا لگتے ہی بچہ کیوں رونے لگتا ہے؟

امداد جمالی نے سسر کے پاس آ کر بیٹے کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لیجئے آپ کا نواسا.........."

مصری خان نے جھجکتے ہوئے اپنے نواسے کو ہاتھوں میں لیا۔ اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے وقت اس نے سوچا کہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے جگر گوشے کو چوم رہا ہے لیکن وہ جگر گوشہ ننگا تھا اور گھوڑے داماد کا پاکٹ ایڈیشن لگ رہا تھا۔ اس نے داماد کی ایک قسم پوری کرانے کے بعد لباس پہنا دیا تھا لیکن اب کسی بھی حکمتِ عملی سے نواسے کو لباس نہیں پہنا سکتا تھا۔

ویسے یہ کچھ زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں تھی۔ ایک انسان کو گھوڑا بنایا جا سکتا ہے تو اس کے گھوڑے بیٹے کو بھی انسان بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا انحصار اعمال پر ہے اور تربیت پر ہے۔ اگر آرزو کی نیت درست ہو گئی اور آئندہ انسان کو گھوڑا نہیں بنانا چاہے گی تو اپنے مثبت اعمال سے اور بہترین تربیت سے اپنے بیٹے کو مکمل انسان بنا لے گی۔

لیکن محض ایک بیٹے کی نہیں' پوری قوم کی تربیت کیسے ہوتی ہے؟ کون تربیت دیتا ہے؟ وہ جس کے ہاتھ میں چابک ہوتا ہے۔

ایک چابک پڑتا ہے سڑاپ.......... اور گھوڑے تمام انسانی حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ایک اور چابک پڑتا ہے سڑاپ.......... مہنگائی بڑھ جاتی ہے اور گھوڑے چابک کے

و سہلاتے رہ جاتے ہیں۔

ایک اور چابک۔ سڑاپ.......... چابک بردار شاہ خرچی کرے اور گھوڑو! تم کفایت ی کرو۔

ایک چابک درس گاہ کے نام۔ سڑاپ.......... طلباء کے ہاتھوں سے قلم چھین لئے کلاشنکوف تھما دیئے گئے۔

ایک چابک.......... کے نام۔ سڑاپ.......... شراب ممنوع اور ہیروئن عام ہو گئی۔

ایک چابک انصاف کے نام۔ سڑاپ.......... جواب طلبی اور جواب دہی کے ۔ے بند۔ نہ سزا' نہ اپیل' نہ داد و فریاد کی اجازت ہے۔

چابک پڑتے جا رہے ہیں۔ چابک پڑتے جا رہے ہیں۔ ملکِ خداداد کے بارہ کروڑ ڑے دوڑتے اور ہانپتے جا رہے ہیں اور چابک بردار صرف دو ہیں۔ کس نے ماں کا و پیا ہے کہ تیسرا چابک بردار بننے کی جرأت کرے گا؟

==============

تخریب نامہ

ایک ایمان دار جج اور ایک دہشت گرد کے درمیان کشمکش کی دل ہلا دینے والی داستان۔ دونوں میں کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ شہر سو رہا تھا۔ عبادت کرنے والے جاگ رہے تھے۔ صبح سویرے کام سے لگ جانے والے بھی بیدار ہو گئے تھے۔ اخبار والے سائیکلوں' موٹر سائیکلوں اور مختلف گاڑیوں میں نکل پڑے تھے۔ فش ہاربر میں مچھلیوں' جھینگوں اور کیکڑوں کے انبار لگ رہے تھے۔ مذبح خانوں میں جانوروں کو ذبح کیا جا رہا تھا۔ صدیوں سے انسانوں کی صبح جانوروں کے لہو سے ہوتی آئی ہے۔ اب ہر صبح انسانوں کا لہو اخبارات کی سرخیوں میں نظر آتا ہے۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

دیدار حسین چارپائی پر ہاتھ پاؤں پھیلائے سو رہا تھا۔ وہ بھی صبح جاگنے کا عادی تھا مگر آنکھیں کھولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تھوڑا سو رہا تھا' تھوڑا جاگ رہا تھا۔ تازہ پراٹھوں کی اشتہا انگیز مہک اس کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی اور ماں کی آواز کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ "دیدار! اٹھ بھی جا۔ کیا بچوں کو اسکول نہیں لے جائے گا؟"

وہ کروٹ بدلتے ہوئے منہ چلانے لگا جیسے نیند میں پراٹھے چبا رہا ہو۔ ماں کی آواز کانوں میں آ رہی تھی۔ "پتا نہیں' کون کون سے علاقوں میں جاتا ہے۔ وہاں سے بچے اٹھا کر اسکول پہنچاتا ہے۔ ارے اٹھے گا بھی یا نہیں؟"

"اماں! اٹھ رہا ہوں۔"

"کوئی دوسری نوکری مل جائے تو بچے لانے لے جانے والا کام کبھی نہ کرنے دوں۔ جب گاڑی لے کر نکلتا ہے تو دل کو دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ پتا نہیں' کہاں گولیاں چل رہی ہوں؟ کہاں آگ لگائی جا رہی ہو؟ اور کہاں چھوٹے بچوں کو اغوا کیا جا رہا ہو؟ توبہ ہے' رات کو نیند میں بھی یہی دکھائی دیتا ہے کہ تُو بچوں کو گاڑی میں بٹھائے آگ اور خون کے دریا سے گزر رہا ہے۔"

ماں نے آخری پراٹھا توے سے اتارتے ہوئے پوچھا۔ "ارے اٹھ بھی چکا ہے یا آ کر پانی ڈالوں؟"

وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے جماہی لیتے ہوئے بولا۔ "میں اٹھ گیا ہوں مگر میری چپلیں کہاں گئیں؟ میں نے رات یہاں اتاری تھیں۔"

"اتارتا ایک طرف ہے' ڈھونڈتا دوسری طرف ہے۔ ذرا گھوم کر اس طرف بھی

دیکھ لے۔"

اس نے گھوم کر چارپائی کے دوسری طرف دیکھا۔ وہاں چپلوں کی دو جوڑیاں نظ
رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ "اماں! میں نے ایک جوڑی اتاری تھی۔ یہ دو جوڑیاں کیے
گئیں؟"

"کتنی بار سمجھایا ہے۔ صبح اٹھتے ہی عینک لگایا کر۔ کبھی دھندلا نظر آتا ہے۔ کبھی اید
کے دو دکھائی دیتے ہیں۔ سرہانے عینک رکھی ہے۔ اسے اٹھالے۔"

اس نے تکیے کی طرف جھک کر عینک اٹھائی۔ اسے ناک پر چڑھایا تو کمرے کا منظ
واضح ہو گیا۔ ہر چیز صاف طور سے دکھائی دینے لگی۔ ہمیں دنیا کے ہر منظر کو اس کے کم
حسن اور رعنائیوں کے ساتھ دیکھنے کا حق ہے۔ جب یہ مناظر دھندلانے لگتے ہیں' آنکھ
صاف طور سے دیکھ نہیں پاتیں تو عینک لگا کر ان مناظر کو صاف طور پر دیکھا جاتا ہے لیک
اس خوب صورت دنیا کو تخریب کاری کی دھند میں لپیٹ دیا جائے اور ہر منظر کو دھوا
دھواں کر دیا جائے تو انسان کی بنائی ہوئی عینک ناکارہ ہو جاتی ہے اور خدا کی دی ہ
آنکھیں شرمندہ شرمندہ سی رہ جاتی ہیں۔

دیدار نے عینک لگا کر دیکھا۔ اب ایک کے دو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ایک
جوڑی چپل نظر آ رہی تھی۔ وہ انہیں پہن کر غسل خانے میں آیا۔ منجن نکال کر دانت
مانجھنے لگا۔ پھر عینک اتار کر واش بیسن پر ایک جگہ رکھنے کے بعد نلکا کھول کر منہ ہا
دھونے لگا۔

ماں نے آواز دی۔ "اب آ بھی جا' میں نے چائے اور پراٹھے رکھ دیئے ہیں۔
کرے گا تو ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

اس نے نلکا بند کرنا چاہا تو وہ ایک کے دو نظر آئے۔ اس نے ٹٹول کر ایک نلکے
پکڑنا چاہا تو ادھر کچھ نہیں تھا۔ کمزور نظر کا فریب تھا۔ اس نے دوسری بار نلکے کو پکڑ لیا
اسے بند کر دیا۔ تولیا بڑے سائز کا تھا۔ اسے اٹھانے میں آسانی ہوئی لیکن بیسن پر رکھ
ہوئی عینک دو عینکیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ماں نے پھر اسے آواز دی۔ وہ جھنجلا کر بولا
"اماں صبر کرو۔ میں عینک پکڑ رہا ہوں۔"

"تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے مچھلی پکڑ رہا ہے۔"

جس کی بصارت کمزور ہو' دھندلا نظر آتا ہو' ایک کے دو دکھائی دیتے ہوں
آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے سے دو چیزوں کی جگہ ایک نظر آنے لگتی ہے۔ دیدار نے آنکھوں
سکیڑ کر دیکھا تو عینک دو سے ایک ہو گئی۔ اس نے اٹھا کر اسے ناک پر چڑھا لیا۔

وہ کمرے میں آ گیا۔ چھوٹی سی میز پر ناشتا رکھا ہوا تھا۔ وہ جلدی جلدی لقمے چباتے
بولا۔ "دیر ہو رہی ہے مجھے' اب نکلنا چاہئے۔ تمام گھروں کے بچے مجھ سے پہلے تیار
تے ہیں۔"

"تو نے پچھلی بار بچوں کو اسکول پہنچانے میں دیر کی تھی۔ میڈم شکایت کر رہی
"

"اماں! دیر سویر ہو جاتی ہے۔ کوشش تو یہی کرتا ہوں کہ تمام بچے وقت پر اسکول
یا کریں۔"

"یہ کوئی طریقہ ہے' کھڑے کھڑے کھا رہا ہے۔ کیا بیٹھ کر کھانے سے روٹی حلق سے
اترے گی؟"

"سمجھا کرو۔ ٹائم نہیں ہے۔ بس میں چلا۔"

وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں گیا پھر لباس تبدیل کر کے گھر سے باہر آ
دروازے کے سامنے ایک سوزوکی کیریئر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس پر سے ترپال ہٹا کر
پڑے سے گاڑی کی باڈی اور شیشے صاف کرنے لگا۔ بڑبڑانے لگا کہ وہ صبح بیدار ہونے
ر کیوں کر دیتا ہے۔ آرام سے ناشتہ بھی نہیں کر سکتا۔ گاڑی کی اچھی طرح صفائی بھی
ہو پاتی۔ وہ کل سے ایک گھنٹا پہلے بیدار ہوا کرے گا مگر افسوس کل کبھی نہیں آتا۔
کل بھی کبھی نہیں آتا تھا۔

اس نے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ اسے سست رفتاری سے آگے
تے ہوئے عقب نما آئینے کو درست کیا۔ اس آئینے میں ماں دکھائی دی۔ وہ ہاتھ ہلا کر
کا اشارہ کر رہی تھی۔

اس نے گاڑی روک دی۔ ریورس گیئر میں چلاتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ "اماں! کتنی
ہے۔ جانے کے وقت نہ ٹوکا کرو۔ آگے بڑھ جاؤں تو روکا نہ کرو۔"

"ماں کے روکنے ٹوکنے میں بدشگونی نہیں ہوتی۔ بھلائی ہوتی ہے۔ چل باہر آ۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ماں نے کہا۔ "ادھر والی آستین اوپر کر۔ روز دیکھتا ہے
ئیں ٹھائیں گولیاں چلتی ہیں۔ روزی کمانے والوں کی بھی گاڑیاں جلادی جاتی ہیں مگر
ل نہیں آتی۔ دیکھ اسے باندھ رہی ہوں۔ خبردار! کبھی نہ کھولنا۔"

ماں اس کے بازو پر امام ضامن باندھنے لگی۔

☆=========☆=========☆

جسٹس عظمت اللہ شاہ بھی فجر کی اذان سے پہلے بیدار ہو جاتے تھے۔ نماز کے بعد

کلام پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ اس کے بعد ناشتے کی میز پر آتے تھے۔ اس روز بھی
تلاوت کے بعد اپنی خواب گاہ سے باہر جا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی سن کر رک گئے۔ فو
کے پاس آکر بستر کے سرے پر بیٹھ کر انہوں نے ریسیور اٹھایا۔ اسے کان سے لگا کر بولے

"ہیلو! عظمت اللہ شاہ بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "آپ نے میری آواز سے مجھے پہچان لیا ہو گا۔"

"میں خدا کے بعد شیطان کو پہچانتا ہوں اس لئے تمہیں پہچان رہا ہوں۔ تمہیں اب
تک معلوم ہو جانا چاہئے کہ میں اصولوں کا پابند ہوں اور ہر حال میں انصاف کے تقاضے
پورے کرتا ہوں۔"

"میں آپ کے اصول اور آپ کی انصاف پسندی کو سمجھنا نہیں چاہتا۔ آج آپ
آخری فیصلہ سنانے والے ہیں۔ آپ چاہیں تو باآسانی اپنے فیصلے میں لچک پیدا کر
ہیں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا' یہ آج عدالت میں معلوم ہو گا۔"

عظمت اللہ شاہ نے یہ کہتے ہی ریسیور رکھ دیا پھر فون کا کنکشن الگ کر دیا تاکہ ان
فیصلے میں لچک پیدا کرانے والے دشمن انہیں بار بار فون پر مخاطب نہ کریں۔

پہلے بھی کئی بار فون پر دھمکیاں دی گئی تھیں کہ دہشت گردی کے زیر سماعت کیس
کو کمزور بنا کر ایک خطرناک بے رحم قاتل کو عدالت سے باعزت بری کر دیا جائے۔ اس
کے عوض فارن کرنسی میں لاکھوں ڈالر دیئے جائیں گے۔ اگر اتنی بڑی آفر سے انکار کیا
اور اسے سزائے موت سنائی گئی تو اس سے پہلے سزا سنانے والے منصف کو موت
گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

اور بھی کئی طرح کی دھمکیاں ملتی رہی تھیں۔ جج صاحبان کی زندگی میں ایسا
ہے۔ بڑے بڑے مجرم بڑے وسیع ذرائع استعمال کر کے ان پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ
فیصلوں میں لچک پیدا کریں۔ بڑی بڑی رشوتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اس پر بھی بات
نہ بنے تو ان جج صاحبان کو یا ان کے عزیزوں کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔

وہ اپنی خواب گاہ سے نکل کر زینے سے اتر کے ڈائننگ روم میں آئے۔ بیگم ان
منتظر تھیں۔ ان کے چار سالہ پوتے سنی نے کہا "مارننگ گرینڈ پا!"

انہوں نے سنی کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر چومتے ہوئے کہا۔ "مارننگ۔"

ناشتے کی میز پر اسکول کا بیگ رکھا ہوا تھا۔ بیگم نے کہا "آج اسکول میں سنی
دن ہے۔ آپ اسے اسکول پہنچا دیجئے گا۔"

"بیگم! تمہیں پتا ہے' آج عدالت میں میرا بہت اہم دن ہے۔ مجھے کوئی ذمے داری
دو۔ میرے لیے تنہائی اور سکون لازمی ہے۔ میں پہلے ہائی کورٹ کی مسجد میں جاؤں گا
وہاں سکون سے وقت گزاروں گا۔"

"میں آپ کا ٹائم ٹیبل جانتی ہوں۔ آپ عدالت کے وقت سے دو گھنٹے پہلے جا رہے
ہیں۔ اسکول راستے ہی میں ہے۔ آپ سنی کو وہاں ڈراپ کرتے ہوئے جا سکتے ہیں۔"

"بھئی پہلے دن اس کے ڈیڈی کو جانا چاہئے۔ اپنے صاحب زادے سے کہو' اسے
اسکول چھوڑ آئے گا۔"

"جنید ابھی اسلام آباد سے واپس نہیں آیا ہے۔ آج کسی وقت آئے گا۔ شازیہ کی
طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بھی نہیں جا سکے گی۔"

"تم سنی کو لے کر چلی جاؤ۔"

"میں اتنی بڑی کوٹھی ملازموں کے حوالے کر کے نہیں جاؤں گی۔ آئے دن ڈاکے
پڑتے ہیں' لڑکیوں کو اغوا کیا جاتا ہے۔ کیا بہو کو یہاں تنہا چھوڑ کر جاؤں؟"

"تم نے اپنے سارے مسائل گنوا دیئے۔ ٹھیک ہے' میں ابھی اپنے بیٹے کو اسکول
پہنچا دوں گا لیکن واپس کون لائے گا۔ میں تو کورٹ میں مصروف رہوں گا۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ واپسی کی فکر نہ کریں۔ اسکول کی چھٹی ایک بجے ہو گی۔ میں گھر
کے سارے کاموں سے نمٹ کر کوٹھی کو لاک کر کے سنی کو لینے اسکول چلی جاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ گھر کی عدالت میں تمہارا ہی فیصلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ میں اپنے
بیٹے کو اسکول پہنچا دوں گا۔"

بچوں کو اسکول پہنچانا اور انہیں گھر واپس لانا روز کا مسئلہ ہے۔ جن کے پاس ذاتی
گاڑیاں ہوتی ہیں' وہ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ حفاظت سے اسکول لے جاتے اور لاتے
ہیں۔ بس' منی بس اور سوزوکی کیریئر جیسی گاڑیاں بچوں کو اس طرح ٹھونس کر
اسکول لے جاتی ہیں جیسے وہ پھول سے بچے نہ ہوں جانور ہوں۔

دیدار حسین ان چند گاڑی والوں میں سے تھا' جو بچوں کو آرام سے بٹھا کر اسکول
پہنچاتے اور چھٹی کے وقت خیریت سے ان کے گھروں تک انہیں چھوڑ کر جاتے ہیں۔
سردی ہو' گرمی ہو' موسلا دھار بارش ہو رہی ہو یا پھر گولیاں چل رہی ہوں' دیدار گاڑی
لے کر گھر گھر ضرور پہنچتا تھا۔ جن علاقوں کی ناکا بندی ہوتی تھی' ان علاقوں سے کترا کر لمبا
چکر کاٹ کر بچوں کو اسکول تک ضرور پہنچا دیتا تھا۔

وہ کسی گھر سے ایک بچہ اور کسی گھر سے دو دو' تین تین بچے لے جاتا تھا۔ ان کی

مائیں گھر سے نکل کر انہیں گاڑی تک چھوڑنے آتی تھیں۔ عذرا اپنے بیٹے پپو کو گود اٹھائے کھڑی تھی۔ جب دیدار نے اس کے دروازے کے سامنے گاڑی روکی تو اس نے کہا۔ "تم جانتے ہو' آج اسکول میں میرے پپو کا پہلا دن ہے۔ اس کا خاص خیال رکھنا بھائی!"

"باجی! فکر نہ کریں۔ میری گاڑی ایک فولادی قلعہ ہے۔ تمام بچے حفاظت سے جاتے ہیں اور حفاظت سے واپس آتے ہیں۔ ہر بچے کی ذمے داری مجھ پر ہوتی ہے۔ میں آپ کے بیٹے کو خیریت سے واپس لاؤں گا۔"

"اسے اپنے پاس آگے والی سیٹ پر بٹھالو۔ میرے دل کو اطمینان رہے گا۔"

دیدار نے پپو کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہر ماں پہلے دن بچے کو اسکول بھیجتے وقت ایسے گھبراتی ہے جیسے اسے میدانِ جنگ میں بھیج رہی ہو۔"

عذرا نے کہا۔ "کیا یہ شہر میدانِ جنگ نہیں بن چکا ہے؟ کیا بچے گولے بارود، آگ اور دھوئیں سے گزر کر اسکول نہیں جاتے ہیں؟؟"

دیدار نے ایک گہری سانس لی۔ گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا مختلف علاقوں سے گزرنے لگا۔ پچھلی رات ایک آدھ جگہ وارداتیں ہوئی تھیں۔ اس وقت عارضی امن اور سکون تھا۔ اس نے اسکول کے بڑے آہنی گیٹ کے قریب گاڑی روک دی۔ انجن بند کر دیا۔ آہنی گیٹ کے پاس ایک دربان کے علاوہ ایک مسلح گارڈ کھڑا ہوا تھا۔ دیدار اپنے سامنے بچوں کو گاڑی سے اتر کر گیٹ کے ذیلی دروازے سے اندر جاتے دیکھنے لگا۔

اسی وقت عظمت اللہ شاہ کی بڑی سی کار آ کر رکی۔ کار کی اگلی سیٹوں پر ایک ڈرائیور اور ایک مسلح گارڈ تھا۔ پیچھے سنی اپنے دادا جان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دادا نے ڈرائیور سے کہا۔ "سنی کو میڈم کے آفس تک پہنچا کر آؤ۔"

ڈرائیور کار سے اتر کر سنی کو اپنے ساتھ اسکول کے احاطے کے اندر لے گیا۔ دیدار نے بھی پپو کو میڈم کے پاس پہنچایا اور بولا۔ "اس بچے کا آج یہاں پہلا دن ہے۔ نرسری میں ایڈمیشن ہو چکا ہے۔ اس کا نام کلیم احمد ہے۔ اسے پپو کہتے ہیں۔ بیگ پر اس کا نام لکھا ہے۔"

میڈم نے کہا۔ "دیدار! کم بولا کرو۔ نیو ایڈمیٹڈ بچوں کی تمام تفصیلات ہمارے پاس موجود ہیں۔ تم جاؤ۔"

ڈرائیور نے سنی کے ساتھ آ کر کہا۔ "میڈم! یہ جسٹس صاحب کے پوتے ہیں۔"

میڈم نے فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے شفقت سے سنی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چپراسی کو بلا کر کہا۔ "ان دونوں کو نرسری کلاس میں پہنچا دو۔"

وہ دونوں چپراسی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگے۔ وہ دونوں ہم عمر تھے۔ ہم جماعت تھے۔ اسکول میں دونوں کا پہلا دن تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کا یہ پہلا قدم تھا۔ خدا جانے وقت کا دوسرا قدم انہیں کہاں پہنچانے والا تھا۔

☆=========☆=========☆

عذرا کچن میں تھی مگر کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر پپو یاد آ رہا تھا۔ دل آپ ہی گھبرا رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر کچن میں نہ رہ سکی۔ سوچا' شاید گرمی سے دل گھبرا رہا ہے۔ اس نے کمرے میں آ کر اے سی کو آن کیا۔ ذرا سی دیر میں کمرے کا موسم بدل گیا۔ گرمی رخصت ہو گئی۔ ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔

بستر کے سرہانے والی میز پر اس کے شوہر نسیم احمد اور بیٹے کلیم احمد عرف پپو کی تصویر تھی۔ تصویر میں دونوں باپ بیٹے اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی مسکرانے لگی۔

اس گھر میں مسکراہٹیں تھیں اور اتنی خوشیاں تھیں' جتنی ایک انسان کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ پہلے اس گھر کے ایک ہی کمرے میں چھت کا ایک ہی پنکھا تھا۔ نسیم احمد کی محدود تنخواہ میں دوسرا پنکھا خریدنے کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی رقم جوڑ کر سال میں ایک بار عید کے نئے جوڑے سلوانے کی توفیق ہوتی تھی۔ بیٹا پیدا ہوا تو اس کے حال اور مستقبل کے حوالے سے دل میں ایسے عزائم پیدا ہونے لگے' جو کسی غریب کے گھر میں پورے نہیں ہوتے۔ وہ محض خوش کن خواب بن کر رہ جاتے ہیں۔

نسیم احمد کہتا تھا۔ "میری بڑی خواہش ہے کہ ہمارا پپو کسی بڑے انگلش اسکول میں پڑھے۔ بڑے لوگوں کے بچوں کی طرح گاڑی میں اسکول جایا کرے اور گاڑی میں آیا کرے۔"

عذرا اپنے شوہر سے دو ہاتھ آگے جا کر جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتی تھی کہ پپو اسکول سے آ کر ڈیفنس کے امیرزادوں کی طرح انگریزی بول رہا ہے اور اگر اس کی تعلیم کا یہی معیار رہے گا تو وہ یورپ یا امریکا جا کر بڑا نام کمائے گا اور دولت بھی۔

خوابوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ غریب کی آنکھوں میں محل تعمیر کرتے ہیں اور بوڑھوں کی نیند میں گمشدہ جوانی کی جھلکیاں دکھاتے ہیں لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی خواب پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر وہ پوری طرح پورا نہ ہو' تب بھی خواب کے کچھ حصے کی تعبیر مل جاتی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ برس پہلے نسیم احمد نے یہ خوش خبری سنائی کہ اسے دواؤں کی ایک بڑی کمپنی میں سیلز ریپریزنٹیٹو کی ملازمت مل گئی ہے۔ ماہانہ تنخواہ کے طور پر پانچ ہزار روپے ملیں گے۔ اس کے علاوہ اوپری آمدنی بہت ہے۔

عذرا نے کہا۔ "اوپری آمدنی ہمیشہ غلط راستوں سے ہوتی ہے۔ ہم نے کبھی حرام نہیں کھایا۔ آپ اوپری آمدنی پر لعنت بھیجیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم بڑی بھولی ہو۔ اوپری آمدنی اسے بھی کہتے ہیں جو کمپنی والے ٹی اے اور ڈی اے الاؤنس کے طور پر دیتے ہیں۔"

"یہ ٹی اے اور ڈی اے کیا ہوتا ہے؟"

"ٹی اے کا مطلب ہے' ٹریولنگ الاؤنس اور ڈی اے کا مطلب ہے' ڈیلی الاؤنس۔ جب میں شہر شہر جا کر دواؤں کے آرڈرز بک کروں گا اور ان شہروں میں دو دو چار دن رہا کروں گا تو کمپنی کی طرف سے مجھے سفر کے اور روزانہ رہائش کے اخراجات کی رقمیں ملتی رہیں گی۔ یہ تنخواہ کے علاوہ ہوں گی اس لئے اسے اوپری آمدنی کہہ رہا ہوں۔"

"پھر تو یہ اوپری آمدنی جائز ہے۔ اب ہم پپو کو انگریزی اسکول میں ضرور پڑھائیں گے۔ یہ بتائیں' اوپری آمدنی کتنی ہو گی؟"

"یہ بزنس ٹور کی نوعیت پر ہے۔ پانچ ہزار سے دس ہزار تک ہو سکتی ہے۔ تنخواہ ملا کر ماہانہ دس پندرہ ہزار روپے ملتے رہیں گے۔"

وہ خوشی سے پپو کو گود میں لے کر بھینچتے ہوئے' پیار کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم اتنے دولت مند ہونے والے ہیں۔"

رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا۔ گھر میں قیمتی فرنیچر اور آرائشی سامان آنے لگا۔ فرش پر قالین بچھ گیا۔ پہلے ایک پنکھا خریدنے کی حیثیت نہیں تھی۔ اب ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں اے سی لگ گئے۔

نسیم احمد کے رہن سہن میں بھی فرق آ گیا۔ حلیہ بدل گیا۔ پہلے وہ صرف شلوار قمیض پہنتا تھا۔ اب جینز' بنیان اور جیکٹ پہننے لگا تھا۔ پیروں میں لانگ بوٹ ہوتے تھے اور سر کے بال شانوں تک بڑھے رہتے تھے۔ وہ انگریزی فلموں کا ہیرو اور پاکستانی فلموں کا ولن دکھائی دینے لگا تھا۔

وہ دواؤں کا بیگ لے کر دوسرے شہروں میں جاتا تھا۔ کبھی ہفتے کبھی دو ہفتے بعد واپس آتا تھا اور جب بھی آتا تو نوٹوں کی گڈیاں ضرور لاتا تھا۔

کمرا ائر کنڈیشنڈ تھا۔ وہ سکون سے بیٹھی نسیم اور پپو کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔

دونوں مسکرا رہے تھے۔ عذرا نے ان کی تصویروں کو آنچل سے پونچھتے ہوئے زیرِ لب کہا۔ "آج ہمارا خواب پورا ہوا ہے۔ ہمارا بیٹا اسکول گیا ہے۔ میرا تو دل گھبرا رہا تھا۔ ان حالات میں اسے گھر سے نکلنے نہ دیتی لیکن پہلے ہی دن ناغہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے دل مضبوط کر کے بھیج دیا ہے۔ آج آپ آنے والے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ بیٹے کو اسکول کی فارم میں دیکھیں۔ اللہ! آپ دیکھیں گے تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ بالکل آپ کا بچپن دکھائی دیتا ہے۔"

وہ زیرِ لب بولتے بولتے یک لخت چپ ہو گئی۔ پہلے "تڑ" کی ایک آواز سنائی دی پھر تڑا تڑ کی آوازیں دور تک سنائی دیں۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ تیزی سے دوسرے کمرے میں جا کر ایک میز پر چڑھ کر روشن دان سے باہر دیکھنے لگی۔

باہر حدِ نظر تک محلہ ویران نظر آ رہا تھا۔ جو چند لوگ باہر تھے' وہ گھروں میں جا کر دبک گئے تھے۔ محلے کی چھوٹی بڑی دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ نہیں' اب خوف نہیں رہا تھا۔ پچھلے دو برسوں میں اتنی گولیاں چلی تھیں' بموں کے اتنے دھماکے ہوئے' اتنے شعلے بھڑکے' اتنا دھواں پھیلا' اتنے مرد' عورتیں اور بچے مرے تھے کہ اب موت سمیت کوئی ڈرانے والی چیز نہیں رہی تھی۔ اس شہر کے لوگ ڈرتے نہیں تھے' محتاط رہتے تھے۔

پیٹ کی آگ بجھانی پڑتی ہے اس لئے مرد موت کا چیلنج قبول کرتے ہوئے مزدوری کرنے' ٹھیلا لگانے' دکان داری کرنے کے لئے گھروں سے نکلتے تھے۔ عورتیں بازاروں سے سودا لانے اور فیکٹریوں میں کام کرنے جاتی تھیں۔

برسوں سے جاری رہنے والی دہشت گردی اور تخریب کاری نہ ختم ہونے والا سلسلہ ثابت ہوتی رہے تو قوم اور ملک کا مستقبل سنوارنے والے بچوں کو ناخواندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ بارود کے ڈھیر پر بھی بیٹھ کر پڑھنا ہے۔ جہنم کی بھڑکائی ہوئی آگ کے شعلوں سے گزرتے ہوئے پڑھنا ہے۔ "اِقرَاْ بِاسمِ رَبِک" انسانی لہو کے دریا پار کرتے ہوئے تاریخ رقم کرنی ہے کہ ان پاکستانی بچوں نے حالات کی کیسی بھیانک یونیورسٹی میں رہ کر علم کا نور حاصل کیا ہے۔ یہ اس شہر کی ماؤں کا حوصلہ تھا کہ وہ کلیجے پر پتھر رکھ کر بچوں کو اسکول بھیجا کرتی تھیں۔ عذرا کلیجے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ اسے یوں لگا' باہر کہیں چلنے والی گولی سیدھی اس کے کلیجے میں آ کر لگی ہے۔

☆=========☆=========☆

بیگم شاہ یوں تو گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھیں لیکن دل اپنے جگر کے

نکڑے سنی کی طرف لگا ہوا تھا۔ انہیں کسی طرح کا خوف نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے دادا اور مسلح گارڈ کے ساتھ گیا تھا اور بیگم شاہ اسی طرح اسے بحفاظت اسکول سے لانے والی تھیں۔ انہیں صرف یہ فکر تھی کہ وہ پہلی بار اسکول گیا ہے' وہاں تمام اجنبی بچوں کے درمیان خود کو تنہا محسوس کر رہا ہو گا اور گھر والوں کو یاد کر رہا ہو گا۔

عظمت اللہ شاہ اپنی کار میں ہائی کورٹ گئے تھے۔ بیگم کی کار گیراج میں تھی۔ انہوں نے ڈرائیور سے کہا۔ "کار گیراج سے نکال کر چیک کرو اور اس کی صفائی کرو۔ میں کسی بھی وقت باہر جاؤں گی۔"

بہو نے کچن سے نکل کر کہا۔ "ممی! میں چائے پی رہی ہوں۔ آپ پئیں گی؟"

"نو تھینکس۔ میں پی چکی ہوں۔ آج تم دیر تک سوتی رہیں ورنہ سنی کو دیکھتیں' اسکول یونی فارم میں بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔"

"اسمارٹ تو لگے گا۔ آخر ہے کس کا بیٹا۔ ویسے اسکول سے لانے جاؤں گی تو اسے خوب پیار کروں گی۔"

"میرے ساتھ اسکول جانا ہے تو تیار ہو جاؤ۔ میں یہاں سے ساڑھے دس بجے نکلوں گی۔"

"اتنی جلدی وہاں جا کر کیا کریں گی۔ اسکول کی چھٹی ایک بجے ہو گی۔" ان کی بہو شازیہ بولی۔

"آج ہفتہ ہے۔ ہاف ڈے ہے۔ گیارہ بجے چھٹی ہو جائے گی۔"

"اوہ۔ میں تو بھول گئی تھی۔ ٹھیک ہے' شاور لینے جا رہی ہوں۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شازیہ نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر خوش ہو کر بولی۔ "آپ ابھی تک اسلام آباد میں ہیں؟ یہاں کب آ رہے ہیں؟"

بیگم نے شازیہ سے ریسیور لیا پھر کان سے لگا کر بولیں۔ "جنید تم نے کہا تھا' صبح آؤ گے۔ وہاں اب تک کیا کر رہے ہو؟"

وہ بیٹے کا جواب سننے لگیں پھر بولیں۔ "اچھا فلائٹ لیٹ ہے۔ یہاں بارہ بجے تک پہنچو گے۔ ہو سکتا ہے' میں گھر نہ ملوں۔ سنی کو اسکول سے لانے جاؤں گی۔ تمہیں تو یاد ہو گا' آج اسکول میں اس کا پہلا دن ہے۔ کبھی گھر والوں کے بغیر سنی اتنی دیر باہر نہیں رہا۔ یاد کر رہا ہو گا۔ ہاں.......... ہاں.......... ہاں.......... اچھا.......... مگر گاڑی ائرپورٹ کیسے

بھیجوں؟ ایک گاڑی تمہارے ڈیڈی لے گئے ہیں۔ دوسری میں لے جاؤں گی۔ تم ٹیکسی میں گھر چلے آنا۔ ہاں.......... اچھا بیٹا! خیریت سے آؤ۔ خدا حافظ۔"

بیگم شاہ نے ریسیور رکھ کر بہو کو دیکھا پھر کہا۔ "تم ابھی تک یہاں تک کھڑی ہو؟ غسل کرنے نہیں گئیں۔"

"جا رہی ہوں۔ گیارہ بجنے میں تو ابھی بہت دیر ہے۔"

وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ بیگم نے سنٹر ٹیبل پر پڑے ہوئے اخبار کو اٹھایا پھر فوراً ہی اسے ہاتھ سے یوں چھوڑ دیا جیسے اخبار نے ڈنک مارا ہو۔ انہیں یاد آگیا کہ ہر روز کی طرح دہشت گردی اور تخریب کلدی کی خبریں چھپی ہوں گی۔ ایک طویل عرصے سے خیر کی کوئی خبر شائع نہیں ہو رہی تھی۔ اخبارات بھی مجبور تھے' بچھو کی طرح ڈنک مارنے والی خبریں شائع کرتے رہتے تھے۔ دنیا کے تمام اخبارات ہر صبح امید کی کرن لاتے ہیں لیکن اب امیدیں لانے والے اخبارات مایوسیاں پھیلاتے ہیں۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بیگم نے چونک کر فون کو دیکھا پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ ایک اجنبی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو! ہیلو!"

بیگم نے پوچھا۔ "ہیلو کون ہے؟ کس سے بات کرنا ہے؟"

"میں بیگم صاحبہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ بیگم عظمت اللہ شاہ سے۔"

"جی میں بول رہی ہوں۔ فرمایئے؟"

"بات یہ ہے کہ میں شاہ صاحب کو کئی بار سمجھا چکا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ دوست بنایا کریں۔ اپنی جان کے دشمن پیدا نہ کریں۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟"

"دیکھئے' ہم کسی کو طمانچہ ماریں گے تو وہ بھی جواباً ہاتھ اٹھائے گا۔ دشمنی اسی طرح پیدا ہوتی ہے۔ آج شاہ جی کسی کو موت کی سزا دیں گے تو کیا ہم ان کی موت کا سامان نہیں کریں گے؟"

وہ خوف زدہ ہو کر بولیں۔ "تم کون ہو؟ اتنے بڑے جج کو قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ کیا تمہاری شامت آئی ہے؟"

"ہر بندہ اپنے گھر خوش رہے تو شامت نہیں آتی۔ گھر سے باہر ایک دوسرے کے خلاف اقدامات کرے تو شامت آ جاتی ہے۔ آپ کے گھر میں کتنا سکون اور آرام ہے۔ خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا رہا ہے۔ کیا آپ چاہیں گی کہ ہمارے خلاف کورٹ میں فیصلہ ہو اور آپ کے گھر میں قیامت آ جائے؟"

"میں کچھ نہیں سمجھ رہی ہوں' میں کچھ نہیں جانتی۔"

"میں آپ کو اس لئے سمجھا رہا ہوں کہ آپ اپنے مجازی خدا کو سمجھائیں۔ بعض حضرات کو بیویاں قائل کر دیتی ہیں۔ آپ بھی قائل کریں گی تو گھر کی جنت بنائے رکھیں گی ورنہ ہم چند منٹوں میں اس گھر کو جہنم بنا دیں گے۔"

بیگم شاہ نے ریسیور رکھ دیا۔ ان کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔ اب سے پہلے بھی عظمت اللہ شاہ نے قتل کے کئی مقدمات کے فیصلے سنائے تھے لیکن قاتل کے احباب کی جانب سے گھر والوں کو کبھی دھمکی نہیں دی گئی تھی۔ البتہ عظمت اللہ شاہ کو خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اس کے لئے سیکیورٹی کے انتظامات کئے گئے تھے۔ وہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے پُر خطر زندگی گزار رہے تھے۔

بیگم شاہ جانتی تھیں کہ وہ ہائی کورٹ میں ہوں گے۔ عدالت کا وقت ہونے تک اپنے چیمبر میں وقت گزار رہے ہوں گے۔ انہوں نے نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر کہا۔

"ہیلو' آپ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"خدا کا شکر ہے۔ خیریت سے ہوں۔ یہ تم خیریت کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ابھی کسی بدمعاش نے فون پر دھمکی دی ہے۔ کہہ رہا تھا' آج آپ کسی قاتل کو سزائے موت دیں گے تو ہمارے گھر کو جہنم بنا دیا جائے گا۔"

"ہوں۔ تو وہ گھر کی عورتوں کو بھی دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

"اس کی آواز کی سختی اور پختگی سے پتا چل رہا تھا کہ جو کہہ رہا ہے وہ کر گزرے گا اور وہ اکیلا تو ہو گا نہیں؟ پتا نہیں اس کے ساتھ کتنے دہشت گرد ہوں گے۔"

"دل سے خوف نکالو۔ سنّی کو اسکول لینے جاؤ تو پوری سیکیورٹی کے ساتھ جاؤ۔ کوٹھی میں ابھی اور کچھ مسلح سپاہی آ جائیں گے۔"

"مجھے اپنی نہیں' آپ کی فکر ہے۔ خدانخواستہ وہ آپ کو.........."

"خدا پر بھروسہ رکھو۔ اللہ نے چاہا تو مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ کیا تم نے شازیہ کو ان دھمکیوں کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟"

"نہیں۔ وہ ابھی باتھ روم میں ہے۔"

"اسے نہ بتانا۔ بچوں کو ایسی باتوں سے خوف زدہ نہیں کرنا چاہئے۔"

عظمت اللہ شاہ نے فون بند کر کے تھوڑی دیر کچھ سوچا پھر کمشنر سے رابطہ کر کے کہا۔ "میں شاہ بول رہا ہوں۔"

"السلام علیکم شاہ جی! میرے لائق کوئی خدمت؟"

"اب وہ شخص گھر کی خواتین کو فون پر پریشان کر رہا ہے۔"

"مجھے احساس ہے کہ آپ کو کس طرح الجھایا جا رہا ہے۔ میں نے حکم دیا ہے کہ آپ کی تمام ٹیلی فون کالیں ٹیپ کی جائیں اور وہ ٹیپ کی جا رہی ہوں گی۔ اس فون نمبر کا سراغ لگایا جا رہا ہو گا' جہاں سے آپ کو فون کیا جاتا ہے۔ بس ایک بار سراغ مل جائے تو پولیس ان کی شہ رگ تک پہنچ جائے گی۔"

"میں چاہتا ہوں' میری کوٹھی کے اطراف مسلح سپاہیوں کی تعداد بڑھا دی جائے۔"

"میں ابھی حکم دے رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں مسلح سپاہی وہاں پہنچ جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ گھر والوں کو پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ریسیور رکھ کر سوچنے لگے۔ ان کے ایک دوست اور مشیر نے کہا۔ "آپ کبھی پریشان نہیں ہوتے لیکن آج بہت خاموش ہیں۔"

"میں آج بھی پریشان نہیں ہوں۔ سوچ رہا ہوں' ہمارے ملک میں لاقانونیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا انجام کیا ہو گا؟"

"برائیوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ مایوسیاں پھیل رہی ہیں۔ ایسے میں ہم سوچتے ہیں' کوئی مسیحا پیدا ہو گا اور وہ اس قوم کے بیمار لوگوں کا علاج کرے گا۔"

"اب تو سب ہی یہ سوچ رہے ہیں' کوئی معجزہ ہو گا تو اس ملک اور قوم کے دن پھریں گے ورنہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔"

پیش کار نے آ کر شاہ صاحب سے کہا۔ "سر! ابھی جیل سے گاڑی نہیں نکلی ہے۔ قیدی کو یہاں پہنچانے میں دیر لگے گی۔"

انہوں نے وال کلاک میں وقت دیکھا پھر کہا۔ "یہ جیل والے ہمیشہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں۔"

پیش کار نے کہا۔ "جی ہاں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے لیکن آج وہاں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ جیل روڈ کے سامنے ایک بم کا دھماکہ ہوا ہے۔ اسی لئے جیل والے محتاط ہیں۔ میں آدھے گھنٹے بعد فون پر معلوم کروں گا۔"

انہوں نے سوچا۔ "دیر نہیں ہونا چاہئے۔ جتنی دیر ہو گی' مجرم کے ساتھی اتنا ہی پریشان کرتے رہیں گے۔ بہرحال عدالتی کارروائی تھوڑی دیر کے لئے ٹل گئی ہے۔ عارضی طور پر فیصلے کی گھڑی ٹل گئی ہے۔ کوئی بات نہیں' میرا فیصلہ اٹل رہے گا۔"

☆========☆========☆

دیدار حسین بچوں کو اسکول پہنچانے کے بعد ایک جلد ساز کے پاس جاتا تھا۔ اس کے

پاس جتنی کتابوں کی جلد بندی ہو جاتی تھی ان مجلد کتابوں کو سوزوکی کے پیچھے لاد کر ان کے پبلشروں کے دفاتر میں پہنچا دیتا تھا۔ صبح سے شام تک سوزوکی اس کے روزگار کا ذریعہ بنی رہتی تھی۔ مارکیٹ میں ہر چھوٹے بڑے دکان دار سے اس کی سلام دعا تھی اس لئے اسے مال لانے لے جانے کا کام ملتا رہتا تھا۔

اس روز وہ مال برداری سے فارغ ہو کر ایک ہوٹل میں آیا اور چائے پینے لگا۔ ایک دوسرا سوزوکی ڈرائیور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دیدار نے اس کے لئے چائے کا آرڈر دیا پھر پوچھا۔ "کام کیسا چل رہا ہے؟"

"گاڑی ہوگی تو کام چلے گا۔"

"گاڑی نہیں ہے؟ کیا بیچ دی ہے؟"

"بیچ دیتا تو کچھ رقم کھری ہو جاتی۔ وہ تو چھین لی گئی ہے۔"

"کیا پولیس والوں نے چھین لی؟"

"نہیں۔ پولیس والے تو میری گاڑی کی بازیابی کے لئے کوششیں کر رہے ہیں۔ پتا نہیں، کتنے دنوں میں اور کتنے مہینوں میں وہ گاڑی ملے گی۔ ہو سکتا ہے، نہ بھی ملے۔ اب تک یہی دیکھا گیا ہے کہ دس گاڑیاں چھینی جاتی ہیں اور دو گاڑیاں ملتی ہیں۔"

دیدار نے کہا۔ "ہم روز کمانے والے اور روز کھانے والے ہیں۔ جس دن کمائی نہ ہو، گھر کا چولھا نہیں جلتا۔ پتا نہیں، یہ دہشت گرد اور تخریب کار انسان ہیں یا نہیں۔ نہ جانے کس منافع کے لالچ میں غریبوں کو ہلاک کر رہے ہیں اور غریبوں کی ہی روزی روٹیاں چھین رہے ہیں۔"

"جب بھی دنگے فسادات ہوتے ہیں اور لاقانونیت زور پکڑتی ہے، غریب ہی مارے جاتے ہیں۔ آج کچھ رقم نہ ملی تو رات کو چولھا نہیں جلے گا۔ مہاجن سے قرض مانگنے آیا تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ صرف دو سو دیئے جبکہ گھر کا پورا راشن خریدنے کے لئے کم سے کم پانچ سو کی ضرورت ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میری اماں کے پاس جاؤ۔ اپنا حال بتاؤ۔ وہ تمہیں پانچ سو روپے دے دیں گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تڑاتڑ گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ موت اچانک آتی ہے۔ اسی طرح اچانک حملہ آور آئے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ وہ دونوں دوسرے گاہکوں کی طرح ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر میز کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فائرنگ ہوتے ہی دیدار کرسی سمیت الٹ کر فٹ پاتھ پر جان بوجھ کر گرا۔ اس کی عینک اس سے

ہو کر دور چلی گئی۔ وہ مسلح افراد ایک گاڑی میں آئے تھے اور مسلسل فائر کرتے ہوئے چلے گئے تھے۔

اب گولیاں نہیں چل رہی تھیں لیکن ہر طرف خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی ڈرائیور کو آواز دی۔ "شبیر! خیریت سے ہو؟" ذرا فاصلے پر پڑا ہوا ساتھی عینک کے بغیر دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ عینک ایک طرف پڑی ہوئی تھی۔ ایک کی دو دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ اس کے دونوں شیشے چُور ہو گئے تھے۔ فریم بھی ٹوٹ گیا تھا۔ نہ جانے بھگدڑ کے دوران کتنے لوگ اس عینک پر پاؤں رکھ کر گزر چکے تھے۔

ایک شخص کی آواز آئی۔ "اسے دو گولیاں لگی ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "آہ! بے چارہ پتا نہیں کون ہے؟"

دیدار نے ٹوٹی ہوئی عینک ہاتھ میں لی اور قریب آ کر شبیر کو دیکھا۔ وہ ابھی بول رہا تھا۔ بیوی بچوں کے لئے راشن خریدنے کی بات کر رہا تھا اور اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ دیدار کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے شبیر کی جیبیں ٹٹول رہے تھے کہ شاید شناختی کارڈ مل جائے۔ اس شہر میں جس کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہوتا تھا اس کی لاش اس کے گھر تک پہنچائی نہیں جاتی تھی۔ اسے لاوارث لاشوں کے درمیان رکھ دیا جاتا تھا۔

پولیس والے آ گئے تھے۔ شبیر کی جیبوں میں شناختی کارڈ نہیں تھا۔ گاڑی کے کاغذات سے بھی اس کے گھر کا پتا معلوم ہو سکتا تھا لیکن گاڑی کے ساتھ کاغذات بھی چلے گئے تھے۔ دیدار نے کہا۔ "میں اس کا نام اور پتا جانتا ہوں۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "ہمارے ساتھ تھانے چلو۔"

اس نے اسکول کے کاغذات دکھاتے ہوئے کہا۔ "بچوں کی چھٹی ہونے والی ہے۔ انہیں اسکول سے گھر پہنچانا لازمی ہے۔ میں انہیں پہنچا کر تھانے میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

وہ شبیر کا نام اور پتا لکھوا کر اسکول کی طرف جانے لگا۔ عینک کے بغیر مشکل ہو رہی تھی۔ ونڈ اسکرین کے پار ہر چیز ایک کی دو نظر آ رہی تھی۔ انسان اور گاڑیاں ایک دوسرے میں گڈمڈ دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسے وقت دونوں آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے کی کوشش کی جائے تو ہر چیز کسی حد تک اپنی جگہ صحیح نظر آتی ہے۔ دیدار اسی طرح آنکھیں سکیڑ کر گاڑی چلا رہا تھا۔ آنکھوں پر زور پڑ رہا تھا۔ پریشانی ہو رہی تھی لیکن اس طرح حادثات سے بچتا ہوا اسکول کے بڑے آہنی گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔

چھٹی ہونے والی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ ایسے وقت شبیر یاد آ رہا تھا۔ انسان کی زندگی کتنی ناقابلِ اعتماد ہے۔ جینے کے لئے سو برس ہوتے ہیں لیکن یہ زندگی اگلے پل ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اس زندگی نے شبیر کو اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ بیوی بچوں کے لئے راشن پہنچاتا۔ کیا یہ ہے زندگی؟ ایک باپ کو بچے کا بوسہ لینے کا بھی موقع نہیں دیتی اور انسان ہے کہ خدا کو بھول کر ایسی زندگی کے لئے مرتے مرتے جیتا ہے۔

چھٹی کی گھنٹی بجنے لگی۔ گیٹ کے سامنے دور تک قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ امیر والدین اپنے بچوں کو ائرکنڈیشنڈ کاروں میں لینے آئے تھے۔ وہ بچے گیٹ کے چھوٹے دروازے سے نکل کر اپنے والدین اور اپنی کاروں کی طرف جا رہے تھے۔ جو ان سے کم تر بچے تھے' وہ گیٹ سے نکل کر دیدار اور دوسرے ڈرائیوروں کی سوزوکیوں میں آ کر بیٹھ رہے تھے۔

تمام ڈرائیور بچوں کو اپنی اپنی گاڑی کے اندر پہنچا رہے تھے۔ دیدار بھی یہی کرتا تھا لیکن اس وقت اپنی سوزوکی کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ اسے تمام بچے ایک ہی یونی فارم میں ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھ رہا تھا اور یقین سے سمجھ رہا تھا کہ بچے اسے اور اس کی سوزوکی پہچانتے ہیں اور صحیح گاڑی میں آ کر بیٹھ رہے ہیں۔

آخر میں ایک چار سالہ بچہ گیٹ کے باہر آیا۔ تب اسے یاد آیا۔ آج ایک نیا بچہ پپو اس کی گاڑی میں آیا ہے۔ اس نے صبح پہلی بار پپو کو دیکھا تھا۔ اب دوسری بار عینک کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ عینک لگا کر دیکھا جائے تب بھی ایک ہی قد کے بچے ایک جیسے یونی فارم میں ایک جیسے لگتے ہیں۔

دیدار نے آگے بڑھ کر دونوں بازو پھیلا کر کہا۔ "پپو! آؤ بیٹے!" وہ دوڑتا ہوا' اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر کہا۔ "واہ یہ بھی خوب رہی۔ میں نام لے کر نہ بلاتا تو تم یہاں بھٹکتے رہ جاتے اور مجھے تنگ کرتے رہتے پھر میں اپنی گاڑی کے پیچھے لکھواتا' پپو یار تنگ نہ کر۔"

اس نے پپو کو اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھایا پھر بچوں کا قافلہ لے کر وہاں سے چل پڑا۔

میڈم اپنے دفتر میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک رجسٹر پر جھکی حساب کتاب میں مصروف تھی۔ ایک چپراسی نے آ کر بیگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میڈم! اس بیگ پر کلیم احمد عرف پپو لکھا ہوا ہے۔ یہ بچہ اپنا بیگ بھول کر چلا گیا ہے۔"

میڈم نے بیگ کو دیکھ کر کہا۔ "ہوں پپو! مجھے یاد ہے۔ اس بچے کا نیا ایڈمیشن ہوا

ہے۔"

چپراسی نے کہا۔ "اس کے ماں باپ کو چاہئے تھا کہ اس کے ساتھ بیگ بھی لے ...ے۔ بڑے بھی بچوں کی طرح چیزیں بھول جاتے ہیں۔"

"وہ کسی کار میں نہیں آیا تھا۔ بچوں کو لانے لے جانے والی کسی گاڑی میں آیا تھا۔ ...یاد آیا۔ دیدار اسے لایا تھا۔ میں کل اسے سمجھاؤں گی کہ بچوں کے ساتھ ان کے بیگ ...کا بھی خیال رکھے۔"

چپراسی جانے لگا۔ میڈم نے پوچھا۔ "کیا تمام بچے جا چکے ہیں؟"

"جی ہاں۔ صرف ایک بچہ رہ گیا ہے۔"

"او۔ یاد آیا۔ جسٹس شاہ صاحب کی گاڑی نہیں آئی ہے۔ وہ بچہ کہاں ہے؟"

"مس صابرہ کے پاس کھیل رہا ہے۔"

میڈم نے ٹیلی فون ڈائری نکال کر اس میں عظمت اللہ شاہ کی کوٹھی کا فون نمبر دیکھا ...ریسیور اٹھا کر وہ نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ میڈم نے ...ہا۔ "بیگم شاہ صاحب سے کہو' اسکول کی چھٹی ہو گئی ہے۔ تمام بچے جا چکے ہیں۔ وہ آ کر ...پوتے کو لے جائیں۔"

ملازم نے کہا۔ "بیگم صاحبہ اسکول جانے کے لئے تیار ہیں مگر گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ گاڑی ٹھیک ہوتے ہی چلی آئیں گی۔"

"ٹھیک ہے مگر انہیں بتا دو کہ میں نے فون کیا تھا۔"

میڈم نے ریسیور رکھ دیا۔

☆=========☆=========☆

عذرا گیارہ بجے سے پپو کا انتظار کرنے لگی۔ دیدار نے کہا تھا' بچوں کو اسکول سے اٹھا کر ایک ایک کے گھر پہنچاتے پہنچاتے ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ وہ تمام بچوں کو ان کے گھروں تک پہنچانے کے بعد آخر میں پپو کو پہنچائے گا کیونکہ عذرا کا گھر دوسرے بچوں کے گھروں کے راستے پر نہیں تھا۔ پپو کو آخر میں پہنچایا جا سکتا تھا۔ اس طرح پپو کی واپسی میں ایک بج سکتا تھا۔

لیکن ممتا کو قرار نہیں تھا۔ وہ گیارہ بجے سے بار بار دروازہ کھول کھول کر آنے جانے والی سوزوکیوں کو دیکھنے لگی۔ ذرا فاصلے پر ایک مکان تھا۔ اس مکان کے سامنے نیم کا گھنا درخت تھا۔ وہاں ایک بوڑھی عورت بچوں کے لئے بسکٹ' ٹافیاں اور سستے کھلونے بیچتی تھی۔ لکڑی کے ایک پرانے تخت پر دکان لگاتی تھی۔

اس وقت لوڈ شیڈنگ کے نتیجے میں بجلی گئی ہوئی تھی۔ گرمی سے برا حال تھا۔ بچ
عورتیں اور بچے دھوپ اور گرمی سے محفوظ رہنے کے لئے نیم کے درخت کے سائے م
آ گئے تھے۔ عذرا بھی آ گئی۔

ایک خاتون نے کہا۔ "روز اپنے میاں کا انتظار کرتی تھیں' آج بیٹے کا انتظار کر رہ
ہو۔"

"ہاں۔ پہلی بار اسکول گیا ہے۔ سوچتی ہوں' اس نے اتنا وقت کیسے گزارا ہو گا۔"

"اس نے تو گزار لیا۔ چھٹی ہو گئی ہو گی مگر تمہارا وقت نہیں گزر رہا ہے۔"

دوسری خاتون نے کہا۔ "میرے دونوں بچے پہلے دن اسکول گئے تھے تو میرا دل بھ
عجیب سا ہو رہا تھا۔ جب بھی اسکول کی چھٹی کا وقت ہوتا تھا' میں بے چین ہو جاتی تھ
اب نہیں ہوتی۔ اسکول سے آنے میں دیر سویر ہو جاتی ہے مگر بچے آ جاتے ہیں۔"

عذرا درخت کے سائے میں کھیلنے والے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ بار بار کلائی پ
بندھی ہوئی گھڑی کو بھی دیکھ رہی تھی۔ ایک عورت نے کہا۔ "بہت خوب صورت گھڑ
ہے۔ تمہارے میاں صاحب باہر کا مال لاتے رہتے ہیں۔ کوئی چیز بیچنے کی ہو تو میں خرید
چاہوں گی۔"

"وہ صرف میری اور پپو کی پسند کے مطابق چیزیں لاتے ہیں۔ باہر کا مال لا کر بیچنا او
منافع حاصل کرنا انہیں پسند نہیں ہے۔"

"تمہارے میاں کسی دوا کی کمپنی میں بڑے افسر ہیں۔ کیا ملک سے باہر بھی جا
رہتے ہیں؟"

"نہیں' باہر کا مال ملک میں بھی ملتا ہے۔ وہ لنڈی کوتل جاتے ہیں۔ وہاں سے
چیزیں لاتے ہیں۔"

اس نے پھر گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے والے تھے۔ وقت جیسے رک گیا تھا۔ گزر نہیں
رہا تھا۔ وہ وہاں سے چلتی ہوئی تیسری گلی میں آئی۔ ایک مکان میں ٹیلی فون تھا۔ مح
والے وہاں سے فون کرتے تھے اور فی کال کے پانچ روپے ادا کرتے تھے۔

اس نے اسکول کی میڈم سے رابطہ کیا۔ پھر پوچھا۔ "کیا بچوں کی چھٹی ہو گئی ہے؟"
میڈم نے کہا۔ "جی ہاں۔ ہو چکی ہے۔ آپ کون ہیں؟"

"میرا نام عذرا ہے۔ آج اسکول میں میرے بیٹے کا پہلا دن تھا۔ سوزوکی ڈرائیو
دیدار حسین اسے لے گیا تھا۔"

"دیدار بہت اچھا اور فرض شناس ڈرائیور ہے۔ وہ آپ کے بچے کو لے گیا ہو گا

ے آپ کے بیٹے کا نام کیا ہے؟"

"کلیم احمد۔ اسے پپو کہہ کر بلاتے ہیں۔ اس کے باپ کا نام نسیم احمد ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ آپ کا بیٹا پہلے دن یہاں اپنا بیگ چھوڑ گیا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ میرے بیٹے کی عادت ہے۔ ہر چیز اِدھر اُدھر بھول جاتا ہے۔ کیا
اسکول میں ہے؟"

"میرے کمرے میں ہے۔ کل وہ اسکول آئے گا تو اسے دے دیا جائے گا۔"

"تھینک یو میڈم! آپ کو یقین ہے نا کہ دیدار پپو کو لے گیا ہے؟"

"او یس۔ آئی ایم شیور۔ وہ روز ہی بچوں کو حفاظت سے لاتا ہے اور حفاظت سے
جاتا ہے۔ وہ اپنی ذمے داریوں کو خوب سمجھتا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ابھی پپو
پ کے پاس لے آئے گا۔"

عذرا نے شکریہ ادا کر کے ریسیور رکھ دیا۔ میڈم کی زبان سے یہ سن کر اطمینان ہوا
ٹا اسکول سے چل پڑا ہے اور اب زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں گھر پہنچ جائے گا۔

☆=========☆=========☆

بچے جا چکے تھے۔ اسی لئے اسکول کے اندر اور احاطے میں خاموشی تھی۔ میڈم اور
ٹیچرز اسکول کے دوسرے اہم کاموں میں مصروف تھیں۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔
بچوں کے جانے کے بعد بھی دو تین گھنٹے اسکول انتظامیہ مختلف کاموں میں مصروف
تھی۔

تب ہی فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی بڑا آہنی گیٹ کھلنے کی آواز
میڈم نے کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ ایک پجیرو آہنی گیٹ سے گزرتی
احاطے میں آ کر رکی۔ چہروں پر ڈھاٹا باندھے ہوئے کچھ لوگ کلاشنکوف لئے' دوڑتے
آفس اور کلاس روم کی طرف آ رہے تھے۔ دور گیٹ کے پاس سیکیورٹی گارڈ کی
پڑی ہوئی تھی۔

میڈم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ کانپتی ہوئی میز کے پاس آئی۔ وہ پولیس
فارم کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور اٹھایا۔ قریبی پولیس
ن کا نمبر یاد نہیں تھا لیکن ڈائری میں لکھا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے ڈائری کھول کر دیکھنے
اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ نمبر ڈائل کرتی اور پولیس سے رابطہ کرتی۔ ڈائننگ کے
ہی دو مسلح افراد دروازے کو لات مار کر کھولتے ہوئے اندر آئے۔ میڈم نے حلق
چیخنا چاہا لیکن چیخ نہ نکل سکی۔ منہ کھلا رہ گیا۔ ریسیور ہاتھ سے گر چکا تھا۔

ایک نے آتے ہی ٹیلی فون کو اٹھا کر پھینک دیا۔ دوسرے نے میڈم کو گن پوا
پر رکھ کر پوچھا۔ ”جسٹس کا پوتا کہاں ہے؟“

وہ خوف سے کانپتے ہوئے بولی۔ ”کک۔ کون جسٹس؟“

”بڑھیا چالاکی دکھائے گی تو ابھی گولی چل جائے گی۔ کیا جسٹس شاہ کوئی معمولی
ہے، جسے تو نہیں جانتی۔ بتا ورنہ گولی مارتا ہوں۔“

”ب........ بتاتی ہوں۔ تمام بچے جا چکے ہیں۔ شاہ صاحب کا ڈرائیور بھی آ کر
کو لے گیا ہو گا۔ میں یہاں آفس میں ہوں۔ مجھے باہر کی خبر نہیں ہے۔“

دو مسلح افراد مختلف کلاسوں میں جا کر سنی کو تلاش کر رہے تھے۔ ایک کلاس روم
مس صابرہ بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ وہاں صرف ایک ہی بچہ گیند سے کھیل
تھا۔ دونوں مسلح افراد نے کمرے میں آ کر مس صابرہ کو گن پوائنٹ پر رکھا پھر پوچھا۔
یہ جسٹس شاہ کا پوتا ہے؟“

صابرہ سہمی ہوئی تھی مگر ہوش و حواس میں تھی۔ یہ سمجھ گئی تھی کہ وہ لوگ
طور پر سنی کو حاصل کرنے آئے ہیں۔ اس نے کہا۔ ”یہ........ یہ وہ نہیں ہے۔ اس
سنی نہیں ہے۔“

ایک نے اس کی گھنی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر کہا۔ ”بکواس مت کرو۔ اس بیگ
اس لڑکے کا نام ہے۔ اگر یہ بیگ اس کا نہیں ہے تو پھر وہ سنی کہاں ہے، جس کا یہ
ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”یار! ہمیں واردات کے لئے صرف پانچ منٹ دیئے گئے
ٹائم زیادہ لو گے اور کام بھی نہیں ہو گا تو دادا ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”یہ مطلوبہ سنی ہے یا نہیں، تصدیق کرنے میں دیر لگے گی۔ اسے یہاں سے
چلو۔ بعد میں تصدیق ہو جائے گی۔ اگر یہ جسٹس کا پوتا نہ ہوا تو اسے مار کر کہیں
دیں گے۔“

ایک نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ صابرہ دوڑتی ہوئی اس کا راستہ روکنے کے
سامنے آ گئی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی۔ ”اس معصوم بچے کو چھوڑ دو۔ بچہ دشمنی
جانتا۔ اس سے دشمنی نہ کرو۔“

اس نے صابرہ کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ مارا۔ وہ لڑکھڑائی تو دوسرے نے اسے تھ
کہا۔ ”یار! اتنی حسین چیز کی ایسی بے قدری نہ کرو۔“

اس کی قدر کرنے والے نے بھی صابرہ کو ایک ہاتھ مار کر نیچے گرایا پھر وہ

ئے کلاس روم سے باہر برآمدے میں آئے۔ دوسری طرف سے مسلح افراد میڈم کے
رے سے آ رہے تھے۔ بچہ اٹھانے والے نے کہا۔ ”پورے اسکول میں یہی ایک بچہ
ہے۔ ہم اس کے بارے میں تصدیق کریں گے۔ ابھی ٹائم نہیں ہے۔“

وہ سب دوڑتے ہوئے جا کر پجیرو میں بیٹھ گئے۔ میڈم نے کھڑکی سے دیکھا۔ وہ
بچے کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے پھر وہ گاڑی اسٹارٹ ہو کر تیزی سے آگے بڑھتی گئی۔
ں کے بعد آہنی گیٹ کے پار جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میڈم نے کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر ٹیلی فون کو دیکھا۔ وہ جاتے جاتے ٹیلی فون کا
ار توڑ گئے تھے۔ دو ٹیچرز مس صابرہ کو سہارا دے کر دفتر میں لائیں۔ صابرہ کی باچھوں اور
اک سے لہو رس رہا تھا۔ وہ تکلیف اور دہشت سے نڈھال ہو رہی تھی۔ انہوں نے
ے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ میڈم نے الماری سے فرسٹ ایڈ بکس نکال کر ان کے سامنے
رکھا پھر چپراسی سے کہا۔ ”انہوں نے فون کا تار توڑ دیا ہے۔ کسی کو بلا کر لاؤ۔ فون کرنا
ضروری ہے۔ پولیس اور بچے کے والدین کو اطلاع دینا ہو گی۔ او گاڈ! یہ کیا ہو گیا ہے؟ میں
کیا کروں؟“

چپراسی نے فون کو اٹھا کر میز پر رکھا پھر ٹوٹے ہوئے تار جوڑنے لگا۔ میڈم نے
پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”میڈم یہ معمولی سا کام ہے۔ کسی کاریگر کو بلانا نہیں پڑے گا۔ یہ ابھی ٹھیک ہو
جائے گا۔“

اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ میڈم نے ریسیور اٹھا کر ٹیون سنی پھر پولیس اسٹیشن کے نمبر
ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر انہیں اسکول میں ہونے والی واردات کے بارے میں بتایا۔
دوسری طرف سے کہا گیا کہ وہ ابھی آ رہے ہیں۔

پھر میڈم نے بیگم شاہ سے رابطہ کیا۔ اسی ملازم کی آواز سنائی دی۔ میڈم نے پوچھا۔
”بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟ انہیں فوراً فون پر بلاؤ۔ کہنا اسکول کی میڈم کا فون ہے۔“

تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا پھر بیگم شاہ کی آواز سنائی دی ”ہیلو میڈم! معذرت خواہ
ہوں۔ مجھے اسکول آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ بات یہ ہے کہ نہ ہماری کار درست ہو رہی
ہے اور نہ کوئی ٹیکسی مل رہی ہے۔ ہم ابھی........“

”پلیز، پہلے آپ میری بات سنیں۔ آپ کے پوتے سنی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”کیا؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ ہوش میں ہیں۔ وہ اسکول کے اندر آپ کی نگرانی
ں تھا پھر اسے کون لے جائے گا؟ نہیں، کوئی اسے اغوا نہیں کر سکتا۔ آپ کہہ دیں کہ

آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"میں سچ کہنے پر مجبور ہوں اور مجھے سخت افسوس ہے۔ وہ منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کلاشنکوفیں تھیں۔ وہ ہمارے سیکیورٹی گارڈ کو قتل کر کے اسکو باؤنڈری میں گھس آئے تھے۔ سنی کی مس کو بھی بری طرح مارا ہے۔ ایسے میں کون انہ اغوا کرنے سے روک سکتا تھا؟"

"نہیں، کوئی اسے اغوا نہیں کر سکتا۔ میرے سنی کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اسے کوئی مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکتا........."

وہ ریسیور کے ماؤتھ پیس پر حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگیں۔ شازیہ نے تیزی سے کمرے میں آکر پوچھا۔ "ممی! کیا ہوا؟ آپ اس طرح کیوں چیخ رہی ہیں؟"

"یہ میڈم کہہ رہی ہیں، سنی کو اسکول سے اغوا کیا گیا ہے۔ میں نہیں مانتی۔ میرے معصوم بچے کو بھلا کوئی کیوں اٹھا کر لے جائے گا۔"

شازیہ نے ریسیور لے کر کہا۔ "ہیلو میڈم! میں سنی کی ماں بول رہی ہوں۔ کیا یہ درست ہے؟"

"یس مائی چائلڈ! تمہاری ممی یہ خبر سن کر اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ تم بھی خود کو سنبھالو اور جسٹس صاحب کو فوراً اطلاع دو۔ میں نے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا۔ پولیس یہاں آنے والی ہے۔"

شازیہ فون بند کر کے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے سسر کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بیگم شاہ منہ پر آنچل رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

☆==========☆==========☆

عدالت کا بڑا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز خاص طور پر وہاں موجود تھے کیونکہ ایک بہت ہی بدنام دہشت گرد کا مقدمہ تھا اور اس روز آخری فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔

اخبارات پڑھنے والوں کو بھی اس مقدمے سے دلچسپی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مجرم کو قرار واقعی سزا ملے تاکہ دوسرے مجرموں کو عبرت حاصل ہو اور عوام کو یہ اطمینان ہو کہ مجرموں کو واقعی سزا دی جا رہی ہے۔ ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ مجرم روپوش ہو جاتے تھے یا ملک سے فرار ہو جاتے تھے۔ یا پھر پولیس مقابلے میں مارے جاتے تھے۔ لوگوں کو مایوسی ہوتی تھی کہ انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو رہے ہیں۔

جب سے اس دہشت گرد بلال بارود کا مقدمہ جسٹس عظمت اللہ شاہ کی عدالت میں آیا

تھا' لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ شاہ صاحب کسی کے دباؤ میں آئے بغیر درست فیصلہ کریں گے اور انصاف کے تقاضے پورے کریں گے۔

بلال بارود کا پیدائشی نام بلال احمد تھا لیکن چوری' ڈکیتی کی وارداتیں کرتے کرتے وہ تخریب کاروں میں شامل ہو گیا۔ وہاں اس نے تخریب کار اور دہشت گرد کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ بلال بارود کے نام سے منفی شہرت حاصل کرنے لگا۔ مختلف دہشت گرد گروپ اسے بڑی بڑی رقمیں دیتے تھے۔ اس کی پشت پناہی کرتے تھے۔ اسے کبھی پولیس اور فوج کے نرغے میں آنے نہیں دیتے تھے۔ پورے شہر میں بلال بارود کی دہشت طاری تھی اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ وہ کبھی گرفتار نہیں ہو گا۔

لیکن دنیا کا ہر فرد اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ بلال بارود بھی پولیس کے نرغے میں آ گیا۔ پہلے تو اس کی شناخت مشکل ہوئی' کیونکہ پولیس ریکارڈ میں اس کا حلیہ تھا' تصویر نہیں تھی۔

ایسے جیالے فوٹو گرافرز بھی ہوتے ہیں' جو گولیوں کی بوچھاڑ اور بموں کے دھماکوں سے گزرتے ہوئے تصاویر اتارتے ہیں۔ ایسے ہی فوٹو گرافروں نے مختلف وارداتوں کے دوران میں بلال بارود کی تصاویر اتاری تھیں۔

پھر اس کے چند خاص ساتھی جو پہلے گرفتار ہوئے' انہوں نے گواہی دی کہ وہی بلال بارود ہے۔ جب مقدمہ عدالت میں پہنچا تو خفیہ طور سے اس کی رہائی کی کوششیں کی جانے لگیں پھر دھمکیاں دی جانے لگیں کہ مقدمے کو کمزور بنا کر بلال بارود کو معمولی سزا دی جائے۔ اگر سزائے موت دی گئی تو اس کے نتائج برے نکلیں گے۔

ایسی دھمکیاں دینے والا اس کا ایک دہشت گرد ساتھی تھا۔ اس کا نام کچھ اور ہو گا لیکن وہ ناموں دادا کے نام سے منفی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ دہشت گردوں کی فہرست میں بلال بارود کے بعد ناموں دادا کا نام آتا تھا۔

جب سے بلال بارود کے مقدمے کی آخری تاریخ دی گئی تھی اور آخری فیصلہ سنانا طے پایا تھا' تب سے ناموں دادا فون کے ذریعے جسٹس عظمت اللہ شاہ کو کبھی سمجھوتے کے لئے کہہ رہا تھا اور کبھی دھمکیاں دے رہا تھا۔ آخر اس نے اپنی ایک دھمکی پر عمل کیا اور سنی کو اسکول سے اٹھوا لیا۔

شاہ صاحب ابھی پوتے کے اغوا سے بے خبر تھے۔ وہ عدالت کے کمرے میں آ گئے تھے۔ بلال بارود ملزموں کے کٹہرے میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے کھڑا تھا۔ عدالتی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ سرکاری وکیل کہہ رہا تھا۔ "جناب عالی! یہ مقدمہ آئینے کی طرح

صاف ہے۔ اس آئینے میں قاتل اور دہشت گرد بلال بارود کا مکروہ اور خطرناک ...
صاف نظر آ رہا ہے۔ اس دہشت گرد کی طرف سے صفائی پیش کرنے والے وکیل ...
کمزور دلائل اور جھوٹے گواہوں کی بیساکھی کے سہارے اس عدالت میں چل نہ ...
آج وہ عدالت میں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ انہوں نے بیماری کا بہانہ کیا ہے تاکہ ...
فیصلے کا دن ان کی غیر حاضری سے ٹل جائے اور آپ آخری فیصلہ کرنے کے لیے
دوسری تاریخ دینے پر مجبور ہو جائیں۔

"میں جناب عالی سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ تاریخ نہ بڑھائی جائے۔ جب
تاریخ بڑھائی جاتی ہے' ملزموں کو چھوٹ ملتی ہے۔ انہیں اپنے بچاؤ کے مواقع مل ...
ہیں۔"

جسٹس شاہ نے کہا۔ "ملزم بلال بارود پر کئی قتل اور دہشت گردی کے الز...
درست ثابت ہو چکے ہیں۔ ملزم بلال بارود کے خلاف جتنے ٹھوس ثبوت اور گواہ ہیں
کے پیشِ نظر آج آخری فیصلہ سنایا جا سکتا ہے لیکن.........."

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر حاضرینِ عدالت کو دیکھا پھر کہا۔ "آخری ...
سنانے سے پہلی لازمی ہے کہ وکیلِ صفائی کو آخری بار صفائی کا موقع دیا جائے لیکن وہ
نہیں ہیں۔ ہمارے ملک کے معروف ڈاکٹر کی میڈیکل رپورٹ کے مطابق وکیل ...
سخت بیمار ہیں اور بیماری کے باعث عدالت میں حاضر ہونے سے معذور ہیں۔

"ایک معروف ڈاکٹر کی میڈیکل رپورٹ کو قانوناً تسلیم کرنا چاہیے۔ وکیل صفائی کی
درخواست ہے کہ ان کی بیماری کے پیشِ نظر مقدمے کی تاریخ بڑھائی جائے۔ ان ...
میں یہ لازمی ہو گیا ہے کہ.........."

ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ پیش کار نے ان کے پاس آ کر ایک چھوٹی سی ...
دی۔ انہوں نے اس پرچی کو لیا پھر اسے کھول کر پڑھا۔ ان کے دل پر ایک گھونسا ...
وہ چند ساعت کے لیے گم صم سے رہے۔ عدالت میں گہری خاموشی چھا گئی تھی
انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں اس فیصلے پر پہنچا ...
کہ وکیل صفائی کی بیماری اور میڈیکل رپورٹ کے پیشِ نظر فیصلہ ملتوی کیا جائے
مقدمے کی تاریخ بڑھائی جائے لیکن.........."

انہوں نے پھر بات ادھوری چھوڑ کر حاضرینِ عدالت کو دیکھا۔ اس کے بعد ...
ہاتھ اٹھا کر اس پرچی کو دکھا کر کہا۔ "ابھی مجھے یہ پرچی ملی ہے۔ اس پرچی نے مجھے

ہے۔ مجھے یہ طے کرنا ہے کہ مقدمے کی تاریخ بڑھا دی جائے یا آج ہی آخری فیصلہ سنا دیا
جائے۔

"میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے عدالتی کارروائی عارضی طور پر ملتوی کر رہا
ہوں۔ نماز کے وقفے کے بعد ٹھیک تین بجے دوبارہ عدالتی کارروائی کا آغاز ہو گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حاضرینِ عدالت بھی احتراماً کھڑے ہوئے۔ وہ
عدالتی کمرے سے چلتے ہوئے ملحقہ چیمبر میں آ گئے۔ وہاں کمشنر اور انسپکٹر جنرل آف پولیس
موجود تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب کو سلام کیا پھر کمشنر نے کہا "مجھے افسوس ہے' میں نے
آپ کی عدالتی کارروائی میں مداخلت کی۔"

آئی جی نے کہا "ہم نے سوچا' اس سے پہلے کہ آپ فیصلہ سنائیں' آپ کو سنی کے
اغوا سے آگاہ کر دیا جائے۔"

"آپ نے اچھا کیا۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں اپنی کرسی پر بیٹھ کر بولے "آپ
لوگ تشریف رکھیں۔"

وہ سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمشنر نے کہا "میں نے جگہ جگہ ناکابندی کر دی ہے۔
ہر قسم کی مشکوک گاڑی اور خاص طور پر پجیرو کو چیک کیا جا رہا ہے۔"

آئی جی نے کہا "اسکول کی میڈم نے پجیرو کی نمبر پلیٹ پڑھی تھی۔ اس نمبر کی
پجیرو کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ ہم جلدی اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

چار برس کا معصوم پوتا شاہ صاحب کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ دھڑکنوں کی طرح وہ
پوتا دل میں تڑپ رہا تھا۔ وہ تنہائی چاہتے تھے۔ تنہائی میں بظاہر چپ رہ کر اپنے اندر رونا
چاہتے تھے لیکن کمشنر اور آئی جی سے ملاقات جاری رکھنا اور پوتے کی بازیابی کے لیے ان
کی جدوجہد کو سمجھنا ضروری تھا۔ انہوں نے پوچھا "کیا ناموں دادا کی فون کالز ٹیپ کی
جا رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔ ٹیپ کی جا رہی ہیں۔ ایکسچینج میں ہم نے اپنا ایک سیل بٹھایا ہے۔ وہ جلد
ہی اس فون کا نمبر اور وہ جگہ معلوم کر لیں گے' جہاں سے دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔"

کمشنر نے کہا "آپ سے ایک درخواست ہے۔"

شاہ صاحب نے پوچھا فرمائیے؟"

"آج کی عدالتی کارروائی ملتوی کر دیں۔ فیصلے کی تاریخ بڑھا دیں۔"

آئی جی نے کہا "ہم نے اس لیے وہ پرچی بھیج دی تھی کہ آپ آخری فیصلہ نہ
سنائیں۔ جب تک آخری فیصلہ نہیں سنائیں گے تب تک پوتا سلامت رہے گا۔ وہ ظالم

اس وقت تک سنی بابا کو نقصان نہیں پہنچائیں گے جب تک بلال بارود سزائے موت سے محفوظ رہے گا۔"

کمشنر نے کہا "آج نہیں تو کل آپ کے پوتے کو ٹریس کر لیا جائے گا۔ اسے آپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ ان کے دباؤ میں نہیں رہیں گے۔"

"میرے پوتے کی بازیابی میں ایک دن بھی لگ سکتا ہے' ایک ہفتہ اور ایک ماہ بھی۔ مجرم یہی چاہتے ہیں کہ انہیں ڈھیل ملے اور وہ بچاؤ کی تدبیر کر لیں۔ کیا آپ یہی چاہتے ہیں؟"

"ہم سنی بابا کی واپسی کے لیے تھوڑی مہلت چاہتے ہیں۔"

"پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ میرے پوتے کی بازیابی میں ہفتے اور مہینے لگ سکتے ہیں۔ کیا میں تاریخیں بڑھا کر قانون اور انصاف کو مذاق بناتا رہوں؟"

"یہ سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ آپ اپنے اصولوں کے سختی سے پابند ہیں لیکن آپ ہمیں مجرموں کی سرکوبی اور بچے کی واپسی کے لیے کچھ وقت دیں۔"

شاہ صاحب نے کہا "گھڑی دیکھیں۔ ایک بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ تین بجے دوبارہ عدالت لگے گی۔ آپ کے پاس تین بجے تک موقع ہے۔ آپ میرے پوتے کو لے آئیں ورنہ مجھے آپ حضرات سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنے فرائض تندہی سے انجام دے رہے ہیں۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے "مجھے اجازت دیں۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے ریسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو؟" دوسری طرف سے بیگم کی آواز آئی۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھیں "کہاں ہے میرا بچہ؟ آپ اس کی بازیابی کے لیے کیا کر رہے ہیں؟"

"کمشنر صاحب اور آئی جی صاحب سب ہی اپنے طور پر پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

میں پوچھتی ہوں' آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟ تم کیا کر سکتی ہو؟ ہم تو پولیس اور انتظامیہ پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں؟"

"پولیس کچھ نہیں کرے گی۔ صرف آپ میرے بچے کو زندہ سلامت گھر لا سکتے ہیں۔"

"میں کیسے لا سکتا ہوں؟"

"ابھی اس کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ اپنے فیصلے میں لچک پیدا کریں گے' کسی کو سزائے موت نہیں دیں گے بلکہ چند برسوں کی قید کی سزا سنا دیں گے تو سنی کو خیریت سے گھر پہنچا دیا جائے گا۔"

"بیگم گھر میں جذباتی رشتے ہوتے ہیں' عدالت میں نہیں۔ میرے فرائض کی ادائیگی میں مداخلت کرو گی تو میں تم سے بات نہیں کروں گا۔"

انہوں نے فون بند کر دیا پھر وہاں سے پلٹ کر چیمبر سے باہر ایک ملحقہ مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ کمشنر نے آئی جی سے کہا۔

"شاہ صاحب پتھر ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کے خلاف ہماری کوئی بات نہیں مانیں گے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

موبائل فون سے اشارہ موصول ہوا۔ آئی جی نے اسے آن کر کے کہا "ہیلو! میں بول رہا ہوں۔"

"سر! ہم نے ایک شخص کو گرفتار کیا ہے۔ اسے ٹارچر سیل میں لے آئے ہیں۔ وہ تھرڈ ڈگری کی اذیتوں سے پہلے ہی اگل رہا ہے کہ وہ ناموں دادا کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک ایسے اڈے کا پتہ بتا رہا ہے' جہاں ہم چھاپا مار کر شاید اس بچے کو حاصل کر سکتے ہیں۔"

"پولیس کی نفری تیار رکھو۔ اس اڈے کو چاروں طرف سے گھیرا جائے گا۔ میں آ رہا ہوں۔"

اس نے موبائل فون بند کیا۔ کمشنر نے پوچھا "کوئی سراغ مل گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ ایک جگہ ریڈ کرنے جا رہا ہوں۔ امید ہے' شاہ صاحب کا پوتا مل جائے گا۔ میں آپ سے فون پر رابطہ کروں گا۔"

آئی جی چلا گیا۔ کمشنر نے اپنے موبائل کے ذریعے رابطہ کیا۔ پھر پوچھا "کیا رپورٹ ہے؟"

دوسری طرف سے تفصیلی رپورٹ پیش کی جانے لگی۔ کمشنر نے سننے کے بعد پوچھا "اس پجیرو کا کوئی سراغ ملا؟"

"نو سر! ہم کوشش کر رہے ہیں۔ نیشنل ہائی وے' سپر ہائی وے اور حب کی چوکیوں سے پتہ چلا ہے کہ پچھلے دو گھنٹوں سے کوئی پجیرو ان راستوں سے نہیں گزری ہے۔ ہمیں یقین ہے' وہ پجیرو اسی شہر میں ہے۔ اسے کہیں چھپا دیا گیا ہے۔ ہم تمام گیراج وغیرہ کھول کر دیکھ رہے ہیں۔"

"کوشش کرتے رہو۔ پجیرو ملے گی تو بچہ بھی ضرور ملے گا۔" اس نے رابطہ ختم کر دیا۔

☆=========☆=========☆

گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ قریبی رشتے دار آ گئے تھے۔ خواتین بیگم شاہ اور ان کی بہو کو تسلیاں دے رہی تھیں کہ اللہ نے چاہا تو سنی واپس آ جائے گا۔

بیگم رو رہی تھیں اور جل بھن کر کہہ رہی تھیں "اللہ تو چاہتا ہے' بندہ نہیں چاہتا۔ مجھے تسلیاں نہ دو۔ شاہ صاحب کو سمجھاؤ کہ وہ اصولوں' قانون اور انصاف کو بھول جائیں۔ ان جان کے دشمنوں کی بات مان لیں مگر میں جانتی ہوں' وہ نہیں مانیں گے۔ ہائے میں کیا کروں؟"

ایک قریبی رشتے دار خاتون نے کہا "صبر کریں۔ شاہ صاحب اوپر سے سخت ہیں مگر اندر سے موم ہیں۔ آپ جانتی ہیں' وہ سنی کو جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ اس کی سلامتی کے لیے ضرور کچھ کریں گے۔"

"وہ کیا کریں گے؟ کچھ نہیں کریں گے۔ وہ پوتے کی جان لے کر اپنی جان دے دیں گے لیکن انصاف کے وقت کسی سے رعایت نہیں کریں گے۔"

ایک اور رشتے دار نے کہا "ہم سب ہائی کورٹ چلتے ہیں۔ شاہ صاحب سے چیمبر میں مل کر انہیں سمجھائیں گے۔"

"کیسے سمجھاؤ گے؟ آج وہ کسی رشتے دار کو چیمبر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ مجھ سے ملنے سے بھی انکار کر دیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' وہ کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں؟ قاتل کو سزائے موت دینے سے پہلے ہماری جان سولی پر لٹکا رکھی ہے۔"

کوٹھی کے باہر ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ شاہ صاحب کا بیٹا جنید اسلام آباد سے آیا تھا۔ ایک رشتے دار نے اسے دیکھا پھر اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ جنید نے حیرانی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہے ہیں؟"

وہ روتے ہوئے بولا "ہائے بیٹا! کیا بتاؤں؟ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

وہ جھنجلا کر بولا "کچھ بتائیں تو سہی۔"

"تمہارا بیٹا اور ہمارا لاڈلا سنی مصیبت میں ہے۔ دہشت گردوں نے اسے اغوا کر لیا ہے۔"

"او گاڈ! سنی کو اغوا کیا گیا ہے؟ کیوں؟"

"وہ بدمعاش کہتے ہیں' تمہارے ڈیڈی ایک قاتل کو قتل کے الزام سے بری کر دیں ے تو سنی کو گھر پہنچا دیا جائے گا ورنہ وہ سنی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"کیا ڈیڈی ہائی کورٹ میں ہیں؟"

"ہاں۔ آج ایک اہم فیصلہ سنانے والے ہیں۔"

وہ چلتا ہوا کوٹھی کے اندر آیا۔ شازیہ شوہر کو دیکھتے ہی تیزی سے آ کر لپٹ گئی ہائے! ہم لٹ گئے ہیں۔ ہمارا سنی اغوا ہو گیا ہے۔ پتا نہیں' وہ ظالم اس کے ساتھ کیسا لوک کر رہے ہوں گے۔ ڈیڈی ان قاتلوں بدمعاشوں کی بات مان لیں تو وہ ہمارے سنی کو نصان نہیں پہنچائیں گے۔ اسے واپس کر دیں گے۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خود کو سنبھالے یا اپنی بے حال بیوی کو دلاسا دے۔

"آپ لوگ حوصلہ کریں۔ رونے اور فریاد کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔"

ماں بولی "بیٹے! وہ دہشت گرد دو بار مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ تمہارے ڈیڈی اپنے لے میں لچک پیدا نہیں کر رہے ہیں۔ میں انہیں کیسے سمجھاؤں۔ میں نے فون پر انہیں جھانا چاہا لیکن وہ میری بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔ تم ہی کچھ کرو بیٹا! انہیں کسی طرح اس تل کے خلاف فیصلہ کرنے سے روکو۔ سنی کو بچاؤ۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ آنسو پونچھ لیں۔ میں ڈیڈی کے پاس جا رہا ہوں۔ انہیں اس د تک سمجھوتے پر آمادہ کروں گا کہ ہمارا سنی واپس آ جائے۔"

وہ ماں کو تسلیاں دے کر کوٹھی کے باہر آیا پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہائی کورٹ کی رف جانے لگا۔ وہ اپنے والد کی اصول پسندی کو خوب سمجھتا تھا اور یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ آج بھی ڈیڈی اپنے اصولوں پر سختی سے قائم رہیں گے تو سنی کا کیا بنے گا؟

وہ چیمبر میں آیا تو معلوم ہوا شاہ صاحب ملحقہ مسجد میں گئے ہیں۔ وہ مسجد کے روازے پر آیا۔ جوتے اتار کر اندر آ کر نمازیوں کو دور تک دیکھا۔ شاہ صاحب ایک صف ے آخر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جنید نے ان کے پاس آ کر کہا۔

"ڈیڈ! السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام بیٹے! اسلام آباد سے کب آئے؟"

"ابھی آ رہا ہوں۔ پہلے گھر گیا تھا۔ وہاں سب رو رو کر اپنا برا حال کر رہے ہیں۔ میں ی کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم نے وضو کیا ہے یا ایسے ہی چلے آئے ہو؟"

"میں ابھی وضو کروں گا۔ آپ پہلے میری بات سن لیں۔"

"پہلے وضو کرو۔ ہماری باتوں کے دوران میں کسی وقت بھی جماعت شروع ہو جا
ئے گی۔ اس وقت جلدی جلدی وضو کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

وہ مجبور ہو کر وضو کرنے گیا پھر چند منٹ میں واپس آکر شاہ صاحب کے پاس بیٹھ
پھر بولا "ڈیڈ! ہم مسجد میں ہیں۔ میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دے
کر التجا کرتا ہوں' سنی کو بچالیں۔"

"مسجد میں اس ایمان کے ساتھ آنا چاہیے کہ مارنے اور بچانے والا صرف اللہ تعالیٰ
ہے۔"

"لیکن کسی کو بچانے کے لیے بندے کی اپنی کوششیں بھی ہوتی ہیں۔"

"بندے کی کوششوں کو قانون اور انصاف کے مطابق ہونا چاہیے۔"

"میں آپ کے فرائض کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا اور نہ آپ مجھے بننے دیں
گے۔ صرف ایک التجا ہے' آج فیصلہ نہ کریں۔ تاریخ بڑھا دیں۔"

"تاریخ بڑھانے سے پہلے انہوں نے سنی کو اغوا کیا۔ قاتل کی رہائی کی خاطر مجھ پر
مزید دباؤ ڈالنے کے لیے اور مجھے بہت زیادہ مجبور کرنے کے لیے تمہیں بھی اغوا کریں
گے۔ تمہاری بیوی شازیہ کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ مجرموں کو جتنی ڈھیل ملے گی
اتنا ہی بہنوں' بھائیوں' بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے عذاب بن جائیں گے اور پتا نہیں شہر کے
کتنے بچوں کو اغوا کریں گے اور ان کے والدین کو ذہنی اذیتیں پہنچائیں گے۔ مجرم کی زندگی
جتنی لمبی ہوتی ہے' عذاب اتنے ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ کیا میں اسے لمبی زندگی دینے کے
لیے تاریخ آگے بڑھا دوں؟"

"ایک بار تاریخ بڑھانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"ذرا عقل سے سوچو۔ وہ مجرم اگلی پیشی تک سنی کو یرغمال بنا کر ہمیں دن رات
عذاب میں مبتلا رکھیں گے۔ سنی کی رہائی اسی وقت ممکن ہے' جب میں قاتل کو رہا
کردوں۔ مسجد میں بیٹھ کر ایمان سے کہو' قاتل کو رہا کردوں؟"

"آپ قاتل کو سزا دیں مگر سزائے موت نہ دیں۔"

"میں تمہاری اس خواہش پر غور کروں گا۔ اب اس موضوع پر نہ بولو۔ فرض سے
پہلے سنت پڑھ لو۔"

جنید نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

☆========☆========☆

شہر کے ایک بڑے میڈیکل اسٹور کا شٹر اوپر سے آدھا بند تھا۔ آدھا نیچے سے کھلا

ہوا تھا۔ آئی جی کو اسی اسٹور کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہ دہشت گردوں کا اڈا ہے اور
وہاں ناموں دادا اکثر جاتا ہے۔

جس شخص کو گرفتار کرکے ٹارچر سیل میں لے جایا گیا تھا' اس نے بتایا تھا کہ وہ ناموں
دادا کے لیے کام کرتا ہے اور اس نے ناموں دادا کو کئی بار اس میڈیکل اسٹور میں جاتے
اور وہاں گھنٹوں وقت گزارتے دیکھا تھا۔ وہ گرفتار ہونے والا شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ
ناموں دادا وہاں کن مصروفیات میں وقت گزارتا تھا کیونکہ میڈیکل اسٹور کے اندرونی حصے
میں تنہا جایا کرتا تھا۔

آئی جی نے حکم دیا تھا کہ اے ایس پی کی کمانڈ میں اس میڈیکل اسٹور کا محاصرہ کیا
جائے۔ ایسا کرنے میں دیر نہیں کی گئی۔ میڈیکل اسٹور کے آگے پیچھے اور آس پاس کی
مکانوں میں مسلح سپاہیوں نے پہنچ کر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ پھر اے ایس پی نے میگا فون
کے ذریعے کہا "میڈیکل اسٹور کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ اندر جو لوگ ہیں
انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ دکان کا شٹر پوری طرح اٹھائیں پھر اپنے ہاتھ اٹھا کر باہر آجائیں۔"

بازار میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ سہم کر وہاں سے دور جانے لگے۔ آس
پاس کی دکانیں بند ہونے لگیں۔ اس میڈیکل اسٹور کا شٹر پوری طرح اوپر اٹھ گیا۔ اندر
سے چار افراد اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے باہر آئے۔ ان چاروں میں سے ایک عذرا کا شوہر'
بچوں کا باپ نسیم احمد تھا۔

پہلے نسیم احمد کے بال شانوں تک بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے پچھلی شام بال کٹوا کر
چھوٹے کرالیے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں بھی چھوٹی کرالی تھیں اور آنکھوں پر زیرو پاور
کی عینک لگالی تھی۔ اس طرح اب وہ انگریزی ایکشن فلموں کا ہیرو اور پاکستانی فلموں کا ولن
نہیں لگ رہا تھا۔ صحیح معنوں میں دواؤں کی کمپنی کا ریپریزنٹیٹو دکھائی دے رہا تھا۔

اے ایس پی نے پوچھا "اندر اور کون ہے؟"

"کوئی نہیں ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"میں دکان کا مالک ہوں۔ یہ ایک سیلز ریپریزنٹیٹو نسیم احمد ہیں اور یہ دونوں سیلز مین
ہیں۔"

افسر نے ایک سپاہی کو پہلے اندر بھیجا۔ وہ تھوڑی دیر بعد باہر آکر بولا "کوئی نہیں
ہے۔ دکان کے اگلے پچھلے حصے خالی ہیں۔"

افسر اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ اندر آیا۔ دکان کا مالک اور نسیم احمد بھی ساتھ تھے۔

سپاہی دکان کے ہر حصے کی تلاشی لینے لگے۔ دکان دار نے پوچھا۔ "جناب! ہمیں بھی بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں؟"

افسر نے کہا "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں اسلحہ چھپا کر رکھا جاتا ہے اور یہاں نامور دادا اکثر آتا ہے۔"

"آپ کو غلط اطلاع دی گئی ہے۔ ویسے آپ تسلی کر لیں۔ ہمارے ہاتھ صاف ہیں۔"

واقعی ان کے ہاتھ صاف نکلے۔ اچھی طرح تلاشی لینے کے باوجود ایک بھی ہتھیار برآمد نہ ہوا۔ افسر نے کہا "قانون کا ساتھ دو اور سچ کہو' ناموں دادا یہاں آتا ہے؟"

دکان دار نے کہا "ہم نے اس کا نام اخباروں میں پڑھا ہے۔ کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ اگر وہ کسی ضرورت کے تحت یہاں آیا ہو گا تو ہم اسے صورت سے پہچانتے نہیں ہیں اس لیے کہہ نہیں سکتے کہ ناموں دادا یہاں آچکا ہے۔"

اے ایس پی موبائل فون کے ذریعے آئی جی کو بتانے لگا کہ انہیں غلط معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ یہاں ایک بھی ہتھیار یا دوسری کوئی غیر قانونی چیز نہیں ہے۔ دکان والے ناموں دادا کو صورت سے نہیں پہچانتے ہیں۔ ہزاروں گاہکوں کے درمیان وہ آتا جاتا ہو گا۔ اس کی کوئی تصویر اور کوئی شناخت نہیں ہے۔

نسیم احمد نے اے ایس پی سے کہا "جناب! میں دواؤں کے سیمپلز لے کر ان کے آرڈرز بک کرنے جارہا ہوں۔ کیا مجھے جانے کی اجازت ہے۔ ویسے آپ جب بھی حکم دیں گے' آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"تم کیا جاؤ گے' ہم جا رہے ہیں۔ خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع ہوا ہے۔"

وہ سپاہیوں کے ساتھ چلا گیا۔ جب ان کی گاڑیاں دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو نسیم احمد اور دکان دار پچھلے دروازے سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ دکان دار نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "ناموں! تم بال بال بچ گئے۔ رمزی گرفتار ہونے کے بعد تمہارا حلیہ بتایا ہو گا۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ شریف آدمیوں کے حلیے میں آگئے۔"

"میں بہت محتاط رہتا ہوں۔ رمزی جیسے لوگوں سے کبھی کبھی کام لیتا ہوں اس لیے عارضی آلۂ کاروں کو اپنا اصلی نام نہیں بتاتا اور کوئی یہ نہیں سوچ سکتا کہ نسیم ہی ناموں دادا ہے۔"

"اب کہاں پہنچاؤں؟"

"گیراج تک پہنچا دو۔ وہاں سے میں اپنی جیپ لے جاؤں گا۔"

"ضلع وسطی کی کوئی خبر ہے؟"

"سنا ہے' بلال بارود کے آدمیوں نے کسی اسکول سے جسٹس شاہ کے پوتے کو اٹھالیا ہے۔ وہ عدالتی فیصلے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ شاید اس جج کو فیصلہ بدلنے پر مجبور"

"میرا بھی یہی خیال ہے' بلال بارود کو سزائے موت نہیں ہو گی۔ وہ معمولی سزا پا کر دو برس میں رہا ہو جائے گا۔"

نسیم احمد نے کہا "بلال کی کیا بات ہے۔ میرا استاد ہے۔ میرا یہ موجودہ نام ناموں دادا اسی نے رکھا تھا۔ مجھے ڈیڑھ برس کے عرصے میں ایسی ٹریننگ دی کہ میں ضلع شرقی میں خطرناک دہشت گرد کی حیثیت سے شہرت پا چکا ہوں۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ سوچنے لگا' ڈیڑھ برس پہلے وہ کیا تھا؟ ایک محدود تنخواہ پانے والا جو اپنے بچے کے لیے ایک اچھا سا مہنگا کھلونا نہیں خرید سکتا تھا۔ آج پپو کے کمرے میں کھلونے بھرے رہتے ہیں۔ وہ تڑاتڑ آواز کرنے والی کلاشنکوف سے کھیلتا ہے۔ ماحول اور معاشرہ ہوتا ہے' بچے ویسے ہی کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ پپو کے پاس کھلونا کلاشنکوف تھی اور اس کے باپ کے پاس اصلی۔

☆=========☆=========☆

ایک بج گیا پھر ڈیڑھ بج گئے مگر پپو نہیں آیا۔ عذرا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ پھر دکان میں آئی' جہاں فون تھا۔ اس نے پھر اسکول کی میڈم کے نمبر ڈائل کیے۔ جب ... اور بے چینی ہوتی ہے تو کبھی کام جلدی نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی وجہ سے دیر ہونے لگتی ہے۔ وہ نمبر ڈائل کر رہی تھی اور بار بار انگیجڈ کی ٹون سنائی دے رہی تھی۔

وقفے وقفے سے ڈائلنگ کرتے رہنے کے بعد آخر رابطہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ گھڑی میں پونے دو ہونے والے ہیں اور میرا بچہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔"

"آپ کون ہیں اور کس بچے کی بات کر رہی ہیں؟"

"میرا نام عذرا ہے۔ میرے بیٹے کا نام کلیم احمد ہے۔ ہم پپو کہتے ہیں۔"

"اچھا سمجھ گئی۔ آپ نے پہلے بھی فون کیا تھا۔ میں نے آپ سے کہا تھا دیدار دوسرے بچوں کے ساتھ اسے لے گیا ہے اور پپو اپنا بیگ یہاں چھوڑ گیا ہے۔"

"مگر کہاں ہے میرا بیٹا؟ دیدار اسے کیوں نہیں لا رہا ہے؟"

"بی بی! صبر کریں۔ دیر سویر ہو جاتی ہے۔ آپ کو پتا ہے شہر کے حالات ٹھیک
ہیں۔ بچے لے جانے والے ڈرائیوروں کو کئی علاقوں سے بچ بچا کر نکلنے میں دیر ہو
ہے۔"

"کیا آپ جانتی ہیں' دیدار کہاں رہتا ہے؟"

"ہاں۔ ہمارے پاس تمام ڈرائیوروں کے نام اور پتے لکھے ہوتے ہیں۔ آپ
پتا لے کر کیا کریں گی؟"

"میں اس کے گھر جا کر معلوم کروں گی کہ وہ میرے بیٹے کو کیوں نہیں لا رہا ہے"

"میرا مشورہ ہے' آپ اور کچھ دیر انتظار کر لیں۔ دیدار بہت ہی ذمے دار
ہے۔ وہ آپ کے بیٹے کو لا رہا ہو گا۔"

"آپ کہتی ہیں تو میں اور انتظار کر لیتی ہوں۔ وہ پھر بھی نہ آیا تو اس کے گھر
گی۔ پلیز آپ بتا دیں۔"

دوسری طرف سے میڈم نے ایک رجسٹر کھول کر دیدار کا پتا دیکھا پھر عذرا کو
کرا دیا۔ وہ پتا لکھ کر ریسیور رکھ کر اپنے مکان میں آئی۔ اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔
نے تھکا دیا تھا۔ اس نے الماری سے کچھ رقم نکالی۔ اسے گریبان میں چھپا لیا۔ حالات
تھے کہ خواتین پرس لے جاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ موٹر سائیکلوں پر سے فائرنگ
ہوئے گزرنے والے پرس بھی چھین کر لے جاتے تھے۔

اس نے پڑوسیوں اور محلے کی خواتین سے کہا۔ "میں سوزوکی ڈرائیور کے
رہی ہوں۔ اگر وہ ڈرائیور میرے پپو کو لے آئے تو اسے نیم کے سائے میں بٹھا لینا۔
جائے تو اسے گھر میں لے جانا۔ میں ابھی آ جاؤں گی۔"

خواتین نے اسے تسلی دی کہ وہ پپو کی فکر نہ کرے۔ وہ آئے گا تو اسے اپنے
کی طرح رکھا جائے گا۔ عذرا مطمئن ہو کر وہاں سے بس اسٹاپ پر آئی۔ وہاں ایک
کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "پرانی نمائش چلو۔"

رکشا شور مچاتا ہوا چل پڑا۔ تیز رفتاری سے چلتے وقت جھٹکے کھانے لگا۔ عذرا
جھٹکے لگ رہے تھے لیکن وہ بیٹے تک پہنچنے کی دھن میں تکلیف کو بھولی ہوئی تھی۔
کے جھٹکے کھاتی جا رہی تھی۔

رکشا قائداعظم کے مزار کے سامنے سے گزرتا ہوا پرانی نمائش کی ایک گلی
سامنے رک گیا۔ آگے راستہ بند تھا۔ اس علاقے کی ناکہ بندی کی گئی تھی۔ رینجرز
گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کسی کو اس محلے میں جانے کی اجازت نہیں تھی اور محلے

نکلنے کی پابندیاں لگائی گئی تھیں۔

نجرز کے جوانوں نے رکشا کو روک دیا۔ عذرا نے رکشا سے اتر کر کہا۔ "میں
ن سوزوکی ڈرائیور کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے جانے دیں۔"

سی کو آگے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں گھر گھر تلاشی لی جا رہی ہے۔ دو چار
آؤ۔ مطلوبہ دہشت گرد گرفتار ہو جائیں گے تو راستہ کھل جائے گا۔"

آپ دہشت گردوں کو تلاش کر رہے ہیں اور میں اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے آئی
رائیور اسے اسکول سے لے کر آیا ہے لیکن اس نے اسے گھر نہیں پہنچایا ہے۔"

تو ہم کیا کریں؟"

مجھے جانے دیں۔ شاید میرا بیٹا اس کے گھر میں ہو۔"

تمہارا بیٹا اس ڈرائیور کے گھر میں ہے تو پھر محفوظ ہو گا۔ انتظار کرو۔ جب ناکا
ہو گی تو پھر بیٹے کے پاس چلی جانا۔"

آپ ایک ماں کی ممتا اور بے قراری کو کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں۔"

ہاری ڈیوٹی میں ماں کو نہیں مجرموں کو سمجھا جاتا ہے۔"

ن وقت عذرا رینجرز والوں کے سامنے گڑگڑا رہی تھی اس وقت دیدار حسین
ہیں تھا۔ اس کے ساتھ وہ بچہ بھی تھا اور گھر کے سامنے اس کی سوزوکی کھڑی ہوئی
کہہ رہی تھی۔ "میں کب تک بچے کو سنبھالوں؟ پتا نہیں' کب راستہ کھلے گا اور
معصوم کو اس کے گھر پہنچاؤ گے؟"

ال! تمام بچوں کو پہنچا دیا ہے۔ اسے بھی پہنچا دیتا مگر یہاں سے گزرتے وقت یاد آیا
رانی عینک گھر میں ہے۔ نئی عینک بننے تک اس سے میرا کام چلے گا۔"

پہلے اس بچے کو گھر پہنچا کر آتا تو بہتر ہوتا۔"

یا بتاؤں ماں! آنکھیں سکیڑ کر صحیح طرح دیکھنے کی کوشش کرتے کرتے آنکھیں
تھیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ عینک لینے آؤں گا تو رینجرز والے آ جائیں گے اور
کر دیں گے۔"

نجرز کے جوان ڈیوٹی کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ اگر کوئی پرندہ بھی اڑ کر اس
جاتا اور اس پر شبہ ہوتا کہ وہ ایک دہشت گرد پرندہ ہے تو وہ اسے بھی گولی مار
ذرا کہہ رہی تھی۔ "ماں دہشت گرد نہیں ہوتی۔ میں تنہا جاؤں گی تو کسی کو
ں پہنچاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے یہاں جانے دو۔"

تنی دیر سے کیوں دماغ کھا رہی ہو؟ کیا گولی کھانا چاہتی ہو؟ جاؤ یہاں سے۔"

اس کی غراہٹ دیکھ کر وہ سہم گئی۔ ذرا پیچھے چلی گئی۔ سوچنے لگی' کیا کر
نہیں' کب راستہ کھلے گا اور کب وہ دیدار کے گھر جا کر بیٹے کا دیدار کر سکے گی؟

پھر یہ بھی یقین نہیں تھا کہ دیدار اپنے گھر میں ہو گا۔ یہ بھی خیال تھا کہ
اب تک گھر پہنچا چکا ہو گا۔ اب وہ اپنے گھر جائے یا راستہ کھلنے کا انتظار کرے؟

پھر اس نے سوچا۔ اتنی دور آہی گئی ہے تو اسکول تک بھی ہو آئے۔ وہاں سے
کا بیگ بھی لے لے گی۔ رکشا والے نے پوچھا۔ "آپ واپس جائیں گی یا کرایہ دیں

وہ رکشا میں بیٹھ گئی۔ اسے اسکول کی طرف جانے کو کہا۔ رکشا پھر شور مچاتے
تیز رفتاری سے جانے لگا۔ اسے بیٹا نہیں مل رہا تھا۔ اس محرومی کے باعث پہلی بار
ہوا کہ رکشا جھٹکے پہنچا رہا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ جھٹکے کھاتی رہی تھی لیکن محبت
کے باعث اس نے محسوس نہیں کیا تھا۔

رکشا اسکول کے آہنی گیٹ کے سامنے رک گیا۔ اس نے ڈرائیور کو کرایہ ادا
احاطے میں آئی۔ بچوں کے بغیر اسکول ویران نظر آرہا تھا۔ میڈم کے کمرے میں ٹی
بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں زخمی صابرہ بھی تھی۔ ایک ٹیچر نے کہا "میڈم! اب ہ
چاہیے۔ میرا گھر بہت دور ہے۔"

میڈم نے کہا "ہمیں یہاں شام تک رہنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے پولیس والے ان
گردوں کو پکڑ کر لے آئیں۔ ہمیں پہچان کر گواہی دینی ہو گی کہ اغوا کرنے والے و
یا دوسرے ہیں؟"

مس صابرہ نے کہا "میں وہ منظر نہیں بھلا پا رہی ہوں کہ وہ ظالم دہشت گ
طرح ہنستے کھیلتے بچے کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہیں اپنی مردانگی پر شرم آنی چاہیے
نے مجھ جیسی کمزور لڑکی پر بھی ہاتھ اٹھایا۔"

"وہ لوگ اسے مردانگی سمجھتے ہیں کہ بچوں کو اغوا کیا جائے اور عورتوں پ
جائے۔ ایسا لگتا ہے' ان ظالموں کی مردانگی کا مقابلہ کرنے والا اور انہیں عبرتناک
تک پہنچانے والا کوئی مرد نہیں رہا ہے۔"

"مرد کے معنی بدل رہے ہیں۔ جو زیادہ سے زیادہ ظلم اور دہشت جاری ر
ہی مرد کہلاتا ہے۔"

میڈم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں عذرا کھڑی ہوئی تھی۔ میڈم
"تشریف لائیں۔"

وہ اندر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی پھر بولی "میرا نام عذرا ہے۔ میں پپو کی ماں

"او۔ آئی۔ سی کیا پپو ابھی تک نہیں پہنچا؟"

"وہ گھر آتا تو میں یہاں نہ آتی۔"

میڈم نے کہا "تعجب ہے۔ دیدار کہاں رہ گیا ہے۔ وہ تو بڑا ذمے دار ڈرائیور ہے۔
ں نے پہلے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔"

"میں اس کے گھر جانا چاہتی تھی لیکن اس علاقے کی ناکابندی کی گئی ہے۔ رینجرز
والوں نے مجھے اس کے گھر تک نہیں جانے دیا۔ پتا نہیں' وہ اپنے گھر میں ہے بھی یا
نہیں؟"

ایک ٹیچر نے کہا "جب آپ کے بیٹے کو پہنچانے کی ذمے داری رہ گئی ہے تو دیدار
اپنے گھر میں نہیں جائے گا۔"

دوسری نے کہا "ہاں بھلا اپنے گھر کیوں جائے گا؟ پہلے تو وہ آپ کے بیٹے کو پہنچائے
گا۔"

میڈم نے کہا "میرا خیال ہے' دیدار نے اب تک اسے آپ کے گھر پہنچا دیا ہو گا۔"

"کیا میں فون کر کے معلوم کر سکتی ہوں؟"

میڈم نے اس کی طرف ٹیلی فون بڑھا دیا۔ عذرا نے اپنے محلے کے اسی گھر میں فون
کیا جہاں سے وہ اب تک میڈم کو فون کرتی رہی تھی۔ اس نے رابطہ ہونے پر کہا "خالہ!
میں عذرا بول رہی ہوں۔ کیا پپو گھر پہنچ گیا ہے؟"

"پتا نہیں۔ تم ہولڈ کرو۔ میں معلوم کرتی ہوں۔"

عذرا کان سے ریسیور لگائے انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد آواز آئی "نہیں۔
تمہارا بیٹا ابھی تک نہیں آیا ہے۔ تم کہاں ہو؟"

"میں اسکول میں ہوں۔ اگر پپو آجائے تو پلیز یہاں فون کر کے مجھے بتا دینا۔ یہاں کا
نمبر نوٹ کرو۔"

اس نے نمبر لکھوا کر ریسیور رکھ دیا۔ ایک ٹیچر نے کہا "پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔ پہلے
یہاں سے ایک بچے کو اغوا کیا گیا۔ اب دوسرے بچے کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ نہ وہ گھر پہنچ
رہا ہے نہ اسکول میں ہے اور نہ ہی دیدار کا کچھ پتا چل رہا ہے۔"

عذرا نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا یہاں سے کسی بچے کو اغوا کیا گیا ہے؟"

"ہاں۔ چار دہشت گرد آئے تھے۔ جسٹس صاحب کے پوتے کو اٹھا کر لے گئے۔"

عذرا نے کہا "اللہ رحم کرے۔ ان ظالموں کو بچوں سے کیا دشمنی ہے۔ بچے کسی کے
گناہوں' معصوم ہوتے ہیں۔ یہ کیسے درندے ہیں کہ معصومیت کو بھی نہیں سمجھتے۔"

میز کے ایک سرے پر پپو کا بیگ رکھا ہوا تھا۔ میڈم نے اسے اٹھا کر عذرا کو د
"اسے لے جائیں۔ انشاء اللہ بیٹا بھی پہنچ جائے گا۔"
عذرا نے بڑے پیار سے بیٹے کے بیگ کو دیکھا پھر اسے دونوں بازوؤں میں لے ک
سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

☆==========☆==========☆

عظمت اللہ شاہ نماز ادا کر کے چیمبر میں آ گئے۔ وہاں کمشنر اور آئی جی موجود تھے۔ جنید بھی بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ صاحب سر جھکائے سوچ میں گم تھے۔ آئی جی نے کہا۔ "ہم ہر ممکن کوششیں کر رہے ہیں۔ وہ بچیبرو شہر کے اندر کہیں چھپا دی گئی ہے۔ وہ آپ کے پوتے کو شہر سے باہر لے جانے میں ناکام رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم بہت جلد سنی بابا کو ڈھونڈ نکالیں گے۔"

کمشنر نے کہا۔ "شاہ صاحب! آپ ہم سے تعاون کریں۔ آج فیصلہ نہ سنائیں۔ تاریخ بڑھا دیں۔"

شاہ صاحب نے کہا۔ "میری عدالت میں یہ مقدمہ تین ماہ سے چل رہا ہے۔ اس عرصے میں مجرم کے حامی مقدمے کو پیچیدہ بناتے رہے اور تاریخیں بڑھاتے رہے۔ وہ لوگ فون پر دھمکیاں دیتے رہے انہیں پولیس تلاش کرتی رہی اور آج تک تلاش کر رہی ہے۔ اب تاریخ بڑھانے سے کیا حاصل ہو گا؟"

"ہمیں سنی بابا کو ڈھونڈنے اور مجرموں کو گرفتار کرنے کا وقت مل جائے گا۔"

"اب تک یہی ہوتا آیا ہے کہ دہشت گرد یا تو فرار ہو جاتے ہیں' یا پھر پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں۔ جب پولیس مقابلہ ہو گا تو کیا وہ میرے پوتے کو زندہ چھوڑ دیں گے؟"

"ہو سکتا ہے' ہم آپ کے پوتے کو زندہ واپس لے آئیں۔"

"ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بہت سی توقعات کے پیشِ نظر مقدمے کو بے طول دینا مناسب نہیں ہے جبکہ ملزم بلال بارود کسی شک و شبہے کے بغیر قاتل اور دہشت گرد ثابت ہو چکا ہے۔ ایسے وقت فیصلہ ملتوی کرنا اور تاریخ بڑھانا انصاف کے منافی ہے۔ یہ قانون سے کھیلنے والی بات ہو گی اور قانون سے کھیلنا میں نے نہیں سیکھا ہے۔"

جنید نے کہا۔ "ڈیڈ! آپ نے کہا تھا کہ فیصلے میں لچک پیدا کریں گے۔"

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹے کو آگے کہنے سے روکا پھر کہا۔ "میں جب عدالت کی کرسی پر بیٹھتا ہوں تو میرے سامنے دو کتابیں ہوتی ہیں۔ ایک قرآن مجید اور

قانون کی کتاب۔ یہ دو کتابیں مجھ سے جو کہتی ہیں' میں وہی عدالت میں کہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ تین بجنے میں چند سیکنڈ رہ گئے تھے۔ عدالتی کارروائی کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ چیمبر کے دروازے سے نکل کر عدالت کے کمرے میں آئے۔ انہیں دیکھتے ہی حاضرینِ عدالت اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کمرا پہلے کی طرح لوگوں سے بھرا تھا۔ وہاں بلال بارود کے حمایتی پُرامن شہریوں کے حلئے میں موجود تھے۔

شاہ صاحب نے انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر حکم دیا کہ بلال بارود کو عدالت میں حاضر کیا جائے۔ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ بلال بارود کو پابہٗ زنجیر لا کر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔

شاہ صاحب نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ "عدالت کی کارروائی میں شروع کرتا ہوں اور میں ہی ختم کروں گا۔ سرکاری وکیل اور وکیلِ صفائی کے کہنے سننے کا وقت گزر چکا ہے۔ البتہ وکیلِ صفائی کو آج آخری بار صفائی کا موقع دینا چاہئے تھا لیکن موصوف غیر حاضر ہیں۔

"میں چاہتا تھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کے پیشِ نظر وکیلِ صفائی کی بیماری اور غیر حاضری کو تسلیم کروں اور اگلی کسی پیشی تک فیصلہ ملتوی کر دوں لیکن ...."

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر حاضرین کو دیکھا پھر کہا۔ "اس سے پہلے کہ میں کارروائی ملتوی کرتا' مجھے ایک پرچی کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ میرے چار برس کے پوتے سنی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔"

کمرے میں سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔ لوگ ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ شاہ صاحب نے کہا۔ "میں یہ بات منظرِ عام پر نہیں لایا کہ پچھلے تین ماہ سے میری جان و مال کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ آج ان دھمکیوں پر عمل شروع ہو گیا ہے۔ میرے معصوم پوتے کو اغوا کر چکے ہیں۔

"ان کا مطالبہ ہے کہ میں بلال بارود کو کم سے کم سزا دوں۔ انہوں نے میرے پوتے کو اغوا کر کے بلال بارود کو ایک سنگدل دہشت گرد ثابت کر دیا ہے۔

"آج جو سزا میں بلال بارود کو سناؤں گا' وہی سزا وہ میرے پوتے کو دیں گے۔ جب تک قاتل اور دہشت گرد کو رہائی نہیں ملے گی' میرے پوتے کو بھی رہائی نصیب نہیں ہو گی۔

"ان مجرموں نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے' جہاں انصاف کمزور ہو جاتا ہے۔

ایمان ڈگمگا جاتا ہے اور باپ کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔

"وہ میری بھی کمر توڑ رہے ہیں۔ عدالت وہ جگہ ہے' جہاں رشتے اور جذبے ہوتے۔ یہاں عقلِ کُل ہوتی ہے۔ دلائل ہوتے ہیں اور قانون کی حکمرانی ہوتی ہے۔

"اگر میں اپنے پوتے کی رہائی کے لئے بلال بارود کو رہا کر دوں تو پتا نہیں یہ پوتے جیسے کتنے بچوں کو اغوا کرے گا اور قتل کرے گا۔ شیطان کی زنجیریں جب بھی ہیں' شر پھیلتا ہے۔ خیر کسی کی نہیں ہوتی۔

"میں ایک بچے کی نہیں' دوسرے ہزاروں بچوں کی خیر چاہتا ہوں اس لئے عدالت تمام ثبوتوں اور گواہوں کے بیانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بلال بارود کو مجرم دیتی ہے اور تعزیراتِ پاکستان دفعہ تین سو دو کے تحت بلال بارود کو سزائے موت کا سناتی ہے۔

"HE WILL BE HANGED TILL DEATH"

شاہ صاحب نے موت کے پروانے پر دستخط کر کے قلم کی نوک توڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی ا باپ کی کمر ٹوٹ گئی۔ عدالت کی تاریخ میں ایک جج نے پہلی بار بیک وقت دو افراد کو سزا موت سنائی تھی۔ ایک مجرم کو اور ایک اپنے معصوم پوتے کو۔ ایک سے انصاف ہوا تھا' دوسرے سے ناانصافی۔ کبھی اس طرح بھی انصاف کے تقاضے پورے کئے جاتے ہیں۔

☆=========☆=========☆

کچرے کا ڈھیر اتنا زیادہ تھا کہ وہ دیوار کی اونچائی تک چل گیا تھا۔ اس جگہ گلی بند گئی تھی۔ اسی بند گلی میں وہ پجیرو کھڑی ہوئی تھی جس میں اس بچے کو اسکول سے اغوا گیا تھا۔

چونکہ وہ کچرے کے درمیان کھڑی ہوئی تھی اس لئے دور گلی کے سرے کچرے کا پہاڑ دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑ کے پیچھے چھپی ہوئی پجیرو نظر نہیں آتی تھی۔ ا کچرے سے ملحق مکان کے ایک کمرے میں چار تنگڑے نوجوان ایک میز کے اطراف کھانا کھا رہے تھے۔ ایک بوڑھا ملازم پاس کھڑا ہوا تھا۔ ان کے آگے سالن کی پلیٹیں رہا تھا اور کبھی پانی پلا رہا تھا۔

ایک نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "چلو یہ تو تصدیق ہو گئی کہ یہ جسٹس کا پوتا اس کے اغوا کی خبر سنتے ہی اس کی ماں اور رشتے دار ماتم کرنے لگے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "سنا ہے' اس جج پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔"

"اثر کیسے نہیں ہو گا؟ تم دیکھ لینا' وہ مقدمے کو اگلی پیشی تک بڑھا دے گا۔ بس تھوڑی دیر میں ہمیں بتایا جائے گا کہ جج نے کیا فیصلہ سنایا ہے۔"

تیسرے ملازم نے پوچھا۔ "خادم بابا! اس چھوکرے کو روٹی کھلا دی؟"

"وہ کھا رہا ہے۔ میں اسے پانی دینے جا رہا ہوں۔"

خادم ایک گلاس میں پانی لے کر وہاں سے چلتا ہوا کمرے سے نکل کر ایک راہداری میں آیا۔ راہداری کے دوسری طرف ایک کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ وہ اسے کھول کر اندر آیا۔ وہ معصوم بچہ فرش پر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ خادم نے اس کے سامنے گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! گرمی بہت ہے۔ یہ اوپر کی شرٹ اتار دو۔ لاؤ میں اتار دیتا ہوں۔"

خادم نے پہلے نکٹائی کھولی پھر بٹن کھول کر شرٹ اتار کر اسے فرش پر ڈال دیا۔ کمرے کے اندر کچرے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اگر روشن دان ٹوٹا ہوا نہ ہوتا اور بند ہوتا تو ایسی بدبو نہ آتی۔ باہر جو کچرا تھا' وہ بڑھتے بڑھتے روشندان تک چلا آیا تھا۔ اگر وہ قیدی بچہ نہ ہوتا' بڑی عمر کا ہوتا تو اس روشن دان سے نکل کر کچرے کے ڈھیر پر پہنچ کر فرار ہو سکتا تھا۔

انہیں اطمینان تھا کہ بچہ وہاں سے کبھی فرار نہیں ہو سکے گا۔ خادم نے اسے دیکھ کر کہا۔ "کھالو بچہ کھالو۔ یہ تمہارا آخری رزق ہے۔"

بوڑھے خادم نے اپنی زندگی میں کئی بار غیر انسانی تماشے دیکھے تھے۔ ان دہشت گردوں کے مظالم بھی دیکھتا تھا اور دیکھ دیکھ کر مسکراتا تھا۔

ایک بار کسی نے اس کی جوان بیٹی بشریٰ کو اغوا کیا تھا۔ خادم اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ کئی ماہ تک ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ ملی تو حاملہ تھی۔ کسی بدمعاش کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی شرم آ رہی تھی۔ اس نے بشریٰ کو ایک رشتے دار کے ہاں چھپا کر رکھا اور کہہ دیا کہ بچہ ہو گا تو اسے ختم کر دیا جائے گا تاکہ وہ آئندہ کنواری ہی کہلائے۔

بشریٰ اپنے بچے سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن ایک بیٹا پیدا کرنے کے بعد اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اپنے بیٹے کی حفاظت نہ کر سکی۔ خادم اس ننھے معصوم کو لے جا کر کہیں پھینک آیا تھا۔ اس کے بعد وہ نیم پاگل ہو گئی تھی۔ ہمیشہ اپنے بچے کو یاد کرتی تھی۔ میرا بچہ! میرا بچہ!..........

اپنی لاڈلی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر خادم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جسے دل و جان سے چاہتا تھا' وہ اندر ہی اندر گھلتی گئی تھی۔ آخری بار وہ باپ کے بازوؤں میں دم توڑتے

ہوئے بولی۔ ”ابا! میرے پاس کیوں ہے؟ جاتا کیوں نہیں؟ میرے بچے کو لاتا کیوں نہیں؟ اسے لائے گا نا؟ آہ میرا بچہ.........“

”بیٹی! میں لاؤں گا۔ تیری طبیعت سنبھل جائے پھر تیرا بچہ لے آؤں گا۔“

اس نے خوش ہو کر باپ کو دیکھا پھر اسی وقت اس کا دم نکل گیا۔ وہ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کے بعد دنیا میں اس کا کوئی نہیں رہا۔ اکیلا تھا' اب محنت مزدوری نہیں ہوتی تھی۔ کمر جھکنے لگی تھی۔ وہ آرام سے تین وقت کی روٹیاں کھانے کے لئے ان دہشت گردوں کی خدمت کرنے لگا تھا۔

وہ خالی پلیٹ اور گلاس لے کر کمرے سے باہر آیا۔ ان چاروں نے بھی پیٹ بھر کر کھا لیا تھا۔ وہ ان کی پلیٹیں بھی اٹھا کر دھونے کے لئے چلا گیا۔ ایک نے کہا۔ ”خادم بابا! برتن بعد میں دھو لینا پہلے میرے لئے سگریٹ لے آؤ۔“

”دوسرے نے کہا۔ ”تھرمس لے جاؤ۔ چائے لے آنا۔“

وہ تھرمس لینے اور برتن رکھنے کے لئے کچن میں چلا گیا۔ اسی وقت فون کا بزر بجنے لگا۔ ایک نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”ہیلو! نمبری بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ”نمبری! تم نے بیگم شاہ کو دوبارہ فون کیا تھا؟“

”دادا آپ کے حکم سے کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ مگر ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہم سب کی فون کالیں ٹیپ ہو رہی ہیں۔ اس طرح وہ پہلے ہمارے فون نمبر معلوم کریں گے۔ پھر یہ بھی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ نمبر کہاں کے ہیں۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں دادا؟“

”میں کیا چاہوں گا؟ تم لوگ بڑے لالچی ہو۔ میں نے کہا تھا بچے کو اغوا کرنے کے بعد پجیرو کو کسی دوسرے علاقے میں چھوڑ دینا لیکن تم لوگوں نے اسے کچرے میں چھپا کر رکھا ہے تاکہ آئندہ اسے بیچ کر دو چار لاکھ حاصل کر سکو۔“

”دادا! آپ حکم کریں' ہم پجیرو کو آگ لگا دیں گے۔“

”یہی بہتر ہو گا ورنہ کہیں نہ کہیں ضرور پھنسو گے۔ تم جہاں ہو' اس اڈے کو بم سے اڑا دو۔“

”کیا واقعی؟ میرا مطلب ہے' وہ بچہ؟“

”اسے وہیں چھوڑ دو۔ اس کے منصف دادا نے اس کے مقدر میں موت لکھ دی ہے۔ بلال بارود کو سزائے موت سنا دی ہے۔“

”اوہ۔ یہ تو بہت برا ہوا۔“

”ہم بھی برا کریں گے۔ بچے کو کسی کمرے میں بند کرو اور ٹائم بم سیٹ کر کے وہاں ے نکل آؤ۔“

خادم تھرماس لے کر جا رہا تھا۔ نمبری نے ریسیور رکھ کر اس سے کہا۔ ”چائے نہ اؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم سے رنچھوڑ لائن کے اڈے میں ملنا۔“

پھر اس نے ساتھیوں سے کہا۔ ”ضروری سامان اٹھا لو۔ شمسو! ٹائم بم میں دس منٹ کا ائم سیٹ کرو۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔“

سب ہی تیزی دکھانے لگے۔ خادم تیزی سے باہر چلا گیا۔ وہ تینوں اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگے پھر وہاں سے نکلنے سے پہلے شمسو نے ٹائم بم کو اس دروازے کے پاس رکھا' جس کے پیچھے وہ معصوم قیدی تھا۔ اس نے دس منٹ کا ٹائم سیٹ کر کے اسے آن کیا پھر وہاں ے بھاگتا چلا گیا۔ اب وہاں خاموشی تھی۔ بچہ بھی کھانے کے بعد اونگھ رہا تھا۔ اسے ٹک ٹک ٹک کی آواز لوری کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

اے بدنصیب ماں! تو کہاں ہے؟ بچے کی لوری بدل گئی ہے۔

☆=========☆=========☆

فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اے ایس پی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”ہیلو؟“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”سر! ہم نے دو ٹیلی فون نمبر معلوم کئے ہیں۔ ایک فون کے ذریعے جسٹس صاحب کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ دوسرے فون سے ان کی بیگم کو دہشت زدہ کیا جا رہا تھا۔“

”کیا صرف ان کے فون نمبر معلوم ہوئے ہیں؟“

”ان مکانوں کا بھی پتا چل گیا ہے' جہاں سے فون کئے گئے ہیں۔“

اے ایس پی نے گھنٹی بجائی۔ فون نمبر اور مکانوں کے پتے نوٹ کئے پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک انسپکٹر نے آ کر اسے سیلوٹ کیا۔ اے ایس پی نے کہا۔ ”وہ کالیں ٹریس ہو چکی ہیں۔ دو مختلف اڈے ہیں۔ تم ایک اڈے کا محاصرہ کرو گے۔ میں دوسرے اڈے کو گھیرے میں لوں گا۔“

اس نے ایک پرچی انسپکٹر کو دے کر کہا۔ ”ان دو اڈوں میں سے کسی ایک اڈے میں ل بچے کو چھپایا گیا ہو گا۔ کاؤنٹر فائرنگ کے وقت خیال رکھنا کہ بچے کو نقصان نہ پہنچے۔ کم آن۔“

وہ سپاہیوں سے بھری ہوئی کھڑی کئی گاڑیاں لے کر دو مختلف سمتوں میں گئے۔

گاڑیاں تیز رفتاری سے جا رہی تھیں۔ اتنی ہی تیز رفتاری سے وقت گزر رہا تھا۔ ٹک ٹک۔ ٹک ٹک۔ ٹک ٹک..........

دس منٹ گزرنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ اے ایس پی کی پولیس پارٹی اس بند گلی کے قریب پہنچ گئی۔ ٹائم بم کی سانسیں ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ چلتی ہیں۔ سانسیں پوری ہو گئیں۔ آخری ٹک کے ساتھ ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ درو دیوار کے ٹکڑے فضا میں اڑ کر بکھرنے لگے۔ آس پاس کے مکانات بھی متاثر ہوئے۔ مرد' عورتیں اور بچے چیختے چلاتے ہوئے بھاگنے لگے۔

پولیس کی گاڑیاں دور کھڑی ہوئی تھیں۔ بدحواسی میں بھاگنے والے اس طرف آ رہے تھے۔ نمبری اور شمسو اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ ایک چائے کی دکان میں آ گئے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد چائے اور سگریٹ سے شغل بھی کرنا چاہتے تھے اور ٹائم بم کی کارکردگی دیکھ کر بچے کی ہلاکت سے مطمئن ہو کر وہاں سے جانا چاہتے تھے۔

جب دھماکے کے نتیجے میں بھگدڑ مچی تو وہ ہوٹل سے باہر آ گئے۔ وہ اس ہنگامے اور بھیڑ میں کسی شک و شبے کے بغیر وہاں سے جا سکتے تھے۔ منصوبے کے مطابق وہ چاروں الگ ہو گئے۔ ان سب کو رنچھوڑ لائن کے اڈے پر پہنچ کر ملنا تھا۔

شمسو نے شلوار پر ایک ٹیکنی کلر شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر کے بال شانوں تک بڑھے ہوئے تھے۔ ایسے لباس کے ساتھ اس نے ایک گٹار پکڑا ہوا تھا۔ لباس جاہلانہ تھا اس پر رئیس زادوں کی طرح گٹار پکڑے ہوئے تھا۔ یہ حلیہ شبے میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھا۔ سی آئی اے کے دو سادہ لباس والوں نے اسے روک لیا۔ اس کی تلاشی لی۔ لباس میں سے کچھ نہ نکلا۔ گٹار کے اندر ہاتھ ڈالنے سے ایک ٹی ٹی اور گولیوں سے بھرا ہوا ایک فاضل میگزین نکلا۔ وہ شمسو کی پٹائی کرتے ہوئے اے ایس پی کے پاس لے آئے۔ وہاں بھی اس کی خاصی پٹائی ہونے لگی۔ سوالات بھی کئے گئے۔ اس سے کہا گیا کہ سیدھی طرح جواب نہیں دے گا تو اسے ٹارچر سیل میں پہنچا دیا جائے گا۔

اس نے اگل دیا کہ اس نے اور اس کے تین ساتھیوں نے بم کا وہ دھماکہ کیا ہے۔ جسٹس کا پوتا اسی مکان میں تھا اور اس معصوم کا انجام صاف ظاہر تھا۔

پولیس اور سی آئی اے والے بڑے سنگدل ہوتے ہیں لیکن سنی کی بات سن کر چند لمحات کے لئے ان کے سر جھک گئے۔ وہ غصے سے بپھر گئے۔ شمسو کو اتنا مارا' کہ وہ مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گیا۔

اسے اٹھا کر ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیا گیا۔ ابھی اسے ٹارچر سیل لے جا

ت سی معلومات حاصل کرنی تھیں اور اس کے تین ساتھیوں تک بھی پہنچنا تھا۔

اب اے ایس پی کو ایک تکلیف دہ فرض ادا کرنا تھا۔ عظمت اللہ شاہ کو یہ جانکاہ خبر نی تھی۔ اس نے اپنے موبائل کو آن کیا لیکن شاہ صاحب کے نمبر ملانے کا حوصلہ نہ ا۔ اس نے آئی جی سے رابطہ کر کے یہ خبر سنائی پھر کہا۔ "میں یہاں بہت سے معاملات ں الجھا ہوا ہوں۔ آپ شاہ صاحب کو یہ افسوس ناک اطلاع دے دیں۔"

آئی جی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔ اس مکان کا ملبہ ہٹا کر لاش برآمد کرو۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ جہاں دھماکا ہوا تھا اس مکان سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کا عملہ پہنچ گیا تھا۔ وہ آگ پر قابو پانے اور بجھانے کی کوششیں کر رہا تھا۔ اے ایس پی نے اپنے ماتحت افسر سے کہا۔ "آگ بجھنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس کے بعد ہمارے ں کی ڈیوٹی ہے۔ کدالیں اور بیلچے منگواؤ۔ سپاہی ملبہ ہٹائیں گے۔ بچے کی لاش برآمد ضروری ہے۔"

ماتحت افسر حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

☆=========☆=========☆

شازیہ نے ایک فلک شگاف چیخ ماری پھر وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگی۔ سینہ پیٹ کر کہنے لگی۔ "ہائے میرا بچہ! میرا بچہ مجھے لا کر دو۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ کہاں ہے؟ کہاں ہے میرا بچہ؟؟"

بیگم شاہ کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ جنید دونوں کو سنبھالنے لگا۔ اس کا اپنا دل ے ہو رہا تھا۔ ایسے میں زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ وہ دونوں کو سنبھال رہا تھا۔ ود بھی رو رہا تھا۔

جنید آنسوؤں کو روک رہا تھا مگر وہ بہہ رہے تھے۔ اس نے انہیں صبر کرنے اور ش رہنے کے لئے نہیں کہا۔ ایسے وقت رونے اور بین کرنے سے اندر کا غبار نکلتا س لئے دونوں تڑپ رہی تھیں۔ بین کر رہی تھیں اور وہ بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

پھر بیگم عظمت اللہ.......... اچانک چپ ہو گئیں۔ خلا میں تکنے لگیں جیسے کچھ دیکھ ہوں۔ جنید سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ عظمت اللہ شاہ ایک صوفے جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی بیگم کی اچانک خاموشی پر انہیں بھی حیرانی ہوئی۔ انہوں ر اٹھا کر دیکھا۔ اسی وقت بیگم نے انہیں دیکھا پھر ان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ پ نہیں رو رہے ہیں؟ کیوں روئیں گے؟ آپ کا تو کلیجا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

جنید نے کہا۔ "ممی! پلیز' ڈیڈی کو کچھ نہ کہیں۔"

"کیوں نہ کہوں؟ انہوں نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ کل کے تمام اخبار
سرخیوں میں ان کا نام جلی حرفوں میں شائع ہو گا۔ سنی کی تصویر کے ساتھ ان کی تصو
ہو گی اور یہ لکھا ہو گا کہ ایک جج نے انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اپنے
کو قربان کر دیا۔ یہ کوئی نہیں لکھے گا کہ یہ پوتے کے قاتل ہیں۔ ایسے قاتل' جنہیں
کسی عدالت سے سزا نہیں ملے گی۔"

جنید نے کہا۔ "ممی! چپ ہو جائیں۔ اپنے بیڈ روم میں چلیں۔"

وہ فرش سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ "بیڈ روم میں سنی نہیں ہے۔ وہ آج سے
پاس نہیں سوئے گا۔ سن رہے ہیں آپ؟ جواب دیں' میرا پوتا میرے ساتھ کیوں
سوئے گا؟ آپ کو اس کی قربانی دینے کا کیا حق ہے؟ جج ہونے کا مطلب یہ نہیں
آپ معصوموں کو بھی سزائے موت دیں۔"

شاہ صاحب نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکے۔ صوفے سے اٹھ کر تیزی سے
ہوئے کوٹھی کے باہر لان میں آ گئے۔ بیگم اور بہو کی آہیں فریادیں ان کا پیچھا کر رہی
اور وہ خود کو مجرم سمجھ رہے تھے۔ اپنے اندر چھپے دادا کو نہیں دکھا سکتے تھے کہ وہ
کے بغیر کس طرح ٹوٹ رہے ہیں۔

جنید نے ان کے پاس آ کر کہا۔ "ڈیڈ! میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ آپ
کیا اچھا کیا اور کیا برا؟ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں آپ کو تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ بیٹا رونے لگا لیکن وہ اصولوں
پابند اور فرض شناس تھے۔ جب انہوں نے قانون اور انصاف کے تقاضے پورے کئے
پھر کیوں روتے؟ ان کی آنکھیں خشک رہیں۔ وہ ان لمحات میں جنید کو سینے سے لگا کر
اپنی دھڑکنوں میں محسوس کر رہے تھے۔

ایک جیپ احاطے میں داخل ہوئی پھر ان کے قریب آ کر رک گئی۔ اے ایس پی
جیپ سے اترتے ہوئے سلام کیا پھر کہا "ہم نے رنچھوڑ لائن کے اڈے پر چھاپا مارا تھا
باقی تین مجرم بھی گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان سے ابھی بہت کچھ معلوم کیا جا رہا ہے۔"

جنید نے کہا "ہمیں اس سے کیا لینا ہے کہ کسے گرفتار کیا جا رہا ہے اور آپ
معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ جو نقصان ہمیں اٹھانا تھا' وہ ہم اٹھا چکے ہیں۔"

"بے شک۔ آپ نے اور آپ کے والدین نے جو نقصان اٹھایا ہے' اسے ہم
نہیں کر سکیں گے۔ ہم تو دوسرے ہزاروں بچوں کے تحفظ کے لیے مجرموں کو گر

کر رہے ہیں۔"

شاہ صاحب نے آنسو بھرے لہجے میں پوچھا "ہمیں لاش کب ملے گی؟"

"فائر بریگیڈ والوں نے آگ پر قابو پا لیا ہے۔ میرا اندازہ ہے آگ بجھ چکی ہو گی۔
میں اسی طرف جا رہا ہوں۔ جو بھی صورتِ حال ہو گی' میں آپ کو فون پر بتاؤں گا۔"

"میں بھی چلوں گا۔ جنید! گاڑی نکالو۔"

جنید نے گیراج میں جا کر ایک کار نکالی۔ شاہ صاحب اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ
گئے۔ پیچھے مسلح گارڈ بیٹھ گیا پھر وہ اے ایس پی کی جیپ کے پیچھے چل پڑے۔ شاہ صاحب
نے ایک منصف کی حیثیت سے کئی یادگار فیصلے کئے تھے۔ ہمیشہ عدالت کے وقار کو بلند
رکھا۔ جب بھی انہوں نے انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا تو اپنے اندر ایک نئی توانائی اور
ایمان کی پختگی محسوس کی۔ اپنی فرض شناسی پر انہیں دلی مسرتیں حاصل ہوتی رہیں لیکن
آج وہ مرجھا گئے تھے۔

سنی کی موت کی خبر سننے کے بعد انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ بیگم نے طعنے دیئے۔
انہیں پوتے کی موت کا ذمے دار ٹھہرایا۔ وہ ایک لفظ نہ بولے۔ بیٹے کے سامنے زبان
کھولی اور پوچھا کہ پوتے کی لاش کب ملے گی؟

اب پوتے سے وہی آخری تعلق رہ گیا تھا کہ اس کی آخری سومات ادا کرتے۔ بیگم
کی نظروں میں تو وہ اس کے قاتل تھے۔ جوان بیٹے اور بہو کو بھی ان سے شکایت ہو گی
لیکن وہ باپ کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے چپ تھے۔ وہ اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ
منصف کی حیثیت سے خواہ کتنے ہی فرض شناس ہوں' ایک باپ کی حیثیت سے مجرم ہیں۔

وہ اس مکان کے سامنے پہنچ گئے' جو بم دھماکے کے بعد کھنڈر بن گیا تھا۔ فائر بریگیڈ
والوں نے آگ بجھا دی تھی۔ دیوار کے جو بڑے بڑے حصے گرے ہوئے تھے انہیں کدال
وغیرہ سے توڑ توڑ کر ہٹایا جا رہا تھا۔ ملبہ اتنا تھا کہ جمع ہو کر پہاڑی کی طرح نظر آ رہا تھا۔
اسے ہٹانے میں کچھ دیر لگنے والی تھی۔ شاہ صاحب صدمات سے چُور ہو کر اُدھر دیکھ رہے
تھے۔ کھنڈرات کو کھود کر تاریخی خزانے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس کھنڈر سے خزانہ
نہیں' پوتے کی لاش برآمد ہونے والی تھی۔

☆=========☆=========☆

ٹارچر سیل میں رمزی کی چیخیں مدھم پڑتی جا رہی تھیں۔ اسے ایسی اذیتیں پہنچائی گئی
تھیں کہ وہ تکالیف برداشت کرتے کرتے اور چیختے چیختے نڈھال ہو گیا تھا۔ اس قدر
کمزوری غالب آ گئی تھی کہ چیخ نہیں نکل رہی تھی۔ اب حلق سے صرف کراہیں نکل رہی

تھیں۔

اس سے پوچھا جا رہا تھا "تم نے پولیس سے جھوٹ کیوں کہا؟ اسٹور میں نہ کوئی اسلحہ تھا اور نہ ہی کوئی مجرم۔ تم نے ناموں دادا کو بچانے کے لیے پولیس کو گمراہ کیا ہے۔"

تکلیف سے کراہتے ہوئے کہنے لگا "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ آپ سے جھوٹ بول کر یہاں مرنا نہیں چاہتا۔ میں اس میڈیکل اسٹور کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ اتنا یقین سے کہتا ہوں کہ ناموں دادا وہاں کسی خاص مقصد کے تحت جاتا رہتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے کئی بار جاتے ہوئے اور دکان کے مالک سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔"

"دکان کا مالک صاف طور سے انکار کرتا ہے کہ کسی ناموں دادا کو نہیں جانتا ہے۔"

"دکان کے مالک نے جھوٹ کہا ہے۔ وہ ناموں دادا کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

"تم نے ناموں دادا کا جو حلیہ بتایا تھا' ہمارے آرٹسٹ نے اس کے مطابق تصویر بنائی ہے۔ بتاؤ اس تصویر میں اور کیا کمی رہ گئی ہے؟"

اسے ایک تصویر لا کر دکھائی گئی۔ تصویر ہو بہو ناموں دادا کی تھی۔ شانوں تک بڑھے ہوئے بال اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ رمزی نے کہا "وہ بالکل ایسا ہی ہے لیکن اب میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ وہ بہت چالاک ہے۔ میری گرفتاری کا علم ہوتے ہی اس نے حلیہ بدل لیا ہو گا۔"

"ہوں" افسر سوچتی ہوئی نظروں سے تصویر کو دیکھنے لگا پھر اس نے آرٹسٹ سے کہا "اس تصویر کے بال چھوٹے کر دیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے' جیسے میں اسے دیکھ چکا ہوں۔"

آرٹسٹ ایسی ہی ایک دوسری تصویر بنانے لگا۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس بار جو تصویر بنائی' اس میں چہرہ وہی تھا' حلیہ بدل گیا تھا۔

افسر نے اسے دیکھا پھر چونک کر کہا "میں اسے میڈیکل اسٹور میں دیکھ چکا ہوں۔ آپ ایک زحمت اور کریں۔ اسے ایک عینک پہنا دیں۔"

آرٹسٹ نے تصویر کو ایک عینک پہنا دی۔ افسر نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بالکل وہی ہے۔ اس نے اپنا نام نسیم احمد بتایا تھا اور خود کو دواؤں کی کمپنی کا ریپریزنٹیٹو کہہ رہا تھا۔ دکان دار نے بھی تائید کی تھی۔"

رمزی نے کراہتے ہوئے کہا "اب آپ کو میری بات کا یقین کرنا چاہیے۔ دکان کا مالک اسے ناموں دادا کی حیثیت سے جانتا تھا لیکن آپ سے جھوٹ بول رہا تھا۔ آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔"

افسر ٹارچر سیل سے نکل کر ایک دفتری کمرے میں آیا پھر اپنے ماتحت افسر سے کہا "...لے کر اسی میڈیکل اسٹور میں جاؤ' جہاں ہم نے اے ایس پی صاحب کی نگرانی میں ...مارا تھا۔ اس دکان کے مالک کو فوراً پکڑ کر یہاں لے آؤ۔"

ماتحت افسر چلا گیا۔ وہ اسٹور زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر دکان کے ...کو ہتھکڑیاں پہنا کر لایا گیا۔ اس سے پوچھا گیا "تم ناموں دادا کو نہیں جانتے؟"

اس نے جواب دیا "جناب! میں نے آپ سے دکان میں ہی عرض کیا تھا' اس نامی ...ای دہشت گرد سے ہمارا بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا ...ہے۔"

اسے مارتے ہوئے ٹارچر سیل میں لایا گیا۔ افسر نے کہا "یہاں تو تمہارا باپ بھی سچ ...ل دے گا۔"

وہاں رمزی پر اتنا تشدد کیا گیا تھا کہ دکان دار اس کی حالت دیکھ کر خوف سے کانپنے ...گڑگڑانے لگا "میں کسی دہشت گرد کو نہیں جانتا ہوں۔ ایک سیدھا سادہ دواؤں کا ڈیلر ...ہوں۔ میرے آس پاس کے دکان دار میری شرافت کی گواہی دیں گے۔"

افسر نے نسیم احمد تصویر دکھاتے ہوئے کہا "اسے تو جانتے ہو۔ یہ دواؤں کی کمپنی کا ...ریپریزنٹیٹو ہے۔ تم نے اس کا نام نسیم احمد بتایا تھا۔"

دکان دار نے کہا "بے شک نسیم احمد ہے۔ سیلز ریپریزنٹیٹو ہے۔"

افسر نے دوسری تصویر دکھائی جس میں سر کے بال اور مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ ...دار نے تصویر دیکھی پھر پریشان ہو کر کہا "یہ نسیم احمد جیسا ہے لیکن میں نے نسیم احمد ...کا یہ حلیہ کبھی نہیں دیکھا۔"

اس کے منہ پر گھونسا پڑا پھر پٹائی شروع ہو گئی۔ ایسی ایسی مار ماری گئی کہ وہ لہولہان ...گیا۔ ہانپتے کانپتے کہنے لگا "میں اقرار کرتا ہوں۔ میں ناموں دادا کو جانتا ہوں۔ یہ وہی نسیم ...ہے' جسے آپ نے دکان میں دیکھا تھا۔"

اسے ایک کرسی پر بٹھا کر باندھا گیا پھر سوئچ آن کر کے بجلی کا تار قریب لا کر اس کے ...کو اس کے ایک گھٹنے پر رکھا۔ بجلی کا ایسا جھٹکا لگا کہ وہ تڑپتے ہوئے چیخنے لگا "مجھے ...دو۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے جو پوچھو گے' جواب دوں گا۔ مجھے ایسا شاک نہ دو۔ ...مر جاؤں گا۔"

افسر نے کہا "تمہیں اس ٹارچر سیل سے اسی وقت نکالا جائے گا' جب تم ناموں دادا ...گرفتار کراؤ گے۔ بتاؤ' وہ کہاں رہتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "وہ واردات کرنے کے بعد میری ہی دکان کے پچھلے حصے
چھپ کر رہتا ہے۔ دکان کے اسی حصے میں خفیہ میٹنگ ہوتی ہے۔ اس میٹنگ میں تخ
وارداتوں کی پلاننگ کی جاتی ہے۔"

"کیا وہ اس شہر میں تنہا رہتا ہے یا اس کے بیوی بچے بھی ہیں؟"

"اس کی ایک بیوی اور بچہ ہے۔"

"کیا وہ فیملی لائف نہیں گزارتا ہے؟"

"گزارتا ہے۔ بیوی یہ سمجھتی ہے کہ وہ بہت زیادہ تنخواہ پانے والا ملازم ہے۔ ا
کی بیوی کے علاوہ محلے والے بھی یہ نہیں جانتے کہ وہ دہشت گرد ہے۔"

"اس کا مکان کہاں ہے؟"

"جہانگیر روڈ پر ہے۔ وہاں اسے کوئی ناموں دادا کی حیثیت سے نہیں جانتا ہے۔"

"وہ ابھی کہاں ہو گا؟"

"میں ٹھیک طرح نہیں کہہ سکتا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے لیے خطرہ بڑھ گیا
اس لیے دو چار دن بیوی بچے کے ساتھ گزارے گا۔"

"اس کا مطلب ہے' وہ اپنے مکان میں ہو گا۔"

"میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ شاید وہ ابھی گھر نہ جائے' رات کو جائے۔ جس حد
مجھے معلوم تھا' میں نے بتا دیا۔ خدا کے لیے مجھے شاک نہ پہنچائیں۔"

"تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تمہارے بتائے ہوئے پتے پر ناموں دادا گرفتار
جائے۔"

"اگر وہ گرفتار نہیں ہو گا تب بھی یہ تصدیق ہو جائے گی کہ ناموں دادا کہلانے
نسیم احمد جہانگیر روڈ کے اسی مکان میں رہتا ہے۔"

☆=========☆=========☆

نسیم احمد نے یہ ارادہ کیا تھا کہ دو چار دن عذرا اور پپو کے ساتھ گھر میں رہ
جب خطرہ کم ہو جائے گا تو واردات کے لیے نکلے گا۔ وہ اپنی جیپ ڈرائیو کرتا ہوا
مکان کے سامنے آیا۔ دروازہ مقفل تھا۔ نیم کے سائے میں کھڑی ہوئی عورتوں میں
ایک نے کہا "تمہاری بیوی پپو کے لئے پریشان ہو رہی ہے۔ وہ ابھی تک اسکول سے
آیا ہے۔ پہلے تو وہ سوزوکی ڈرائیو کے پاس گئی تھی پھر اس نے اسکول سے فون کیا تھا
پپو یہاں آجائے تو اسے فون پر بتادیں۔"

نسیم نے پوچھا "وہ کس اسکول میں گئی ہے؟"

"جس اسکول میں بیٹے کو داخل کرایا ہے' وہیں گئی ہے۔"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں' اسکول کا نام کیا ہے؟ اور وہ اسکول کہاں ہے؟"

دو چار عورتوں نے اسے تعجب سے دیکھا پھر ایک نے کہا "تم کیسے باپ ہو' یہ بھی
جانتے کہ بیٹا کس اسکول میں پڑھنے گیا ہے؟"

"چاچی! تم تو جانتی ہو میں ملازمت کے سلسلے میں شہر سے باہر جاتا رہتا ہوں۔ گھر اور
ساری ذمے داریاں عذرا سنبھالتی ہے۔ تم مجھے اسکول کا نام بتاؤ۔"

"تمہاری فون والی خالہ جانتی ہیں۔ ان سے جاکر پوچھو۔"

عذرا جہاں فون کرنے جاتی تھی' وہاں نسیم نے جاکر پوچھا۔

"خالہ! عذرا کون سے اسکول گئی ہے؟"

"سن رائز گرامر اسکول۔ اس نے وہاں کا فون نمبر دیا ہے۔ اس کے ساتھ بات کرنا
کرلو۔"

نسیم نے فون نمبر نوٹ کر کے کہا "میں بعد میں فون کر لوں گا۔ نمبر سے پتا چل رہا
اسکول صدر میں ہے۔"

"ہاں۔ عذرا اسی طرف گئی ہے۔"

وہ تیزی سے پلٹ کر اپنی جیپ کی طرف جانے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ
تنے مہنگے اسکول میں پپو کو داخل کرائے گی' جہاں کروڑ پتی اور ارب پتی لوگوں کے
لیم حاصل کرتے ہیں۔ ویسے یہ خواب اس کا بھی تھا کہ بیٹا مہنگے انگریزی اسکول میں
لیم حاصل کرے لیکن وہ اسکول اسے کھٹک رہا تھا۔

یپ میں اس کا ایک ماتحت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے
کرتے ہوئے پوچھا "کیا جج کے پوتے کو سن رائز گرامر اسکول سے اٹھایا گیا تھا؟"

"ہاں جی۔ وہ بچہ اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔"

ں نے جیپ کو یوٹرن دیا پھر اسے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے موبائل کو
یک نمبر ملائے پھر رابطہ ہونے پر دوسری طرف سے آواز آئی "سن رائز گرامر
ول میڈم بول رہی ہوں۔"

"میڈم! کیا وہاں عذرا خاتون ہیں۔ میں ان کا خاوند ہوں۔"

سٹ اے منٹ۔"

ں نے انتظار کیا پھر عذرا کی آواز سنائی دی "ہیلو نسیم؟ آپ ہیں؟ آپ کب

"ابھی آیا ہوں۔ پپو کہاں ہے؟"

"وہ سوزوکی ڈرائیور دیدار کے پاس ہے۔ اس کے علاقے کی ناکابندی ہو چکی ہے۔ تھوڑی دیر بعد راستہ کھل جائے گا تو میں وہاں جاکر پپو کو لے آؤں گی۔"

"تم وہیں رہو۔ مجھے دیدار کے گھر کا پتا بتاؤ۔ شاید راستہ کھل گیا ہو گا۔ میں لے کر تمہارے پاس آؤں گا۔"

عذرا نے پتا بتایا۔ نسیم نے اسے ذہن نشین کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس میں پپو کو کیوں داخل کرایا ہے؟"

"کیوں نہ کراتی؟ یہ خواب ہم دونوں نے دیکھا تھا۔"

"اوہ عذرا! سمجھا کرو۔ وہ بڑے لوگوں کا اسکول ہے۔ وہاں بڑے مسائل ہیں۔ کیا تمہیں پتا ہے کہ ایک جج کے پوتے کو وہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟"

"یہاں اسکول آکر یہ بات معلوم ہوئی۔ اس بات پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ یہ ذلیل کتے دہشت گرد بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولا "گالیاں کیوں دے رہی ہو؟"

"کیوں نہ دوں؟ ان کے منہ پر تو تھوکنا چاہیے۔ انہیں شاہراہوں پر خوب مارنے کے بعد گولی مار دینا چاہیے۔"

"اچھا بکواس نہ کرو۔ کیا فون پر ایسی باتیں کی جاتی ہیں؟"

"تعجب ہے۔ آپ کو برا کیوں لگ رہا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فون بند کر دیا۔

☆==========☆==========☆

ملبہ ہٹایا جارہا تھا۔ دور تک لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اس راستے سے گزرنے والے کر دیکھتے تھے، پوچھتے تھے پھر چلے جاتے تھے۔ اگر کوئی ملبے میں دب گیا تھا اور اس کی نکالی جانے والی تھی تو لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہاں گھنٹوں کھڑے رہ کر ہونے والی لاش کو دیکھتے۔ اس شہر کے انسان کتے بلیوں کی طرح مرتے رہتے تھے کسی کی موت متاثر نہیں کرتی تھی۔

جنہیں متاثر کر رہی تھی، وہ ایک کار سے لگے کھڑے تھے اور دل ہی دل میں پاک کی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔ نظروں کے سامنے کچھ فاصلے پر کئی سپاہی اور بیلچے لیے کھدائی کرنے اور ملبہ ہٹانے میں مصروف تھے۔

یہ بات یقینی تھی کہ پہاڑ جیسے ملبے کی تہہ در تہہ سے بچہ زندہ نہیں نکلے گا۔

معجزہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں سے لاش ہی نکلنے والی تھی لیکن اس لاش کے برآمد ہونے تک دونوں باپ بیٹے انتظار کی سولی پر چڑھے ہوئے تھے۔

اے ایس پی نے شاہ صاحب کے پاس آکر کہا "آپ بڑی دیر سے کھڑے ہوئے ہیں۔ میں نے سپاہی سے کہا ہے، وہ کرسی لا رہا ہے۔"

سپاہی ایک کرسی لے آیا۔ شاہ صاحب نے کہا۔ "اسے لے جاؤ۔"

جنید نے کہا "ڈیڈ! آپ تھک گئے ہوں گے۔ بیٹھ جائیں۔"

"میں ایک باپ ہوں۔ جب تک بچہ نہیں مل جاتا، میں نہیں بیٹھوں گا۔"

جنید اور اے ایس پی کے سر جھک گئے پھر جنید نے کہا "آپ کے اندر فرض شناسی اور ایمان کی جو پختگی ہے اسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔ نہ سمجھنے کے باوجود میرا دل کہتا ہے کہ آپ عظیم مصنف بھی ہیں اور ایک عظیم باپ بھی۔"

"یہ تمہاری محبت اور سعادت مندی ہے لیکن آج میں نے تم لوگوں کا دل بری طرح توڑا ہے اور اس کے لیے میں کبھی خود کو معاف نہیں کروں گا۔"

پھر انہوں نے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "وہ رو رہی ہوں گی۔ رشتے داروں کی بھیڑ میں وہ اکیلی ہوں گی۔ تم جاؤ۔ انہیں سنبھالو۔"

"وہاں دوسرے لوگ انہیں سنبھال لیں گے۔ میری ضرورت یہاں ہے۔ جب سامنے ملبے سے سنی کی لاش نکلے گی تو مجھے آپ حوصلہ دیں گے اور مجھے دیکھ کر آپ کو حوصلہ ہو گا کہ پوتا مر گیا لیکن بیٹا زندہ ہے اور جوان ہے۔"

انہوں نے جوان بیٹے کو بڑی چاہت سے دیکھا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا پھر سر کو جھکا لیا۔

اسی وقت ایک سپاہی نے بلند آواز سے کہا "مل گئی۔"

سب ہی نے چونک کر ملبے کی طرف دیکھا۔ افسران اُدھر جانے لگے۔ جنید نے باپ کو سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھیں ڈیڈ!"

سپاہی نے بیلچہ ایک طرف رکھ کر ایک نکٹائی اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا "یہ بچے کی نکٹائی ہے۔"

اے ایس پی نے آگے بڑھ کر اس نکٹائی کو لے کر دیکھا۔ اس پر ایس۔ آر۔ جی۔ ایس کا مونوگرام تھا اور وہ سن رائز گرامر اسکول کا مخفف تھا۔

شاہ صاحب کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکنے لگے۔ جنید انہیں سنبھال کر واپس کار کے پاس لے آیا۔ دروازہ کھول کر انہیں اندر بٹھاتے ہوئے سپاہی

سے کہا "ایک گلاس پانی لے آؤ۔"

ابھی صرف ایک ٹائی برآمد ہوئی تھی۔ ملبہ اتنا زیادہ تھا کہ اسے گہرائی تک کھود کر ہٹانا ضروری تھا۔ پتا نہیں وہ بچہ ملبے کی کس اتھاہ گہرائی میں چھپا ہوا تھا۔

☆==========☆==========☆

ایک گھنٹے سے ناکا بندی جاری تھی۔ ایک ایک گھر میں مطلوبہ دہشت گردوں کو تلاش کیا جارہا تھا۔ جو دکانیں بند تھیں انہیں بھی کھلوا کر ان کے اندر گھس کر انہیں ڈھونڈا جارہا تھا۔ جب تک وہ نہ ملتے' کسی کو اس محلے سے باہر جانے نہیں دیا جاتا۔

اس محلے کے باہر ان لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جو محلے کے اندر اپنے گھروں میں جانا چاہتے تھے۔ کئی گاڑیاں راستہ کھلنے کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں نسیم احمد کی جیپ بھی تھی۔

اسے یقین تھا کہ دہشت گرد ناکا بندی سے پہلے جاچکے ہوں گے۔ جب کوئی ہاتھ نہیں آئے گا تو راستہ کھل جائے گا۔ اپنے بارے میں بھی یقین تھا کہ اسے بھی قانون کے محافظ پہچان نہیں سکیں گے۔ ناموں دادا کی حیثیت سے اس نے کبھی اپنی تصویر نہیں اتروائی تھی۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ پہلے ایک فائر کی آواز سنائی دی پھر مسلسل فائرنگ ہونے لگی۔ اس کا مطلب تھا' مطلوبہ دہشت گرد نظروں میں آگئے ہیں۔ رینجرز والوں سے مقابلہ کرتے ہوئے فرار ہونا چاہتے ہیں۔

جو لوگ محلے کے باہر کھڑے ہوئے تھے' وہ فائرنگ سے بچنے کے لیے دور بھاگنے لگے۔ گاڑیاں بھی وہاں سے جانے لگیں۔ نسیم بھی اپنی جیپ دور لے گیا۔ پہلے وہ سمجھ رہا تھا کہ دہشت گرد ناکا بندی سے پہلے نکل چکے ہوں گے۔ اب فائرنگ سے سمجھ میں آرہا تھا' وہ موجود ہیں اور گرفتاری سے بچنے کے لئے رینجرز کے جوانوں سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

اگر وہ بھاگتے ہوئے ادھر چلے آئیں گے تو یقیناً ناموں دادا کو پہچان لیں گے اور فرار ہونے کے لیے اس کی جیپ استعمال کریں گے۔ ان حالات میں وہ ان کے کام آنے سے انکار نہیں کرسکے گا۔ اس طرح رینجرز والوں کو اپنے پیچھے لگالے گا۔

اس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اسکول کی طرف جانے لگا۔ اسے محتاط رہنے کی عادت تھی۔ عقل میں یہ بات آئی کہ اسکول میں اغوا کی واردات ہو چکی ہے۔ وہاں رینجرز یا پولیس وا

ے۔ ان کا سامنا اسے نہیں کرنا چاہیے۔

اس نے گاڑی ایک جگہ روک دی پھر موبائل فون کے ذریعے عذرا سے رابطہ کیا۔ سکول میں بیٹھی باپ بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ فون پہلے میڈم نے اٹینڈ کیا پھر عذرا کو اس نے پوچھا "کیا میرے بیٹے کو لارہے ہیں؟"

"نہیں۔ ناکا بندی جاری ہے۔ وہاں فائرنگ شروع ہو چکی ہے۔"

"اللہ خیر کرے۔ وہاں ہمارا بیٹا ہے۔"

"ہمارا بیٹا دیدار کے گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہوگا۔ اس کی فکر نہ کرو۔ تم سوال کرتی ہو۔ میں بلا رہا ہوں۔ چپ چاپ چلی آؤ۔"

"ابھی آرہی ہوں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ اسکول سے وہاں تک دس منٹ کا راستہ تھا۔ وہ آگئی۔ کو دیکھ کر پوچھا "یہ کس کی گاڑی ہے؟"

"اپنی ہے۔ آؤ بیٹھو۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولی "یہ تو بہت مہنگی ہوگی۔ آپ نے کب خریدی؟"

"پھر وہی سوالات۔ بھئی میرے دوست کی ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے ہم یانی کھائیں گے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ جب تک بیٹے کو نہیں دیکھوں گی' لقمہ حلق سے نہیں ے گا۔" وہ جیپ کو آگے بڑھا کر ہوٹل کے قریب لے آیا پھر دو پلیٹ بریانی کا آرڈر ے کر بولا "ہمارا بیٹا خیریت سے ہوگا۔ جب تک ناکا بندی جاری ہے' ہم کچھ کھالیں۔"

"آپ زبردستی نہ کریں۔ مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔"

"اولاد کی محبت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بھوکی رہو۔ اگر نہیں کھاؤ گی تو میں بھی ں کھاؤں گا۔ چلو یہاں سے۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرنا چاہتا تھا۔ عذرا نے اسے روک دیا۔ "اچھا منگوا لیجیے۔"

"تم جانتی ہو کہ میں تمہیں اور پپو کو کتنا چاہتا ہوں۔ تم دونوں کی خاطر اتنی محنت رتا ہوں کہ آج ہم خوش حال ہوگئے ہیں۔ پورے محلے میں صرف ہمارے گھر میں نڈیشنر لگے ہوئے ہیں۔ ایک سے ایک قیمتی سامان ہے۔ بینک بیلنس ہے اور ہمارا بیٹا ے اسکول میں پڑھ رہا ہے۔"

بریانی کی پلیٹیں آگئیں۔ وہ کھانے لگے۔ عذرا نے کہا "آپ واقعی بہت محنتی ہیں اور ہ تعالیٰ آپ کی حق حلال کی کمائی میں برکت دے رہا ہے۔"

نسیم کو کھاتے کھاتے ٹھسکا لگا۔ عذرا نے فوراً ہی پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر دیا۔ وہ
پانی پینے لگا۔ وہ بولی ”آرام سے کھائیں۔ جلدی کیا ہے؟“
وہ گلاس رکھ کر بولا ”بہتر ہے‘ تم کھانے کے درمیان میں نہ بولا کرو۔“
وہ خاموشی سے کھانے لگی۔ اس نے کہا ”میری ایک بات غور سے سنو۔“
”آپ بولنے سے منع کر رہے ہیں اور بول بھی رہے ہیں۔“
”میں نے تمہیں بولنے سے منع کیا ہے۔ میری بات سنو‘ ہو سکتا ہے‘ ہمارے کھانے
تک ناکا بندی ختم ہو جائے۔ راستہ کھلا ہو گا تو میں تمہیں گلی کے سرے پر چھوڑ دوں گا۔ تم
اس ڈرائیور کے گھر جا کر پپو کو لے آنا پھر ہم ساتھ گھر جائیں گے؟“
”آپ اس محلے میں کیوں نہیں جائیں گے؟“
”پھر سوال کر رہی ہو۔ بھئی اس گلی کے سرے پر ایک دکان دار ہے۔ میں اس سے
ضروری باتیں کروں گا۔ تسلی ہو گئی تمہاری؟“
”ہاں“ وہ پلیٹ ایک طرف رکھ کر بولی ”میں کھا چکی ہوں۔ اب بول سکتی ہوں؟“
”کوئی سوال نہ کرنا۔“
وہ ہنس کر بولی ”میں سوچتی ہوں‘ ضروری نہیں کہ دیدار ہمارے بیٹے کو اپنے گھر
لے گیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی گاڑی میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہو جس کی وہ مرمت
کروا رہا ہو اور ہو سکتا ہے‘ گاڑی درست ہو گئی ہو اور اس نے پپو کو ہمارے پڑوس میں
پہنچا دیا ہو۔“
”ایسا ہو سکتا ہے۔ تم فون کر کے معلوم کرو۔“
اس نے عذرا کو موبائل فون دیا۔ وہ نمبر پنچ کرنے لگی۔ نسیم خاموش رہا۔ محلے کی
فون والی خالہ سے رابطہ ہو گیا۔ اس نے کہا ”میں عذرا بول رہی ہوں۔ کیا پپو آ گیا ہے؟“
”پپو تو نہیں آیا۔ درجنوں پولیس والے آ گئے ہیں۔ انہوں نے تمہارے مکان کو
چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ وہ دروازے کا تالا توڑ کر اندر گئے ہیں۔ محلے والوں سے
پوچھ رہے ہیں‘ نسیم احمد عرف ناموں دادا اپنی بیوی بچے سے کب ملنے آتا ہے۔“
عذرا نے پوچھا ”ناموں دادا؟ یہ تو ایک بہت خطرناک دہشت گرد کا نام ہے۔“
نسیم نے اپنا نام سنتے ہی چونک کر عذرا کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ نام کیوں
لے رہی ہو؟ کس سے فون پر بات کر رہی ہو؟“ اس نے موبائل بند کر دیا۔
”خالہ بتا رہی ہیں کہ پولیس نے ہمارے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور
آپ کو نسیم احمد عرف ناموں دادا کہہ رہی ہے۔ محلے والوں سے سوالات کر رہی ہے۔

ہے دروازے کا تالا توڑ کر اندر گھس گئی ہے۔ ہمیں فوراً وہاں جانا چاہیے۔“
”دماغ خراب ہوا ہے۔ پولیس نے محاصرہ کیا ہے اور تم وہاں جانے کو کہہ رہی
ہو؟“
”تو کیا ہوا؟ ہم کوئی مجرم نہیں ہیں۔ اگر وہ آپ کو ناموں دادا کہہ رہے ہیں تو آپ
ان سے مل کر ان کی غلط فہمی دور کر دیں۔“
”میں ان سے نہیں مل سکتا۔“
”کیوں نہیں مل سکتے۔ وہ ہمارے گھر میں گھس گئے ہیں۔ پتا نہیں کیا نقصان
پہنچا رہے ہیں۔ جب تک انہیں یقین نہیں دلایا جائے گا کہ وہ مکان ناموں دادا کا نہیں ہمارا
ہے‘ محاصرہ ختم نہیں کریں گے۔“
”فی الحال اس مکان کو بھول جاؤ۔ میں تمہیں اور پپو کو ایک دوست کے مکان میں
لے جاؤں گا۔“
وہ شدید حیرانی سے بولی ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ فی الحال ہم اپنا گھر چھوڑ کر کسی
دوسرے کے گھر جائیں گے؟ کیوں؟“
”کیا تم چاہتی ہو‘ پولیس مجھے گرفتار کر لے؟“
”خدا نہ کرے‘ پولیس آپ کو گرفتار کیوں کرے گی؟“
”اس لیے کہ میں ناموں دادا ہوں۔ میں ایسی خطرناک مجرمانہ زندگی گزار رہا ہوں‘
جس کی حقیقت اپنی بیوی اور بچے کو بھی نہیں بتا سکتا۔ ہمیں بہت محتاط اور پُراسرار بن کر
دوہری زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ میں تمہارا نسیم احمد ہوں مگر بلال بارود کے بعد اس شہر کا
دوسرا خطرناک دہشت گرد ناموں دادا ہوں۔“
”نہیں..........نہیں۔ آپ کہہ دیں کہ آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ مذاق کر رہے
ہیں۔ ہمارا ہنستا بستا گھر آپ کی اس مختصر سی کہانی سے برباد نہیں ہو سکتا۔ کہہ دیں کہ یہ
جھوٹ ہے۔“
”یہ سچ ہے۔ یہ کہانی نہیں ہے۔ تمہارے پاس صرف نسیم احمد نہیں‘ ناموں دادا بھی
بیٹھا ہوا ہے۔ میں ہوں ناموں دادا۔ پولیس والے میرے اس چہرے سے مجھے نہیں
پہچانتے لیکن گھر جاتے ہی وہ مجھے پکڑ لیں گے۔“
وہ سکتے کی حالت میں اپنے خاوند کو دیکھنے لگی۔ یہ سوچ کر دماغ میں آندھی سی چل
رہی تھی کہ جس کے ساتھ دن رات گزارتی رہی‘ وہ بدنام دہشت گرد ہے۔ حلال کمانے
والا خاوند نہیں ہے۔ بڑے اسکول میں پڑھنے والے بچے کا بڑا باپ نہیں ہے‘ بڑا بدمعاش

ہے۔

اس نے کھانے کا بل ادا کیا پھر پوچھا "بوتل پیو گی؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ منہ پھیر لیا۔ اس نے آہستگی سے پوچھا "ناراض ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ اس نے کہا "میں سمجھ رہا ہوں' تمہیں شاک پہنچا ہوگا۔ میں تم سے جھوٹ بولتا رہا۔ تمہیں دھوکا دیتا رہا لیکن جو بھی کیا' تمہاری اور بیٹے کی بھلائی کے لیے کیا۔ ذرا سوچو' ڈیڑھ برس پہلے ہمارے پاس کیا تھا؟ ہم اچھا کھانے اور اچھا پہننے کے لیے ترستے تھے۔ آج کھانا اور کپڑا غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو' تمہارے بینک اکاؤنٹ میں پچیس یا تیس ہزار ہیں لیکن تم سے اپنا دوسرا روپ چھپانے کے لیے میں تمہاری لاعلمی میں لاکھوں روپے جمع کرتا رہا۔ تمہارے اکاؤنٹ میں پندرہ لاکھ روپے سے زیادہ رقم ہے اور یہ سب تمہارے پاس ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میرا کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے۔"

وہ سن رہی تھی۔ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں سختی سے بولا "کچھ بولتی کیوں نہیں؟ میں تمہیں ڈانٹ بھی نہیں سکتا اور تمہاری خاموشی برداشت بھی نہیں کرسکتا۔ میں نے اچھا کیا یا برا کیا' مان لو کہ تمہارے اور پپو کے شاندار مستقبل کے لیے کیا۔ کیا تم کہہ سکتی ہو کہ میں ایک محبت کرنے والا خاوند اور ایک ذمے دار باپ نہیں ہوں؟"

عذرا نے ایک گہری سانس لی پھر کہا "آپ نے میرے اکاؤنٹ میں پندرہ لاکھ روپے جمع کیے ہیں مجھے ایک دولت مند بیوی بنادیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولا "یہ تو کچھ نہیں ہے۔ جلدی ہی پندرہ کے تیس ہوجائیں گے۔"

"آگے نہ بولیں۔ اتنا بتادیں' پندرہ لاکھ روپے کے لیے کتنی سہاگنوں کو بیوہ بنایا ہے؟"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" اس نے بے اختیار اونچی آواز میں ڈانٹ کر آگے بھی کچھ کہنا چاہا پھر عقل آگئی کہ دوسرے لوگ سنیں گے۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے مین روڈ پر آیا پھر آگے بڑھتے ہوئے کہا "ہم پہلے پپو کو لیں گے پھر ایک دوست کے گھر جائیں گے۔ وہیں میں تم سے بات کروں گا۔"

"میں آپ کے کسی دوست کے گھر نہیں جاؤں گی۔ وہ گھر آپ کے والد نے حلال کی کمائی سے بنایا تھا۔ اسی گھر میں جاؤں گی اور حرام کی کمائی کا جتنا قیمتی سامان اور ائرکنڈیشنر وغیرہ ہے' وہ سب نکال کر باہر پھینک دوں گی۔"

"یعنی تم مجھے بھی اس گھر سے نکال کر پھینک رہی ہو؟"

"وہ آپ کا گھر ہے لیکن آپ نے اپنے ہی گھر کو اپنے رہنے کے قابل نہیں رہنے دیا۔ وہاں جاتے ہی گرفتار ہوجائیں گے۔ آپ کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے لیکن میں بیوی ہوں۔ آپ کے بچے کی ماں ہو' کس دل سے آپ کو نقصان پہنچنے والی بات سوچوں؟ آپ مجھے اور پپو کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔"

"عذرا ضد نہ کرو۔ میرے دوست کا مکان بہت بڑا ہے۔ ہم آرام سے چھپ کر رہیں گے۔"

"میرا معصوم بچہ مجرم نہیں ہے۔ وہ کیوں چھپ کر رہے گا؟ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ میں کیوں چھپ کر رہوں گی؟"

"صاف کہہ دو کہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو۔"

"آپ ایک باپ کی حیثیت سے جواب دیں' کیا بیٹے کو ایک دہشت گرد کے سائے میں رکھنا چاہیے؟ کیا اسے مستقبل کا دہشت گرد بنانا چاہیے؟"

اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں ناکا بندی کی گئی تھی۔ اب وہ راستہ کھل گیا تھا۔ مطلوبہ دہشت گرد گرفتار ہوگئے تھے۔ میڈم نے دیدار کے مکان کا جو پتا نوٹ کرایا تھا' وہ اس کے مطابق اس مکان کے سامنے پہنچ گئے۔

عذرا نے جیپ سے اتر کر اس مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ دیدار کی ماں نے اسے دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہے بیٹی؟"

"دیدار آج پہلی بار میرے بیٹے کو اسکول لے گیا تھا۔ میرا بیٹا ابھی تک گھر نہیں آیا ہے' آخر وہ پپو کو لے کر کہاں گیا ہے؟"

"بیٹی! وہ تو پپو کے ساتھ یہاں تھا۔ ناکا بندی میں پھنس گیا تھا۔ ابھی پندرہ منٹ پہلے وہ پپو کو تمہارے گھر پہنچانے گیا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے' میرا بیٹا خیریت سے ہے۔ شکریہ اماں!"

وہ واپس آکر جیپ میں بیٹھ گئی پھر بولی "آپ نے سن لیا' اماں کیا کہہ رہی تھیں؟"

"ہاں۔ ہمارا بیٹا اپنے گھر پہنچنے والا ہے۔"

اس نے جیپ اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔ عذرا نے کہا۔ "پپو وہاں پہنچنے والا ہوگا مجھے بھی فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔"

"ہوں۔ میں کسی ٹیکسی اسٹینڈ کے پاس تمہیں اتار دوں گا۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر عذرا نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ "آپ کہاں جائیں گے؟"

"یہ نہ پوچھو۔ اب تم پپو کو لے کر میرے پیچھے آؤ گی تو پولیس والے تمہارے پیچھے آئیں گے۔ تم اسی گھر میں رہو۔"

وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جیپ آہستہ آہستہ چلتی رہی پھر وہ بڑے دکھ سے بولی "یہ آپ کیا کر بیٹھے ہیں؟ آپ ہمارا مستقبل شاندار بنانا چاہتے تھے۔ کیا آپ کے بغیر بیٹا خوش رہ سکے گا۔ پورے محلے میں ہم ماں بیٹے کو ایک دہشت گرد کی بیوی اور بیٹا کہا جائے گا۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے مگر آپ کا نام رہے گا' ناموں دادا......."

اس نے ایک ٹیکسی اسٹینڈ کے پاس جیپ روک کر کہا "ابھی یہاں بیٹھو۔ پندرہ منٹ انتظار کرو۔ پپو وہاں پہنچ جائے گا تو تم خالہ کو فون کر کے پپو کی خیریت بھی معلوم کرو اور پولیس محاصرے کے بارے میں بھی پوچھو کہ وہاں میرے خلاف کیا کارروائی ہو رہی ہے؟"

وہ تھوڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے آنچل میں منہ چھپالیا۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ وہ سسک رہی تھی اور آنسو چھپا رہی تھی۔

☆=========☆=========☆

پولیس نے کچھ اس طرح آکر ناموں دادا کے مکان کا محاصرہ کیا تھا کہ پورے علاقے میں کھلبلی پیدا ہوگئی تھی۔ لوگ دور دور سے آکر دیکھ رہے تھے اور یہ معلوم ہونے پر حیران ہو رہے تھے کہ جسے وہ برسوں سے نسیم احمد سمجھتے رہے' وہ بدنام دہشت گرد ناموں دادا ہے۔

پولیس والے اس کے بارے میں انکوائری کر رہے تھے اور اس کے مکان کے ایک ایک حصے کی تلاشی لے رہے تھے۔ کوئی ہتھیار وغیرہ برآمد نہیں ہوا۔ افسر نے محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا۔ چند سپاہیوں کی ڈیوٹی لگادی کہ وہ باری باری دن رات اس مکان کے آس پاس رہیں اور جب بھی ناموں دادا آئے' اسے گرفتار کرلیں۔

ایسے وقت دیدار بچے کو اپنی سوزوکی میں لے آیا۔ محلے پڑوس کی عورتیں اس کی طرف آنے لگیں۔ اس نے بچے کو اگلی سیٹ سے اتارتے ہوئے پڑوسن سے کہا "اس گھر میں تو پولیس والے ہیں۔ بچے کی ماں کہاں ؟"

پڑوسن نے کہا "وہ اپنے بچے کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔"

دیدار نے کہا "مجھے افسوس ہے۔ میں بچے کو وقت پر نہ لا سکا۔ میرے علاقے کی

ناکہ بندی ہوئی تھی۔ تمام راستے بند ہوگئے تھے۔ جیسے ہی راستہ کھلا' میں اسے لے آیا لیکن اس کی ماں تو نہیں ہے۔"

پڑوسن نے حیرانی سے پوچھا "یہ تم کس کا بچہ لے آئے ہو' پپو کہاں ہے؟"

دیدار نے کہا "یہی تو پپو ہے۔"

"کیا اندھے ہوگئے ہو؟ صبح یہاں سے پپو کو لے کر گئے تھے اور واپسی میں دوسرے بچے کو لاکر کہہ رہے ہو' یہ پپو ہے۔"

پولیس افسر نے آکر پوچھا "کیا بات ہے؟"

ایک خاتون نے کہا۔ "یہ ڈرائیور صبح یہاں سے عذرا کے بیٹے پپو کو لے گیا تھا اور یہ دوسرا بچہ واپس لا کر دے رہا ہے۔"

افسر نے پوچھا "یہ اس گھر سے لے گیا تھا۔ یعنی یہ ناموں دادا کا بیٹا ہے؟"

"آپ نسیم کہیں یا ناموں کہیں' یہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔ اس ڈرائیور نے بچہ بدل دیا ہے۔"

افسر نے پوچھا "یہ بچہ کہاں سے لائے ہو؟"

"سن رائز گرامر اسکول کے بچے لاتا لے جاتا ہوں۔ آج میری عینک ٹوٹ گئی۔ پھر پپو کو پہلے دن اسکول لے گیا تھا اس لیے اس کی صورت اچھی طرح یاد نہیں رہی مگر یہ اسی اسکول کا بچہ ہے۔"

افسر نے اس کی نکٹائی اور شرٹ کا مونوگرام پڑھ کر کہا "ہاں یہ اسی اسکول کا بچہ ہے۔"

پڑوسن نے پوچھا "تو پھر پپو کہاں ہے؟"

دیدار نے کہا "پپو اسکول میں رہ گیا ہوگا۔"

"وہ اسکول میں نہیں ہے۔ اس کی ماں بڑی دیر سے اسکول میں بیٹھی اپنے بچے کا انتظار کر رہی ہے۔"

افسر نے اپنے ماتحت سے کہا "اس کے ساتھ بچے کو لے کر اسکول جاؤ اور معلوم کرو' یہ کس کا بچہ ہے اور جس بچے کو یہاں لانا چاہیے تھا' وہ کہاں رہ گیا ہے۔"

اس ماتحت افسر نے دو سپاہیوں کو بھی اپنے ساتھ سوزوکی میں بٹھایا پھر دیدار اور بچے کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

فون والی خالہ اپنے گھر آئی تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر کہا "ہیلو کون؟"

"خالہ! میں عذرا بول رہی ہوں۔ کیا پپو وہاں پہنچ گیا ہے؟"

"اے بیٹی! پتا نہیں تمہارے نصیب میں کیوں بھٹکنا لکھا ہے۔ وہ سوزوکی ڈرائیور ا
تھا۔ خدا جانے کس کا بچہ لے آیا تھا' اسے پپو کہہ رہا تھا۔"

"کیا وہ میرا پپو نہیں تھا؟"

"نہیں۔ دوسرا بچہ تھا۔ سارا محلہ پپو کو پہچانتا ہے۔ سبھی نے اس بچے کو دیکھ کر
پوچھا' پپو کہاں ہے؟ پولیس افسر نے بھی پوچھا۔"

"وہ ڈرائیور کیا کہہ رہا تھا؟"

"اس کی عینک ٹوٹ گئی تھی۔ پپو کو صرف ایک بار صبح دیکھا تھا اس لیے پہچاننے میں
غلطی ہوگئی ہے۔ دوسرے بچے کو پپو سمجھ کر اٹھالیا ہے۔"

"تو پھر میرا پپو کہاں ہے؟ وہ تو اسکول میں بھی نہیں ہے۔"

"ہوسکتا ہے' ان والدین کے پاس ہو جن کا بچہ سوزوکی ڈرائیور لیے گھوم رہا ہے۔"

"وہ ڈرائیور کہاں ہے؟"

"ایک پولیس افسر ڈرائیور اور بچے کو اسکول لے گیا ہے۔ اس بچے کے والدین کا
چلے گا تو تمہارے پپو کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوسکے گا۔"

عذرا نے موبائل فون بند کردیا۔ نسیم نے کہا "یہ کیا ہورہا ہے؟ وہ ڈرائیور کس کے
بچے کو پپو کہہ رہا ہے؟"

وہ روتے ہوئے بولی "وہ کسی کا بھی بچہ ہو' ہمارا بیٹا کہاں ہے؟"

"روتی کیوں ہو؟ وہ مل جائے گا۔ ہم ابھی اس سوزوکی ڈرائیور کو پکڑیں گے۔
بدل گئے ہیں' آنسو پونچھو' پپو مل جائے گا۔"

اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔ عذرا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اسکول چلیں۔ ایک
پولیس افسر اس ڈرائیور اور بچے کو اسکول لے گیا ہے۔"

وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا "وہاں پولیس ہوگی۔ میں نہیں
جاسکوں گا۔ وہیں اسٹوڈنٹ بریانی کے سامنے تمہارا انتظار کروں گا۔ میرا موبائل فون نمبر
رکھو' کوئی بھی ضروری بات ہو' مجھ سے رابطہ کرلینا۔"

اس نے نمبر بتائے۔ عذرا نے لکھ لیے۔ آگے ٹریفک رکا ہوا تھا۔ نسیم راستہ بدل کر
ایک لمبا چکر کاٹ کر جانے لگا۔ اس راستے پر وہی جگہ آئی' جہاں بم کے دھماکے سے مکان
تباہ ہوا تھا اور عظمت اللہ شاہ اپنی کار کے پاس کھڑے پوتے کی لاش کے برآمد ہونے
انتظار کررہے تھے۔

وہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ نسیم کو جیپ کی رفتار سست کرنی پڑی۔ عذرا نے پوچھا
"وہاں بھیڑ کیوں ہے؟"

نسیم نے کہا۔ "وہ جو کھنڈر دکھائی دے رہا ہے' وہاں ایک مکان تباہ کردیا گیا ہے۔"

سپاہی راستہ روک رہے تھے۔ دوسرے راستے پر جانے کو کہہ رہے تھے۔ نسیم نے
رکتے ہوئے شاہ صاحب کو دیکھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "اوہ۔ جج عظمت
شاہ۔"

عذرا نے کہا "جج عظمت اللہ.......... ہاں بے چاروں کے گھر ماتم ہورہا ہوگا۔ پپو کے
اسکول سے ان کے پوتے کو اغوا کیا گیا ہے۔"

اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ ہیں جج صاحب۔"

اس نے بڑی لگن سے شاہ صاحب کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "نسیم! راستہ رکا ہوا ہے
جج صاحب سے ہمدردی کے دو بول' بول کر آتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھی رہو' ابھی آگے جانے کا راستہ مل جائے گا۔"

"ان کا پوتا ہمارے بیٹے کے اسکول سے اغوا ہوا ہے۔ پلیز ایک منٹ۔"

وہ جیپ سے اتر کر تیزی سے چلتی ہوئی شاہ صاحب کے سامنے آئی پھر ہاتھ اٹھا کر کہا
"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

"سر! میرا بیٹا بھی سن رائز میں پڑھتا ہے۔ میں نے آپ کے پوتے کے بارے میں سنا
ہے۔ کیا وہ واپس مل گیا؟"

شاہ صاحب نے گہرے دکھ سے اسے دیکھا پھر کہا "مل گیا' وہ وہاں ہے۔"

انہوں نے ملبے کی طرف اشارہ کیا۔ عذرا نے حیرانی سے دیدے پھاڑ کر اُدھر دیکھا
پریشان ہو کر پوچھا "آ.......... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

ایک افسر نے کہا "بی بی! آپ ادھر آئیں۔"

وہ عذرا کو ایک طرف لے جا کر بولا "ظالموں نے اس بچے کو اس مکان میں قید کیا
اب ملبے سے اس کی لاش نکالی جارہی ہے۔"

"نہیں!" وہ چیخ پڑی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ "یہ کیسا ظلم ہے؟ اس
بچے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ کیوں مار ڈالا اسے؟ اسے کیوں مار ڈالا؟"

وہ دیوانہ وار ایسے چیخنے لگی جیسے اس کی اپنی کوکھ اجڑ گئی ہو۔ افسر اسے سمجھاتا اور
تسلیاں دیتا ہوا دور لے گیا "بی بی! شاہ صاحب اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ آپ کو ان کے

سامنے یوں نہیں رونا چاہیے۔"

اسی وقت ملبے کی طرف سے ایک سپاہی نے اونچی آواز میں کہا "مل گئی۔"

پھر ایک بار یہی سمجھ میں آیا کہ بچے کی لاش مل گئی ہے۔ وہ ملبے کی طرف آئے۔ عذرا نے بھی آکر دیکھا۔ سپاہی کے ہاتھ میں ایک بچے شرٹ تھی۔ افسر نے اس شرٹ کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ عذرا نے کہا "یہ تو سن رائز گرامر اسکول کا یونیفارم ہے۔ میرے پپو کی شرٹ بھی ایسی ہے۔"

اس نے افسر سے وہ شرٹ لے کر دیکھی۔ افسر نے کہا۔ "بی بی! آپ ہماری کارروائی میں مداخلت نہ کریں۔ یہ شرٹ مجھے دیں۔"

وہ اسے واپس دیتے رک گئی۔ شرٹ کے دامن پر ایک ننھا سا دھبا لگا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پپو کی شرٹ کے دامن میں بھی ٹھیک اسی جگہ دھبا تھا۔ اچھی طرح دھونے کے باوجود مٹ نہ سکا تھا۔ عذرا نے سوچا تھا کہ کوئی بات نہیں، دامن نیکر کے اندر رہے گا، دھبا دکھائی نہیں دے گا۔

عذرا نے اس شرٹ کو نیکر کے اندر کر کے اس دھبے کو چھپا دیا تھا۔ کیا دو بچوں کی مختلف شرٹس میں ایک ہی جگہ ایک جیسے دھبے ہو سکتے ہیں؟

وہ خیالات سے چونک گئی۔ افسر نے اس کے ہاتھ سے شرٹ چھین کر سپاہی سے کہا۔ "بی بی کو یہاں سے لے جاؤ۔"

وہ خود ہی پلٹ کر بوجھل قدموں سے جانے لگی۔ جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، ملبے کے نیچے سے دو ننھے ہاتھ اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک رہے ہیں مگر وہ ملبے سے دور آگئی۔ اس نے شاہ صاحب کے سامنے ایک ذرا رک کر انہیں دکھ اور ہمدردی سے دیکھا پھر سر جھکا کر تیزی سے دوڑتی ہوئی آکر جیپ میں بیٹھ گئی۔

نسیم نے جیپ اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں احساس ہے کہ تم مجھے مصیبت میں پھنسا کر گئی تھیں۔ پولیس والے مجھ سے ذرا دور تھے۔ پہچان لیتے تو ابھی میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں۔ شکر ہے کہ مجھے صورت سے کوئی پہچانتا نہیں ہے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کا دل اور دماغ اس ملبے کی طرف تھا اور وہ شرٹ اسے پکار رہی تھی۔

نسیم کہہ رہا تھا۔ "میں حیران ہوں، پولیس کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں ہی ناموں دادا ہوں اور کس نے انہیں میرے گھر کا پتا بتایا ہے؟ میری اصلیت صرف ایک شخص جانتا

"کیا وہ پولیس کسٹڈی میں ہے؟"

اس نے بڑبڑاتے ہوئے عذرا کو دیکھا پھر حیرانی سے بولا۔ "تم رو رہی ہو؟ کیا بات ہے؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "ملبے سے بچے کی جو شرٹ نکلی، وہ پپو کی شرٹ جیسی ہے۔"

"وہ تو ہو گی۔ ایک اسکول کے تمام بچوں کے یونیفارم ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"اس شرٹ کے دامن میں بالکل ویسا ہی دھبا لگا ہوا تھا جیسا کہ ہمارے پپو کی شرٹ میں ہے۔"

"ریڈی میڈ یونیفارم فروخت کرنے والے دکان دار کتنے ہی کپڑوں پر دھبے لگا دیتے ہیں مگر تم کیوں رو رہی ہو؟"

"کیا دوسرے بچے کی چیز دیکھ کر اپنا بچہ یاد نہیں آتا؟"

"بھئی تم اسکول جا رہی ہو، بچہ مل جائے گا۔"

وہ اسٹوڈنٹ بریانی کے سامنے پہنچ گئے۔ وہ اتر کر جانے لگی۔ نسیم نے تھوڑی دور تک ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "میں بے چینی سے فون کا انتظار کرتا رہوں گا۔ کوئی بات ہو تو فوراً رابطہ کرنا۔"

وہ رک گیا۔ عذرا ایک موڑ مڑتی ہوئی اسکول کے آہنی گیٹ کے سامنے آئی۔ بڑا گیٹ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کئی مسلح سپاہی جگہ جگہ نظر آرہے تھے۔ وہ اسکول کی عمارت میں داخل ہو کر میڈم کے کمرے میں آگئی۔

وہاں میڈم اور تین ٹیچرز بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ "کیا دیدار نہیں آیا ہے؟"

میڈم نے کہا۔ "وہ ایک پولیس افسر کے ساتھ آ رہا ہے۔ افسر نے فون پر بتایا ہے کہ دیدار نے بچے کو پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ وہ یہاں سے تمہارے بیٹے کی جگہ کسی اور کے بیٹے کو لے گیا ہے۔"

عذرا نے کہا۔ "میں محلے میں فون کر کے معلوم کر چکی ہوں۔ دیدار کے پاس میرا بیٹا نہیں ہے۔ وہ اسکول میں بھی نہیں ہے، پھر کہاں ہے؟"

"فی الحال یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ جو بچہ دیدار کے پاس ہے اس بچے کے والدین بھی غلطی سے لے گئے ہیں۔"

"وہ کیسے والدین ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو نہیں پہچانا۔ اس کی جگہ میرے بیٹے کو

لے گئے؟"

"آپ کے سوال کا جواب وہ والدین ہی دے سکیں گے۔"

اسکول کے احاطے میں سوزوکی آ کر رکی۔ دیدار اور پولیس افسر اس بچے کو لے
میڈم کے پاس آئے۔ افسر نے پوچھا۔ "آپ اس بچے کو پہچانتی ہیں؟"

میڈم اور ٹیچرز اسے غور سے دیکھنے لگیں۔ الگ الگ کلاس کی ٹیچرز نے اسے نہ
پہچانا۔ میڈم نے کہا۔ "دراصل اس کا نیا ایڈمیشن ہوا ہے اور یہ آج پہلی بار آیا ہے۔
بچوں کے درمیان ایک نئے بچے کی صورت پہلے دن یاد نہیں رہتی۔"

افسر نے پوچھا۔ "آج نئے ایڈمیشن والے کتنے بچے آئے تھے؟"

"صرف دو بچے۔ ایک تو یہ عذرا خاتون ہیں۔ ان کا بیٹا گم ہے' اس کا پتا نہیں چل
رہا ہے۔ دوسرا بچہ جج صاحب کا پوتا تھا' جسے بدمعاش اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"کیا آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے پوتے کو اٹھا
لے گئے تھے؟"

"وہ بچہ مس صابرہ کی کلاس میں کھیل رہا تھا۔ انہوں نے ان پر تشدد کیا تھا۔ یہ مس
صابرہ ہیں۔"

افسر نے صابرہ سے پوچھا۔ "وہ بچہ پہلی بار اسکول آیا تھا۔ آپ اسے کیسے پہچان رہی
تھیں کہ وہی جج صاحب کا پوتا ہے؟"

"جج صاحب کے پوتے کا نام ثناء اللہ عرف سنی تھا اور اس نام کا بیگ میری کلاس
میں رکھا تھا اور کوئی دوسرا بیگ اور دوسرا بچہ نہیں تھا۔"

مس صابرہ نے سنی کا بیگ اٹھا کر میڈم کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے سنی
بیگ۔"

اس بچے نے بیگ کی طرف دیکھا پھر ادھر انگلی اٹھا کر کہنے لگا۔ "ٹافی...... ٹا
دو......"

"یہ بیگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کیا اس میں ٹافی ہے؟"

مس صابرہ نے کہا۔ "پتا نہیں۔ میں نے بیگ کھول کر نہیں دیکھا ہے۔"

افسر نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں چار ٹافیاں تھیں۔ سب نے حیران ہو کر
کو دیکھا۔ افسر نے کہا۔ "یہ اپنا بیگ پہچان رہا ہے۔ یہ سنی ہے۔ شاہ صاحب کا پوتا ہے"

عذرا کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ ابھی سنی کی شرٹ دیکھ کر آئی تھی' جو ملبے
سے نکلی تھی۔ سنی کو بھی مردہ اس ملبے سے نکلنا تھا لیکن وہ زندہ سب کے درمیان کھ

ک ٹافی چوس رہا تھا۔

افسر نے میڈم سے پوچھا "آپ کے پاس شاہ صاحب کا فون نمبر ہے؟"

"ان کے گھر کا نمبر ہے۔"

"پلیز آپ ڈائل کریں۔"

میڈم نے ٹیلی فون ڈائری میں نمبر دیکھے پھر وہ نمبر ڈائل کر کے ریسیور افسر کو دیا۔
ی طرف سے آواز آئی۔ افسر نے کہا۔ "میں پولیس افسر بول رہا ہوں۔ شاہ صاحب
بات کرائیں۔"

"وہ نہیں ہیں۔"

"بیگم صاحبہ کو فون دیں۔"

"وہ صدمے سے نڈھال ہیں۔ کسی سے بات نہیں کریں گی۔"

"کسی بھی طرح ان سے بات کرائیں۔ بہت ضروری کام ہے۔"

تھوڑی دیر بعد آواز آئی۔ "میں بیگم شاہ ہوں' فرمائیے؟"

"ہم سنی کی نمایاں شناخت چاہتے ہیں۔ اس کے جسم پر کہیں کوئی پیدائشی نشان یا
چوٹ کا گہرا نشان ہے؟"

"اس کے بائیں کان کے پیچھے ایک بڑا سا مسا تھا اور دائیں گھٹنے پر چوٹ کا نشان تھا۔
زخم تھا' وہ بھر گیا تھا۔ نشان رہ گیا تھا۔" انہوں نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

"پلیز' آپ ایک منٹ ہولڈ کریں۔"

اس نے ریسیور ایک طرف رکھ کر بچے کی طرف جھک کر بائیں کان کے پیچھے دیکھا۔
ایک بڑا سا مسا تھا اور گھٹنے پر بھی زخم کا نشان نظر آ گیا۔

اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر کہا۔ "بی بی! آپ لوگوں کے لئے بہت بڑی
خبر ہے۔ شاہ صاحب کا پوتا سنی زندہ ہے۔"

"کیا؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا میرا بچہ اس ملبے سے زندہ نکل آیا ہے؟"

"آپ کا پوتا ملبے میں نہیں تھا۔"

عذرا سکتے کے عالم میں یہ باتیں سن رہی تھی۔ اس کے دماغ میں ایسی شدت سے
سائیں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں جیسے ہوا آندھی کی رفتار سے چل رہی ہو۔

بیگم شاہ نے فون پر پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"بیگم صاحبہ! میں ایک پولیس افسر ہوں۔ پوری ذمے داری سے کہہ رہا ہوں' آپ
سنی زندہ ہے۔ یہاں اسکول میں میڈم کے پاس ہے۔ آپ خود ان سے بات

کریں۔"

میڈم نے ریسیور لے کر کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کو پوتے کی نئی زندگی مبارک ہو۔ آپ کا پوتا ثناء اللہ عرف سنی یہاں میرے پاس ہے۔ آپ اس کی آواز سنیں۔"

میڈم نے اس اپنے پاس بلایا۔ "سنی بیٹے! ادھر آؤ۔"

وہ قریب آیا تو اس کے کان سے ریسیور لگا کر بولی۔ "اپنی دادی سے بات کرو۔ ہیلو کہو۔"

اس نے کہا۔ "ہیلو' گرینڈ مام!"

"میرے لال! میرے جگر کے ٹکڑے' میں ابھی آ رہی ہوں۔"

میڈم نے ریسیور اپنے کان سے لگا کر کہا "آپ فوراً یہاں آجائیں اور شاہ صاحب کو بھی یہ خوش خبری سنادیں۔"

بیگم نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر شاہ صاحب کے موبائل نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا "ہیلو! آپ بول رہے ہیں شاہ صاحب' آپ بول رہے ہیں؟"

"ہاں میں ہوں۔ بیگم! میرا خیال ہے تم........"

بیگم نے بات کاٹ کر کہا "آپ کچھ نہ بولیں۔ خوش خبری سنیں' ہمارا سنی زندہ اور اسکول میں ہے۔ میں اسے لینے جارہی ہوں۔ آپ فوراً وہاں پہنچیں۔"

"بیگم! یہ تم کیسی ناممکن بات کہہ رہی ہو؟ صدمات نے تمہیں متاثر کیا ہے۔"

"خدا کی قسم! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ میڈم کو فون کرکے معلوم کرلیں۔"

بیگم نے انہیں فون نمبر بتایا پھر رابطہ ختم کردیا۔ جنید نے پوچھا۔

"ڈیڈ! کیا بات ہے' ممی تو ٹھیک ہیں؟"

"بیٹے! وہ کہہ رہی ہیں کہ سنی زندہ ہے اور اسکول میں ہے۔"

"کیا؟" جنید اور آس پاس کھڑے ہوئے پولیس افسران اور سپاہی وغیرہ چونک گئے۔ شاہ صاحب موبائل کے ذریعے رابطہ کرنے لگے۔ تمام لوگوں کی نظریں ملبے کی طرف تھیں۔ سب ہی یہ سوچ رہے تھے' اس ملبے کے نیچے سنی نہیں ہے تو پھر اسی اسکول کا دوسرا بچہ کون ہے؟

شاہ صاحب نے کہا "ہیلو میڈم! میں عظمت اللہ شاہ بول رہا ہوں۔ کیا وہاں میرا ثناء اللہ عرف سنی ہے؟"

میڈم نے کہا "شاہ صاحب! آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کا پوتا زندہ ہے؟ یہاں میرے پاس ہے۔"

"میں ابھی آرہا ہوں۔"

انہوں نے فون بند کرکے خوشی سے کانپتے ہوئے کہا "بیٹے! ہمارا سنی زندہ ہے۔ ل میں ہے۔ جلدی چلو' تمہاری ممی بھی وہاں گئی ہیں۔"

وہ کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ وہ ایسے ملبے کے پاس کھڑے رہے تھے جو کا مدفن سمجھا جارہا تھا۔ ابھی وہاں سے لاش برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ہی سنی ل سے برآمد ہو رہا تھا۔ اب وہ لاش ایک معما تھی کہ وہ کس بچے کی ہے؟

اسکول میں پہلے بیگم شاہ اپنی بہو شازیہ کے ساتھ وہاں پہنچیں پھر سنی کو دیکھتے ہی ی سے چیخ مار کر اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا پھر اسے چوم چوم کر رونے لگیں۔

اسی وقت شاہ صاحب اور جنید بھی پہنچ گئے۔ شاہ صاحب کی آنکھیں خوشی سے گئیں۔ شازیہ اور جنید اپنے بیٹے کو پیار کرنے لگے۔ مُردہ' زندہ ہو کر چلا آئے تو اس عزیز و اقارب کی خوشیوں کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ ان کی خوشیاں دیکھ کر دوسرے خوش ہو رہے تھے۔

پھر سب ہی ایک دم سے چونک گئے۔ سب سے پیچھے دیوار سے لگی ہوئی عذرا نے کر پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

سب نے ادھر دیکھا' وہ بولی۔ "میرا بیٹا کہاں ہے؟ کہاں ہے میرا پپو؟"

اس نے آگے بڑھ کر دیدار کا گریبان پکڑ لیا۔ "کہاں ہے میرا بچہ؟ ہم مائیں تمہارے ڈرائیوروں پر بھروسا کرتی ہیں۔ اپنے جگر کا ٹکڑا تمہارے حوالے کرتی ہیں تم میری ت لے گئے تھے۔ امانت میں خیانت نہ کرو۔ میرا بچہ لاؤ' کہاں ہے وہ؟"

دیدار نے کہا "باجی! میں انسپکٹر صاحب کے سامنے وضاحت کرچکا ہوں۔ ایک جگہ نگ ہو رہی تھی۔ وہاں بھگدڑ میں میری عینک ٹوٹ گئی۔ اسکول کی چھٹی کا وقت ہوچکا میں بچوں کو لینے اسکول آگیا۔ میں نے آپ کے بیٹے کو صرف ایک بار صبح دیکھا تھا۔ ری بار عینک کے بغیر میں نے شاہ صاحب کے پوتے کو پپو سمجھ لیا۔ میں نے اسے پپو کر بلایا تو یہ میرے پاس دوڑتا ہوا آگیا۔ آپ خود دیکھیں۔"

سنی ماں باپ کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ دیدار نے اس کی طرف دونوں بازو پھیلا کر "پپو! آؤ' آجاؤ پپو!"

وہ دوڑتا ہوا دیدار کے پاس آگیا۔ بیگم شاہ نے کہا "یہ اس کی عادت ہے' جو پیار بلاتا ہے' اس کے پاس چلا جاتا ہے۔ ہم گھر میں اسے پپو بھی کہتے ہیں۔"

شاہ صاحب نے پوچھا "تم ان خاتون کے بچے کے دھوکے میں ہمارے پوتے کو لے

گئے۔ سوال یہ ہے کہ ان خاتون کا بیٹا کہاں ہے؟"

میڈم نے کہا "آج نئے دو بچے اسکول آئے تھے۔ ایک سنی' دوسرا پپو۔ دونوں ہم جماعت اور ہم عمر ہیں۔ دیدار' پپو کے دھوکے میں سنی کو لے گیا اور وہ دہشت گرد ی کے دھوکے میں پپو کو لے گئے تھے۔"

"ہاں۔" عذرا نے چیخ کر کہا "وہ میرے بیٹے کو لے گئے تھے۔ میں بہت دیر سے اس حقیقت کو سمجھ رہی ہوں اور بہت دیر سے اپنے اندر انکار کر رہی ہوں کہ جو شرٹ میں نے ملبے میں دیکھی تھی' وہ میرے بیٹے کی نہیں ہے لیکن اس شرٹ کے دامن میں ایسا دھبا ہے جو میرے بیٹے کی شرٹ میں تھا۔ آہ!........ آہ.........!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے جھک گئی۔ فرش پر گھٹنے ٹیک دیئے۔

شاہ صاحب نے بڑے دکھ سے کہا "یاخدا! یہ کیا ہوگیا؟ وہ معصوم ہمارے پوتے پر قربان ہو گیا ہے۔"

بیگم شاہ' عذرا کے پاس آکر گھٹنے ٹیک کر بولیں "تم میری بیٹی کی طرح ہو۔ خدا جانتا ہے۔ ابھی ہم جس قدر خوش ہو رہے تھے اتنا ہی اندر سے ہمارا دل کٹ رہا ہے۔ ہمارے پاس زبان نہیں ہے' الفاظ نہیں ہیں' ہم بیان نہیں کرسکتے کہ اپنے پوتے کو زندہ پاکر خود کو کس طرح مجرم سمجھ رہے ہیں۔"

میڈم نے کہا "خدا ان دہشت گردوں کو غارت کرے۔ کیا ان کے بچے نہیں ہوتے؟ کیا ان کے بچے بھی ہلاک نہیں ہوتے؟؟"

عذرا کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے چونک کر سر اٹھا کر میڈم کو دیکھا۔ ایک د سے فرش سے اٹھ کر ٹیلی فون کے پاس آئی۔ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ رابطہ ہوتے ہی وہ چیخ کر بولی "ناموں دادا! میری آواز سن رہے ہو؟"

نسیم نے گھبرا کر پوچھا "تم چیخ کر مجھے ناموں دادا کیوں کہہ رہی ہو؟"

"اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تم میرے مجازی خدا نسیم ہو مگر اپنے بیٹے کے قاتل ناموں دادا ہو۔ میرے پپو کو تم نے مجھ سے چھین لیا ہے۔ جس ملبے کے پاس ہم گئے ت وہاں جج صاحب کا پوتا نہیں ہمارا بیٹا دفن ہے۔ سن رہے ہو۔ تم دوسرے بچوں کے گڑھا کھودتے رہتے تھے۔ آج اس گڑھے میں ہمارے بچے کی لاش پڑی ہے۔ کیا اپ بچے کی لاش وہاں سے نہیں نکالو گے؟

"مگر کیسے نکالو گے؟ وہاں جاؤ گے تو پولیس تمہیں گرفتار کرلے گی اور تم ابھی گرفت

نہیں چاہتے۔ ابھی آزاد رہ کر کچھ اور بچوں کو مارنا چاہو گے۔ تم بچوں کی لاشیں گرا کر بچے کے لیے قیمتی کھلونے لاتے تھے۔ اب کس کے لیے لاؤ گے۔ تم تو پولیس کے سے اپنے بچے کا آخری دیدار بھی نہیں کرسکو گے۔ جاؤ' منہ چھپاؤ۔ میں اپنے بیٹے پاس جا رہی ہوں۔"

وہ ریسیور پھینک کر دوڑتے ہوئے کمرے باہر چلی گئی۔

بیگم شاہ نے کہا "اسے روکو۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔"

انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا "خاتون کو روکو' جانے نہ دو۔"

باہر کھڑے ہوئے سپاہیوں نے اسے روکنا چاہا مگر وہ بھاگتی جا رہی تھی۔ انہوں نے پکڑ لیا' وہ چیخنے لگی۔ "مجھے جانے دو' میرا بچہ وہاں اکیلا پڑا ہے۔ مجھے جانے دو' چھوڑ مجھے چھوڑ دو۔"

وہ حلق پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ خود کو چھڑانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ شدت سے چیخنے جیسے دماغ کی رگیں پھٹ گئی ہوں' وہ چکرا کر سپاہیوں کی گرفت میں جھول گئی۔ ں نے اسے زمین پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

انسپکٹر نے ایمبولینس کے لئے ایک قریبی اسپتال میں فون کیا۔ شاہ صاحب نے کہا۔ "تم سنی اور شازیہ کو لے کر گھر جاؤ۔ میں اور جنید اس خاتون کے ساتھ رہیں گے۔"

بیگم شاہ نے بے ہوش عذرا کی طرف دیکھا پھر بڑے دکھ سے کہا۔ "میں کیا کروں؟ کا بچہ کہاں سے لا کر دوں۔ بے چاری کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔"

وہ سر جھکا کر سنی اور شازیہ کے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گئیں اور ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔

ایمبولینس بھی آگئی۔ عذرا کو اس کے پچھلے حصے میں لٹایا گیا۔ دیدار اپنی سوزوکی میں شاہ صاحب اور جنید اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ پھر پولیس افسر کے ساتھ وہ قافلہ اسپتال طرف چل پڑا۔

☆==========☆==========☆
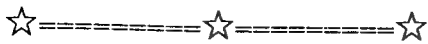
نسیم کئی منٹ تک گم صم بیٹھا رہا۔ عذرا کی دل پھاڑ دینے والی باتیں اس کے کانوں گونج رہی تھیں۔ اسے عذرا کی زبان سے بھی سن کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ دہشت ی کی راہ میں ایک دہشت گرد کا بیٹا مارا گیا ہے۔ جو ظالمانہ موت باپ کو ملنی چاہئے وہ معصوم بیٹے کو ملی تھی۔

اس نے خیالات سے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ بڑی دیر سے اسٹوڈنٹ بریانی کے

سامنے اپنی جیپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے موبائل کے ذریعے میڈم کے نمبر ملائے۔ پھر
رابطہ ہونے پر کہا۔ "میں عذرا خاتون سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کون ہیں؟"

"عذرا میری شریکِ حیات ہے۔"

"اوہ۔ سمجھی۔ وہ آپ کو ناموں دادا کہہ رہی تھی۔"

"پلیز آپ عذرا سے بات کرائیں۔"

"وہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ ان کے لئے ایمبولینس بلائی گئی ہے۔"

"او گاڈ! میں کیا کروں؟ کیا واقعی دہشت گرد میرے بیٹے کو لے گئے تھے؟"

"ہاں۔ یہ ٹریجڈی ہو چکی ہے اسی لئے بے چاری صدمہ برداشت نہ کر سکی' بے
ہوش ہو گئی ہے۔"

اس نے فون بند کر کے جیپ اسٹارٹ کی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔
گاڑی بے منزل چل رہی تھی۔ اس کے دماغ کے اندر تڑا تڑ گولیاں چل رہی تھیں۔
بموں کے دھماکے ہو رہے تھے۔ آگ کے شعلے آسمان کی بلندیوں تک جا رہے تھے۔ وہ
ڈرائیو کر رہا تھا' آنکھوں کے سامنے دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مرد' عورتیں اور بچے
دہشت زدہ ہو کر اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور اپنی جان سے جا
رہے تھے۔ نسیم احمد عرف ناموں دادا ہاتھ میں کلاشنکوف لئے قہقہے لگا رہا تھا۔

اس نے آج تک جو کچھ کیا' وہ ایک فلمی منظر کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے آ
رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی واردات کرتا تھا' قہقہے لگاتا تھا۔ کیونکہ موت کے ہر منظر کے
ساتھ اسے لاکھوں روپے ملتے تھے اور وہ لاکھوں روپے بیٹے کے شاندار مستقبل کے لئے
جمع ہو رہے تھے۔ کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ بیٹے کی
زندگی کے اکاؤنٹ میں موت کے سکے ڈالتا آ رہا تھا۔

وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک پرانے سے مکان کے سامنے پہنچا۔
رنگو دادا کا اڈا تھا۔ اس کے مسلح حواری مکان کی چھت پر پہرا دے رہے تھے۔ ایک نے
آواز دی۔ "دادا! اپنا ناموں دادا آیا ہے۔ کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔"

دادا نے کہا۔ "آنے دو۔ کوئی گڑبڑ ہوتی ہے' تب ہی یہ لوگ میرے پاس آتے
ہیں۔"

نسیم نے جیپ سے اتر کر سیٹ کے نیچے سے ایک ٹی ٹی نکال لیا پھر اسے ہاتھ میں
لئے مکان کے دروازے پر آیا۔ ایک حواری نے دروازہ کھول دیا۔ وہ تیزی سے مکان کے

مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آیا۔ وہاں رنگو دادا ایک کرسی پر
بیٹھا ہوا تھا' اس نے کہا۔ "آؤ ناموں دادا! ہمیں خبر مل گئی ہے کہ تمہارے گھر کا محاصرہ کیا
گیا تھا۔"

نسیم نے کہا۔ "میں یہ پوچھنے آیا ہوں' جج کے پوتے کو اغوا کرنے کے لئے تم نے
کن کتوں پھر بھروسا کیا تھا؟"

"جن پر بھروسا کیا تھا' وہ چاروں گرفتار ہو گئے ہیں۔"

"تمہیں پتا ہے' وہ جج کے پوتے کو اغوا نہ کر سکے۔"

"انہوں نے اغوا بھی کیا اور میرے حکم سے اس بچے کو اُڑا بھی دیا۔"

"وہ جج کا پوتا نہیں تھا۔"

"نہ ہو۔ کسی کتے کا پلا ہو گا۔ جج شاہ ہم سے نہیں بچے گا۔"

"تم نہیں بچو گے۔ تم ہو کتے کے پلے۔ یو ڈاگ! تم نے جج کے پوتے کو نہیں'
میرے بیٹے کو مار ڈالا ہے۔"

اس نے رنگو دادا کا نشانہ لیا اور دوسرے ہی لمحے ٹی ٹی کی کئی گولیوں سے اسے چھلنی
کر دیا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے حواری اور چھت پر پہرا دینے والوں نے فائرنگ کی
آواز سنی۔ ادھر دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ نسیم دوڑتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا اور
سامنے سے آنے والے حواری کو گولی مارنے کے بعد باہر آ کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس سے
پہلے کہ چھت والے نیچے اتر کر باہر آتے' وہ جیپ اسٹارٹ کر کے وہاں سے سیدھا ایس
ایس پی کے دفتر میں پہنچا اور اس سے کہا۔ "پولیس کو جس ناموں دادا کی تلاش ہے' وہ
میں ہوں۔"

ایس ایس پی نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم ناموں دادا ہو؟"

"جن افسران نے میرے گھر کا محاصرہ کیا تھا' وہ میرے ناموں دادا ہونے کی تصدیق
کریں گے۔"

"تعجب ہے' تم گرفتاری کیوں پیش کر رہے ہو؟"

"اس لئے کہ آج مجھے اپنے دہشت گرد ہونے کا یقین ہوا ہے۔ ویسے تو میرے بیٹے
کو ایک دوسرے دہشت گرد نے ہلاک کیا ہے لیکن میرے اندر یہ انکشاف ہوا کہ میں
بھی تو دہشت گرد ہوں اور دہشت گرد نہ کسی کے باپ ہوتے ہیں' نہ بھائی ہوتے ہیں اور
نہ بیٹے...... جناب! اب میرے پاس وہ چہرہ نہیں' جسے میں اپنی بیوی کو دکھا سکوں۔ بس
یہی ایک پولیس کو پیش کرنے والی صورت رہ گئی ہے۔"

اسے گرفتار کر لیا گیا۔

☆==========☆==========☆

ایمبولینس تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ تب ہی عذرا کو ہوش آ گیا۔ وہ پچھلے حصے میں لیٹی ہوئی تھی۔ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قریب ہی دو سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے کہا۔ "آپ آرام سے لیٹ جائیں۔"

"مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ میں اپنے بیٹے کے پاس جاؤں گی۔"

"ہم آپ کو اسپتال لے جا رہے ہیں۔"

"میں اسپتال نہیں جاؤں گی۔ گاڑی روکو۔ میں کہتی ہوں، گاڑی روکو۔"

سپاہیوں نے آگے بیٹھے ہوئے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ ایمبولینس کے ساتھ شاہ صاحب اور پولیس والوں کی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ ایمبولینس کا پچھلا دروازہ کھلتے ہی وہ اتنی پھرتی سے باہر آئی کہ سپاہی اسے روک نہ سکے۔ ایمبولینس سے باہر آتے ہی وہ تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگی۔

افسر نے کہا۔ "ارے کہاں جا رہی ہو؟ رک جاؤ۔ ہم تمہیں لے جائیں گے۔"

افسر نے سپاہی ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی اس کی طرف لے چلو۔"

جنید بھی اس کی طرف کار لے گیا۔ وہ فٹ پاتھ پر دوڑتی جا رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر افسر نے کہا۔ "پلیز رک جاؤ۔ ہم تمہیں گاڑی میں لے چلیں گے۔"

گاڑی اس سے آگے جا کر رک گئی۔ سپاہیوں نے گاڑی سے اتر کر اسے پکڑ لیا۔ جنید نے قریب آ کر کار روک دی۔ شاہ صاحب نے کہا۔ "تم میری بیٹی ہو۔ میری بات مان لو۔ آؤ میری گاڑی میں بیٹھو۔ ہم تمہیں وہیں پہنچائیں گے، جہاں تم جا رہی ہو۔"

سپاہیوں نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا پھر وہ اسپتال کی طرف جانے والا کارواں ملبے کی طرف جانے لگا۔

شام ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ وہ سب وہاں پہنچے۔ سپاہیوں نے ملبہ ہٹانے کا کام روک دیا تھا کیونکہ اندھیرا ہونے والا تھا۔ عذرا ملبے کی طرف دیکھتے ہوئے کار سے باہر آئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ دوپٹہ ایک شانے سے جھول رہا تھا۔ وہ صدمے سے ٹوٹ کر چل رہی تھی اور ملبے کی طرف جا رہی تھی۔

شاہ صاحب نے ایک انسپکٹر سے پوچھا۔ "لاش ابھی تک برآمد نہیں ہوئی؟"

"نہیں جناب! ملبہ بہت ہے۔ اسے ہٹانے میں ٹائم لگے گا۔"

"تو پھر کام کیوں بند کر دیا؟"

"پہلے یہاں ضرورت کے مطابق روشنی کا انتظام کیا جائے گا پھر کام شروع ہو گا۔"

وہ سب عذرا کے پیچھے چلتے ہوئے ملبے کے قریب آ گئے۔ وہاں اب بھی لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ایک بچہ دبا ہوا تھا، اسے برآمد ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ ماں کا کلیجہ اندر سے کانپ رہا تھا کہ وہ اپنے بچے کی لاش کس دل سے اور کس حوصلے سے دیکھ سکے گی؟

وہ ملبے پر آتے ہی لڑکھڑا گئی۔ گھٹنے مٹی پر ٹیک کر دو زانو ہو گئی۔ زیر لب کہنے لگی۔

"یا اللہ! مجھ سے کیا غلطی ہوئی تھی؟ مجھے اتنی بڑی سزا کیوں مل رہی ہے؟"

کیا ہم کوئی غلطی نہ کریں، تب بھی اس دنیا میں سزا ملتی ہے؟ دنیاوی قانون کے مطابق باپ کے جرم کی سزا بیٹے کو نہیں ملتی لیکن قانونِ قدرت کے مطابق باپ کے جرائم کی سزا بیٹے کو مل چکی تھی اور میاں کی غلطیوں کی سزا بیوی بھگت رہی تھی۔

شاہ صاحب اور افسران چاہتے تھے کہ اسے تسلیاں دیں۔ اسے سمجھائیں کہ جب تک لاش برآمد نہ ہو، تب تک وہاں سے ذرا دور آ کر کار میں بیٹھ جائے۔ یوں ملبے میں نہ بیٹھے لیکن ماتمی جنون کے آگے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ماتم کرنے والے خاک پر بیٹھتے ہیں اور سر پر خاک ڈالتے ہیں۔

وہ اس ملبے میں بیٹھی، اس کی تہہ میں اپنے بیٹے کو محسوس کر رہی تھی۔ اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ "وہ یہاں ہے، جہاں میں بیٹھی ہوئی ہوں، اس مٹی کے نیچے ہے۔ اوپر سے ملبہ ہٹانے میں اتنی دیر ہو گئی۔ میرا بچہ پریشان ہو گیا ہے۔ اب وہ خود ہی اپنے ننھے ہاتھوں سے مٹی ہٹا رہا ہے۔ جیسے سرنگ کھودتے ہیں، اس طرح وہ مٹی کھود کر اوپر کی طرف آ رہا ہے۔"

ہاں یہ ماں کا دل دھڑک رہا ہے۔ دھک، اور دھپ دھپ کی ملی جلی آواز ہے۔ جیسے مٹی کو دھپ دھپ کی آواز کے ساتھ ہٹایا جا رہا ہے۔

ارے اس ننھے نے ملبہ ہٹا دیا ہے۔ اس کے ننھے سے ہاتھ نظر آ رہے ہیں، وہ ملبے کی تہہ سے ابھر رہا ہے۔ مُردہ کبھی قبر سے نہیں نکلتا ہے، وہ زندہ ہے، نکل رہا ہے۔ ارے کیا کرشمہ دکھا رہا ہے؟

وہ اوپر آ چکا ہے۔ اس کے ننھے ننھے پاؤں ملبے کی ناہموار سطح پر چل رہے ہیں، وہ ڈگمگا رہا ہے۔ گرتے گرتے سنبھل رہا ہے۔ جیسے پُل صراط پر چلتا ہوا ماں کی جنت کی طرف آ رہا ہے۔

ماں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے پیچھے سے آ کر ماں کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ عذرا نے چونک کر دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے پپو کھڑا ہوا تھا۔ اس کے حلق سے ایک

مسرتوں بھری چیخ نکلی۔ "پپو! میرا بیٹا! میری جان! تم زندہ ہو۔ ماں کی تمام سانسیں تمہیں ملتی رہیں۔ میرا لال زندہ ہے۔"

مگر یہ اس کا پاگل پن تھا' ہاں وہ پاگل ہو چکی تھی!

==================

بین السطور

ایک رنگیلے پیر کی داستان ہوس۔

وہ بادشاہ گر تھا۔

جس کو تعویذ دیتا تھا اسے حکومت مل جاتی تھی۔

آنکھ تو پڑھنے کے لئے ہوتی ہے' سمجھنے کے لئے ذہن ہوتا ہے۔ اگر کوئی با
معیوب ہو تو وہ لکھی نہیں جاتی۔ پھر بھی تحریر میں نہ آنے والی چھپی ہوئی بات ذہن سم
لیتا ہے۔

مثلاً مصنف لکھتا ہے۔ "چھوٹے سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ چارو
میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے بھرے گلاس رکھے ہوئے تھے۔"

ان سطور میں یہ نہیں لکھا گیا کہ ان گلاسوں میں کیا تھا؟ مگر پڑھنے والے کا ذہن سم
لیتا ہے کہ وہ بند کمرے میں راز داری سے کیا پی رہے ہوں گے۔

اگر کچھ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو مصنف اگلی سطروں میں اپنے لکھنے کے انا
سے کچھ اور اشارے دیتا ہے اور یوں لکھتا ہے۔ "ان چاروں کے اطراف فضا میں ایک
پھیلی ہوئی تھی جو سب کے لئے بری ہوتی ہے مگر بروں کے لئے بری نہیں ہوتی۔ سگریٹ
کا دھواں اتنا زیادہ تھا کہ ان میں چاروں کے چہرے دھندلا گئے تھے۔ آدمی اور اس کا ماحو
تب ہی دھندلاتے ہیں' جب ان کے اندر آلودگی بھری ہوتی ہے۔"

قلم کار جب مجبور ہو جاتا ہے۔ کھل کر کچھ بول نہیں پاتا تو پھر لکھتا کچھ ہے اور لکھے
کے پیچھے بولتا کچھ اور ہے۔ پھر تجاہلِ عارفانہ سے کہتا ہے' پتا نہیں میں نے جنوں میں
کہہ دیا ہے۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

میر علی جسکانی نے تمام بھرے ہوئے گلاسوں کو دیکھ کر کہا۔ "پاشا بھائی! ابھی جو با
سمجھ میں آئے گی وہ تھوڑی دیر بعد ناقابلِ فہم ہو جائے گی۔ کیونکہ ہم ہوش میں نہیں
رہیں گے۔ اس سے پہلے کہ ہم موج میں آئیں اور بولنے کے قابل نہ رہیں' ہمیں ا
بات بول دینا چاہئے۔"

پاشا نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ہاں بولو' دھندا کیا ہے؟"

"نو لاکھ کی وصولی ہے۔ وہ سُور کا بچہ دو برس سے لارے لپے دے رہا ہے۔ یہ ر
بینک میں رہتی تو سُود کے ہزاروں روپے ملتے رہتے۔"

"اس کا نام اور علاقہ بتاؤ؟"

"کھوکھراپار کا بندہ ہے۔ نام ہے عبداللہ لالانی۔"

کھوکھراپار میں کوئی لکھ پتی نہیں رہتا۔ تم نے کس کنگلے کو رقم دی ہے۔ اس کا لہو
ڑنے سے بھی رقم پوری نہیں ہو گی۔"

"پاشا بھائی! وہ رقم لے کر کنگال ہو جاتا تو مجھے صبر آ جاتا یا میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ وہ
نٹرز میں لاکھوں کا کاروبار کر رہا ہے۔"

"کاروبار کیا ہے؟"

"کیکڑا مرچنٹ ہے۔ ٹن پیکس میں کیکڑوں کا گوشت محفوظ کر کے بیرونی ملکوں میں
لائی دیتا ہے۔"

"پھر تو سمجھو' رقم وصول ہو گئی۔ ہمارا ففٹی پرسنٹ ہو گا۔"

"ارے پاشا بھائی! ہوش میں رہ کر بولو' تم پہلے گلاس میں آؤٹ ہو رہے ہو۔"

پاشا کے ساتھی صمدو نے کہا۔ "یہ بڑے جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ اس کے بیوی
ں کو اغوا کر کے وصولی کرنی ہو گی۔"

میر علی جسکانی نے کہا۔ "اگر میں مقدمہ دائر کروں۔ عبداللہ لالانی کو عدالت میں
سیٹنا شروع کر دوں تو زیادہ سے زیادہ سال بھر میں وصولی ہو جائے گی۔ مقدمہ میں لاکھ
و لاکھ اٹھیں گے۔"

پاشا اپنے ساتھیوں کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ان کے درمیان ایک لالٹین
کی زرد روشنی سے ان کے چہروں کو سیاہ زردی مائل بنا رہی تھی۔ جسکانی نے کہا۔ "ایسے
چ کے دیکھو' مقدمہ سستا پڑ رہا ہے اور تم مہنگے۔"

"مقدمہ جب طول پکڑتا ہے تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ
سان ہوتا تو تم اِدھر نہ آتے۔ دیکھو نو لاکھ کی وصولی ہے۔ ہمیں دو لاکھ دو اور سات لاکھ
لے جاؤ۔"

"نہیں پاشا بھائی! تم کو چڑھ گئی ہے۔ اگر نہیں چڑھی تو ذرا سوچو۔ اگر میں پولیس
لوں سے معاملہ کروں تو وہ کیکڑوں کے ٹن پیکس میں چرس ڈال کر اس سے پوچھیں
گے' بولو لالانی! جیل جاؤ گے۔ لاکھوں کا کاروبار ٹھپ کرو گے یا نو لاکھ ادا کرو گے۔ پولیس
لے راتوں رات اُس سے رقم اگلوا لیں گے اور میرا کیا خرچ ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ ایک
کھ۔"

پاشا' صمدو اور رحمت سوچ میں پڑ گئے۔ ملک کے سیاسی حالات خراب تھے۔ پچھلے
ین ماہ سے کسی پارٹی نے انہیں کسی بڑی واردات کے لئے سپاری نہیں دی۔ اتنی کڑکی

کے بعد میر علی جسکانی نولاکھ کی سپاری دینے آیا تھا۔

جسکانی نے کہا۔ ”میں زندگی میں پہلی بار اپنے مزاج کے خلاف اس کچی آبادی
آیا ہوں اور تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پی رہا ہوں تو کچھ بچانے کے لئے' لٹانے کے
نہیں۔“

پاشا نے کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا دو گے؟“

”تم تین بندے ہو' تیس ہزار دوں گا۔“

رحمت بھڑک کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہم میں سے ہر ایک
صرف دس ہزار ملیں گے؟ نہیں پاشا بھائی! ہم یہ سپاری نہیں لیں گے۔“

پاشا نے اسے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آرام سے بولو۔ تمہارا
وردی والا باپ گلی سے گزر رہا ہو گا تو ابھی گردن ناپنے آجائے گا۔“

پھر وہ میر علی جسکانی سے بولا۔ ”تم ہمارے مہمان ہو' آرام سے پیو۔ ہمارے سا
روٹی کھاؤ' پھر خدا حافظ۔“

”تم تو ناراض ہو گئے پاشا بھائی! آخری بات بولتا ہوں پندرہ پندرہ ہزار لے لو'
اور منہ نہ پھاڑو۔“

”منہ پھاڑنے کی بات نہیں ہے۔ ہم خطرات سے کھیلتے ہیں۔ میں آخری بات
ہوں۔ اس کے بعد کوئی بات نہیں ہو گی۔ ہم بیس بیس ہزار یعنی کل ساٹھ ہزار
گے۔“

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ میر علی جسکانی سر جھکائے بیٹھا رہا پھر سر اٹھا
بولا۔ ”ڈن۔“

ادھر سودا طے ہوا ادھر بجلی آ گئی۔ کمرا ٹیوب لائٹ سے روشن ہو گیا۔ ایک نے ک
”ڈن کہتے ہی روشنی آ گئی' یہ تقدیر کا اشارہ ہے۔ جسکانی صاحب کی وصولی ضرور ہو گی
وہ سب ہنسنے لگے۔ پینے پلانے لگے پھر دروازے پر دستک سن کر خاموش ہو گئے

صمدو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

باہر سے آواز آئی۔ ”حضور سلطان ابن سلطان نے مجھے بھیجا ہے' احمد پاشا کی
ہے۔“

حضور کا نام سن کر سب کھڑے ہو گئے۔ پاشا نے حیرانی سے کہا۔ ”حضور کا
میرے گھر آیا ہے' کھڑے کیا ہو دروازہ کھولو۔“

پھر وہ خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہوا باہر آیا۔ پھر آنے والے سے

ہوئے بولا۔ ”تشریف لائیے آپ کے آنے سے میرا خون بڑھ گیا ہے۔“

”پاشا بھائی! میں ذرا جلدی میں ہوں۔ دوسرے بندے کو بھی خبر پہنچانے جا رہا
وہ جو آپ کے علاقے میں عیدو ہے نا؟ اسے بھی حضور نے طلب کیا ہے۔“

وہ پیغام لانے والے کا ہاتھ تھام کر عاجزی سے بولا۔ ”رمضانی بھائی! ہمارے پرانے
ن کا خیال کرو۔ اتنا بتا دو' حضور کے دربار میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟“

رمضانی نے کہا۔ ”بڑے لوگوں کی بڑی باتیں' ہم جیسے ادنیٰ ملازم کیا جانیں۔ ہاں
یں بھنک پڑی ہے کہ حضور ادھر تھانے کی دلالی کسی کو سونپنا چاہتے ہیں۔ پتا نہیں
عہدہ تمہیں دیں گے یا عیدو کو۔“

وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”خدا کے لئے عیدو کا نام نہ لو۔ یہ عہدہ مجھے ملنا چاہئے۔“

”مجھ سے کیا کہہ رہے ہو۔ یہ سخاوت حضور کریں گے۔“

”رمضانی بھائی! بادشاہ کے قدموں میں رہنے والے ہی اصل بادشاہ ہوتے ہیں۔ اپنی
ہیری سے شاہ کے احکامات کی تعمیل ہونے نہیں دیتے۔ تم حضور کا پیغام عیدو کو نہ
کوئی بہانہ کر دو۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو؟ حضور کا حکم ہے دونوں کو یہ پیغام پہنچایا جائے۔ اگر میں نے
اسے خبر رکھا تو.........“

”تو کچھ نہیں ہو گا۔ تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ ذرا ایک منٹ......... اندر
......بس ایک منٹ کے لئے۔“

وہ رمضانی کو کمرے کے اندر ہاتھ پکڑ کر لایا۔ پھر میر علی جسکانی سے بولا۔ ”ابھی آپ
معاملہ ڈن ہوا ہے۔ ذرا اپنی جیب سے دو ہزار نکالیں۔“

جسکانی نے سو سو کے بیس نوٹ گن کر دیئے۔ پاشا وہ تمام نوٹ رمضانی کی جیب میں
نے لگا' وہ بولا۔ ”یہ......... یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا مجھے حضور کے دربار سے نکلواؤ
“

”تمہیں کوئی وہاں سے نہیں نکالے گا۔ تم حضور کے پی اے سے اتنا کہو گے کہ
کے گھر پیغام دینے گئے تھے لیکن وہ موجود نہیں تھا۔ تم اس کے گھر کے سامنے ایک
تک بیٹھے رہے۔“

پھر اس نے رحمت سے کہا۔ ”تم ابھی عیدو کے گھر جاؤ۔ اسے کسی بہانے گھر سے
ہوٹل میں لے جاؤ اور رمضانی بھائی اب تو تمہیں انکار نہیں ہے۔ تم جاؤ گے' عیدو
طے گا۔ تم حضور کے سامنے جھوٹے نہیں کہلاؤ گے۔ تمہارا ایمان سلامت رہے

گا۔"

رحمت، عیدو کے گھر چلا گیا۔ صمدو، رمضانی کو ایک قریبی ہوٹل میں چائے پ
لے گیا۔ تاکہ وہ ذرا دیر سے عیدو کے گھر جائے۔

میر علی جسکانی نے پاشا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بھئی اتنے بڑے ابن س
صاحب نے تمہیں بلایا ہے۔ تم تو چھپے رستم نکلے۔ پہلے نہیں بتایا کہ تمہاری پہنچ وہاں
ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "ہم بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ پچھلے فسادات میں مَیں نے حضو
لئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ ایک بار گولی کھا کر اسپتال گیا۔ پھر جیل گیا۔ حضور اپ
کے بندوں کو بھلاتے نہیں ہیں۔"

"میری گاڑی میں چلو۔ میں کلفٹن کی طرف جا رہا ہوں، حضور کی کوٹھی کے
ڈراپ کر دوں گا۔"

وہ گاڑی میں آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے سائیں! پینے کی محفل
برہم ہو گئی۔ ہم آپ کی خدمت نہ کر سکے۔"

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ دوسری
میری کوٹھی میں ہو گی۔ مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ تمہیں اوپر والے بلاتے
بھئی تم تو ہمارے لیول کے آدمی ہو۔"

"آپ کی قدردانی ہے کہ مجھے اپنے برابر کا سمجھتے ہیں۔ اگر مجھے تھانے کی دا
گئی تو سمجھئے پلک جھپکتے ہی آپ کے نو لاکھ وصول ہو جائیں گے۔"

"وہ تو ہو ہی جائیں گے۔ مگر اب اس سے بھی بڑا ایک کام ہے۔ اگر حضور
کام کرا دو تو تمہاری بھی چاندی ہی چاندی ہو گی۔"

"کام کیا ہے؟"

"تم تو جانتے ہو، آج کل وڈیو کیسٹ انڈین فلمیں آ رہی ہیں۔ اگرچہ یہ غی
ہیں مگر اس میں کمائی بہت ہے۔ رنچھوڑ لائن میں چوری چھپے ایسی فلمیں کرائے
ہیں۔ کتنے ہی گھروں میں ایک ایک کمرے کے سینما چل رہے ہیں۔ پولیس والوں
چاندی ہو رہی ہے۔ اگر حضور سلطان ابن سلطان تھوڑی سی چھوٹ دیں تو اس کا
قانونی تحفظ مل سکتا ہے۔"

"غیر قانونی دھندے کو قانونی تحفظ کیسے مل سکتا ہے؟"

"جیسے لاہور کی ہیرا منڈی اور کراچی کے نیپئر روڈ کو ملتا ہے۔ جسم فروشی

ر پر ممنوع اور باعثِ شرم ہے۔ جب ہمارے ملک میں جسم فروشی کو قانوناً ممنوع
یا تو اخبارات نے جلی حرفوں میں یہ حیا افروز خبریں شائع کیں، تمہیں تو یاد ہو

ہاں۔ مگر بازار اب بھی قائم ہیں۔ بلکہ بازار والیوں نے شریفوں کے محلوں میں
ر فلیٹس خرید لئے ہیں۔ شریف اور مہذب خاندان کے لوگوں نے اوپر تک
کیں۔ مگر تمام شکایتیں کاغذی کارروائیوں تک محدود رہیں۔ قانون کہتا ہے،
، کاروبار بند ہو چکے ہیں تو پھر شکایتیں کیسی؟"

یہ اوپر والے اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق قانون بناتے ہیں۔ قانون کی
یں شراب ممنوع ہے لیکن اوپر والے شراب کی بہترین اقسام اپنے لئے اسمگل
ہیں۔"

انون کی شکل بگاڑنے کے مختلف حیلے حوالے ہیں۔ کروڑوں روپے کی پبلسٹی سے
پینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ وزارتِ صحت مختصر فقرہ لکھ دیتی
ریٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے۔

لک کی اتنی بڑی اور اہم وزارتِ قانون کی زبان، صرف نصیحت کا حق ادا کرتی ہے
وزارتوں کے چھوٹے بڑے عہدیدار سرِعام سگریٹ کا کش لگاتے رہتے ہیں۔
ہر شعبے میں یہی ہو رہا ہے۔ قانون پاس ہوتا ہے کہ یہ نہ کرو۔ اوپر والے کرتے
اتے ہیں اور جیبیں بھرتے ہیں۔ ملکی آئین کی دستاویزات کا آدھا قانون شاید
ہے۔ باقی آدھا قانون عمل کرنے کے لیے نہیں ہے۔ یعنی نیم قانون ہے اور نیم کے
ے کے ہیں۔ لوگ حب الوطنی کے باعث زبان سے اسے برا نہیں کہتے اور اچھا
ں سمجھتے تو پھر یہ قانون یہ ہوتا ہے، نہ وہ ہوتا ہے۔ نیم ہوتا ہے، کڑوا ہوتا ہے،
بشہ تھوک دیا جاتا ہے مگر لوگ نگلتے رہتے ہیں۔

ی ترانے میں "پاک سرزمین کا نظام" پیش کیا گیا ہے۔ اوپر والے ناپاک سرزمین
یش کرتے رہتے ہیں۔

پاشا نے جسکانی سے پوچھا "وڈیو فلموں کو کس طرح قانونی تحفظ دلانا چاہتے ہو"
ہ بولا "ابھی رنچھوڑ لائن کے چور دروازے سے انڈین فلمیں آتی ہیں۔ دیکھو یہ
۱۹۷۶ء کا سال ختم ہو رہا ہے۔ اگلے تین چار برس میں پاکستان کے بڑے شہروں میں
ی انڈین فلموں کی مارکیٹ قائم ہو جائیں گی۔ بابا! ہم کاروباری لوگ ہیں۔ وقت کی
ڈلتے رہتے ہیں۔ حضور ہماری تھوڑی سی سرپرستی کریں گے تو میں انڈیا والوں سے

ان کی فلموں کے حقوق خریدنا شروع کر دوں گا۔ یہاں صدر میں بہت بڑی مارکیٹ
کروں گا۔"

"میں کاروباری معاملات نہیں سمجھتا ہوں اور ہو سکتا ہے' یہ بات حضور کے ر
کے خلاف ہو۔"

"پاشا بھائی! تم ان سے کسی کاروبار کی بات نہ کرو۔ صرف اتنی سی بات ان
کانوں میں پھونک دو کہ ہر ہفتہ ایک لاکھ روپے دینے والی ایک پارٹی ملاقات کرنا چا
ہے۔ بس پھر تمہارا کام ختم' ہمارا کام شروع۔"

اس نے کوٹھی کے سامنے گاڑی روک دی' پھر کہا۔ "صرف اونچی کرسی پر بیٹھ
کوئی سلطان ابن سلطان نہیں بن جاتا ہم جیسے لوگ انہیں بناتے ہیں۔ جب ان کے
میں یہ بات جائے گی کہ ایک ہفتے میں ایک لاکھ اور سال میں باون لاکھ ملنے والے ہیں
پانچ برس رہ گئے تو دو کروڑ ساٹھ لاکھ ملیں گے تو وہ مجھے ضرور ملاقات کا شرف حا
کرنے دیں گے۔"

پاشا نے گاڑی سے اتر کر وعدہ کیا کہ وہ فون پر اس سے رابطہ کرے گا۔ پھر
کے قریب آیا۔ وہاں مسلح پہرے دار کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے کیبن میں آکر کہا
نام احمد پاشا ہے۔ حضور نے مجھے حاضری کا حکم دیا ہے۔"

سیکیورٹی افسر نے ملاقات کرنے والوں کی فہرست میں اس کا نام دیکھا۔ ایک
ٹاکی اٹھا کر رابطہ کیا پھر پی اے پیر محمد سے پاشا کے متعلق دریافت کیا' پی اے نے کہا
کو آنے دو۔ عیدو نامی ایک اور کتا آئے گا۔ اسے بھی اندر بھیج دینا۔"

سیکیورٹی افسر نے واکی ٹاکی کو آف کیا۔ پھر کیبن کے باہر جھانک کر کہا "اسے
کرو اور جانے دو۔"

گارڈ نے گیٹ کا چھوٹا ضمنی دروازہ کھول دیا۔ پاشا دروازے سے اندر آیا۔ دو
گارڈ نے اس کی تلاشی لی اور اسے جانے کی اجازت دی۔ وہ ایک وسیع و عریض لا
گزر کر محل نما کوٹھی کے بڑے دروازے پر پہنچا۔ ایک ملازم نے دروازہ کھول کر کہا

"آجاؤ۔"

وہ جوتے اتار کر کوٹھی کے اندر ٹھنڈے چکنے فرش پر آیا۔ ملازم کے پیچھے چ
ایک کاریڈور سے گزر کر بڑے سے شاہانہ طرز کے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ وہا
آرائش اور رئیسانہ شان و شوکت دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ا
اپنی آنکھوں سے حضور ابن سلطان کو غریبوں کی جھگیوں میں جاتے' کتنی ہی جھگیو

ہاتھوں سے چھت ڈالتے اور بیماروں کو اپنی گاڑی میں اسپتال پہنچاتے دیکھا تھا۔ ایسے
حضور ایک عام سے آدمی دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت ان کے محل کو اندر سے دیکھ
چلا کہ وقت اور حالات کے مطابق غریب نواز بن جانے والے سیاست داں ایسے ہی
میں رہتے ہیں۔

پی اے پیر محمد ڈرائنگ روم میں آیا۔ پاشا نے مسکرا کر اسے سلام کیا۔ پیر محمد نے
ی سے کہا "دانت نہ نکالو۔ کیا حضور کے سامنے اسی طرح مسکراؤ گے؟"

"نن.......... نہیں سر! میری کیا مجال ہے۔ حضور نے مجھے اس قابل سمجھا ہے۔
بلایا ہے۔ میں پھر ان کے لیے جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔"

"میرا احسان مانو۔ میں نے ہی حضور کے سامنے تمہارا نام پیش کیا تھا۔"

"آپ کی مہربانی ہے سر! یہ میرے لیے بڑی بات ہے کہ اتنے بڑے محل میں میرا
رکھا جاتا ہے۔"

"تم بھی ہمیں یاد رکھا کرو۔"

"خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ ہی لوگوں کو یاد کرتا رہتا
۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں۔"

"یہاں سے باہر نکل کر بتاؤں گا۔ اگر خدمت نہ کر سکے تو پھر کبھی اس محل میں نہیں
دگے۔"

"میں تابعدار ہوں۔ حضور کے لیے گولی کھا کر جیل جا سکتا ہوں تو آپ کے لیے بھی
ہینہ ایک کر سکتا ہوں۔"

"یہ بار بار جان کی بازی لگانے' گولی کھانے اور جیل جانے کی بات کیا کر رہے ہو' کیا
ان جتا رہے ہو۔ کیا تمہیں اس کا صلہ نہیں ملتا ہے۔ کیا یہ صلہ کم ہے کہ تمہیں پولیس
ڑ میں ایک نمبری سے دس نمبری تک ہونے نہیں دیا جاتا۔ حضور تمہاری پرورش
تے ہیں تو اسی لیے کہ ایک دن تم جیسوں کو جیل جانا یا گولی کھانا اور کتے کی موت مرنا
ے"

"سر! آپ تو ناراض ہو گئے۔ میں نے کب انکار کیا ہے۔ میں تو آپ کی بھی خدمت
ا چاہتا ہوں۔"

وہ دونوں سرگوشیوں کے انداز میں دبی زبان سے بول رہے تھے۔ پھر دروازے پر
ر ابن سلطان کو دیکھ کر چپ ہو گئے۔ پاشا نے فرش پر گھٹنے ٹیک دیئے۔ دو زانو ہو گیا۔
ر حضور جا کر بیٹھے' اُدھر منہ کر کے سر جھکا لیا۔ "پھر بولا' حضور کا اقبال بلند ہو۔ بندہ

ناچیز آپ کے قدموں کی دھول ہے۔"

حضور نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں پوچھا۔ "تُو کہاں مر گیا تھا؟ کیا بلانا ضروری ہے؟ خود حاضر نہیں ہو سکتا تھا؟"

"خدا گواہ ہے۔ غلام نے کئی بار کوششیں کیں۔ فون پر ہمیشہ کہا گیا کہ آپ مصروف ہیں۔ گیٹ پر آ کر اطلاع دی تو آپ کے یہ پیر محمد صاحب نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔"

حضور نے پیر محمد کو گھور کر دیکھا۔ پھر سخت لہجے میں کہا۔ "گیٹ آؤٹ۔"

وہ ادب سے سر جھکا کر چلا گیا' حضور نے کہا۔ "تیری غیر حاضری سے شبہ ہوا تھا کہ تُو دوسری پارٹی کا کتا بن گیا ہے۔"

"نہیں حضور! میں جان دے سکتا ہوں' وفاداری نہیں بدل سکتا۔"

"ہمارے جاسوس نے بھی یہ اطلاع دی ہے۔ ہم یہ جان کر بہت خوش ہیں کہ تُو باپ بدل سکتا ہے آقا نہیں بدل سکتا۔"

"آپ خوش ہو گئے یہی میرا انعام ہے۔"

"ہم نے سوچا تھا کہ تجھے ایک تھانے کی دلالی دی جائے۔"

"آپ کی عنائیت ہے۔ نوازش ہے۔"

"شٹ اپ۔ زیادہ نہ بول۔ دلالی تو چھوٹے لوگ کرتے ہیں۔ ہم تیرے جیسے وفادار کو ذرا اونچی سطح پر رکھنا چاہتے ہیں۔ تُو پیر صاحب کا کام کرے گا۔ ہمارے آقا پیر نظام شاہ کی خدت کرے گا۔"

"یہ میری خوش بختی ہے حضور!"

"پچھلی بار جب پیر صاحب یہاں مریدوں کے پاس آئے تھے تو خواتین کی ایک ایسوسی ایشن میں بھی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں بہت سی خواتین کے ساتھ ان کی تصویریں اتاری گئی تھیں۔ ان میں ایک حسین لڑکی تھی' جو پیر صاحب کی نظروں میں گئی ہے۔"

حضور ابن سلطان نے ایک تصویر اس کی طرف بڑھائی۔ پاشا نے اپنی دونوں ہتھیلیاں دعا کے انداز میں بڑھائیں اور تصویر یوں لی جیسے تبرک لے رہا ہو۔ پھر اس تصویر پر نظر ڈالی۔ بلا شبہ وہ ایک حسین دوشیزہ تھی۔ پاشا نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "میں نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے۔"

"ضرور دیکھا ہو گا۔ یہ تیرے ہی علاقے میں رہتی ہے۔"

پاشا کو ایک دم سے یاد آیا کہ آج صبح ہی آنکھ کھلنے کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ لا تو وہ لڑکی گلی سے گزر رہی تھی۔

وہ بولا۔ "جی حضور! یہ میرے ہی علاقے کی ہے۔"

"ہمارے آدمیوں نے اس کا پتہ ٹھکانہ معلوم کیا ہے۔ تصویر کے پیچھے دیکھو۔"

اس نے تصویر کو اُلٹ کر دیکھا۔ اسی کے محلے کے ایک مکان کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ اس کہا۔ "کمال ہے حضور! آپ نے اتنے عالی شان محل میں رہ کر یہاں سے تقریباً پندرہ ں دور رہنے والی کا پتا معلوم کر لیا ہے۔"

"اور تُو اسی محلے میں رہ کر اس سے بے خبر ہے۔ اصل بات ضرورت کی ہے۔ تجھے ورت نہیں ہے۔ ہمیں اپنی کرسی سنبھالے رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم جھکتے لتے جھگیوں میں گھس جاتے ہیں۔"

"حضور! میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"تُو دو ماہ کے اندر اس تصویر والی کو پیر صاحب کی خدمت میں پیش کرے گا۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر' اسے پیش کر دوں گا۔"

"تیرے کہہ دینے سے مجھے اطمینان نہیں ہو گا۔ ملکی حالات دن بہ دن بگڑتے جا ہے ہیں۔ اس علاقے میں تُو ہماری پارٹی کا غنڈہ سمجھا جاتا ہے۔ تُو کوئی واردات کرے گا تو زیشن کو ہم پر کیچڑ اچھالنے کا موقع مل جائے گا۔"

"جی ہاں۔ حالات ایسے ہیں کہ اسے اغوا نہیں کروں گا۔ اسے سبز باغ دکھا کر کسی ح بہلا پھسلا کر لاؤں گا' تب بھی یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔"

"نہ اسے اغوا کرو نہ اس کی مرضی سے اسے بھگا کر لاؤ۔ سیدھا سا راستہ اختیار لو۔ اس سے نکاح پڑھوا لو۔"

"جی؟" وہ حیرانی سے بولا۔ پھر جی حضوری میں سر ہلانے لگا۔ "جی' جی ہاں پڑھوا لوں نکاح پڑھوا لوں گا۔"

"ادھر کلفٹن میں تمہیں کچھ عرصے کے لئے ایک فلیٹ دیا جائے گا۔ تم دلہن کو بیاہ راس فلیٹ میں لاؤ گے۔"

"سمجھ گیا حضور! میں نے ایک پاکستانی فلم "خاموش رہو" دیکھی تھی۔ اس میں کار محمد علی حسین لڑکیوں سے شادیاں کرتا تھا لیکن سہاگ کے کمرے میں اس کے گاہک اکرتے تھے۔"

حضور ابن سلطان نے غصے سے گرج کر کہا "کتے کے بچے! تُو پیر صاحب کو گاہک کہہ

رہا ہے۔"

"نن......... نن نہیں حضور! میری کیا مجال ہے کہ پیر صاحب کی شان میں گستاخی کروں۔ مم' میں گدھا ہوں' آپ کی بات میری عقل میں نہیں آئی۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پیر صاحب کی منظورِ نظر ہے تو اس سے میری شادی کیوں ہو گی؟"

"سیاسی شادی ہو گی۔"

"سیاسی شادی؟"

"ہاں جیسے مخالفوں کو کاٹنے اور چودہ انجکشنوں کے عذاب میں مبتلا کرنے کے لیے سیاسی کتے پالے جاتے ہیں۔ جیسے انتخابات کے ریس کورس میں سیاسی گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں اور اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے کے لیے ممبر خریدے جاتے ہیں' ویسے ہی پیر صاحب کو خوش رکھنے کے لیے یہ شادی ضروری ہے۔"

"حضور! میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔"

"ایک اور اہم بات سمجھ لو کہ یہ سچے پیر ہیں۔ گناہ سے ڈرتے ہیں۔ کسی شریف زادی کی عزت کو کھلونا نہیں سمجھتے ہیں۔ کسی نامحرم کو ہاتھ لگانا بھی خلافِ مذہب اور باعثِ شرم گردانتے ہیں۔"

"تو پھر میری دُلہن بھی ان کے لیے نامحرم ہو گی۔"

"نکاح یوں پڑھایا جائے گا کہ وہ نامحرم نہیں رہے گی۔ بلکہ تُو اس کے لیے نامحرم رہے گا۔"

وہ اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ حضور نے کہا "میری بات غور سے سن۔ پرسوں تک اخبارات میں یہ اعلان شائع کرا دے کہ تُو نے اپنا نام تبدیل کر دیا ہے اور اب سے تیرا نام محمد نظام شاہ ولد اعظم شاہ ہے۔"

پاشا نے کہا "میرے باپ کا نام اعظم شاہ نہیں' اعظم پاشا ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جو سمجھا رہا ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کر۔ پیر صاحب کا پورا نام نظام شاہ ولد اعظم شاہ ہے۔ اخبارات میں اعلان کے بعد تیرا بھی یہی نام اور ولدیت ہو گی۔ تیرا شناختی کارڈ بھی نئے نام سے بن جائے گا اور یوں نکاح نامے میں یہی نام اور ولدیت ہو گی۔"

"لیکن نکاح نامے پر میرے دستخط ہوں گے۔ اس کا نکاح میرے ساتھ ہو جائے گا۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ نکاح پڑھانے والا قاضی ہمارا آدمی ہو گا۔ نکاح نامہ کی خانہ پُری پہلے

ہو جائے گی۔ پیر صاحب پہلے ہی اس پر دستخط کر چکے ہوں گے۔ گویا پیر صاحب نے لڑکی سے نکاح قبول کیا ہو گا۔"

"بات سمجھ میں آ رہی ہے مگر........."

"مگر کیا؟ کوئی بات کھٹک رہی ہو تو بولو۔"

"حضور! نکاح نامہ کی رُو سے وہ لڑکی پیر صاحب کی منکوحہ ہو گی لیکن زبان سے میں کروں گا۔ بارات کا دُلہا میں رہوں گا' دُلہن کو میں لے کر آؤں گا۔"

"تو کیا ہوا؟ میں تمہیں ایک چیک پر دستخط کر کے دوں اور تمہیں بینک سے رقم نے کو کہوں۔ مجھے بتاؤ' بینک والے تمہارے لینے والے ہاتھ کو دیکھیں گے یا میرے ط کو اہمیت دیں گے؟"

"آپ کے دستخط کے بغیر رقم نہیں ملے گی۔"

"اسی طرح تم پیر صاحب کے دستخط سے دُلہن لاؤ گے۔ جس طرح چیک کی رقم اری نہیں ہو گی' اسی طرح نکاح نامے سے لائی ہوئی دُلہن بھی تمہاری نہیں ہو گی۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ یہ جائز اور قانونی بات لگ رہی ہے کہ میں محض ایک قائم م دلہا رہوں گا۔ جیسے کوئی اعلیٰ افسر غیر حاضر ہو تو اس کا ماتحت قائم مقام افسر ہوتا ہے۔ گھر میں ہو تو ملازم اس کے چیک سے بینک کی رقم لاتا ہے۔ اہمیت قائم مقام کی نہیں' کی ہے۔ نکاح نامے کی رُو سے وہ لڑکی پیر صاحب کی بیاہتا ہو گی۔ کسی پہلو سے تراض کی گنجائش نہیں ہے۔ کیا کمال کی ہیرا پھیری ہے۔ ایسا صرف سیاسی ذہانت سے تا ہے۔ ایسی سیاست سے صرف ملک کے قوانین ہی کی نہیں' مذہبی احکامات کی بھی ں بگاڑ دی جاتی ہے۔

کسی اعتراض گنجائش نہ ہونے کے باوجود نکاح کے پیچھے جھوٹ اور فریب چھپا ہوا

"حضور! ایک اور پھانس چبھی ہوئی ہے' اسے نکالنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں بولو' اب کیا ہے؟"

"دین کے ہر کام میں ہر عمل میں انسان کی نیت دیکھی جاتی ہے۔"

"بے شک' نکاح بھی نیک نیتی سے ہونا چاہئے۔ پیر صاحب پوری نیک نیتی سے ے منکوحہ بنائیں گے۔ اس پر ظلم نہیں کریں گے۔ دُلہن سے ازدواجی وظیفہ حاصل نے سے پہلے اسے اپنی صورت دکھائیں گے۔ :ب دُلہن سے کوئی دھوکا نہیں ہو گا تو صاحب پر کیا الزام آ سکتا ہے؟"

"یہی کہ اصل دُلہا کیوں چھپا رہے گا؟"

"کئی لوگ چھپ کر باقاعدہ نکاح پڑھواتے ہیں۔ کچھ دُلہا نکاح کے وقت اپنے ملک سے یا اپنے شہر سے باہر ہوتے ہیں اور ٹیلی فون کے ذریعے نکاح قبول کرتے ہیں۔ پیر صاحب ہم سے زیادہ دین اور دنیا کو سمجھتے ہیں اور وہ مطمئن ہیں کہ مذہبی احکامات کے مطابق وہ اپنی منکوحہ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاریں گے اور منکوحہ کے تمام حقوق ادا کریں گے۔"

وہ سر جھکائے خاموشی سے سنتا رہا۔ انہوں نے کہا "تُو اپنے خاندان کے بزرگوں سے کہے گا کہ وہ لڑکی کا رشتہ مانگنے جائیں۔ سب کچھ رسم و رواج کے مطابق ہو گا۔ یہ بات تمہارے باپ کو بھی معلوم نہ ہو کہ کس مقصد کے لیے یہ شادی کر رہے ہو۔"

"حضور! میں اپنے سائے کو بھی نہیں بتاؤں گا۔"

"نکاح کے بعد رخصتی ہو گی تو دُلہن کو لے کر اسلام آباد چلا جائے گا۔"

"اسلام آباد؟ مم.......... مگر میرے گھر والے اور لڑکی والے کیا کہیں گے؟"

"تجھے لڑکی والوں پر یہ ظاہر کرتے رہنا ہے کہ تُو سرکاری ملازم ہے۔ کراچی اور اسلام آباد میں آتا جاتا رہتا ہے اور وہاں بھی تیرا ایک مکان ہے اور تُو دُلہن کو اسی مکان میں لے جائے گا۔"

"لیکن شادی کی رات میرے خاندان والے چاہیں گے کہ دُلہن ہمارے گھر میں قدم رکھے۔ ہمیں دوسرے دن اسلام آباد جانے کے لیے کہا جائے گا۔"

"تُو نکاح سے پہلے یہ سرکاری حکم سنائے گا کہ تجھے اسلام آباد میں فوراً طلب کیا گیا ہے۔ تجھے حکم سنانے سرکاری اہلکار وہاں پہنچیں گے تو سب کو یقین ہو جائے گا پھر کوئی دُلہن کو اسلام آباد لے جانے پر اعتراض نہیں کرے گا۔"

"حضور! رشتہ مانگنے پھر منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت پڑے گی۔"

"فی الحال تیس ہزار لے جا۔ بعد میں وہاں جو طے ہو گا' اس کے مطابق تجھے رقم مل جائے گی۔"

"ایک اور عرض ہے۔ میرا کوئی روزگار نہیں ہے۔ کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے۔"

حضور نے ریسیور اٹھا کر کسی سے رابطہ کیا' پھر کہا "احکامات نوٹ کرو۔ ایک نیا شناختی کارڈ فوراً تیار کراؤ۔ وہ کارڈ محمد نظام شاہ ولد اعظم شاہ کے نام سے ہو گا۔ عمر تیس برس' اورنگی ٹاؤن کا کوئی پتا درج کرا دو۔ تمام اخبارات میں احمد پاشا کی طرف سے یہ

ن شائع کرا دو کہ اس نے اپنا نام تبدیل کیا ہے اور نیا نام محمد نظام شاہ ہے۔ اورنگی ن اور اس کے اطراف کے پانچ تھانوں کے دلالوں کو پابند کرو کہ وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو نظام شاہ سابقہ احمد پاشا کو ایک ہزار روپے پہنچایا کریں۔ جو اس سلسلے میں کوتاہی کرے اس کی دلالی چھین لی جائے گی۔"

حضور نے یہ تمام احکامات نوٹ کرانے کے بعد ریسیور رکھا۔ پھر پاشا سے پوچھا باتا ہے' پیر صاحب کی دلہن لانے کے لیے تیرا ہی انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟"

"حضور کی ذرہ نوازی ہے۔ آپ مجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔"

"یہی بات ہے۔ تیری وفاداریوں سے مطمئن ہو کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہمارے میوں کی رپورٹ یہ بھی ہے کہ تُو نشہ کرتا ہے مگر عورتوں سے دور رہتا ہے۔ یہ یقین ے کہ تُو پیر صاحب کی دلہن کو بری نیت سے نہیں دیکھے گا۔ جب تک امانت کو اس کے ع حقدار تک نہیں پہنچائے گا کوئی نشہ نہیں کرے گا کیونکہ نشے میں انسان بہک جاتا ہے ر گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔"

"میں نے آج تک ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ میں نے بڑی سے بڑی وارداتیں ا ہیں لیکن کسی عورت کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"یہ اچھی بات ہے۔ تجھ پر بھروسا کرنے کے باوجود تیری نگرانی ہوتی رہے گی۔ کبھی ھاس پر بیٹھے گی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔"

"یہ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ مجھے زندہ رہنے کے لیے آج ہی سے نشہ چھوڑ ینا چاہیے۔"

"بے شک تیری سلامتی اسی میں ہے۔"

"حضور! ایک اور عرض ہے۔ ایک بزنس مین ہر ہفتہ ایک لاکھ روپے ادا کرنا چاہتا ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ شاید ماہانہ اور سالانہ آمدنی کا حساب کرنے لگے پھر بولے "کل اُسے بھیج دے اور اُس کا نام لکھوا دے۔"

"حضور! پی اے صاحب مجھ جیسے جاں نثار کو گھاس نہیں ڈالتے' اس بے چارے کو رُخا دیں گے۔ میں بھی آپ سے ملاقات کی سہولتیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے پی اے پیر محمد کو بلا کر کہا "کل صبح دس بجے ایک بزنس مین مجھ سے ملاقات کرنے آئے گا۔ اس کا نام اور وقت نوٹ کرو۔"

پاشا نے کہا "اس کا نام میر علی جسکانی ہے۔"

پی اے ایک ڈائری میں نوٹ کرنے لگا۔ حضور نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "پاشا فون آئے یا خود آئے تو مجھے فوراً اطلاع دیا کرو اور ابھی کیشئر سے اسے تیس ہزار دو۔"

وہ حکم دے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد پی اے پیر محمد نے ڈائری بند کی۔ پ اسے غرا کر دیکھتے ہوئے کہا "میں سب سن رہا تھا۔ تُو میری شکایتیں کر رہا تھا۔"

"جو سچ ہے' وہ کہہ رہا تھا۔"

"کیا تُو پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرے گا؟"

"میں پانی میں کبھی نہیں اترتا۔ کنارے کنارے چلتا ہوں۔"

اس نے پھر غرا کر دیکھا' پھر آگے جاتے ہوئے بولا "پیچھے آؤ۔"

وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے کیشئر کے پاس پہنچے' پی اے نے کہا۔ "تیس ہزار کی پیمنٹ ہے پانچ ہزار کاٹ کر اسے دے دو۔"

پاشا نے کہا "پانچ پیسے بھی کاٹے گئے تو میں پیمنٹ نہیں لوں گا۔"

وہ حقارت سے بولا "حضور سے ملاقات کرتے ہی اونچا اُڑنے لگا ہے۔ ایسا گراؤں کہ سانس بھی نہیں لے سکے گا۔"

وہ کیشئر سے بولا "اسے تیس ہزار دو اور یہاں سے باہر کرو۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پاشا مسکرانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیس ہزار روپے جیبوں میں ٹھونس کر محل نما کوٹھی سے باہر آکر ٹیکسی کی تلاش میں ایک طرف چلنے لگا۔ آج سے اس کی شب برات اور کل سے عید تھی۔ ایک تو معقول ماہانہ آمدنی مقرر ہو گئی تھی۔ دوسرے جیبوں میں نوٹ ٹھنسے ہوئے تھے۔ آئندہ سیاسی شادی کی تکمیل تک وہ ابن سلطان سے کم از کم ایک لاکھ روپے وصول کر سکتا تھا۔ پھر یہ کہ اس کی وفاداری تسلیم کر لی گئی تھی۔ حضور آئندہ بھی اس سے لاکھوں کا فائدہ پہنچانے والے بڑے بڑے کام لے سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی زبان سے کہا تھا کہ وہ اسے اونچی سطح پر لا رہے ہیں۔

اسی وقت جسکانی کی گاڑی قریب آکر رک گئی' وہ چونک کر بولا۔ "ارے تم! ابھی تک تم یہاں ہو؟"

وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بولا "پاشا بھائی! تم سے محبت ہو گئی ہے۔ گھر جاتے جاتے پلٹ کر آگیا۔"

پاشا مسکرا کر اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جسکانی کو اپنے دھندے کی فکر ہے۔ اسی لیے حضور کے محل کے آس پاس ہی بھٹک رہا تھا۔ وہ سیٹ کی

پشت سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولا "اگر خوشخبری سناؤں تو کیا دو گے؟"

وہ خوش ہو کر بولا "تمہاری باتوں سے اشارہ مل گیا ہے۔ یار پاشا بھائی! تم منہ سے جو بولو گے اسے پورا کروں گا۔"

"کل صبح دس بجے سے ذرا پہلے گیٹ پر پہنچ جاؤ۔ حضور تم سے ملاقات کریں گے۔"

جسکانی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ پھر اس کے گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا "میں نے حضور سے ملنے کے لیے بڑے ذرائع اختیار کیے۔ لوگوں کو رشوتیں بھی دیں مگر آج تک محل کے باہر ہی کھڑا رہا۔ تم نے تو کمال کر دیا۔ ابھی گئے اور ابھی ملاقات کا وقت مقرر کر کے چلے آئے۔ بولو' میں تمہیں کیسے خوش کروں؟"

پاشا نے اپنی جیبیں دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں مال ہے۔ ادھر بھی مال ہے اور یہ جیب بھی بھری ہوئی ہے۔ آج تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کپڑے نہیں نوٹ پر نوٹ پہنے ہوئے ہیں۔"

"مانتا ہوں بھائی مانتا ہوں۔ حضور جیسے بڑے لوگ آپ کو نوٹوں میں تولتے ہیں۔ میں بھلا آپ کو کیا دے سکتا ہوں۔ پھر بھی آپ کو خوش کروں گا۔ کل ذرا بات بن جانے دو۔ میرے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ فرسٹ کلاس کار ہے' وہ تمہیں دے دوں گا۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کہاں جائیں گے؟"

پاشا کا درجہ تم سے آپ ہو گیا تھا' وہ مسکرا کر بولا۔ "اپنے گھر جاؤں گا۔ مجھے کسی ٹیکسی اسٹینڈ کے پاس چھوڑ دو۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ؟ میں آپ کو گھر کے دروازے تک چھوڑ کر آؤں گا۔"

گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ پاشا کو یوں لگ رہا تھا جیسے ہواؤں میں اُڑا جا رہا ہے۔ اچانک ہی اس کے مقدر کا ستارہ چمکنے لگا تھا۔ اس نے مسکرا کر سوچا' پتا نہیں آج صبح کس کا منہ دیکھا تھا؟

بھولی ہوئی بات پھر یاد آگئی۔ اسی لڑکی کا منہ دیکھا تھا' جس کی تصویر جیب میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ کبھی کسی لڑکی کو نظر بھر کے نہیں دیکھتا تھا۔ کسی کو دیکھ بھی لیتا تو چند قدم آگے جا کر اسے بھول جاتا تھا۔ وہ لڑکی بھی اسے یاد نہ آتی۔ چونکہ حضور ابن سلطان اور پیر صاحب کی طرف سے اس حسینہ کی سپاری ملی تھی۔ اس لئے وہ ذہن میں نقش ہو گئی

تھی۔

صبح بیدار ہوا تو بند کمرے میں وقت کا اندازہ نہ ہو سکا کہ کتنا دن نکل آیا ہے۔ وہ چارپائی سے اتر کر دروازے کے پاس آیا پھر اسے کھول کر دیکھا۔ باہر دھوپ کے باعث آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس نے آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے۔ انگلیوں کے درمیان سے گلی کے اجالے کو تھوڑا تھوڑا سا دیکھا۔ ایسے میں وہ تھوڑی تھوڑی سی نظر آئی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے سوٹ میں تھی۔ شانے سے ایک بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر پاشا کی طرف دیکھا تھا۔ پھر جلدی سے سر پر رکھے ہوئے دوپٹے کو آڑ بناتی ہوئی گزر گئی تھی۔ یہ پاشا کے لئے ایسی کوئی نرالی بات نہیں تھی کہ اسے یاد رکھتا۔ سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں سامنے سے گزرتی رہتی ہیں۔ بندہ کس کس کو یاد رکھے گا۔

جسکانی کی آواز نے اسے چونکا دیا' وہ کہہ رہا تھا۔ "پاشا بھائی! آپ کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ بھئی سگریٹ سلگائیں۔ میں نے آپ کے لئے گولڈ لیف کا پیکٹ لیا ہے۔ ادھر ڈیش بورڈ کے خانے میں ہے۔"

اس نے وہ خانہ کھول کر گولڈ لیف کا نیا پیکٹ نکالا پھر اس کا ریپر اتارتے ہوئے کہا "تم تو دیسی برانڈ پیتے ہو' پھر اتنا مہنگا سگریٹ کیوں خرید لیا۔"

"پاشا بھائی! آپ کے لیے خریدا ہے۔ آپ کے لیے کوئی چیز مہنگی نہیں ہے۔ پورا پیکٹ رکھ لیں۔"

اس نے ایک سگریٹ نکال کر جسکانی کے ہونٹوں کے درمیان رکھا۔ دوسرا اپنے ہونٹوں میں دبایا۔ دیا سلائی سے پہلے اس کا سگریٹ سلگایا پھر اپنا سلگا کر ایک گہرا کش لینا چاہا۔ مگر آدھا کش لے کر رک گیا۔ اچانک رکنے سے دھواں منہ' ناک اور حلق میں گڑبڑا گیا۔ کھانسی کے جھٹکے لگنے لگے۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ آئندہ نشہ نہ کرنے کا عہد کر چکا ہے۔

نشہ کرنے سے کیا ہو گا؟ بہکے گا۔ اپنے اختیار میں نہیں رہے گا۔ امانت میں خیانت کرے گا تو حضور اور پیر صاحب اسے سزائے موت دیں گے۔ کہیں سے بھی ایک اندھی گولی آئے گی اور اس کی ہنستی بستی زندگی کو چاٹ جائے گی۔ کسی سے کہہ نہیں پائے گا کہ وہ گولی کتنے بڑے دہشت گرد کے دماغ سے چلی تھی اور مرتے مرتے کہہ بھی دے گا تو کون یقین کرے گا؟

جسکانی نے پوچھا "کیا سگریٹ پسند نہیں ہے؟"

"وہ ....بات یہ ہے کہ میں نشہ چھوڑ رہا ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "کیا مذاق کرتے ہیں؟ نشہ چھوڑ رہے ہیں' کیوں چھوڑ رہے

"

"اس لیے کہ کوئی سا نشہ ہو' وہ نقصان پہنچاتا ہے۔"

"مگر سگریٹ کوئی نشے کی چیز نہیں ہے۔ اکثر لوگ اسٹائل کے لیے پیتے ہیں۔ پورے ے کا ایک آدھ کش لیتے ہیں۔ باقی انگلیوں کے درمیان اگربتی کی طرح سلگاتے رہتے "

پاشا نے کہا "جب پہلی بار سگریٹ کا کش لگایا تھا تو ذرا سر چکرایا تھا۔ اس کے بعد نشہ محسوس نہیں ہوا۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے نشہ پیدا کرنے کے لیے یں چرس بھری جاتی ہے۔"

"چرس گھٹیا نشہ ہے۔ میں کبھی ہاتھ نہیں لگاتا۔"

"میں جس ماحول میں رہتا ہوں' وہاں خالی سگریٹ کو گناہِ بے لذت کہتے ہیں۔ اگر گریٹ سے ہی توبہ کرلوں تو یار دوست چرس بھرا سگریٹ پیش نہیں کریں گے۔"

"پاشا بھائی! توبہ کرنا آسان ہے۔ چھوڑنا مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن ہے۔"

"اگر پینے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ سگریٹ کے باعث چند دنوں میں مرنے ے تو کیا پھر بھی پیئے گا؟"

"مریں آپ کے دشمن۔ آپ نے کیا ڈاکٹری معائنہ کرایا ہے؟ کیا کسی ڈاکٹر نے آپ رننگ دی ہے۔"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ حالات سے بڑا ڈاکٹر کوئی نہیں ہے۔ اس ڈاکٹر نے تھوڑی ے وارننگ دی ہے۔ شراب چھوڑ دو۔ سگریٹ چھوڑ دو۔"

پاشا نے یہ کہتے ہوئے سگریٹ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ سگریٹ کے پیکٹ کو بورڈ کے خانے میں رکھ دیا۔ وہ اپنی کمزوری سے واقف تھا۔ کوئی سا بھی نشہ کرنے د بری طرح بہکنے لگتا تھا۔ یار دوست اسے سہارا دے کر گھر پہنچاتے تھے۔ دماغ میں ے خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے ابھی سے پرہیز کرنے

جسکانی اسے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ے بھائی محمود پاشا نے دروازہ کھولا۔ اس نے اندر آ کر اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا ازہ بند کر دے۔ نہیں تو تیرے بھائی کی جیب کو نظر لگ جائے گی۔ چور نوٹوں کی ا لیتے ہیں۔"

محمود پاشا نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا "اماں! یہ

آپ کے لاڈلے تشریف لے آئے ہیں۔ اب یہ بڑے بڑے نوٹوں کے خواب دکھا
گے۔"

دوسرے کمرے سے ماں کی آواز آئی "اس ناکارہ لفنگے کو وہیں سمجھا دو' میر
سامنے نہ آئے۔ جب کوئی ڈھنگ کا کام کرے تو مجھے منہ دکھائے۔"

وہ کمرے میں آکر جیبوں سے نوٹ نکال نکال کر ماں پر برسانے لگا اور قہقہے لگا
لگا۔ ماں اور بھائی اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر ادھر ادھر اڑ
ہوئے نوٹوں کو دیکھ کر پوچھ رہی تھی "ارے کمبخت! یہ سب کیا ہے؟ اتنی دولت ک
سے لُوٹ کرلایا ہے؟"

"یہ تمہارے بیٹے کی کمائی ہے لوٹ کا مال نہیں ہے۔ مجھے اسلام آباد میں سرکا
ملازمت مل گئی ہے۔"

محمود پاشا نے کہا "سرکاری ملازمت میں اتنے بے حساب نوٹ کسی اعلیٰ افسر کو
نہیں ملتے۔ کیا تمہیں اسلام آباد کی گورنری مل گئی ہے۔"

"یہی سمجھ لو۔ لاٹ صاحب والا کام ہے۔ کبھی یہاں رہوں گا' کبھی وہاں۔ جب ا
آیا کرے گا تو وہاں جاؤں گا۔ ورنہ اپنی ماں کے پاس رہا کروں گا۔"

اس نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھی آس پاس بکھرے ہوئے نو
کو اٹھا رہی تھی۔ اس نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اللہ تمہیں سلا
رکھے۔ ماں کا دل کہتا تھا کہ ایک دن میرے بیٹے کی قسمت ضرور چمکے گی۔"

محمود نے کہا "آپ کا دل غلط کہتا ہے۔ کوئی قسمت وسمت نہیں چمکی ہے۔ بھائی
پھر کوئی بڑی واردات کی ہے۔"

"اب چپ رہتا ہے یا دوں ایک جھانپڑ۔ میری کمائی دیکھ کر جل رہا ہے۔ الا
بھڑکا رہا ہے۔ پہلے اپنی حیثیت دیکھ۔ چار برس سے کلرکی کر رہا ہے۔ مہینے میں ایک
روپے لاتا ہے۔ کبھی تُو نے اتنے سارے نوٹ دیکھے ہیں۔ یہ تیرے ایک ہزار نہیں
ہزار ہیں تیس ہزار.........."

ماں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ "محمود! چپ ہو
تیرا بھائی کچھ نہیں کر رہا تھا۔ اب کر رہا ہے' کما رہا ہے تو کمانے دے۔ تیری ایمانداری
بندھی بندھائی تنخواہ سے کیا ہوتا ہے؟ مہینے کے آخر میں ادھار لے کر چولہا جلاتی ہو
میں تو تھک گئی ہوں اب جہاں سے بھی رقم آئے میں سب سے پہلے دو بہوئیں لا
گی۔"

پاشا نے کہا۔ "اماں! تم نے تو میرے منہ کی بات کہہ دی ہے۔ یہ تیس ہزار شادی
لئے لایا ہوں۔ میں نے تو لڑکی بھی پسند کرلی ہے۔ یہ تصویر دیکھو۔"

وہ جیب سے تصویر نکالنے لگا۔ محمود پاشا نے ناگواری سے بڑے بھائی کو دیکھا پھر منہ
ر کر چلا گیا۔ ماں نے تصویر لے کر دیکھی پھر ہنس کر بولی۔ "اے بیٹا! یہ تو آسیہ ہے۔
ے مکان کے پیچھے پانچویں گلی میں رہتی ہے۔"

"بس تو پھر صبح چلی جاؤ اور بات پکی کر آؤ۔"

"بیٹے! بہت مشکل ہے۔ یہ رشتہ نہیں ملے گا۔"

"کیوں نہیں ملے گا' ان کا جو مطالبہ ہو گا' میں پورا کروں گا۔"

"بات مطالبے کی نہیں ہے۔ لڑکیوں کی ماں پہلے بڑی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"ہاں تو کرتی رہے اس کی شادی۔ ہمیں تو اس لڑکی کے لئے ہاں کہہ دے۔"

"جب تک بڑی نہیں اٹھے گی' وہ چھوٹی کے لئے ہاں نہیں کرے گی اور بڑی رنگ
روپ میں ایسی ہے کہ رشتہ مانگنے والے اسے دیکھتے ہی لوٹ جاتے ہیں یا پھر آسیہ کو
لتے ہیں۔ اب تک درجنوں رشتے آچکے ہیں' ماشاء اللہ ہے لاکھوں میں ایک۔ میرا بس
ے تو کل ہی اسے بہو بنا کر لے آؤں۔"

"تو پھر جاؤ۔ اسے ہر قیمت پر بہو بناؤ۔"

"میں پچھلے ماہ تمہاری جمیلہ پھوپی کے ساتھ گئی تھی۔ تمہاری پھوپی نے اپنے اسد
لئے رشتہ مانگا تھا۔ اس کی ماں نے صاف کہہ دیا کہ آسیہ کا رشتہ اس کے چچا زاد سے
ے ہو چکا ہے۔"

"اماں! مجھے آسیہ نہ ملی تو.......... تو میں نہیں جانتا' میرا کیا ہو گا۔"

"اے بیٹا! ایسی بھی کیا دیوانگی ہے۔"

"آپ مجھے دیوانہ ہی سمجھ کر وہاں جائیں۔"

"دیوار سے سر پھوڑنے والی بات ہے بیٹا!؟"

"آپ سر پھوڑنے کی بات کرتی ہیں' آسیہ میرے.......... سر میں بارود کی طرح
ی ہوئی ہے۔ اگر وہ نہ ملی تو میرا سر پھوٹ جائے گا۔"

"ارے کیا اول فول بک رہا ہے؟ اس میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایسی
جنوں مل جائیں گی۔"

"جس کی تصویر محلوں میں پہنچ جائے' ویسی ایک بھی لاکھوں اور کروڑوں میں نہیں
ے گی۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟ آسیہ کی تصویر کہاں کے محلوں میں پہنچی ہے؟"

وہ آسیہ کو طلب کرنے کی دھن میں سچ بولنے لگا تھا' پھر سنبھل کر بات بناتے ہو
بولا۔ "اماں' اس زمانے میں بادشاہوں کے محل کہاں ہیں؟ میں مثال دینے کے لئے ایسا ک
رہا تھا کہ وہ اتنی حسین ہے کہ محلوں والے بھی اس کا رشتہ مانگنے لگیں گے۔"

"تُو ایک چھوٹے سے ٹن کی چھت والے مکان میں ہے۔ اپنی بات کر اور میری با
مان' میں تجھے اور لڑکیاں........"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "مجھے صرف وہی چاہئے۔ تم جانتی ہو کہ میں کتنا بڑا واردا
ہوں۔ مجھے سیدھی طرح نہ ملی تو اس کے گھر سے اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

ماں کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ جو گولیاں
چکا ہو' جیل جا چکا ہو' اس کے لئے ایک لڑکی کو اٹھا کر لے جانا معمولی سی بات ہوتی ہے
ماں کا کلیجا کانپ رہا تھا۔ دماغ میں ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ ہر حال میں بیٹے کا مطا
پورا ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ پھر جیل میں ہو گا اور کوڑے کھائے گا۔

☆==========☆==========☆

اچانک بجلی چلی جائے تو بتول اندھیرے میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے برعکـ
آسیہ کا چہرہ ریڈیم ڈائل کی طرح چمکتا تھا۔ ماں اسے تاریکی میں دیکھ کر پوچھتی تھ
"بتول کہاں ہے؟"

بتول کی آواز آتی۔ "امی! سامنے ہوں۔"

"توبہ ہے لڑکی کیا رنگ پایا ہے۔ اندھیرے میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ جا لالٹین جلا
لے آ۔"

وہ لالٹین روشن کرتی اور سوچتی۔ "پہلی اولاد ہوں' امی کے پیٹ کا سارا میل ہو
کر آئی ہوں۔ جب پیٹ صاف ہو گیا تو آسیہ چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر آگئ
میرے بھی کیا نصیب ہیں۔ آخر میں پیدا ہوتی تو آج جستجو کے بغیر تاریکی میں پائی جاتی۔"

کبھی وہ کمرے میں تنہا ہوتی تو آئینے سے پوچھتی۔ "کیا میں بالکل گئی گزری ہوں؟"

آئینہ سچ دکھاتا ہے مگر جھوٹی تسلیاں دیتا ہے۔ اس لئے وہ کہتا "تم کمتر نہیں ہو
کہ خوب تر بھی نہیں ہو مگر خوب ہو۔ گوری نہیں' کالی بھی نہیں ہو۔ بلکہ نکھرتا ہوا سا
رنگ ہو۔ جب گھر میں ایک بہن گوری ہو تو سانولی کو کالی کہہ دیا جاتا ہے۔"

باپ زندہ تھا تب اس نے بتول کا ماتھا چوم کر کہا تھا۔ "میری بیٹی لاکھوں میں ا
ہے۔ میں اس کے لئے چاند سا دلہا لاؤں گا۔"

پتا نہیں باپ دلہا لانے چاند پر گیا۔ یا اللہ میاں کے پاس پہنچ گیا۔ بس ایسا گیا کہ لوٹ
ہیں آیا۔ رشتہ مانگنے والے بھی جب اسے دیکھ کر جاتے تھے تو لوٹ کر نہیں آتے
جیسے اس بے چاری کے وجود نے انہیں گالیاں دے کر گھر سے بھگایا ہو۔

اور اگر جاتے وقت آسیہ پر نظر پڑ جاتی تو وہ اس کی امی کے پیچھے پڑ جاتے۔ اے
اسے کیوں بٹھائے رکھا ہے۔ اپنے دروازے پر آنے والوں کے آگے دال روٹی رکھو
ور چکن بریانی چھپاؤ گی تو کوئی دال روٹی کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ بریانی کی خوشبو بند
ے سے بھی چلی آتی ہے۔

بتول کی طرح آسیہ آئینہ نہیں دیکھتی تھی۔ ایک اکیلا آئینہ کیا کہے گا۔ زبانِ خلق
تھی۔ رشتے ایسے آتے تھے جیسے مٹھائی کے سامنے کالے چیونٹوں کی قطار لگتی ہے۔
آئینے کی حسن بیانی بے آواز ہوتی ہے۔ زبانِ خلق' نقارے کی طرح بجتی اور گونجتی

جو دل پھینک ہوتے' وہ آسیہ کو دیکھ کر سیٹیاں بجاتے تھے۔ وہ گھر سے بس اسٹینڈ
تک کتنے ہی بولتے آئینوں کی آوازیں سنتی تھی۔ کوئی کسی سے پوچھتا تھا۔ "یار! یہ
ہے؟"

وہ اپنے پیچھے جواب سنتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ "یار! یہ حاشیہ ہے۔ پتا نہیں حاشیئے
اندر کیا ہو گا؟"

کوئی معنی خیز فلمی گیت گنگناتا تھا۔ کوئی صدا لگاتا تھا۔ "اللہ کے نام پر خیرات دے
۔ تیرا بھی بھلا ہو گا۔ میرا بھی بھلا ہو گا۔"

لڑکیوں کو بہت سی ناقابلِ برداشت بولیاں سن کر بہری اور گونگی کی طرح سر جھکا کر
ا پڑتا ہے۔ ایسا دنیا کے بیشتر ملکوں' شہروں' شاہراہوں اور گلیوں میں ہوتا ہے۔ جب
ا سے مغرب تک گالیاں دینے کے انداز میں چھیڑنے کا عمل جاری رہے تو اس کا
ب ہے کہ مردوں نے اس عادت کو تہذیب کا حصہ بنا لیا ہے اور دوسرے مردوں کو
اوارگی میں اجازت دے رہے ہیں کہ جاؤ' دوسری گلی میں ہماری بھی ماں بہن کو
۔ تیرا بھی بھلا ہو گا۔ میرا بھی بھلا ہو گا۔

آسیہ کو بہت تکلیف پہنچتی تھی۔ اس لئے بتول کی طرح آئینہ نہیں دیکھتی تھی۔
تو اپنے ہی حسن و شباب سے وحشت ہوتی تھی۔ سوچتی تھی' خدا نے اتنی خوبصورتی
ش کیوں دی؟ کچھ کم کر لیتا۔ آدھی بتول آپا کو دے دیتا۔ لڑکیاں اپنے حسن پر ناز
ہیں۔ وہ شرمندہ ہوتی تھی۔ باہر سے ننگی شاعری کے پتھر کھا کر آتی تھی اور بتول آپا

کو دیکھ کر رشک کرتی تھی کہ آپا عذابِ سنگ سے محفوظ ہے۔
عجیب ستم ظریفی تھی۔ بتول کا رشتہ اس لئے نہیں آتا تھا کہ وہ حسین نہیں تھی اور
آسیہ کا رشتہ اس لئے نہیں ہو رہا تھا کہ بتول نہیں ٹل رہی تھی۔
آسیہ کو اپنی آبرو اسی میں نظر آ رہی تھی کہ جلد ہی کوئی اسے دلہن بنا کر لے
جائے۔ تاکہ پھر کوئی اسے ہوس بھری نظروں سے نہ دیکھے اور دیکھے تو اس کا شوہر منہ توڑ
جواب دے۔ ہاتھ لگانے والے کا ہاتھ توڑ دے اور گھورنے والے کی آنکھیں پھوڑ
ڈالے۔
ایک روز وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ آنگن سے امی کی آواز سنائی دی۔ وہ
کسی آنے والے کا استقبال کر رہی تھیں اور اونچی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ "بیٹی بتول!
ٹھنڈا میٹھا شربت لے آؤ۔ تمہاری پانچویں گلی والی خالہ آئی ہیں۔"
وہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی۔ پردے کے پیچھے سے دیکھنے لگی۔ پانچویں گلی
کی بات سنتے ہی آسیہ کے تصور میں احمد پاشا طلوع ہو گیا تھا۔ اس نے کئی بار احمد پاشا کو دور
دور سے دیکھا تھا۔ اس کی ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ اس کا نام پاشا ہے۔ لوگ اسے غنڈہ
بدمعاش کہتے ہیں' وہ غنڈہ ہو گا لیکن کبھی آنکھ اٹھا کر کسی لڑکی کو نہیں دیکھتا ہے۔ اس کے
سامنے کسی لچے لفنگے کی ہمت نہیں ہے کہ محلے کی کسی لڑکی کو چھیڑ دے۔ اگر تمہیں کوئی
چھیڑے تو تم اتنا ہی کہہ دو کہ پاشا سے شکایت کر دوں گی یا کہہ دو کہ پاشا کی گلی میں رہتی
ہو۔ پھر کوئی تمہاری طرف نظریں اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔
اسے یقین نہیں آیا تھا کہ اس علاقے کے غنڈے بدمعاش ایک پاشا سے مرعوب
ہوں گے۔ دوسرے دن وہ خود مرعوب ہو گئی۔ گھر سے نکل کر گلی کے نکڑ پر پہنچی تو پان کی
دکان کے پاس کھڑے ہوئے دو نوجوانوں نے خرمستی دکھائی۔ ایک نے کہا۔ "یار! کیا لبوں
کی لالی ہے۔ ہمارے ہونٹ پان کھانے سے بھی ایسے لال نہیں ہوتے۔"
وہ رک گئی۔ انہیں غصے سے دیکھا پھر بولی۔ "کیا اپنی ماں کے ہونٹوں کا قصیدہ پڑ
رہے ہو؟ بلاؤں پاشا کو۔"
"پاشا؟" دونوں کے منہ گھبراہٹ سے کھلے۔ پان کی پیک رال کی طرح بہتی ہوئی
کے لباس کو آسیہ کے لبوں کی طرح سرخ کرنے لگی' ایک نے کہا۔ "ب...... باجی!
تمہیں نہیں کہہ رہے تھے۔"
"کیا اپنی بہن سے کہہ رہے تھے؟"
وہ دونوں ہچکچائے۔ پھر وہاں سے پلٹ کر گلی کے اندر تیزی سے جانے لگے۔ آ

اختیار مسکرانے لگی۔ اسے ایسی خوشی مل رہی تھی جیسے سپاہی کو بچاؤ کے لئے ڈھال
ورت کو تحفظ کے لئے حجاب مل جاتا ہے۔ وہ بے حد متاثر ہوئی تھی۔ دل نے کہا مجھے
ی محافظ چاہئے۔ خدایا! یا تو میرا حسن غارت کر دے یا پھر اسے پاشا کی امانت کر دے۔
اس نے کھڑکی کے پاس پردے کے پیچھے سے دیکھا۔ آنے والی ایک خاتون چارپائی پر
ے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "بہن! تکلف نہ کرو۔ میرا کلیجا ٹھنڈا کرنا چاہتی ہو تو شربت
نہ کرو' میری جھولی میں آسیہ بیٹی کو ڈال دو۔ میرا پاشا سرکاری ملازم ہے۔ ماہانہ پانچ
کماتا ہے۔ آئندہ دس ہزار روپے ماہانہ تک ترقی ہو گی۔"
امی نے کہا۔ "آپ ایک بار جمیلہ باجی کے ساتھ آ چکی ہیں اور میرا جواب سن چکی
۔ آپ کو یاد نہ ہو تو پھر کہتی ہوں' آسیہ کا رشتہ اس کے چچا زاد سے طے ہو چکا ہے۔
سمجھو میرے گھر میں ایک ہی بیٹی بتول رہ گئی ہے۔"
آسیہ اپنی امی کی زبان سے ہمیشہ یہی جھوٹ سنا کرتی تھی اور مطمئن ہو جاتی تھی۔
پاشا کا نام سن کر دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور ماں کا جھوٹ برا لگ رہا تھا۔
پاشا کی ماں کہہ رہی تھی۔ "میں اچھی طرح معلوم کر چکی ہوں' آسیہ کا کوئی چچا زاد
ہے۔ ایک ماموں کا بیٹا تھا۔ پانچ برس پہلے اس کی شادی ہو چکی ہے۔ آپ بڑی بیٹی کی
ر مجھے ٹال رہی ہیں۔"
وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ "بہن! میں کیا کروں۔ جب کوئی ٹالنے سے نہ
تو جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ سیدھی سی آخری بات یہی ہے کہ پہلے بڑی کے ہاتھ پیلے
ں گی۔"
آسیہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا' وہ جانتی تھی کہ امی کی
پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ وہ بتول آپا کو پہلے سہاگن بنانے کے لئے آنے والیوں سے کہتی
"ابھی میری آسیہ پورے سولہ کی نہیں ہوئی ہے۔ میں اتنی کم عمر میں بچی کی شادی
نگنی بھی نہیں کروں گی۔"
اور آسیہ کو اپنی عمر معلوم تھی۔ وہ بچی نہیں تھی۔ پورے بیس برس کی ہو چکی
اب اپنی امی کا ہر جھوٹ اسے دکھ پہنچا رہا تھا۔ وہ کمرے کے ایک اندرونی دروازے
دوسرے کمرے میں آئی۔ بتول نے اس کا جھکا ہوا سر دیکھا۔ پھر قریب آ کر بولی۔
ہ! میں تجھے دیکھ کر خود کو مجرم سمجھنے لگتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا! امی کب تک تیرا
مانگنے والوں کو واپس کرتی رہیں گی؟"
وہ سر جھکائے ہوئے تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر ہچکچا رہی تھی۔ بتول نے کہا۔

"میں تو سدا کی بدنصیب ہوں۔ مجھے صبر آگیا ہے کہ آخری سانس تک میکے میں ہی رہو
گی۔ آج امی سے بات کروں گی کہ وہ میرے لئے اب سوچنا چھوڑ دیں اور تیری زند
برباد نہ کریں۔"

وہ بولی۔ "امی نے ہمیشہ میرا رشتہ ٹالا۔ میں نے پرواہ نہیں کی کیونکہ مجھے خود کو
رشتہ پسند نہیں تھا۔ مم......... مگر وہ......... وہ جو آئی ہوئی ہیں۔ وہ......... وہ.........

وہ آگے نہ کہہ سکی بتول سے لپٹ گئی۔ بڑی بہن نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا
"اچھا سمجھ گئی' آسی! پتا نہیں تو کتنی مدت کے بعد میرے سینے سے آکر لگی ہے۔ سچ کہ
ہوں' تیرے لئے میرے اندر ممتا پیدا ہو رہی ہے' تو اپنے کمرے میں جا۔ میں امی کو بلا
ابھی بات کرتی ہوں۔"

آسیہ نے خوش ہو کر بتول کو بھینچ لیا۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بتول ماں
کمرے میں بلا کر اس سلسلے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دروازے کے پاس آ
دیکھا۔ آنگن میں اب پاشا کی ماں نہیں تھی۔ اس نے آنگن میں آکر پوچھا۔ "امی! کیا وہ
چلی گئی ہیں؟"

"ہاں۔ تو نے اچھا کیا جو شربت نہیں لائی۔ چینی دن بہ دن مہنگی ہوتی جا رہی ہے
یہ عورتیں ہیں کہ آئے دن منہ اٹھائے چلی آتی ہیں۔ میں کیا کروں' کیا بورڈ لکھوا
دروازے پر لگوا دوں کہ میرے گھر میں صرف میری بتول ہے۔"

وہ بولی۔ "امی! بتول مرچکی ہے۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں۔ آ
کے لئے یہ رشتہ منظور کرلیں۔ ایک بیٹی کے لئے دوسری بیٹی کو بٹھائے رکھنا کہاں
دانشمندی ہے۔"

"اچھا تو مجھے دانشمندی سکھائے گی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے امی! آپ نے باپ بن کر ہماری پرورش کی ہے۔
بی اے تک تعلیم دلائی ہے۔ آج میں آپ کے طفیل ایک اسکول میں ٹیچر ہوں۔ ا
برس ہیڈ مسٹریس بننے کا چانس ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی کسی کے سہار
کے بغیر گزر جائے گی لیکن آسیہ ابھی انٹر میں ہے۔ شادی کے بعد سسرال والوں نے چاہا
آگے پڑھے گی' ورنہ اپنے گھر کی ہو کر رہے گی۔"

"کچھ معلوم تو ہو کہ اتنی لمبی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"وہ بات یہ ہے امی کہ ابھی جو خاتون آئی تھیں' آپ انہیں ہاں کہہ دیں۔ آ
بہت خوش رہے گی۔"

"اللہ نے چاہا تو تم دونوں بہت خوش رہو گی۔"

"آپ پھر میری بات کر رہی ہیں' میں شادی نہیں کروں گی۔"

"کیا رشتہ آئے گا تب بھی نہیں کرے گی؟"

"اسی شرط پر کروں گی کہ آسیہ کے لئے آپ انہی خاتون کی بات مان لیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ آئیں گی تو مان لوں گی۔"

"واہ امی! آپ نے تو انہیں بھگا دیا ہے۔ وہ کس امید پر آئیں گی۔"

"بیٹی! میں آنے جانے والیوں کو بڑے غور سے پڑھتی رہتی ہوں۔ اگر میں نے غلط
نہیں پڑھا ہے تو یہ خاتون آج کل میں پھر آئیں گی۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"ذرا کل تک صبر کرو۔ تم خود ہی دیکھ لو گی۔"

پاشا کی ماں بدحواسی میں مبتلا تھی۔ عقل ایک ہی بات سمجھا رہی تھی کہ بیٹا کوئی
واردات نہ کرے۔ اس نے آسیہ کا رشتہ مانگنے کے لئے التجا کی۔ بیٹے کی ماہانہ تنخواہ بڑھا
چڑھا کر بتائی۔ لڑکی والوں کو قائل کرنے کا کوئی حربہ نہ چھوڑا لیکن آسیہ کی ماں یہی کہتی
رہی "ایسی جلدی کیا ہے۔ آپ گھر جاکر ٹھنڈے دل اور دماغ سے غور کریں۔ میری بتول
آپ کو ضرور پسند آئے گی۔"

وہ گھر آکر پاشا سے بولی۔ "تو خواہ مخواہ ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے' میں کہہ چکی تھی
کہ انکار ہو گا۔ سو ہو گیا۔"

"اس کا مطلب ہے' سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔"

ماں نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "خبردار! اگر تو نے بدمعاشی والی کوئی بات کی تو میں کھڑے
کھڑے جان دے دوں گی۔"

وہ پریشان ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حضور اور پیر صاحب کے کام آنے اور ان
کے قریب رہ کر بہت سے فائدے اٹھانے کا موقع ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ اسے آسیہ اور
اس کی ماں پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر راز کھولنے کی بات نہ ہوتی تو وہ انکار کرنے والی کی گردن
دبوچ کر کہتا۔ مجھے تیری بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تیری بیٹی کا دلہا میں نہیں بنوں گا۔
ایک بہت بڑا' مشہور و معروف پیر ہے' جس کے پاس تیری بیٹی راج کرے گی اور تو اسے
داماد بنا کر اتراتی پھرے گی۔

افسوس کہ حکم زبان بندی تھا۔ وہ پس پردہ ہونے والے رشتے کا انکشاف نہیں کر
سکتا تھا اور کوئی واردات نہ کرنے کی بھی سختی سے تائید کی گئی تھی۔ اس نے ماں کو دیکھتے

ہوئے سوچا۔ پھر پوچھا۔ "ان کی یہی ضد ہے کہ بڑی بیٹی کا رشتہ پہلے ہوگا؟"

"ہاں' وہ عورت چٹان بن گئی ہے۔"

"آخر وہ بڑی ہے کیسی؟"

"کیا بتاؤں کیسی ہے؟ ایسی بری بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے اس کی بدبختی یہ ہے کہ ایک حسین بہن کے سامنے بجھ کر رہ گئی ہے۔"

"اگر وہ اپنے گھر سے ٹل جائے تو کیا وہ آسیہ کا رشتہ ہمیں دیں گے؟"

"دینا تو چاہئے' مگر وہ ٹلے گی نہیں۔"

وہ سوچنے لگا۔ "اگر بڑی کو اٹھوا لیا جائے تو اس کے گھر والے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ پھر گھر سے لاپتا ہونے والی لڑکی کی دوسری بہن کا رشتہ مانگنے شاید کوئی نہیں آئے گا۔ ایسے میں وہ ہمیں رشتہ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

وہ ایسی بات سوچ کر رہ گیا۔ کیونکہ ایسی کوئی واردات کرنے کا حکم نہیں تھا' ماں نے کہا۔ "دیکھ پاشا! تیرے دماغ میں شیطان رہتا ہے۔ تجھے میری قسم ہے کوئی بدمعاشی نہ کرنا۔ اس عورت نے بڑی شرافت اور نیک نامی سے دونوں بیٹیوں کی پرورش کی ہے۔ اگر ان کی عزت پر آنچ آئے گی تو میں شرم سے مر جاؤں گی۔"

"اماں! تم خواہ مخواہ ایسی باتیں سوچ رہی ہو' میں تمہیں شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔"

"ایسا ہے تو پھر اتنا پریشان کیوں لگ رہا ہے۔"

"میں' میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آسیہ مجھے نہیں ملے گی تو میں اسلام آباد چلا جاؤں گا' یہاں رہوں گا تو آسیہ کو نہ پانے کا صدمہ بڑھتا رہے گا۔"

"میرے بچے! اسے بھول جا۔ میں کتنے ارمانوں سے دو بہوئیں لانے کے خواب دیکھ رہی ہوں۔"

"اماں! میری بات چھوڑو۔ محمود کی شادی کر دو۔"

ایسا کہتے ہی وہ ایک دم چونک پڑا۔ ماں کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا' ماں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"ایک آئیڈیا ہے۔ تم میری ایک بات مانو گی؟"

"تیری کون سی بات نہیں مانتی ہوں۔ تیرے عیب چھپانے کے لئے تیرے باپ سے جھوٹ بولتی تھی۔ تیرے باپ کے مرنے کے بعد اکثر سوچتی ہوں کہ میری اندھی ممتا نے تجھے برباد کر دیا ہے۔"

"تم غلط سوچتی ہو۔ تمہاری ممتا اور حمایت نے ایسے راستے پر چلایا ہے کہ میں دیکھتے دیکھتے امیر کبیر بن جاؤں گا۔ تم صرف ایک بات مان لو۔"

"میں تو مانتی ہی رہتی ہوں۔ یہ بار بار خوشامدیں کیوں کر رہا ہے؟"

"مجھے ڈر ہے' تم انکار کر دو گی اور میں اس کے عشق میں شہر چھوڑ دوں گا۔ شہر چھوڑنے سے بھی قرار نہ آیا' اس کی یادیں تڑپاتی رہیں تو خودکشی کر لوں گا۔"

ماں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خودکشی کریں تیرے دشمن۔ میں تیری بات ضرور مانوں گی۔"

اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا پھر کہا۔ "تمہارا ہاتھ میرے سر پر ہے۔ قسم کھاؤ' میں جو کہوں گا وہی کروں گی۔"

"یاخدا! کیا پاگل بیٹا ملا ہے۔ ارے پگلے! تیرے لیے جان بھی حاضر ہے' میں قسم کھاتی ہوں جو کہے گا وہی کروں گی۔"

"تو پھر محمود کے لئے بتول کا رشتہ مانگ لو۔"

وہ فوراً ہی بیٹے کے سر سے اپنا ہاتھ کھینچ کر بولی۔ "کیا بک رہا ہے؟"

"آرام سے امی! آرام سے میری بات سمجھیں۔ بتول کو اس شرط پر محمود کے لئے مانگیں کہ وہ مجھے آسیہ کا رشتہ دیں۔ وہ ضرور یہ شرط منظور کریں گے۔ کیونکہ ویسے بتول قیامت تک اس گھر سے نہیں اٹھے گی۔"

"تو کیسا خود غرض بھائی ہے۔ ایک حور پری لانے کے لئے بھائی کے پلے چڑیل باندھ رہا ہے۔"

"تم کہہ چکی ہو کہ وہ اتنی بری نہیں ہے۔ کالی بھی نہیں ہے۔ سانولی ہے' قابلِ قبول ہے۔"

"ہاں وہ بری نہیں ہے۔ مگر ایک بیٹے کے لئے حور اور دوسرے کے لئے چڑیل لے آؤں' یہ ناانصافی مجھ سے نہیں ہو گی۔"

پھر وہ چونک کر بولی۔ "ارے کیسی جگ ہنسائی کی باتیں کرتا ہے؟ دو بہنوں میں جو بڑی ہے' اسے چھوٹے کے لئے مانگوں اور جو چھوٹی ہے' اسے بڑے بیٹے سے بیاہنے کی بات کروں۔ ہوش میں تو ہے۔"

"ہوش میں ہوں۔ نشہ چھوڑ دیا ہے۔ دنیا والے تو نہ ہنسنے والی بات پر بھی ہنستے ہیں' پھر ہم پر کون کون ہنسے گا؟ کس کی مجال ہے؟ دو چار کی دھنائی کر دوں گا تو سب کو چپ لگ جائے گی۔"

"مگر میں اپنے چھوٹے سے ناانصافی کیسے کروں؟ اور کیوں کروں؟"

"اس لئے کہ تم میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا چکی ہو۔ اب جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو گی۔ اگر ماں ہو کر قسم سے پھرو گی تو بیٹا مر جائے گا۔"

ماں کا کلیجا کانپ گیا۔ وہ تڑخ کر بولی۔ "کیوں میرا دل ہلاتا ہے؟ کیوں ممتا کو آزمائش میں ڈال رہا ہے؟ میرا محمود بہت معصوم ہے۔ وہ بڑی عمر والی دلہن بن کر آئے گی تو بیوی نہیں ماں لگے گی۔"

"یہ تو فضول سی بات ہے۔ وہ تمہیں پسند نہیں ہے تو خواہ مخواہ اسے عمر رسیدہ کہہ رہی ہو۔ ویسے تم قسم سے پھرنے کے لئے اس میں لاکھ کیڑے نکالو۔ قسم پھر قسم ہوتی ہے، پوری نہ ہو تو کسی کی جان لیتی ہے۔"

یہ کہتے ہی وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ ماں کو ممتا کے عذاب میں چھوڑ گیا۔ محبت صرف بڑے سے نہیں، چھوٹے سے بھی اتنی ہی تھی۔ کبھی مخصوص حالات میں محبت کا پلڑا کسی ایک طرف بھاری ہو جاتا تھا۔ بڑے بیٹے کے پلڑے پر بہت وزنی قسم رکھی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ ادھر کو جھک رہی تھی۔

اگرچہ بتول پسند نہیں تھی۔ تاہم بڑے بیٹے کی خاطر اپنی سوچ میں لچک پیدا کرنے لگی کہ وہ خوب صورت نہیں ہے تو بدصورت بھی نہیں ہے۔ ناک نقشے میں بھی کوئی نقص نہیں ہے۔ سر سے پاؤں تک عیبوں سے پاک ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ آسیہ کے حسن کی چکاچوند نے بے چاری بتول کی خوبیوں پر مٹی ڈال رکھی تھی۔

ماں قسم پوری کرنے کے لئے مٹی ہٹا کر بتول کو دریافت کر رہی تھی۔ شام کو محمود فیکٹری سے آیا، منہ ہاتھ دھو کر آنگن میں آ کر بیٹھا تو ماں نے چائے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! اب اس گھر میں بہو آ جانا چاہئے۔"

"کل رات بھائی اپنی شادی کی بات کر رہا تھا۔ کسی کی تصویر بھی دکھا رہا تھا۔"

"میں ایک کی نہیں، دونوں کی بات کر رہی ہوں۔ دو بہوئیں ایک ساتھ لاؤں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

"اس کی ملازمت اسلام آباد میں ہے۔ وہ شادی کے بعد دلہن کو وہاں لے جائے گا۔ میں تیری دلہن کے ساتھ رہوں گی۔"

"بھائی یوں چھوڑ کر جائے گا، آپ کو دکھ نہیں ہو گا؟"

"بچھڑنے کا دکھ ضرور ہوتا ہے لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ ترقی کر رہا ہے۔ جہاں رہے گا، خوش رہے گا اور ہم سے آ کر ملتا رہے گا۔"

"آپ میرے دل کی پوچھیں تو میں بھائی سے الگ رہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے مزاج مختلف ہیں، ہم ہمیشہ ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکیں گے۔"

"بیٹے! جب تقدیر ہی جدا کر رہی ہے تو میں یکجا رہنے کی بات کیسے کروں۔ ویسے جس لڑکی کا رشتہ مانگنے جا رہی ہوں اس کی ایک اور بہن کو تیرے لئے مانگنا چاہتی ہوں۔"

"آپ یہ چاہتی ہیں تو بہتر ہی چاہتی ہوں گی۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "ایک بات ہے بیٹا! پاشا کی دلہن تیری دلہن سے کچھ زیادہ خوب صورت ہے۔ وہ گوری ہے اور تیری والی سانولی ہے۔"

وہ چند لمحوں تک خاموشی سے چائے کی پیالی کو تکتا اور سوچتا رہا۔ پھر ایک گھونٹ پی کر بولا۔ "یہ چائے نہ گوری ہے نہ کالی ہے۔ پھر بھی پی رہا ہوں، میں دودھ پتی نہیں پیتا۔"

بیٹے کی بات فوراً ہی ماں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ اس کا منہ تکنے لگی۔ اس نے کہا۔ "میں ایسی شریکِ حیات چاہتا ہوں، جو صحیح معنوں میں ازدواجی زندگی کا دوسرا پہیہ بن کر رہے۔"

ماں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ بیٹے نے آدھا بوجھ اتار دیا تھا، وہ بولی۔ "بیٹے! وہ بی اے پاس ہے۔ کسی انگریزوں والے اسکولوں میں ٹیچر ہے۔ سنا ہے اچھی تنخواہ ملتی ہے، طبیعت کی میٹھی ہے۔ اُس میں گھر گرہستی والے سارے گُن ہیں۔"

"پھر تو میری طرف سے ہاں ہے۔ میری آمدنی محدود ہے۔ اگر وہ ملازمت کرتی ہے تو واقعی گاڑی کا دوسرا پہیہ ہے۔"

"ایک اور بات ہے۔ میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھوں گی۔ پاشا چھوٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور جو دوسری ہے، اس کا نام بتول ہے، وہ تمہاری دلہن ہو گی۔"

"وہ اپنی بہن سے بڑی ہے کیا مجھ سے بھی بڑی ہے؟"

"وہ عمر والی لگتی نہیں ہے۔ تم اگلے ماہ پورے اٹھائیس کے ہو جاؤ گے، وہ زیادہ سے زیادہ پچیس یا چھبیس کی ہو گی۔"

"مجھے ایک بہترین شریکِ حیات کے ساتھ گھر بسانا ہے۔ مجھے وہ لڑکی معقول لگتی ہے۔"

ماں کی آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو آ گئے۔ ایک بیٹا اندھے کنوئیں میں گراتا تھا۔ دوسرا کنوئیں سے نکالتا تھا۔ اتنی تفریق کے باوجود ممتا بھی عجیب ہوتی ہے۔ دونوں کے لئے محبت یکساں تھی۔

محمود پاشا نادان نہیں تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اتنی ہیرا پھیری سے ہونے والے رشتے کے پیچھے بڑے بھائی کا کوئی خاص مقصد ہے۔ وہ بھائی کے سلسلے میں اس بے غیرتی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا' جس کا مظاہرہ وہ کرنے والا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں کل سے آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں۔ ابھی آپ کے منہ پر رونق آئی ہے۔ اگر میں شادی سے انکار کر دوں تو کیا پھر پریشان ہو جائیں گی؟"

ماں نے پریشان ہو کر دیکھا' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اماں! میں انکار نہیں کر رہا ہوں۔ آپ ہنستی مسکراتی اچھی لگتی ہیں۔ بتول مجھے پسند ہے۔ مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے' بڑی کی میرے ساتھ اور چھوٹی کی بھائی کے ساتھ؟"

"بیٹا! وہ آسیہ کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ کہہ رہا تھا' وہ نہ ملی تو خودکشی کر لے گا۔"

"تعجب ہے' بھائی ایسا عاشق مزاج کبھی نہیں تھا۔ اماں! بھائی سے میری بنتی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بہت ہی خودغرض ہے۔ میں نے آپ کو مطمئن کر دیا ہے لیکن شادی کے معاملات میں میری کچھ شرائط ہوں گی۔"

آنگن کا دروازہ کھلا۔ پاشا نظر آیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں میں تو خودغرض ہوں۔ تم بہت ہی نیک فرشتے ہو۔ بولو تمہاری شرائط کیا ہیں؟"

محمود نے کہا۔ "یہ جو تم نے مکان کے ساتھ والا ایک ہزار گز کا پلاٹ گھیر رکھا ہے۔ اسے میرے نام لکھ دو اور اس مکان پر بھی ہم دونوں برابر کے حق دار ہوں گے۔"

پاشا نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بولا۔ "آنکھیں نہ دکھاؤ' کسی وکیل کے سامنے باقاعدہ لکھا پڑھی ہو گی۔"

پاشا نے پوچھا۔ "میں ہزار گز کا پلاٹ تمہارے نام کیوں لکھوں؟"

محمود نے پوچھا۔ "میں بتول سے شادی کیوں کروں؟"

پاشا نے کہا۔ "اماں! دیکھو یہ بنتا ہوا کام بگاڑ رہا ہے۔ یہ سمجھتا ہے' میں مجبور ہوں۔ آسیہ سے شادی کرنے کے لئے اسے ہزار گز کا پلاٹ دے دوں گا۔"

ماں نے کہا۔ "محمود! یہاں جو کچھ ہے' تم دونوں بھائیوں کا ہے۔"

"نہیں' وہ ہزار گز کا پورا پلاٹ میرا ہو گا اور پلاٹ کے علاوہ بھائی مجھے پانچ ہزار روپے دے گا۔"

پاشا نے اس کا گریبان پکڑ لیا پھر اسے جھنجوڑ کر کہا۔ "میں تجھے اسی پلاٹ میں لے جا کر دفن کر دوں گا۔"

ماں دونوں کو الگ کرنے کے لئے آگے بڑھی' محمود نے کہا۔ "امی! آپ رک

جائیں۔ اگر اس نے فوراً ہی گریبان نہ چھوڑا تو میں بتول سے شادی نہ کرنے کی قسم کھا لوں گا۔"

پاشا اسے فوراً ہی چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ محمود مسکرا کر بولا۔ "بھائی سچا عاشق ثابت ہو رہا ہے۔ کل ہم کچہری جائیں گے اور اسٹامپ وینڈر سے پکا کاغذ لے کر............"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "کیوں اس پلاٹ کے پیچھے پڑے ہو۔ میں نے اسے برے وقتوں کے لئے سنبھال کر رکھا ہے۔"

"تم ایسا کام کیوں کرتے ہو کہ برا وقت آئے۔"

"میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔"

"ایک ہی رات میں تیس ہزار روپے ایمانداری سے حاصل نہیں ہوتے۔"

"تم میری نیک کمائی سے جل رہے ہو۔ کڑھ رہے ہو' تم بھائی نہیں دشمن ہو۔"

"ایسی بکواس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ بہتر ہے' صرف کام کی باتوں پر توجہ دو۔ جو میں نے کہہ دیا ہے اس پر عمل کرو گے تو شادی کی بات آگے بڑھے گی۔"

پاشا غصے سے پاؤں پٹختا ہوا باہر جانے لگا لیکن دہلیز پر آ کر رک گیا۔ آخر کہاں جاتا؟ یہ تو وہ ڈراما کھیلنا تھا جس کے لئے تیس ہزار لے کر آیا تھا اور آئندہ بھی ہزاروں لاکھوں روپے حاصل کرنے کی توقع کر رہا تھا۔ بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے تھوڑا سا اپنے پلے سے بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ان دنوں اورنگی میں ہزار گز کے پلاٹ کی قیمت زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار روپے تھی۔ وہ اتنی سی رقم کے پلاٹ کے لئے آسیہ کو ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ دروازے سے پلٹ کر بولا۔ "ٹھیک ہے کل پکے کاغذ پر لکھ دوں گا اور یہ پانچ ہزار کیوں مانگ رہا ہے؟ کیا یہ غنڈہ ٹیکس ہے؟"

"میں اس رقم سے پلاٹ کے اطراف چار دیواری اٹھا کر تالا ڈال دوں گا۔ میری ہونے والی بیوی اسکول ٹیچر ہے۔ میں رفتہ رفتہ اس پلاٹ پر اسکول کی عمارت تعمیر کروں گا۔ تم اپنا مستقبل کس طرح بنا رہے ہو' یہ خدا جانتا ہے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ تعمیری انداز میں مستقبل سنواروں گا۔"

"میرے سامنے لیکچر نہ دو۔ اگر ابھی میں پانچ ہزار دوں گا تو تمہاری شادی میں ایک پیسہ خرچ نہیں کروں گا۔"

"میں تو ایک ہزار روپے ماہوار کمانے والا کلرک ہوں۔ جب کبھی رقم جمع ہو گی تو شادی کر لوں گا۔"

"کب رقم جمع ہو گی؟ کب شادی کرو گے۔ جب تک بڑی سے شادی نہیں کرو گے

تب تک وہ چھوٹی کو میری دلہن نہیں بننے دیں گے۔"

ماں نے کہا۔ "پاشا کیوں بات بڑھاتا ہے۔ غرض تیری ہے محمود کو شادی کی ایسی جلدی نہیں ہے۔ میں نے تیرے ہی اصرار پر اسے راضی کیا ہے۔ اس کی تنخواہ سے چولہا ہانڈی کا خرچ پورا نہیں ہوتا ہے۔ یہ شادی کیسے کرے گا۔ رقم تو تجھے ہی خرچ کرنی پڑے گی۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں بیٹھ گیا' پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اس کمبخت سے لڑتے وقت بھول گیا تھا کہ ضرورت میری ہے۔ مجھے ہی ساری ذمے داریاں اٹھانی ہوں گی۔ تم صبح ہی جاکر ہم دونوں کا رشتہ طے کر دو۔"

اس نے جیب سے نیا شناختی کارڈ نکال کر چھوٹے بھائی کو دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنا نام بدل دیا ہے' یہ میرا نیا نام اور نئی شناخت ہے۔ کل کے اخبارات میں بھی میرے نئے نام کا اعلان شائع ہو جائے گا۔"

محمود نے شناختی کارڈ کو پڑھتے ہوئے کہا۔ "محمد نظام شاہ ولد اعظم شاہ۔ یہ تمہارا نیا نام اور ولدیت ہے۔ مگر تم نے باپ کا نام کیوں بدلا ہے؟"

"نام کہاں بدلا ہے؟ کیا ابا مرحوم کا نام اعظم نہیں تھا؟"

"ہمارے ابا کا نام اعظم پاشا تھا اور تم نے شناختی کارڈ میں اعظم شاہ لکھوایا ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق یہ پڑتا ہے کہ رشتے اگر طے ہو گئے تو ہم دونوں کی بارات ایک ہی گھر میں جائے گی۔ ایک ہی گھر کی دو لڑکیوں کے نکاح ناموں میں دلہا کے باپ کے نام الگ ہوں۔ ہم سگے بھائی ہیں۔ تم اپنے باپ کے نام کے ساتھ شاہ لکھواؤ گے اور میں ابا کے نام کے ساتھ پاشا لکھواؤں گا۔ تب لڑکی والے کیا کہیں گے؟"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیوں بال کی کھال نکال رہے ہو؟ پاشا اور شاہ میں کیا فرق ہے؟ میں نے سنا ہے' بادشاہ کو ایران میں شاہ اور ترکی میں پاشا کہتے ہیں۔ دونوں کے معنی ایک ہیں صرف الفاظ مختلف ہیں۔"

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ نام بدلنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی ہے؟"

"اماں! یہ سرکاری ملازمت ہے اور نام کی تبدیلی ایک سرکاری راز ہے۔"

"ماں اور بھائی سے کیا پردہ ہے؟"

"سرکاری راز اپنے باپ سے بھی چھپایا جاتا ہے۔ محمود! میرے بھائی! تو مجھ سے

...ا ہے پھر بھی میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ باپ کے نام پر بحث نہ کر۔ میں نے ...تمام شرائط مان لیں۔ تُو میری یہ بات مان لے۔ ابا کے نام کے ساتھ شاہ لکھا جائے ..."

اس نے جیب سے نوٹ نکالے۔ ان میں سے پانچ ہزار گن کر دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ...کل وہ پلاٹ بھی تیرا ہو گا۔ اب کوئی ضد نہ کرنا میرے بھائی! تجھے اماں کی قسم ..."

وہ فوراً ہی اٹھ گیا تاکہ مزید بحث نہ ہو۔ جب وہ کمرے سے چلا گیا تو محمود نے کہا۔ ...رکاری ملازمت' تیس ہزار روپے اور نام کی تبدیلی' مجھے لگتا ہے' اس بار بھائی کوئی ...ی بڑی واردات کرنے والا ہے۔ مجھے اس کے غلط دھندے سے کچھ نہیں لینا ہے لیکن ...ی گڑبڑ ہوئی اور وہ گرفتار ہو گا تو مجھے بتول اور اس کے خاندان والوں کے سامنے ...ندگی ہو گی۔"

ماں نے کہا۔ "تُو خواہ مخواہ اندیشوں میں گھرا ہوا ہے۔ پاشا پہلے بھی جیل گیا ہے۔ کیا ...ی نے اسے مجرم کہا تھا؟ جب وہ جیل سے رہا ہوا تو اسے پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ ...ندہ بھی گرفتار ہو گا تو سیاسی قیدی کہلائے گا۔"

محمود پاشا سر جھکا کر سو سو کے پچاس نوٹوں کو دیکھنے لگا۔ پاشا کو نظرانداز کر کے اپنے ...تقبل کے متعلق سوچنے لگا۔

دوسری صبح وہ پھر آسیہ کے گھر پہنچ گئی۔ اس کی ماں سے کہا۔ "بہن! کل تم نے ... کہا تھا کہ میں گھر جا کر غور کروں گی تو آپ کی بتول مجھے ضرور پسند آئے گی' اب میں ...بیٹے کے لئے بتول کو اور دوسرے بیٹے کے لئے آسیہ کو مانگنے آئی ہوں۔ اب انکار نہ ...نا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "میں ابھی منہ میٹھا کرتی ہوں۔ کسی سے مٹھائی منگواتی ہوں۔"

پاشا کی ماں نے کہا۔ "مٹھائی تو لڑکے والے لاتے ہیں۔ ٹھہرو' میں کسی سے منگواتی ...ہوں۔"

دونوں ہی مٹھائیاں لانے کے لئے اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ آسیہ کی امی نے کہا۔ "سو ...پے مجھے دو۔ سو تمہارے' سو میرے پورے دو سو کی مٹھائی منگواتی ہوں۔"

وہ جانے لگی' پاشا کی ماں نے کہا۔ "میرے سو تو لے جاؤ۔"

وہ جاتے ہوئے بولی۔ "لے لوں گی۔ جلدی کیا ہے۔ آرام سے بیٹھو' ابھی آتی ...ہوں۔"

وہ کمرے میں آئی۔ دونوں بیٹیاں ماں کو دیکھ کر شرما رہی تھیں۔ ماں نے کہا۔ "کہا میں نے کہا تھا کہ میں ان جانے والیوں کو غور سے پڑھتی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے دو بیٹے ہیں' اگر یہ آسیہ کے لئے اتنا گڑگڑا رہی ہے اور اسے بہو بنانے پر تلی ہوئی ہے تو پھر دوسرے بیٹے کے لئے بتول کو مانگنے ضرور آئے گی۔ اگر نہیں آئے گی تو نہ آئے اور آئے گی تو ایک کی خاطر دوسری کو لے جانے پر مجبور ہو جائے گی۔"

یہ دستور بازاروں سے گھروں میں آیا ہے کہ ٹوتھ پیسٹ یا شیمپو کوئی خریدتا نہ ہو تو اس کے ساتھ ایک دم چھلا لگا دیا جاتا ہے۔ یہ مال خریدو گے تو وہ مال ملے گا۔ ازل سے عورت محض مال ہے جب تک اس کے پیچھے کوئی بڑا لالچ نہیں رکھا جاتا' تہذیب کے بازار میں کوئی اسے خریدنے نہیں آتا۔ بتول بھی قبول ہوئی۔ اس کے پیچھے آسیہ انعام میں مل رہی تھی۔

ماں نے گھر آ کر پاشا کو خوشخبری سنائی۔ آسیہ سے رشتہ طے ہو گیا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والی تھی۔ ایسے ہی وقت پاشا کے ساتھ رحمت نے آ کر اسے گھر سے باہر بلایا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔ "کام ہو گیا ہے۔ عبداللہ لالانی کے بچے کو صدو اسی جگہ اٹھا کر لے گیا ہے۔"

"کیا عبداللہ سے فون پر بات کی تھی۔"

"میں نے صرف اتنا کہا تھا' بچہ ہمارے پاس ہے۔ جب تک پولیس سے دور رہو گے' وہ زندہ رہے گا۔ ہمارے اگلے فون کا انتظار کرو۔"

"ٹھیک ہے' میں ابھی صدو اور بچے کے پاس جا رہا ہوں۔ تم ایک بار آج اور دوسری بار کل صبح اسے فون کرو۔ اس سے دس لاکھ کا مطالبہ کرو اور اسے کل دوپہر دو بجے تنہا رقم کے ساتھ آنے کو کہو۔"

"پاشا بھائی! کیا وہ دس لاکھ دے گا؟"

"بچے کے لئے نو لاکھ دے سکے گا تو دس لاکھ بھی دے گا۔ ہم ایک لاکھ زیادہ حاصل نہیں کریں گے تو جسکانی کے صرف ساٹھ ہزار پر گزارہ کرنا ہو گا۔ تم جاؤ' کل شام تک ہمارے پاس ایک لاکھ ساٹھ ہزار ہوں گے۔"

رحمت چلا گیا۔ پاشا نے ماں کے پاس آ کر کہا۔ "میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شاید رات کو نہ آ سکوں۔ کل شام تک ضرور آؤں گا۔"

وہ ایک بریف کیس میں ضروری سامان رکھ کر وہاں سے چل پڑا۔ اس ضروری سامان میں ایک ریوالور بھی تھا۔

وہ اغوا ہونے والا بچہ چھ برس کا تھا۔ اس گھر میں بڑی منتوں اور مرادوں سے پیدا ہوا تھا۔ بے چاری ماں پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ باپ کو دھمکی مل چکی تھی کہ چوبیس گھنٹے کے اندر دس لاکھ روپے ادا نہ کئے تو بچے کی لاش ملے گی۔ اس معاملے میں پولیس کو ملوث کرنے کا انجام بھی یہی ہو گا۔

عبداللہ لالانی وہ شخص تھا جس نے نو لاکھ روپے قرض لے کر اس رقم کا ایک روپیہ واپس نہیں کیا تھا۔ وہ تاوان کی رقم آسانی سے ادا کرنے والا نہیں تھا لیکن دوسرے پر اس نے مطالبہ کرنے والے سے ادائیگی کا وعدہ کیا تھا اور پوچھا تھا۔ "رقم کہاں؟ میرا بچہ کہاں ملے گا؟"

جواب ملا۔ "حب چوکی سے چودہ میل دور ویرانی میں ایک پھوس کی جھگی ہے۔ جھگی چھت پر لگی ہوئی سرخ جھنڈی دور سے نظر آتی ہے۔ وہاں رقم لے کر اکیلے آؤ۔ کوئی راہ گیا دور سے ہی پولیس کا کوئی بندہ نظر آئے گا تو ہم بچے کو گولی مار کر بھاگ جائیں گے۔"

"میں بالکل تنہا آؤں گا' وقت بتاؤ؟"

"دوپہر کے دو بجے دور تک دھوپ پھیلی رہتی ہے۔ ایسے میں کوئی بندہ چھپ کر آ سکے گا۔ کیونکہ ادھر جھاڑیاں اور پہاڑی ٹیلے وغیرہ نہیں ہیں۔"

عبداللہ لالانی نے ریسیور رکھ دیا۔ بیوی نے پوچھا۔ "وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا میرے لا رہے ہیں؟"

"طاہرہ! جو ماں کے رونے کی آواز سن کر بچہ واپس لے آئیں' ایسے رحم دل میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ وہ پورے دس لاکھ مانگ رہے ہیں۔ دس لاکھ! ان کے نے کما کر میرے پاس رکھ چھوڑے ہیں۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "دس لاکھ میرے بچے سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ آپ ان کے ماریں اور ساجد کو لے آئیں۔"

"میرا دماغ خراب نہ کرو۔ جب عقل سے ہم ایک پیسہ خرچ کئے بغیر ساجد کو لا سکتے دس لاکھ ضائع کرنا کون سی عقلمندی ہے؟ کیا ایک روپیہ بھی مفت مل جاتا ہے؟ ایک کے لئے بھی محنت کرنی پڑتی ہے' سر سے ایڑی تک پسینہ بہانا پڑتا ہے۔"

وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ طاہرہ بیگم نے کہا۔ "مجھے پتا ہے آپ کتنا پسینہ بہاتے ہیں۔ کیکڑے کے گوشت میں بڑے جھینگوں کا گوشت ملا کر پیکنگ کراتے ہیں' آپ ایمانی کی سزا بچے کو کیوں ملے۔ آپ رقم ادا کر کے اسے لائیں' ابھی جا کر اسے

لائیں۔"

"ہوش کی باتیں کرو۔ رات کا وقت ہے' انہوں نے کل دوپہر دو بجے بلایا ہے۔"

پھر وہ ٹیلی فون پر بولا۔ "ہیلو پولیس اسٹیشن؟ جی.......... جی میں عبداللہ لالانی ہوں۔ تمہارے انسپکٹر صاحب نعیم چوہدری کا دوست ہوں' ان سے بات کراؤ۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "ہیلو چوہدری صاحب! ابھی ایک بندے نے فون کیا تھا۔ وہ تاوان مانگ رہا ہے' دس لاکھ روپے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ ہرگز رقم ادا نہ کریں مگر ادائیگی کا وعدہ کریں۔ ورنہ وہ بدمعاش بچے کی جان کے دشمن ہو جائیں گے۔"

"جی ہاں' اس نے یہی دھمکی دی ہے کہ پولیس کی مدد حاصل کی گئی تو وہ بچے کو گولی مار دیں گے۔"

طاہرہ بیگم نے ایک زور کی چیخ ماری۔ دوڑتی ہوئی فون کے پاس آئی۔ پھر کریڈل پر ہاتھ رکھ کر فون کا رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ غصے سے بولا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

وہ چیخ کر بولی۔ "آپ کیا کر رہے ہیں' بچے کی جان لے رہے ہیں؟"

"میں اسے خیریت سے لاؤں گا' ہٹو یہاں سے۔"

اس نے فون پر سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔ طاہرہ نے پھر ٹیلیفون کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا۔ وہ اسے پھینکنا چاہتی تھی۔ عبداللہ ٹیلی فون کو پکڑ کر اس سے چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تم پاگل ہو گئی ہو' تم چاہتی ہو' میں تنہا اتنی بڑی رقم لے کر جاؤں تو وہ مجھے بھی گولی مار کر رقم لے کر بھاگ جائیں۔ بچے کے ساتھ شوہر بھی چلا جائے۔"

وہ ٹیلی فون کو دونوں بازوؤں میں دبوچ کر فرش پر جھک کر بیٹھ گئی۔ انکار میں سر ہلا کر کہہ رہی تھی۔ "نہیں کرنے دوں گی۔ پولیس سے بات نہیں کرنے دوں گی۔ تمہیں اپنی جان کا ڈر ہے تو میں رقم لے کر تنہا جاؤں گی اور اپنے بیٹے کو لاؤں گی۔"

وہ اسے مارتے ہوئے بولا۔ "میں کیا پاگل کا بچہ ہوں کہ بچہ بھی جائے' دس لاکھ روپے بھی جائیں اور وہ تیرے جیسی جوان عورت کو بھی اٹھا کر لے جائیں' سیدھی طرح فون کرنے دے۔ ورنہ.........."

وہ اس کا گلا دبوچنے لگا۔ سانس رکنے لگی تو ٹیلیفون ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اس نے بیوی کے بالوں کو پکڑ کر گھسیٹا تو وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔ "میں کیا اپنے بیٹے کا دشمن ہوں؟ میرا ایک

ہے۔ سالی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں دس لاکھ روپے بچاؤں گا تو ہمارے بیٹے کے ہی کام آئیں گے۔"

اس نے دروازے کے پاس لا کر اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کمرے کے اندر آ گئی۔ پھر پلٹ کر آئی تو لالانی نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا تھا۔ طاہرہ دروازے کو گھونسے مارنے لگی۔ چیخنے چلانے لگی۔ وہ چیخ کر بولا۔ "صرف ایک منٹ کے لئے چپ ہو جا۔ میری ایک بات سن لے۔"

وہ ذرا چپ ہوئی تو وہ بولا۔ "اغوا کرنے والوں کی پوری ٹولی ہوتی ہے۔ اُن کے آدمی ہماری کوٹھی کے آس پاس ہماری حرکتوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ تیری چیخیں سن کر انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں پولیس سے رابطہ کر رہا ہوں۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ ہمارے بیٹے کو مار ڈالیں گے۔"

عبداللہ کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ ماں کا کلیجا کانپ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ دبا لیا تا کہ بیٹے کے لئے چیخ نہ نکلے۔ وہ بند کمرے میں دروازے سے لگی ٹیلیفون کے ڈائل کرنے کی آواز سن رہی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے' دبی دبی آواز میں التجا کر رہی تھی۔ "نہ کرو۔ خدا کا واسطہ ہے پولیس کی مدد نہ لو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے' میرے بچے کو کچھ ہوا تو میں بھی اپنی جان دے دوں گی۔"

وہ فون پر بول رہا تھا۔ "حب چوکی سے چودہ میل دور ایک بہت بڑا میدانی علاقہ ہے۔ وہاں صرف ایک ہی پھوس کی جھگی ہے۔ جھگی کی چھت پر ایک سرخ جھنڈی دور سے نظر آتی ہے۔ وہاں کل دوپہر دو بجے مجھے بلایا گیا ہے۔"

وہ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ وہ ایسی دبی آواز میں گڑگڑا رہی تھی جیسے آواز مر رہی ہو' صرف ماں کا کلیجا زندگی کی آخری آواز میں بول رہا ہو۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس نے سنا تھا' کتابوں میں بھی پڑھا تھا' فلموں میں بھی دیکھا تھا کہ بچے اغوا کرنے والے قصائیوں کی طرح بے رحم ہوتے ہیں۔ مطالبہ پورا نہ کیا جائے تو بے دردی سے بچوں کی جان لے لیتے ہیں۔ وہ تمام رات اپنے بچے کے لئے اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتی رہی۔ جیسے دم نکل رہا ہو مگر وہ اپنے بیٹے کو بخیریت دیکھنے کے لئے اپنی سانسوں سے لڑ رہی تھی۔

عبداللہ نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ "آرام سے رہو۔ رونے' فریاد کرنے اور آسمان سر پر اٹھانے سے ساجد نہیں ملے گا۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میں عقل سے کام لے رہا ہوں۔ انسپکٹر نعیم بہت چالاک پولیس افسر ہے۔ وہ ہمارے بیٹے کو بھی لے آئے گا اور ان

بدمعاشوں کو بھی گرفتار کر لے گا۔"

وہ دلاسہ دے کر چلا گیا۔ طاہرہ کے اندر دھواں بھرا ہوا تھا۔ دھواں انسان کو غبارے کی طرح اُڑا دیتا ہے یا اسے گھٹن سے مار دیتا ہے۔ ماں کا عزم مرنے والا نہیں تھا وہ غبارے کی طرح پرواز کر کے اپنے بچے تک پہنچنے کی تدبیر سوچ رہی تھی۔ تمام رات کی جاگی ہوئی تھی' پھر بھی پلکیں نہیں جھپکا رہی تھی۔ آرام سے نہیں بیٹھ رہی تھی۔ کبھی ٹہلتی رہتی تھی' کبھی کسی چیز سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگتی تھی۔

اسے تصور میں نظر آتا تھا کہ پولیس کے درجنوں سپاہی بدمعاشوں کو گھیر رہے ہیں۔ انہیں گولیاں مار رہے ہیں' اسی فائرنگ کے دوران ایک گولی اس کے بیٹے کو بھی لگ گئی ہے۔ وہ ایک دم سے چونک گئی۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

اس نے وحشت زدہ نظروں سے ٹیلیفون کو دیکھا۔ گھنٹی کی آواز میں بچے کے دشمن یا قاتل پکار رہے تھے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی فون کے قریب آئی۔ پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر بولی۔ "ہیلو؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں بچے کے باپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "میں بچے کی ماں ہوں' میرا بیٹا کیسا ہے؟ تمہیں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا واسطہ دیتی ہوں۔ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔"

دوسری طرف سے ڈانٹ کر کہا گیا۔ "فون پر لمبی باتیں نہ کرو۔ اپنے آدمی سے کہہ دینا' ہم نے یاد دہانی کے لئے فون کیا تھا۔ وہ کوئی چالاکی نہ کرے۔ سیدھی طرح تنہا آئے۔ ایک ہاتھ سے رقم دے کر دوسرے ہاتھ سے بچے کو لے جائے۔"

وہ بولی۔ "پھر ایک بار بتا دو۔ کس جگہ آنا ہے۔"

اُدھر سے جگہ کی نشاندہی کرنے کے بعد رابطہ ختم کر دیا گیا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔ پھر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ الماری کھول کر اس کے سیف میں دیکھا' نوٹ گنے صرف چھ ہزار اور زیورات کے دو سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ دس لاکھ روپے کے مطالبے کے سامنے اونٹ کے منہ میں زیرہ تھے۔ پھر بھی اس نے رقم اور زیورات کو اپنے پرس مین رکھ لیا۔

وہ الماری بند کر کے کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وہاں کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں تھی جسے وہ اپنے شوہر سے چھپا کر لے جا سکتی۔ اسی وقت پورچ میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ عبداللہ آیا تھا۔ اس کے ساتھ انسپکٹر نعیم بھی تھا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ عبداللہ نے آواز دی۔ "طاہرہ! کہاں ہو' کیا کسی کا فون آیا تھا؟"

اس نے کمرے میں آ کر کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے اس شخص کا فون آیا تھا۔"

عبداللہ نے چونک کر پوچھا۔ "کس شخص کا؟ کیا وہی بدمعاش تھا؟"

"ہاں' کہہ رہا تھا۔ انہوں نے پروگرام اور جگہ بدل دی ہے۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا نئی جگہ بتائی ہے؟"

"مجھے نہیں بتائی۔ وہ کہہ رہا تھا' اپنے شوہر سے کہنا' یہاں دو بجے فون کے پاس ۔وہ نئی جگہ کا تعین کرے گا۔"

انسپکٹر فوراً ہی صوفے سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر فون کے پاس آیا۔ ریسیور اٹھا کر ڈائل کرنے لگا۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "رحیم داد! پولیس پارٹی کو حب جانے سے دو۔ ان بدمعاشوں نے جگہ بدل دی ہے۔ وہ بعد میں نئی جگہ بتائیں گے۔ ویسے تم ن کے ساتھ تیار رہو۔ وہ لوگ کسی وقت بھی اچانک بچے کے باپ کو بلا سکتے ہیں۔"

اس نے مزید کچھ ہدایات دے کر ریسیور رکھ دیا۔ طاہرہ نے شوہر سے کہا۔ "آپ فون کا انتظار کریں گے' میں تھوڑی دیر کے لئے گاڑی لے جا رہی ہوں۔"

"اس وقت کہاں جا رہی ہو؟"

"حضرت عبداللہ شاہ غازی کے دربار جا کر اپنے بچے کے لئے دعا کروں گی۔ آدھے میں آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔ ہم دوا کر رہے ہیں' تم دعا کرو۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "بھابی! میں بھی چلتا ہوں' آپ مجھے تھانے کے سامنے ڈراپ کر
"

"آپ باہر نکلیں' میں آ رہی ہوں۔"

وہ اپنے کمرے میں آئی۔ وہاں سے ضروری سامان اٹھایا' پھر عبداللہ کا سامنا کئے بغیر ے دروازے سے باہر نکل کر کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ انسپکٹر ساتھ والی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "لالانی صاحب کہہ رہے تھے' آپ بہت پریشان ہیں' پولیس کی لینا چاہتی تھیں؟"

"ہاں۔ میں غلطی پر تھی' جب انہوں نے بتایا کہ آپ بڑی حکمتِ عملی سے وں کو پکڑ لیں گے اور میرے ساجد کو حفاظت سے لے آئیں گے تو میں آپ پر اعتماد ی ہوں۔"

"شکریہ بھابی! یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ لوگوں نے ہم پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ما آپ بھروسا کر رہی ہیں۔"

طاہرہ کا راستہ دوسرا تھا۔ اسے انسپکٹر کی وجہ سے راستہ بدل کر تھانے تک جانا پڑا۔ وہ بیٹے کو حاصل کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے تھانے کے سامنے چھوڑ کر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی' حب کی سمت جانے لگی۔ تقریباً تیس میل کا فاصلہ تھا۔ اُس نے چوکی سے گزر کر چودہ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جھگی دیکھی' جس کی چھت پر سرخ جھنڈی لہرا رہی تھی۔

جھگی کے اندر احمد پاشا اپنے دونوں ساتھیوں رحمت اور صمدو کے ساتھ تھا۔ انہوں نے بچے کے منہ پر کپڑا باندھ دیا تھا تاکہ وہ کسی آنے والے کو اپنی آواز نہ سنا سکے۔ پاشا نے جھگی کا پچھلا دروازہ کھول کر دور تک نظریں دوڑائیں۔ تیز چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ایک آدمی تو کیا ایک جانور بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے خطرے کے وقت فرار ہونے کے لیے وہی پچھلا راستہ دیکھ رکھا تھا۔

رحمت نے کہا "میں نے فون پر اچھی طرح تڑی دی ہے۔ وہ بچے کی زندگی چاہے تو تنہا آئے گا۔"

پاشا دور خلا میں تکتے ہوئے سوچنے لگا "یہ آسیہ میرے لیے بڑی لکی ہے۔ اس رات صبح اٹھ کر اس کا منہ دیکھا تو تیس ہزار روپے ملے۔ کل اس سے رشتہ طے ہوا تو بچے باپ دس لاکھ روپے ادا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ آج دوپہر تک ہمارے پاس ایک لا ساٹھ ہزار روپے ہوں گے۔"

سوچتے سوچتے اسے ایک اور فائدہ نظر آیا' جو آسیہ کی ذات سے حاصل ہو رہا تھا اور وہ یہ تھا کہ پاشا نے پچھلے تین دنوں سے کوئی نشہ نہیں کیا تھا۔ سگریٹ کا ایک کش نہیں لگایا تھا۔ اگرچہ طلب ستاتی رہی تھی۔ تاہم وہ زندہ سلامت رہ کر ہزاروں لاکھوں کمانے کے لیے نشہ کی طلب کو کچلتا جا رہا تھا۔

نشہ دراصل لالچ میں ہوتا ہے' صرف شراب یا چرس وغیرہ میں نہیں ہوتا۔ جو نشہ کا لالچ کرتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہیں' وہ موت کو دور رکھنے کے لیے نشے سے دور رہتے ہیں۔ پاشا کو دولت سے پیار تھا' زندگی سے پیار تھا اور حضور نے آسیہ کو اس کی زندگی میں لا کر وارننگ دی تھی کہ حسن و شباب کے نشے سے دور رہو۔ آسیہ کے قریب رہ کر بھی دور رہنے کا طریقہ صرف یہ تھا کہ وہ بہکانے والے تمام نشے سے دور رہے۔ مختصر یہ کہ آسیہ کی آمد نے اس سے ہر طرح کا نشہ چھڑا دیا تھا۔

پاشا' رحمت اور صمدو نے جھگی کی چھوٹی سے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بہت سے ایک کار چلی آرہی تھی۔ اس کار کے آگے پیچھے دور تک کوئی کار یا کوئی بندہ نظر

آرہا تھا۔ پاشا نے کہا۔ "صمدو! پیچھے جا کر دیکھو۔ پہاڑیوں پر کوئی نظر آئے تو ہم اِدھر سامنے سے بھاگیں گے۔"

صمدو دوڑتا ہوا جھگی کا پچھلا دروازہ کھول کر دور تک پہاڑیوں پر اوپر نیچے نظریں دوڑانے لگا۔ رحمت بچے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بڑا سا چاقو کھول کر بولا "میری وارننگ یاد ہے نا؟ آواز نکالے گا تو اس چاقو سے تیرا گلا کاٹ دوں گا۔"

بچے کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ بری طرح سہا ہوا تھا۔ پاشا نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا "عبداللہ وعدے کے مطابق تنہا آرہا ہے۔ میں باہر جاتا ہوں۔ تم لوگ ہوشیار رہو۔"

وہ ہاتھ میں ریوالور لیے جھگی سے باہر آیا۔ دور سے آنے والی کار کو دیکھنے لگا۔ جب کار پچاس گز کے فاصلے پر رہ گئی تو اس نے حیرانی سے ایک عورت کو کار ڈرائیو کرتے دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ریوالور کو تھام کر نشانہ لیتے ہوئے بولا "وہیں رک جاؤ۔"

کار رک گئی۔ وہ بولا "خبردار! دروازہ نہ کھولنا۔ باہر نہ نکلنا۔ اگر تمہارے ساتھی کار میں چھپے ہوئے ہیں تو اس جھگی کے اندر بچے کو گولی مار دی جائے گی۔"

طاہرہ نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر کہا "میں بچے کی ماں ہوں۔ میں اس کی سلامتی کے لیے کسی کو ساتھ نہیں لائی ہوں' میں بالکل تنہا ہوں۔"

"صمدو! کار کے پاس جاؤ۔ اس کے اندر اور ڈکی میں دیکھو۔"

صمدو دوڑتا ہوا کار کے قریب آیا۔ یہ خوف تھا کہ پچھلی سیٹ کے نیچے چھپے ہوئے مسلح افراد اچانک ہی ابھر کر اسے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے لیکن اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان کوئی چھپا ہوا نہیں تھا۔ طاہرہ نے اسے ڈکی کھولنے کے لیے چابی دی۔ پاشا ڈکی کے قریب آکر ریوالور تان کر کھڑا ہو گیا۔ صمدو نے اسے چابی سے کھولا۔ وہاں بھی اندر کوئی نہیں تھا۔

پاشا اگلی سیٹ کی طرف آکر طاہرہ کو نشانے پر رکھ کر بولا۔ "عبداللہ کہاں ہے؟ کیا یہ کوئی چال ہے؟ وہ پیچھے پولیس لے کر آئے گا؟"

"اگر ایسا کرنا ہوتا تو میں شوہر سے پہلے تنہا جان دینے نہ آتی۔ کیا دور سے پولیس والے نظر آئیں گے تو تم مجھے اور میرے بچے کو زندہ چھوڑو گے!؟"

"کیا تم رقم لائی ہو؟"

"کیا مجھے گاڑی سے باہر نہیں آنے دو گے؟"

"ٹھیک ہے۔ باہر آؤ' وہ تمہارے سامنے ڈیش بورڈ پر کیا رکھا ہوا ہے' اس پر سے

کپڑا ہٹاؤ۔"

طاہرہ نے اس پر سے کپڑا ہٹایا۔ جزدان میں لپٹا ہوا کلام پاک رکھا ہوا تھا۔ اس نے کلام پاک کو وہاں سے اٹھا کر چوما' اسے آنکھوں سے لگایا' پھر اسے اپنے سر پر رکھ کر دروازہ کھول کر جیسے ہی کار سے نکلی پاشا کئی قدم پیچھے چلا گیا۔

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ حالانکہ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ پھر وہ بے رحم بدمعاش تھا۔ ایسا بے رحم کہ بچے کو ماں کی گود سے اغوا کرانے کے بعد بے دردی سے اسے گولی مار سکتا تھا۔

اس کے سامنے ایک کمزور عوت تھی۔ تنہا اور بے یارومددگار تھی۔ وہ اسے قتل کر کے اس کا سب کچھ لوٹ سکتا تھا۔ اس کے پاس نقدی نہ ہوتی تو کار لے جا کر کسی دوسرے شہر میں بیچ دیتا۔ وہ ہر لحاظ سے اس پر غالب تھا لیکن بدمعاش خواہ کیسا ہی بے رحم اور سفاک ہو' اس کے اندر کہیں نہ کہیں خوفِ خدا ہوتا ہے اور خدا کی یہی شان ہے کہ وہ بدمعاش کے دل میں بھی رہتا ہے۔

پاشا کو خدا یاد نہیں آتا تھا۔ وہ کسی معاملے میں صرف قسم کھاتے وقت خدا کا نام لیتا تھا۔ ورنہ کبھی اسے خدا کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ قرآن مجید کو اس نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن مسلمان کی حیثیت سے یہ جانتا تھا کہ ناپاکی کی حالت میں اس مقدس کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا ہے۔ اسی لیے اسے طاہرہ کے سر پر دیکھتے ہی پیچھے لوٹ گیا تھا۔

وہ ریوالور سے گولی مارتا تھا اور دنیا کی آخری کتاب ہدایت کے پھول مارتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ پیچھے ہٹنے والے ناپاک شخص کو بھی پھول مار رہی تھی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا "یہ......یہ......اسے ہٹالو۔"

طاہرہ نے کہا "خدا کا شکر ہے' تم ریوالور رکھ کر بھی خدا سے ڈرتے ہو۔ تمہیں اس کتاب کی صورت میں خدا نظر آرہا ہے۔"

حدِ نظر تک کھلا میدانی علاقہ تھا۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوائیں ان کے درمیان سے گزر رہی تھیں۔ رحمت جھگی کے دروازے پر آکر بولا "ارے یہ کیا ڈرامہ ہو رہا ہے؟ اے بی بی! کیوں اللہ کے کلام کو بیچ میں لا رہی ہو' اسے گاڑی میں رکھ دو۔"

"میں اسے سر پر رکھ کر تم سب کو یقین دلانے آئی ہوں کہ اگر میں نہ آتی تو تم میں سے کوئی یہاں سے زندہ بچ کر نہ جاتا۔ کیونکہ میرا شوہر پولیس کی بھاری تعداد کے ساتھ اس علاقے میں دور تک گھیراؤ ڈالنے والا تھا۔"

انہیں شاید یقین نہ آتا لیکن وہ سر پر رکھی ہوئی کتابِ مقدس کو دیکھ رہے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی "میرا شوہر بہت کنجوس ہے۔ وہ رقم لے کر نہیں پولیس لے کر آرہا ہیں نے اس سے اور پولیس والوں سے جھوٹ کہہ دیا کہ تم میں سے کسی نے اب ھائی گھنٹے پہلے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ تاوان وصول کرنے کی جگہ بدل گئی ہے۔ اب دو بجے فون کر کے نئی جگہ بتاؤ گے۔"

پاشا' رحمت اور صمدو ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے' طاہرہ نے کہا "اگر پولیس آجاتے تو سوچو کیا ہوتا' میرے بچے کے ساتھ تم سب کی بھی جانیں جاتیں۔"

صمدو نے کہا "ہم اناڑی نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے بچاؤ کا محفوظ راستہ رکھا ہے۔"

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم سب بچو گے یا مرو گے؟ میں نہیں جانتی تھی کہ میرے زندہ چھوڑو گے یا مار ڈالو گے؟ میں تو تم سب کو نئی زندگی دینے کے جذبات سے ہوں۔"

یہ بات ذرا دل کو لگی۔ ان تینوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ عورت پولیس کا راستہ روک ئی ہے' وہ بولی "یقین نہ ہو تو مجھے اور میرے بچے کو مار ڈالو۔ پھر یہاں سے جاؤ گے تو ے پیچھے کوئی پولیس نہیں ہو گی۔ تمہارے آگے پیچھے وہ سلامتی ہو گی' جو میں ے لیے لائی ہوں۔"

رحمت نے کہا "پاشا بھائی! یہ کلام پاک رکھ کر بچے کو ہم سے مفت لے جانے آئی "

وہ بولی "میری گاڑی میں صرف چھ ہزار نقد اور تیس ہزار کے زیورات ہیں۔ یہ میں شوہر سے چھپا کر لائی ہوں' تم ہماری جان لے سکتے ہو' یا یہ مال رکھ سکتے ہو۔ اس زیادہ کچھ پا نہیں سکو گے۔ سوچ لو' تمہیں کیا پانا ہے اور کیا کھونا ہے؟"

"اے بی بی! زیادہ مت بولو۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ جب رقم لاؤ گی تو بچہ ملے گا۔"

وہ بڑے عزم سے بولی "بچہ تو ابھی لے کر جاؤں گی۔ میں عہد کر کے آئی ہوں کہ میں جو پہلی مسجد آئے گی' وہاں لے جا کر بیٹے کو سجدہ کراؤں گی۔ پھر غازی بابا کے لے جاؤں گی۔ تم تینوں مسلمان ہو۔ کیا میرے بچے کو سجدہ کرنے سے روکو گے؟ غازی بابا کے پاس جانے نہیں دو گے؟"

پاشا نے گہری سنجیدگی سے کہا "تم بہت مضبوط ایمان والی ہو۔ تمہارا ایمان دیکھ کر ہو رہا ہے کہ پولیس نہیں آئے گی۔ تم اپنے بچے کی جان ہم سے بچا رہی ہو اور جان پولیس والوں سے۔"

اس نے جھگی کی طرف دیکھ کر کہا "رحمت! بچے کی رسیاں کھولو اور اسے ماں کے
پاس لے آؤ۔"

رحمت نے کہا "پاشا بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

صمدو نے کہا "اس کے پاس جو بھی مال ہے، پہلے اسے تو وصول کرو۔"

"کس عورت سے مال چھیننا چاہتے ہو، جس نے ابھی ہمیں پولیس والوں سے بچایا
ہے؟"

"پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ ہم نے بھاگنے کا راستہ بنا رکھا ہے۔"

"اگر بھاگنے کے راستے پر بھی پولیس آجاتی تو کیا کرتے؟ کیا ہم ہی فقط چالاک ہیں
کیا دوسرے ہم سے زیادہ چالاک نہیں ہیں؟ پھر بات یہ نہیں ہے کہ یہاں کیا ہوتا؟ بات
اس عورت کے جذبے کی ہے۔ اس ماں نے اپنے بچے کے ساتھ ہمیں بھی بچالیا ہے۔
اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ بچے کی سلامتی، ہماری سلامتی میں ہے۔ مجھ سے بحث نہ کرو
بچے کو فوراً یہاں لے آؤ۔"

رحمت نے اندر آکر بچے کی رسیاں کھول دیں۔ منہ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ وہ پاشا سے
کمزور نہیں تھا۔ حکم عدولی کر سکتا تھا لیکن بہت سی مجبوریاں آڑے آگئی تھیں۔ ایک
ان تینوں کے پاس اکلوتا ریوالور تھا جو پاشا کے قبضے میں تھا۔ وہ انکار کرنے پر گولی مار سکتا
تھا۔ پھر یہ بھی جانتا تھا کہ پاشا کے تعلقات بڑے لوگوں سے ہیں۔ کسی مصیبت کے وقت
وہ اسے پولیس سے بچا سکتا تھا۔

وہ بچے کو باہر لے آیا۔ ماں اُسے دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گئی۔ اسے کلام پاک کے
سائے میں چومنے لگی۔ اس کی ممتا قابلِ دید تھی۔ اس نے کلام پاک کو بچے کے سر پر رکھ
دیا تھا تاکہ اغوا کرنے والوں کی نیت نہ بدل جائے۔ وہ قرآن مجید کی تلوار سے مجرموں کے
ارادوں کو کاٹ رہی تھی اور انہیں رو رو کر دعائیں دے رہی تھی۔

وہ بیٹے کو کتابِ مقدس کے سائے میں کار کے پاس لائی۔ اسے اندر بٹھایا۔ پھر ڈیش
بورڈ کے خانے سے ایک بڑا کاغذ کا لفافہ نکال کر ان تینوں کی طرف بڑھاتے ہوئے
"اس میں چھ ہزار روپے نقد اور تیس ہزار کے زیورات ہیں۔"

پاشا نے پیچھے ہٹ کر کہا "نہیں۔ ایک پیسہ بھی دوگی تو ہماری نیکی برباد ہو جائے گی
یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔"

صمدو اس کے ہاتھ سے لفافہ جھپٹ کر رحمت کے پاس آگیا، پھر بولا "پاشا بھائی! ہم
مال نہیں چھوڑیں گے۔ تمہاری تو اندھی کمائی ہو رہی ہے۔ تمہیں اس کی ضرورت نہیں

ہم کنگلے ہیں۔ ہم کل سے رقم کے لیے جان لڑا رہے تھے اور خطرات سے کھیل
رہے تھے۔"

"صمدو! کبھی تو تھوڑی دیر کے لیے انسان بن جاؤ۔"

رحمت نے کہا "ہم انسان بن کر ہی دس لاکھ نہیں لے رہے ہیں اور زندہ بچہ اسے
دے رہے ہیں۔"

پاشا نے دونوں کا نشانہ لیتے ہوئے کہا "میری زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی
ہے۔ یہ ریوالور سمجھائے گا تو سمجھنے کے قابل نہیں رہ جاؤ گے۔"

طاہرہ دوڑ کر درمیان میں آئی۔ پھر رحمت اور صمدو کے سامنے ڈھال بن کر بولی
"آپس میں نہ لڑو۔ خدا دیکھ رہا ہے کہ تم میرے ساتھ بے لوث نیکی کر رہے ہو۔ یہ
ضرورت مند ہیں انہیں رقم لے جانے دو۔ میں ایک بہن کی زبان سے التجا کر رہی ہوں۔
انہیں رقم لے جانے دو۔"

پاشا نے گھور کر رحمت اور صمدو سے کہا "میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا۔ مال لے
جاؤ، ہماری دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔"

وہ دونوں کوئی جواب دیئے بغیر پہاڑی کی طرف جانے لگے۔ طاہرہ کار میں آکر بیٹھ
گئی، پھر بولی "آؤ میرے ساتھ چلو، میں شہر پہنچا دوں گی۔"

"نہیں۔ تم جاؤ میں چلا جاؤں گا۔"

"تم اکیلے رہ گئے ہو۔ آگے پندرہ سولہ میل تک کوئی گاڑی نہیں ملے گی۔ پلیز
میری گاڑی میں چلو۔"

پاشا نے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے کلام پاک کو دیکھا پھر کہا "میں انکار کر چکا ہوں،
ضد نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی "بیٹا میرا ہے، میں نے تم سے لے لیا۔ اس
کا مال تمہارا نہیں تھا، تم نے اسے نہیں لیا۔ میری دعا ہے ساری زندگی اسی طریقہ پر
چلو، جو چیز تمہاری نہیں ہے، اسے دوسروں سے نہ لو اور جو تمہاری ہے، اسے
رکھنے کے لیے جان لڑاتے رہو، خدا حافظ۔"

وہ کار کو واپس موڑ کر جانے لگی۔ پاشا میلوں دور تک پھیلے ہوئے ویران علاقے میں
اس کو دور جاتے دیکھتا رہا۔ وہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے نقصان میں تھا۔ نقصان
کے نتیجے میں ہو، یا نیکی کر کے اٹھانا پڑے، ہر حال میں وہ نقصان ہوتا ہے۔ اب وہ
سوچ رہا تھا کہ بدمعاشی کرنے آیا تھا پھر نیکی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

طاہرہ کی کار دور جاکر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس نے دوسری طرف پلٹ کر دیکھا۔ رحمت اور صمد و میدانی حصہ عبور کرکے اب پہاڑی پر چڑھتے جارہے تھے۔ اس نے سوچا "انہوں نے پوری طرح کلام پاک کا لحاظ کیوں نہیں کیا؟ ایک ماں سے رقم زیورات کیوں لے گئے۔ میں خالی ہاتھ کیوں رہ گیا؟"

اس نے جھنجلا کر ریوالور سے ان دونوں کا نشانہ لیا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے ریوالور کا رخ آسمان کی طرف کیا اور گولی چلا دی۔ پہلے ایک فائر کیا۔ گونجتی ہوئی آواز دونوں تک پہنچی۔ انہوں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا۔ یہی سمجھ میں آیا کہ دوست اب دشمن بن کر ان کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ دونوں گرتے پڑتے پہاڑیاں چڑھنے لگے۔ پاشا نے دوسرا اور تیسرا فایر کیا۔ اس کی فائرنگ کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ وہ انہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ انہیں دہشت زدہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی سے دشمنی بھی نہ ہو اور غصہ بھی آرہا ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟

ایسے میں آدمی دیوار پر گھونسے مارتا ہے۔ اسلحہ ہو تو ہوائی فائرنگ کرتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' وہ جانور تھا' آدمی کیسے بن گیا؟ آدمی تھا' انسان کیسے ہو گیا؟ انسان تھا' فرشتہ کیسے ہو چلا ہے؟ کیوں اس نے نیکی کی؟

کبھی سوچے سمجھے بغیر بھی نیکی ہو جاتی ہے۔ ایک شرابی نشے میں لڑکھڑاتا ہوا راستہ چلتا ہے۔ اسے ایک کاغذ پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے جس پر عربی زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ کسی کسی عرب باشندے کے دھوبی کا حساب اس کاغذ پر لکھا ہو۔ شرابی عربی پڑھنا نہیں جانتا صرف اتنا جانتا ہے کہ وہ کلام پاک کی زبان ہے۔ وہ اس کاغذ کو اٹھا کر کسی اونچی جگہ رکھ کر چلا جاتا ہے تاکہ کسی کے قدموں تلے نہ آئے۔ پھر وہ صبح بھول جاتا ہے کہ رات اس سے کون سا نیک عمل ہو گیا تھا۔

پاشا نے ہوش مندی میں نیکی کی تھی۔ پھر بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیوں کی اور ان دونوں سے وہ عمل پورا کیوں نہ ہوا؟ شاید اس لیے کہ کسی کے اندر اچھائی زیادہ ہوتی ہے اور کسی کے اندر اچھائی کچھ کم ہوتی ہے۔ ایسی اچھائی بقدر عقیدہ اور بقدر احساس ہوتی ہے۔

اس نے جھنجلا کر آسیہ کو گالی دی "لعنت ہے اس پر۔ میں سمجھ رہا تھا' سالی میرے لیے لکی ہے لیکن کل رشتہ طے ہوا' آج ایک لاکھ ساٹھ ہزار کا نقصان ہو گیا۔ ہش ہوا کہ صرف دُلہن بن رہی ہے' بیوی نہیں بن رہی ہے۔"

یہ جو اندر ہی اندر تبدیلی ہوتی رہتی ہے' اسے آدمی اوپر سے دیکھ نہیں پاتا۔

نہیں پاتا کہ جانور سے آدمی کیسے بن رہا ہے؟

اس نے ایک ہفتے بعد حضور ابن سلطان کے دربار میں حاضری دی۔ وہاں اور بھی کئی ضرورت مند بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے پاشا کی طلبی ہوئی۔ وہ حضور کے سامنے آکر فرش پر دو زانو ہو گیا۔ حضور نے کہا "جو بکنا ہے' جلد بکو۔ ابھی پیر صاحب کا فون آنے والا ہے۔ انہیں کیا جواب دوں؟"

"حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔ اگلے ماہ کی تیس تاریخ کو اسے دُلہن بنا کر لے آؤں گا۔"

"شاباش! تم نے میرے سر سے بوجھ اتار دیا ہے۔ پیر صاحب کی مراد پوری نہ ہوتی تو میری کرسی کے پائے ہل جاتے۔ تم میرے لیے صرف جان پر ہی نہیں کھیلتے بلکہ مشکل سے مشکل کام بھی کر دکھاتے ہو۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آئندہ جو مشکلات پیش آئیں گی' ان سے نمٹنے کے لئے میرا بھرپور ساتھ دو گے۔"

"حضور! میں آپ ہی کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ یہ جان آپ ہی پر قربان کروں گا۔ مجھے بتائیں آئندہ کس طرح کی مشکلات پیش آئیں گی؟"

"یہ ابھی کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تو پیر صاحب کے مطالبات پورے کر رہا ہوں۔ مگر وہ حد سے گزر رہے ہیں۔ مجھے اور تمہیں ایک لڑکی کا دلال بنا دیا ہے۔"

پاشا نے چونک کر حضور کو دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے بڑے ابن سلطان کی زبان سے اتنا کڑوا سچ نکلے گا۔ حضور نے کہا "مجھ جیسی شخصیت کے لیے دلال سے بڑی گالی اور کیا ہو سکتی ہے مگر ہم اقتدار میں رہنے کے لیے یہ سوچ کر برداشت کر لیتے ہیں کہ ایسی گالیاں اخبارات میں نہیں چھپتیں۔ عوام کو پتا نہیں چلتا کہ ہم پیر صاحب کے قدموں میں جاکر کیسی بے عزتی برداشت کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال تم ہوشیار رہو۔ حالات کسی وقت بھی اچانک بدل سکتے ہیں۔ ان حالات میں' میں تمہیں تحفظ دیتا رہوں گا اور تم میرے کام آتے رہو گے۔"

"حضور! آپ کے اعتماد نے میرا مرتبہ بڑھا دیا ہے۔"

"ہاں۔ اب تمہارا مرتبہ بڑھے گا۔ تم سے اچانک رابطہ کرنے کے لیے تمہارے پاس ٹیلیفون کا ہونا ضروری ہے۔ میرے پاس فوراً پہنچنے کے لیے گاڑی بھی ضروری ہے۔ میرے قریب تر رہنے کے لیے کلفٹن کے آس پاس تمہاری رہائش لازمی ہے۔ گزری کے علاقے میں ایک چھوٹی سی کوٹھی تمہیں لے کر دی جائے گی۔ وہاں ٹیلیفون بھی ہو گا اور گاڑی بھی' اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر کیشئر کو دے جاؤ۔ تمہارے اکاؤنٹ میں فی الحال پانچ

لاکھ جمع ہو جائیں گے۔ اگر حالات میرے خلاف ہوں گے تو مزید بیس پچیس لاکھ جمع کرادوں گا۔ تاکہ تم کسی محتاجی کے بغیر میرے کام آتے رہو۔"

"حضور! میں سیاسی حالات کو سمجھ رہا ہوں۔ ایسے وقت ضروری ہے کہ میرے چند وفادار ماتحت ہوں، جو جدید اسلحہ سے لیس ہوں۔"

"بے شک یہ بہت ضروری ہے۔ تم اپنے اعتماد کے ایک درجن مسلح ماتحت رکھ سکتے ہو۔ کل تمہارے اکاؤنٹ میں پانچ نہیں، دس لاکھ روپے پہنچ جائیں گے۔ تم پرسوں آؤ اور نئی کوٹھی اور کار وغیرہ کی چابیاں لے جاؤ۔"

وہ اٹھ کر سلام کرتا ہوا، الٹے قدموں چلتا ہوا اس کمرے سے باہر آگیا۔ کاریڈور سے گزر کر انتظار گاہ میں پہنچا۔ وہاں چھوٹے بڑے سیاسی یتیم اور صنعت کار اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں میر علی جسکانی بھی تھا۔ وہ دوسری طرف منہ پھیر کر انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاشا نے قریب آکر کہا "جسکانی بھائی! ایسی بھی کیا بے مروتی؟ منہ پھیر کر بیٹھے ہو۔ بھئی آپ نے مجھ سے تو قرض نہیں لیا ہے۔"

وہ جھینپ کر مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا پھر مصافحہ کرتے ہوئے بولا "ارے پاشا بھائی! آپ ہیں؟ میں اصل میں ایک مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ آپ کو نہیں دیکھا، سوزی ریئلی سوری۔"

وہ کچھ پریشان سا تھا۔ دروازے کی طرف دیکھ کر پھر قریب ہو کر سرگوشی میں بولا "پاشا بھائی! ایک گزارش ہے۔ یہاں مجھ سے باتیں نہ کریں۔ وہ جو حضور کا پی اے پیر محمد ہے، اس سے میرا معاملہ فٹ ہو گیا ہے۔ وہ آپ کو غنڈہ بدمعاش کہتا ہے اور مجھے اپنے لیول کا آدمی سمجھتا ہے۔ آپ مجھ سے بے تکلف ہو کر بولیں گے تو یہاں بنتا ہوا کام بگڑ جائے گا۔"

پاشا نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا "خوش رہو اور اپنا کام بناؤ۔ میں یہ بتا دوں کہ نو لاکھ کی وصولی کا سودا ختم کر رہا ہوں اور تم نے جو دو ہزار پیشگی دی تھی وہ........"

وہ بات کاٹ کر بولا "اسے بھول جاؤ۔ میں تم سے سارے لین دین ختم کر رہا ہوں۔"

پاشا مسکرا کر اس کمرے سے نکل آیا۔ پھر کیشئر کے پاس پہنچا۔ اسے ایک کاغذ پر بینک اکاؤنٹ نمبر وغیرہ لکھ کر دینے کے بعد بولا "میں جا رہا ہوں، پرسوں کچھ ضروری چابیاں لینے آؤں گا۔"

کیشئر نے کہا "اس رسید پر دستخط کرو اور پچاس ہزار روپے لے جاؤ۔"

"پچاس ہزار؟" وہ حیرانی سے بولا "کیا حضور نے پیمنٹ کا حکم دیا ہے؟"

"اور کیا اُن کے حکم کے بغیر میں اپنی جیب سے دوں گا؟ انہوں نے ابھی انٹر کام پر دیا ہے۔"

اسی وقت پی اے پیر محمد نے آکر پچاس ہزار کی ایک پرچی دی۔ پھر پاشا کو دیکھ کر اتے ہوئے کہا "بڑا مال کھینچ رہے ہو۔"

وہ جواباً مسکرا کر بولا "اللہ کسی نہ کسی ذریعے سے دیتا ہے اور بندہ لیتا ہے۔"

"کیا یہ ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے خوش نہیں رکھو گے تو یہاں سے ڑ کر پھینک دیئے جاؤ گے۔"

"میں صرف اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ حضور کا جو کام کر رہا ہوں، وہ ان کا پی اے بھی کر سکے گا اور جب تک وہ کام نہ ہو، کوئی مائی کا لال میرے قدم نہیں اکھاڑ سکے گا۔"

پی اے پیر محمد نے حقارت سے کہا "اونہہ، بیوی کا دلال........"

پاشا ٹھٹک گیا۔ چشم زدن میں سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حالانکہ ابھی کوئی نہیں تھی اور جو ہونے والی تھی، اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس کے لیے کوئی جذبہ کوئی غیرت کا تقاضا نہیں تھا۔ پھر بھی تن بدن میں آگ لگ گئی۔

جو بیوی والے نہیں ہوتے مگر یہ سمجھتے ہیں کہ کبھی تو ایک بیوی ہوگی، ایسے ارے کو بھی بیوی کے حوالے سے گالی دی جائے تو وہ ہونے والی شریکِ حیات کی نابرداشت نہیں کرتا کیونکہ وہ اپنی ہوتی ہے، اپنے گھر کی عزت، اپنی مردانگی کا سائن اور اپنے ہونے والے بچوں کی ماں ہوتی ہے۔

وہ تھانے کا دلال بن کر فخر کرنے والا تھا لیکن عورت کے حوالے سے دلالی والی گالی گئی۔

عورت کو خواہ کتنا ہی ذلیل کرو۔ اُسے لے جا کر کوٹھے میں بٹھا دو۔ اس کی عزت، انا خودداری کی دھجیاں بکھیر دو لیکن کسی لمحاتی احساس کے راستے، جب یہ عورت دل کو گی تو پھر کینسر کی طرح لگے گی۔

کینسر سے خدا بچائے۔ عورت سے بھی خدا ہی بچا سکتا ہے۔

لیکن بعض حالات میں نہ بچائے۔ وہ عورت گالی بھی بن جائے تو دعا ہے کہ اس بچاؤ ممکن نہ ہو۔

پی اے پیر محمد وہاں سے چلا گیا تھا اور پاشا پہلی بار چوٹ کھا کر سوچ رہا تھا کہ آسیہ کی زندگی میں گالی کی طرح آرہی ہے اور احساسات کو چرکے لگا رہی ہے "اونہہ، بیوی

کا دلال........."

اس کی بغل میں پچاس ہزار روپے تھے۔ آسیہ پھر اس کے لیے لکی بن گئی تھی۔ مال کی گٹھڑی بغل میں دبا کر محل سے باہر آتے ہوئے بڑبڑایا "خدا عورت سے بچائے۔"

☆======☆======☆

شادی کا دن آگیا۔ اس روز صبح ہی دو نکاح نامے پاشا کے پاس پہنچ گئے۔ ایک نکاح نامہ محمد اعظم شاہ یعنی پاشا کا تھا۔ دوسرا اس کے چھوٹے بھائی محمود پاشا کا تھا۔ دونوں فارموں کی خانہ پُری پہلے سے ہو چکی تھی۔ پیر صاحب کے دستخط ہو چکے تھے۔ وہ دستخط شدہ نکاح نامہ اسلام آباد سے آیا تھا۔ پاشا نے چھوٹے بھائی کے پاس آکر کہا "محمود! میں قاضی کے پاس گیا تھا۔ وہیں دونوں نکاح نامے پُر کرالیے ہیں۔ میں اپنے دستخط کر چکا ہوں۔ تم بھی کردو۔"

وہ بولا "ابھی سے کیوں کردوں؟ دستخط نکاح کے وقت کیے جاتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، تم نکاح کے وقت کر دینا۔ ویسے یہ عجیب سا لگے گا کہ میں پہلے سے کر چکا ہوں اور وہاں تم تنہا دستخط کرو گے۔ بھئی وہاں تو قاضی صاحب سب کے سامنے نکاح پڑھائیں گے اور قبول کرالیں گے۔ لو دستخط کردو۔"

یہ کوئی خاص قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ محمود پاشا نے بھی دستخط کر دیئے۔ شام کو دھوم دھام سے بارات دونوں لڑکیوں کے گھر پہنچی۔ زندگی کے ہر شعبے میں اور خصوصاً سیاست میں ایسے ایسے پیچیدہ فراڈ ہوتے ہیں جو عام افراد کی سمجھ سے بالا تر ہوتے ہیں۔ شادی میں گواہ بن کر آنے والے اور بریانی کھا کر جانے والے کبھی یہ جان نہیں سکتے تھے کہ پیر صاحب نے اپنا دین بھی بچایا ہے اور دنیا بھی لُوٹ رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگ رِند کے رِند رہتے ہیں اور ہاتھ سے جنت کو بھی جانے نہیں دیتے۔

شادی ہو گئی۔ شاد و آباد رہنے کی جو مسرتیں ہوتی ہیں، ان مسرتوں کو شادی کہتے ہیں۔ اس شادی کے پیچھے ایک دُلہن آباد اور دوسری برباد ہونے جارہی تھی۔ جب باراتی کھانے میں مصروف تھے، تب پولیس کا ایک بڑا افسر چند سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ اس نے پاشا سے مصافحہ کر کے سرکاری حکم نامہ سنایا کہ اسے کل صبح سے پہلے اسلام آباد پہنچنا ہے۔ رات کی فلائٹ میں اس کی سیٹ ہو گئی ہے۔

یہ خبر دُلہا اور دُلہن کے بزرگوں تک پہنچی۔ دُلہن کی ماں نے پوچھا "کیا میری آسیہ کی رخصتی نہیں ہو گی؟"

پاشا نے کہا "ضرور ہوگی۔ میں دُلہن کو اسلام آباد لے جاؤں گا۔"

ایک بوڑھی عورت نے کہا "ابھی دُلہن نے ایک رات نہیں گزاری ہے۔ سیکڑوں میل دور کیسے جائے گی؟"

دوسری نے کہا "یہ رخصتی روک دی جائے۔ دُلہا کل پرسوں واپس آکر اپنی دُلہن لے جائے گا۔"

پاشا نے کہا "نکاح ہو چکا ہے۔ دُلہن میری ہو چکی ہے۔ میں اسے کہیں بھی لے جاسکتا ہوں۔"

بڑے افسر نے کہا "ایک نہایت ہی اہم سرکاری کام ہے۔ ورنہ دُلہا آج ہی نہ جاتا لیکن ڈیوٹی پھر ڈیوٹی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ایک ہفتے میں واپس نہ آسکے۔ کئی ہفتے لگ جائیں۔ بہتر ہے آپ لوگ دُلہن کو رخصت کر دیں۔"

ماں نے آسیہ کے پاس آکر تنہائی میں کہا "بیٹی! دل تو نہیں مانتا کہ تجھے اچانک ہی اتنی دور جانے دوں۔ مگر تو پرائی ہو چکی ہے۔ اب تو جو فیصلہ ہو گا' تیرا اور تیرے شوہر کا ہو گا' اگر نہ جانا چاہے تو مجھے بتا دے۔ میں کسی بہانے سے رخصتی روک دوں گی۔"

وہ سر جھکا کر بولی "امی! خدا جو کرتا ہے' بہتری کے لیے کرتا ہے۔ مجھے میرے مقصد کی راہ پر چلنے دیں۔"

فیصلہ ہو گیا' افسر نے کہا "میں جا رہا ہوں' رات کی فلائٹ میں اب دو سیٹیں ریزرو رہیں گی۔"

افسر چلا گیا۔ پاشا کی ماں نے پوچھا "بیٹے! دُلہن گھر سے ہو کر ائرپورٹ جائے گی نا؟"

"اماں! دلہن کو ہمارے گھر لے جانے کا وقت کہاں ہے۔ گیارہ بجنے والے ہیں۔ ایک بجے جہاز پرواز کرے گا۔ آپ فوراً ہی رخصتی کا بندوبست کریں۔"

بڑی افراتفری کے عالم میں دُلہن والوں نے رسومات ادا کیں۔ پھر جب بتول کو محمود کے ساتھ اور آسیہ کو پاشا کے ساتھ رخصت کیا جانے لگا تو ایسے وقت پاشا پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے پچھلے دو ماہ سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس مقصد کے لیے پاشا نے اپنا ہی نہیں باپ کا بھی نام تھوڑا تبدیل کیا تھا۔ ماں اور بھائی کو دھوکا دے رہا تھا۔ جب وہ خون کے رشتوں کو دھوکا دے رہا تھا تو آسیہ کون سی سگی تھی کہ اس کے لیے دل میں کوئی درد پیدا ہوتا؟

ہر نصیحت' ہر ہدایت بے اثر تھی۔ انسانیت کا واسطہ فضول تھا۔ نکاح تین بار قبول

کرتے وقت بھی خدا کا خوف نہ آیا۔ اگر جرم یا گناہ کے وقت خدا سے ڈر لگتا تو آج کوئی مجرم یا گناہگار نہ ہوتا۔ یہ خدا جانتا ہے کہ دل سے ڈر کیوں نکل جاتا ہے اور یہ بھی خدا جانتا ہے کہ انسان پر خوف کب طاری ہونا چاہیے اور کیسے طاری ہونا چاہیے؟

شادی کی بعض رسومات بڑی معنی خیز ہوتی ہیں۔ جب آسیہ کو اس کے ساتھ میکے سے رخصت کیا جانے لگا تو ماں نے اُن کے سر پر کلام پاک کا سایہ کیا۔ اس کا سایہ آسیہ کے سر پر بھی تھا اور پاشا کے سر پر بھی تھا۔

یہ وہی کلام پاک تھا' جسے ایک ماں اپنے بچے کی رہائی کے لیے لے کر آئی تھی۔

اور یہ وہی کلام پاک تھا' جس کے سائے میں ایک ماں اپنی جوان بیٹی کی آبرو اس کے حوالے کر رہی تھی۔

پاشا پر گھبراہٹ طاری تھی۔ پچھلی بار وہ ناپاک تھا تو اس کتاب کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ آج وہ پاک صاف تھا۔ پیچھے ہٹنا چاہتا' اس کے سائے سے دور نکلنا چاہتا' تب بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ آسیہ کے ساتھ چلتے رہنے پر مجبور تھا۔

وہ شاید دنیا کا پہلا چور تھا جو کلام پاک کے سائے میں مال چُرا کر لے جا رہا تھا۔ اور ایک ماں کا اعتماد اور اعتقاد کہہ رہا تھا "میرے داماد بیٹے! قرآن پاک کے سائے میں اپنی بیٹی تیرے حوالے کرتی ہوں۔ شاید کبھی تیرے سر پر سے آسمان سرک جائے لیکن یہ کتاب نہیں سرکے گی.........."

پاشا پسینہ پسینہ ہو کر کار کی پچھلی سیٹ پر دُلہن کے ساتھ آکر بیٹھا۔ اب سر پر کار کی چھت تھی۔ وہ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے رومال سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کی ماں' بھائی' اور سسرالی رشتے دار الوداعی کلمات ادا کر رہے تھے۔ وہ ہوں ہاں کہتا جا رہا تھا مگر دماغی طور پر حاضر نہیں تھا۔ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کار چل پڑی۔ باراتیوں اور رشتے داروں سے فاصلہ بڑھنے لگا۔

پچھلی سیٹ پر آسیہ کی ماں بھی تھی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ آسیہ کا ماموں تھا۔ وہ بیٹی کو ائرپورٹ تک چھوڑنے جا رہے تھے۔ ماں نے پاشا سے کہا "بیٹے! میں نے دونوں بیٹیوں کو کبھی نظروں سے دور ہونے نہیں دیا۔ آج اسے سیکڑوں میل دور بھیج رہی ہوں۔ تم ہی اس کے مالک و مختار اور محافظ ہو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "آ.......... آپ اطمینان رکھیں' آپ کی بیٹی جہاں بھی رہے گی' شاد و آباد رہے گی۔"

ماموں نے اگلی سیٹ سے سر گھما کر پوچھا "جہاں بھی رہے گی کا مطلب کیا ہوا

برخوردار! بھئی یہ تو تمہارے ہی پاس رہے گی۔"

"جی........ جی ہاں' میں یہی کہہ رہا ہوں۔ ویسے یہ گھونگھٹ عجیب سا لگ رہا ہے۔ ائر پورٹ پر اور طیارے میں لوگ دیکھیں اور سوچیں گے کہ میں اتنی رات کو یہ نئی دلہن کہاں لے جارہا ہوں۔"

ماموں نے کہا "لوگوں کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ بھئی تمہاری دُلہن ہے' تم کہیں بھی لے جارہے ہو۔"

"ماموں صاحب! لوگ طرح طرح کے سوالات کریں گے۔ کتنوں سے کہتا پھروں گا کہ سرکاری ڈیوٹی کے باعث دلہن کو اس مصیبت میں مبتلا کررہا ہوں۔"

آسیہ کی گوری کلائیوں میں چوڑیاں کھنکنے لگیں۔ دنوں ہاتھ اٹھا کر خود ہی گھونگھٹ اٹھا رہی تھی۔ دلہن سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لیے پاشا نے بے اختیار اسے دیکھا۔ ایک تو وہ ویسے ہی حسین تھی۔ دلہن کا روپ اس پر مستزاد تھا۔ وہ کار کے اندر روشنی میں نہیں تھی۔ کبھی تاریکی میں ریڈیم ڈائل کی طرح چمک رہی تھی' کبھی گزرتی ہوئی اسٹریٹ لائٹس اس کے طلسماتی حسن کی جھلکیاں پیش کر رہی تھیں اور باقی آئندہ کہہ کر رخصت ہوتی جارہی تھیں۔

حسن کسی گدھے کو متاثر نہیں کرتا۔ وہ اس لیے بے اختیار دیکھ رہا تھا کہ اغوا کرنے کے لیے جس آسیہ کی تصویر اسے دی گئی تھی' وہ دلہن اس سے مختلف تھی۔ ایک عام سی تصویر میں اور دُلہن کے رنگ و روپ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے پھر تصویر کا بدن نہیں ہوتا۔ دلہن اپنے بدن کے ساتھ اس سے لگی بیٹھی تھی' اپنے وجود کی آنچ پہنچا رہی تھی۔

وہ فوراً ہی نظریں پھیر کر سامنے بیٹھے ہوئے ڈرائیور کی گنجی کھوپڑی کو دیکھنے لگا' پھر بولا "یہ........ یہ زیور بہت زیادہ ہیں۔ میرا مطلب ہے' اتنی رات کو اتنے سارے زیورات پہنے رہنے سے........"

ماں نے کہا "بیٹے! زیورات رہنے دو۔ میری بیٹی کچھ دیر تو دلہن کے روپ میں رہے۔"

ماموں نے کہا "میاں برخوردار! تم کسی ویرانے میں تو سفر کرو گے نہیں کہ چور ڈاکوؤں کا خطرہ رہے گا۔ پہننے کی چیزوں کو چھپا کر رکھنا کون سی دانش مندی ہے؟"

"وہ بات یہ ہے کہ میں اپنی بات سمجھا نہیں پارہا ہوں۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر گوری کلائیوں کی چوڑیاں کھنکنے لگیں۔ وہ خود ہی دونوں

ں سے ناک کی نتھ' کانوں کے جھمکے' گلے کا ہار اتار رہی تھی۔ اس نے دُلہن کو حکم دیا تھا۔ مگر وہ دُلہا کے مزاج کو سمجھ کر زیورات سے محروم اور گھونگھٹ سے خالی ہو تھی۔ آسیہ کی اس مزاج شناسی اور خاموش تابعداری سے وہ ذرا نادم سا ہوا۔ وہ یں اتارنے لگی تو اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا "یہ........ اسے نے دو۔"

اس کا ہاتھ دلہن کے حنائی ہاتھ پر تھم گیا۔ اس میں ایسی دھیمی دھیمی حرارت تھی وہ ہاتھ حرارت کی زبان سے سرگوشی کر رہا ہو۔ وہ پہلے تھم گیا۔ پھر جم گیا۔ پھر سہم گیا رفتار ہو رہا ہے۔ اس نے فوراً ہی ہاتھ ہٹا لیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ عورت بھی نشہ

وہ ائر پورٹ پہنچے۔ جہاز کی پرواز کا وقت ہو چلا تھا۔ ماموں نے انہیں دعائیں دیں۔ نے بیٹی کو گلے سے لگا کر روتے روتے رخصت کیا۔ پھر وہ بورڈنگ کارڈز لے کر ے میں آکر بیٹھ گئے۔ اگرچہ اب وہ گھونگھٹ میں نہیں تھی۔ بدن پر زیورات بھی تھے۔ تاہم سرخ جوڑا تھا۔ اگر وہ دُلہن نہیں تو دلہن جیسی ضرور لگ رہی تھی۔

وہ اپنی سیٹ پر سیدھا اکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ گردن بھی اکڑائی تھی تاکہ وہ آسیہ کی طرف ے اور اس پر ایک نظر بھی نہ ڈالے۔ جی چاہتا تھا' پلک جھپکتے ہی اسلام آباد پہنچے۔ ب کے تکیے پر جائے اور اُن کی امانت اُن کے حوالے کرکے ان احساسات سے حاصل کرے' جو اس پر حاوی ہو رہے تھے اور اسے الجھا رہے تھے۔

پھر خیال آیا' وہ رات کو تکیے پر نہیں جاسکے گا۔ پیر صاحب خواب غفلت میں ہوں ان کے حکم کے بغیر کوئی ان کے محل نما تکیے میں داخل نہیں ہوسکتا تھا پھر پنڈی کے ٹ پر حضور ابن سلطان کا ایک خاص ماتحت اس کی راہنمائی کے لیے موجود ہوگا۔ پتا وہ اسے اور آسیہ کو صبح ہونے تک کہاں کہاں لیے پھرے گا۔

وہ پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا' جب وہ رن وے پر ے اور پرواز کرنے لگا تو اس نے سہم کر پاشا کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ نازک ہاتھ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح اس کے پاس آیا۔ اپنی بے زبانی سے پناہ مانگنے لگا۔ پاشا معلوم کرنے کے لیے اسے دیکھا کہ شرمیلی دلہن نے اس کا ہاتھ کیوں پکڑا ہے؟ ے چہرے سے خوف عیاں تھا۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں غیر محفوظ ہونے کی تھی اور پناہ کا بے پناہ مطالبہ تھا۔ پاشا نے اس کا خوف دور کرنے کے لیے دونوں ے اس کے ہاتھ دبوچ کر کہا "گھبراؤ نہیں' میں جو ہوں۔"

اسے دلاسہ دینے کے لیے غیریت سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ گھبراؤ نہیں یہاں
دوسرے مسافر بھی ہیں لیکن غیر شعوری طور پر اس نے اپنائیت سے کہا "میں جو ہوں"
یعنی مسافر اپنی جگہ ہیں۔ سب اپنی اپنی منزل کے راہی ہیں صرف میں تمہارے ساتھ
ہوں۔ سکھ میں بھی، دکھ میں بھی اور خطرات میں بھی۔

وہ ایسے مطمئن ہوگئی جیسے خلا میں معلق نہ ہو۔ پاشا نے ہاتھ تھام کر زمین پر پہنچا
ہو اور سر پر آسمان کی طرح تن گیا ہو۔ وہ سر جھکا کر شرماتی ہوئی بولی "میں ڈرتی نہیں
ہوں۔ بس یونہی گھبراہٹ سی ہو رہی تھی، میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔"

پاشا نے ائرہوسٹس کو بلا کر پانی کی فرمائش کی۔ ایک منٹ کے اندر پانی کا گلاس آگیا
اس نے ایک گھونٹ لیا تو حلق تر ہوا۔ کلیجے میں ٹھنڈک پہنچی۔ پاشا کن انکھیوں سے دیکھ
رہا تھا۔ دلہن کے چہرے سے خوف مٹ گیا تھا۔ وہ بہت مطمئن نظر آرہی تھی۔ اس
خالی گلاس واپس کرتے ہوئے کہا "آپ نہ ہوتے تو میں جہاز میں سفر کرنے سے انکار
کردیتی۔"

وہ بولا "میرے ہونے سے بھی جہاز نیچے گر سکتا ہے۔"

"آپ گریں گے تو میں گروں گی۔ میرا گرنا اور سنبھلنا آپ کے ساتھ ہے۔"

پاشا نے فوراً ہی آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے اس سے چھپ رہا ہو اور وہ اسے پکڑ رہی
ہو۔ اس نے سوچا تھا کہ دلہن گھونگھٹ میں رہے گی۔ شرم سے نہیں بولے گی۔ وہ اس
سے گفتگو کیے بغیر صبح تک اس سے نجات حاصل کرلے گا۔ مگر حالات نے شرم اور جھجک
قدرے کم کردی تھی اور وہ بول رہی تھی۔ اپنی دانست میں سادگی سے بول رہی تھی۔
کی دانست میں اندر سے چٹکیاں لے رہی تھی۔

ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ بولی "کیا آپ کم بولتے ہیں؟"

"کیا تم زیادہ بولتی ہو؟"

"نہیں، زیادہ سے زیادہ سننا چاہتی ہوں۔ آج کی رات تو یوں بھی مجھے خاموش
اور آپ کو زیادہ سے زیادہ بولنا چاہیے۔ اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں، اپنی عاد
اور مصروفیات کے متعلق، اپنے نئے گھر اور نئے ماحول کے سلسلے میں آپ جتنا بتائیں
میں اتنے ہی جذبوں سے اور عزائم سے نئی زندگی کا آغاز کروں گی۔"

"کراچی میں میری ایک چھوٹی سی کوٹھی، کار، ٹیلیفون اور نوکر چاکر ہیں۔ اسلام
میں عارضی ڈیوٹی کے لیے جا رہا ہوں۔ پتا نہیں کہاں قیام ہوگا۔"

"مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ آج ہماری شادی ہوئی ہے اور آج ہمارا کوئی

ہیں ہے۔ نہ کراچی میں اور نہ اسلام آباد میں۔ کیا واقعی آپ نہیں جانتے ہیں کہ دلہن کو
س چاردیواری میں لے جانا ہے؟"

دلہا واقعی نہیں جانتا تھا کہ دلہن کو کس چھت کے نیچے لے جا کر رکھے گا۔ اس نے
ہا "پنڈی میں کوئی سرکاری آدمی ہم سے ملاقات کرے گا اور ہماری رہائش کا انتظام
رے گا۔"

"کیا آپ صبح ڈیوٹی پر چلے جائیں گے؟"

"ہاں اسی لیے مجھے ابھی بلا گیا ہے۔"

"پھر تو آپ آرام سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ پتا نہیں وہاں پہنچ کر سونے کا
ت ملے گا یا نہیں؟"

یہ اچھا موقع تھا۔ اس نے فوراً ہی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔
یہ کی باتوں سے عارضی طور پر نجات حاصل کرلی۔ نیند نہیں آسکتی تھی۔ ذہن میں یہ
ت گردش کر رہی تھی کہ آسیہ کو دوسرے کے حوالے کرنے کے بعد کبھی نہ کبھی ماں اور
ائی کا اور محلے والوں کا سامنا کرنا ہوگا اور انہیں آسیہ کی زندگی کا حساب دینا ہوگا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ پیر صاحب کتنے عرصے تک اسے شریکِ حیات بنائے رکھیں
ے۔ اگر ساری زندگی یہ رشتہ نباہنا ہوتا تو وہ اتنی رازداری سے ازدواجی رشتہ قائم نہ
رتے۔ لہٰذا یہ بھی پریشانی تھی کہ جب وہ آسیہ کو طلاق دے دیں گے تو وہ کہاں جائے
ی؟ اس کا کیا بنے گا؟ اتنا یقین تھا کہ جب وہ حرم سرا سے نکالی جائے گی تو پیر صاحب اس
ے نام کچھ جائیداد لکھ دیں گے اور دو چار لاکھ روپے ضرور دیں گے لیکن وہ پاشا کی بے
رمی اور بے غیرتی کا ثبوت بن کر لوٹے گی اور وہ اپنے لوگوں میں منہ دکھانے کے قابل
ہیں رہے گا۔

وہ ایسے نتائج کے متعلق پچھلے دو ماہ سے سوچتا آرہا تھا اور یہ سمجھتا آرہا تھا کہ تب
ک اس کے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے ہوں گے۔ اپنی کار اور کوٹھی ہوگی۔ زینے کی
ندی پر پہنچنے کے بعد کوئی نیچے نہیں اترتا۔ ماں اور بھائی اوپر آنا چاہیں گے تو انہیں لے
ئے گا۔ ورنہ وہ اپنے حال میں خوش رہیں گے' یہ اپنی نئی سوسائٹی میں نئے سرے سے
زت بناتا رہے گا۔

پنڈی ائرپورٹ کی عمارت میں جب وہ لوگیج ہال سے باہر آئے تو ایک شخص نے
ے مخاطب کیا "مسٹر اعظم شاہ!"

پاشا نے اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ میں اپنی تصویر دیکھی، وہ بولا "میرا نام جمال اختر

ہے۔ مجھے آپ کی یہ تصویر دی گئی تاکہ میں آپ کو پہچانوں اور آپ مجھ پر بھروسا کریں۔"

اس نے جمال اختر سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا "کہاں چلنا ہے؟"

"آپ لوگوں کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلا ہے۔ آپ بھابی کو وہاں چھوڑ کے حضور کے پاس چلیں گے۔"

"کیا ابھی؟ ذرا گھڑی دیکھو۔ تین بج چکے ہیں۔ حضور سو رہے ہوں گے۔"

"وہ جاگ رہے ہیں' آپ کو فوراً بلایا ہے۔"

وہ آسیہ کے ساتھ ایک کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ جمال اختر نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بنگلے میں ایک ملازمہ ہے۔ وہ بھابی کا خیال رکھے گی۔ اگر آپ کو لوٹنے میں دیر ہوجائے تو بھابی کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

آسیہ نے پاشا کا بازو تھام کر کہا "میں کسی بنگلے میں تنہا نہیں رہوں گی۔"

"تم نے سنا نہیں؟ وہاں ایک ملازمہ ہے۔"

"میں کسی ملازمہ کے نہیں' آپ کے بھروسے پر آئی ہوں۔ آپ جہاں جارہے ہیں' وہاں مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔"

"کیا پاگل ہوئی ہو؟ میں سرکاری معاملات میں تمہیں کہاں کہاں لیے پھروں گا۔ تمہیں کیا پتا' مجھے خطرات سے کھیلنا پڑتا ہے۔"

"آپ کیوں خطرات سے کھیلتے ہیں؟ آخر کام کیا کرتے ہیں؟"

"ایسے سوالات پھر کبھی کرسکتی ہو۔ ابھی مجھے خاموش رہ کر اپنے حالات پر غور کرنے دو۔"

وہ خاموش رہی' یہ اس کا فرض تھا کہ شوہر کی پریشانیوں کے وقت تکرار نہ کرے۔ وہ بنگلے میں پہنچ کر بولی "میں آپ کی بات مان کر یہاں تنہا رہوں گی لیکن اپنا کمرا اندر سے بند رکھوں گی۔ ملازمہ کو بھی اندر نہیں آنے دوں گی' یہاں فون نظر آرہا ہے۔ وعدہ کریں کہ مجھے فون کرتے رہیں گے۔"

وہ وعدہ کرکے پھر کار میں آکر بیٹھ گیا۔ بنگلے سے دور نکل آنے پر اُس نے پوچھا "حضور یہاں کب آئے؟ صبح تو کراچی میں تھے۔"

"دوپہر کی فلائٹ سے آئے تھے۔ پیر صاحب سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ واپسی میں موڈ خراب ہوگیا تھا۔"

"اوہ تو معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے۔"

"کچھ نہیں بہت گڑ بڑ ہے۔"

وہ زیرو پوائنٹ کراس کرکے اسلام آباد پہنچ گئے۔ وہاں بھی حضور ابن سلطان کی محل نما شاندار کوٹھی تھی۔ سیکیورٹی گارڈز نے انہیں گیٹ پر چیک کیا۔ اندر سے پی پیر محمد نے حکم دیا تھا کہ انہیں محل میں آنے دیا جائے۔ پاشا اندر آیا تو پہلے پیر محمد سے سنا ہوا' وہ مسکرا کر بولا "پاشا! تم کمال کے آدمی ہو۔ مشکل سے مشکل کام کر دکھاتے مجھے تم پر بہت غصہ آتا تھا مگر اب پیار آرہا ہے۔"

"کیا اس مہربانی کی کوئی وجہ ہے؟"

"کوئی وجہ' کوئی لالچ نہیں۔ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پاشا نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "دوستی کا ریہ۔"

وہ بولا "میں یاروں کا یار ہوں۔ جاؤ حضور سے ملاقات کرکے واپس آؤ۔ میں مارے فائدے کی ایک بات کہوں گا۔"

وہ ایک بڑے سٹنگ روم میں آیا۔ حضور ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھے کسی سے فون باتیں کر رہے تھے۔ وہ سلام کرتا ہوا جھکتا ہوا رُوبرو آکر فرش پر دو زانو ہوگیا۔ حضور ے میں تھے۔ گرج گرج کر کسی سے بول رہے تھے۔ "میں پیر صاحب کی اطاعت ایک حد تک ر سکتا تھا مگر وہ حد سے بڑھ رہے تھے۔ آخر ایک دن یہ وقت آنا تھا۔ سو آج آگیا۔ میں یکھوں گا کہ وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ وہ شخص جو پیر کہلاتا ہے' ایسا ضدی ہے کہ آپ کی صالحت کی تمام کوششیں بے کار ہوں گی۔ بس اب رات گزر چکی ہے۔ میں سونے جارہا وں' خدا حافظ۔"

حضور ریسیور رکھ کر ہانپنے لگے۔ سوچتی ہوئی نظروں سے پاشا کو دیکھنے لگے پھر انہوں نے پوچھا "اُسے لے آئے ہو؟"

"جی ہاں' جمال اختر کے بتائے ہوئے ایک بنگلے میں ہے۔"

"اب تمہاری آزمائش کا وقت ہے۔ اسے پیر صاحب کی دست رس سے دور رکھنا وگا۔"

"ایسا ہی ہوگا حضور!"

"میں نے پیر صاحب سے جھوٹ کہہ دیا ہے کہ شادی کی تاریخ بدل گئی ہے۔ دلہن آج نہیں دو دن بعد آئے گی لیکن ہمارے درمیان جو اختلافات پیدا ہوگئے ہیں اس کے بعد یہ جھوٹ چھپا نہیں رہے گا۔ ان کے جاسوس معلوم کرلیں گے کہ تم دلہن کو یہاں لے آئے ہو۔ پھر تمہاری تلاش شروع ہوگی۔ تمہیں گھیرا جائے گا۔ میرا حکم ہے کہ وہ

دلہن کسی کے ہاتھ میں نہ جائے۔"

"اسے کوئی ہاتھ نہ لگا سکے گا حضور!"

"اس سلسلے میں میرے اگلے کسی حکم تک تم اس کی حفاظت کرو گے۔"

"کروں گا حضور! لیکن........."

"لیکن کیا؟ جو بات ہے وہ فوراً بولو۔"

" اس کی حفاظت کے لیے مجھے اس کے ساتھ رہنا پڑے گا اور وہ مجھے اپنا شوہر سمجھتی ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کیا اسے ہاتھ لگاؤ گے؟ مجھے ذرا بھی شبہ ہوا تو میرے آدمی تمہیں گولی مار دیں گے۔ موجودہ حالات میں وہ لڑکی میرا ایک زبردست مہرہ ہے۔"

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ زبردست مہرہ کیسے بن گئی ہے؟"

حضور نے کہا "پیر صاحب نے حرم سرا توڑ دی ہے۔"

اس نے تعجب سے پوچھا "حرم سرا توڑ دی ہے"

"ہاں، جو پرانی تھیں، وہ اپنے گھروں کو چلی گئی ہیں۔ پیرا صاحب کو نئی حرم سرا بنانے کے لیے ان حسیناؤں کی ضرورت ہے، جنہیں وہ پہلے پسند کر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ دلہن ہے، جسے تم لائے ہو۔"

سوال پیدا ہوتا ہے، آخر یہ پیر صاحب کتنی شادیاں کرتے ہیں؟ کچھ لوگوں کو اپنی جواں مردی کی نمائش کا خبط ہوتا ہے۔ ایسے بے شمار لوگ ہیں، جنہوں نے بے شمار شادیاں کیں۔ بڑھاپے کی آخری منزل پر بھی کھانستے اور بلغم تھوکتے ہوئے نکاح قبول کیا اور یوں عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

پیر صاحب نے مقدر سے صرف دولت ہی نہیں، غیر مرئی صلاحیتیں بھی حاصل کی تھیں۔ بہت بڑے عامل تھے۔ تعویذ لکھتے تھے اور ضرورت مندوں کی ایسی ضرورتیں پوری کر دیتے تھے، جو کسی ملک کا بادشاہ ہی کر سکتا تھا۔ قلم پکڑنا سب کو آتا ہے۔ لکھنا کسی کسی کو آتا ہے، وہ تعویذ لکھتے تھے اور کسی کو ہزاروں گز کا پلاٹ مل جاتا تھا۔ وہ تعویذ لکھتے تھے اور کسی کو ایکسپورٹ اور امپورٹ کے لامحدود اختیارات مل جاتے تھے۔ وہ تعویذ لکھتے تھے اور کسی کو مختلف علاقوں کی بے تاج بادشاہی مل جاتی تھی۔ وہ تعویذ نہیں، تقدیر لکھتے تھے۔ آج تک کسی پیر نے ایسی کرامات نہیں دکھائی تھیں۔

آج حکومت کرسی پر بیٹھ کر کی جاتی ہے۔ جبکہ مسلمان حکمرانوں کی روایات کے مطابق تخت پر بیٹھنا چاہیے۔ کرسی تنگ ہوتی ہے۔ بیشتر سیاسی معاملات میں تنگ کرتی

ہے۔ اس پر بیٹھنے والا اپنی مدت کے پانچ برس پورے نہیں کر پاتا۔ ایک ذرا ٹائلٹ کے لیے جاتا ہے تو دوسرا اس پر آبیٹھتا ہے۔ تخت کشادہ ہوتا ہے۔ حکومت کرنے والا اس پر لیٹے بیٹھے سو بھی سکتا ہے اور اس پر اپنے جانشینوں کو بھی سُلا سکتا ہے۔

پیر صاحب کو حکومت کرنے کا شوق نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے کرسی نہیں بنوائی، تخت بنوایا۔ فقیرانہ طبیعت تھی۔ پھیل کر بیٹھنے کے عادی تھے۔ پھر تخت پر پھیلنے کی جو گنجائش ہوتی ہے، اس کے پیشِ نظر سہاگ رات کو تخت کی رات بھی کہتے ہیں۔ وہ جو شادیاں کرتے تھے تو دلہنیں اسی تخت پر آتی تھیں۔ کبھی لانگ ٹرم اور کبھی مڈٹرم کے لیے آیا کرتی تھیں۔ یوں حرم سرا کی رونق بڑھاتی رہتی تھیں۔

یہ حرم سرا فانی تھی۔ کسی وقت بھی پیر صاحب کے حکم سے فنا ہو جاتی تھی۔ پھر حکم ثانی سے نئی حرم سرا کے قیام کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس بار نئی حرم سرا کے لیے جو دلہنیں نامزد ہوئی تھیں، ان میں آسیہ کا بھی نام تھا۔

پاشا نے کہا "حضور! بات سمجھ میں آگئی ہے۔ یہاں کے حالات مٔوافق نہیں ہیں۔ مخالف پارٹی کے لوگ آسیہ کو مجھ سے چھین کر اسے حرم سرا میں پہنچانے اور اپنے حق میں تعویذ لکھوانے کی کوششیں کریں گے۔ اگر میں آسیہ کو واپس کراچی لے جاؤں تو اپنے علاقے میں مخالفوں سے ڈٹ کر مقابلہ کر سکوں گا۔"

"ہوں۔ بہتر یہی ہے۔ اپنے قلعہ میں محفوظ رہ کر جنگ لڑنا چاہیے۔ صبح ہوتے ہی کسی پہلی فلائٹ سے اسے واپس لے جاؤ۔ میں بھی یہاں سے جا رہا ہوں۔ اس کمبخت پیر نے میری نیندیں حرام کر دی ہیں۔ میں سونے جا رہا ہوں، تم بھی جاؤ۔"

وہ اٹھ کر سلام کرتا ہوا، الٹے قدموں چلتا ہوا اس کمرے سے باہر آگیا۔ باہر برآمدے میں پیر محمد اُس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا "مجھے حضور نے سونے کی چھٹی دے دی تھی۔ مگر میں تمہارے لیے جاگ رہا ہوں۔"

"خیریت تو ہے، میرے لیے کیوں جاگ رہے ہیں؟"

"پاشا! میں چاہتا ہوں، تم بدلتے ہوئے حالات کو اور ان بڑے لوگوں کی چالوں کو سمجھو۔ اگر تم ہارنے والی فوج میں رہو گے تو میدانِ جنگ میں مارے جاؤ گے۔ جس فوج کا پلڑا بھاری ہو، ادھر جاؤ گے تو فاتح کہلاؤ گے اور انعام و اکرام سے نوازے جاؤ گے۔"

پی اے پیر محمد نے ایک چھوٹی سی پرچی اسے دی پھر کہا "یہ ایک فون نمبر ہے۔ اس پر برکت علی سے بات کرو۔ تمہاری سمجھ میں بہت سی باتیں آجائیں گی۔"

"کچھ معلوم تو ہو، یہ برکت علی کون ہے؟"

یہ بیگم لاثانی کا ایجنٹ ہے۔"

"یعنی حضور کی مخالف پارٹی کا ایجنٹ ہے اور آپ حضور کے وفادار ہو کر مجھے ان سے رابطہ کرنے کو کہہ رہے ہیں؟"

"میں کسی کا وفادار نہیں ہوں۔ حالات کے مطابق وفاداریاں بدلتا ہوں۔ میں بیگم لاثانی کے محاذ پر جارہا ہوں اور تمہیں بھی یہ نیک مشورہ دے رہا ہوں۔"

"ابھی یہ بات حضور کو معلوم ہو جائے تو؟"

"تو وہ یقین نہیں کریں گے کہ میں اُن کے ڈھیر سارے راز لے کر بیگم لاثانی کی جھولی میں جارہا ہوں۔ عقل سے کام لو۔ تمہاری وہ نئی دلہن مخالف پارٹی کی بیگم لاثانی کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے، جتنی حضور کے لیے ہے۔ دُلہن کو اُدھر لے جاؤ۔ بڑے فائدے میں رہو گے۔ ورنہ موت یا لامحدود مصیبتیں تمہارا مقدر ہوں گی۔"

یہ کہنے کے بعد وہ کوئی جواب سنے بغیر محل کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا۔ پاشا پورچ میں آکر جمال اختر کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا، پھر بولا "مجھے بنگلے میں پہنچا دو۔ وہ تنہا پریشان ہوگی۔"

وہ تو پریشان تھی لیکن اس نے خود اپنے لیے بھی پریشانیاں بڑھالی تھیں۔ اسے دشمنوں کی پروا نہیں تھی۔ صرف آسیہ کے معاملے میں فکر تھی کہ اس کے ساتھ اس کے قریب رہ کر اُس سے دور کیسے رہا کرے گا۔ وہ بیوی کی حیثیت سے قریب آئے گی۔ یہ اُسے دور کیسے ہٹائے گا۔ میاں بیوی کے درمیان فاصلہ رکھنے کا کیا جواز پیش کرے گا؟

دوسری مصیبت یہ تھی کہ وہ کراچی واپس جارہا تھا۔ وہاں آسیہ اپنے میکے جانا چاہے گی۔ اپنی بہن بتول سے یا کسی سہیلی سے یہ دکھڑا بیان کرے گی کہ شوہر نے اب تک ازدواجی حق ادا نہیں کیا ہے تو پھر دُلہا میاں کے سلسلے میں طرح طرح کی باتیں بنائی جائیں گی۔ پھر دو ہی باتیں ہوں گی، اسے بیوی کے حقوق دینے ہونگے یا پھر طلاق دینی ہوگی اور دونوں صورتوں میں حضور سے نافرمانی ہوگی۔ کوٹھی، کار اور بینک بیلنس سے محرومی ہوگی اور حرام موت مرنے کا دھڑکا ہمیشہ لگا رہے گا۔

وہ بنگلے کے سامنے پہنچ کر جمال اختر سے بولا "اب تو صبح ہو رہی ہے۔ حضور کا حکم ہے کہ میں فوراً یہ جگہ چھوڑ دوں۔ اس شہر سے چلا جاؤں۔ کیا صبح کی کسی فلائٹ میں دو سیٹیں مل جائیں گی؟"

"میرا مشورہ ہے، آپ یہاں سے کسی فلائٹ میں نہ جائیں اپنے اور بھابی کے شناختی کارڈ کے ذریعے پہچان لیے جائیں گے۔ میں یہ کار چھوڑ کر جارہا ہوں۔ آپ اس میں لاہور

تک جائیں۔ پھر ٹرین یا ہوائی جہاز سے سفر کریں۔ گاڑی کے کاغذات میں میرے بھائی کمال اختر کا پتا درج ہے۔ آپ لاہور میں یہ کار اُن کے حوالے کر دیں، خدا حافظ۔"

وہ کار کی چابی دے کر چلا گیا۔ پاشا نے بنگلے کے دروازے پر دستک دی۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ اس نے پوچھا "بیگم صاحبہ سو رہی ہیں؟"

"پتا نہیں صاحب جی! کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہے۔ میں نے چائے پانی کے لیے پوچھا تو کوئی جواب نہیں دیا۔"

وہ اس کمرے کے دروازے پر آیا۔ ہولے سے دستک دے کر آواز دی "آسی!"

پھر وہ ذرا ٹھٹک گیا۔ جس سے کوئی لگاؤ نہ ہو، اسے پورے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کی زبان نے اسے اپنائیت سے آسی کہا جاتا تھا۔ اس نے دوسری بار سنبھل کر آواز دی۔ "آسیہ! کیا سو رہی ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ دُلہن ابٹن اور مہندی کے رت جگوں سے نڈھال تھی۔ اس لیے سو رہی تھی۔ اس نے ملازمہ سے کہا۔ "جلدی ناشتہ تیار کرو۔ ہم یہاں سے جائیں گے۔"

وہ چلی گئی۔ پاشا یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ اس نے کمرے کی کھڑکی کو کھولنا چاہا، وہ اندر سے بند تھی۔ وہ دوسرے کمرے سے ایک اونچا سا اسٹول اٹھا کر لے آیا۔ پھر اُس پر چڑھ کر روشن دان سے جھانک کر دیکھا۔ وہ ایک آرام دہ بستر پر دوپٹے سے بے نیاز پڑی ہوئی تھی۔ گہری نیند میں لباس اِدھر سے اُدھر ہو گیا تھا۔ سیلنگ فین کی ہوا سے زلفیں اڑ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا، وہ حقیقت نہیں ہے۔ کسی مصور نے ایک حسینہ کو خوابیدہ انداز میں پینٹ کیا ہے۔

وہ لڑکیوں سے کترا کر گزر جایا کرتا تھا۔ کیا جانتا تھا کہ ایک بے انتہا حسین دوشیزہ اس کے اتنے قریب آجائے گی اور وہ اس سے نظریں چراتے رہنے کے باوجود اسے چھپ کر دیکھنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈے گا۔

پھر اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ ایسے کیوں تک رہا ہے؟ یہ معلوم کر چکا ہے کہ وہ سو رہی ہے۔ پھر خوابیدہ حسن کے وجود سے کیا دریافت کر رہا ہے؟ یہ بری بات ہے۔ نشے کو دیکھنا نہیں چاہئے۔ ایسے نشے کا آغاز آنکھ کے دیکھنے اور نیت کے بدلنے سے ہوتا ہے۔

وہ روشندان سے ہٹ گیا۔ اسٹول سے اتر گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی سنائی دی۔ اس نے روشندان کی طرف دیکھا کیونکہ ٹیلی فون اسی کمرے میں تھا۔ آسیہ نے اسے سرہانے رکھا تھا تاکہ اس کا پاشا کہیں بھی ہو، اسے اپنی آواز سناتا رہے اور اپنی خیریت سے

آگاہ کرتا رہے۔ ماں کے بعد وہ دوسری ہستی تھی جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جو اس کے لیے ایک کمرے میں بند ہوگئی تھی اور صرف اسی کی آواز پر دروازہ کھولنے والی تھی۔ کوئی دوست، کوئی دشمن اور کوئی حاکم اس سے وہ دروازہ نہیں کھلوا سکتا تھا۔ ایک عورت اپنے دل کا اور اپنی خواب گاہ کا دروازہ صرف اپنے مرد کے لیے کھولتی ہے۔

وہ سر جھکائے اسٹول کے پاس کھڑا سوچتا رہا۔ فون کی گھنٹی بند ہوگئی تھی۔ آسیہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پاشا کی آواز سن کر اٹھنے کے لیے سوئی تھی اور فون کی گھنٹی کہہ رہی تھی کہ پاشا آواز سنانے والا ہے۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگا کر بولی "ہیلو، کون؟"

دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ کسی عورت نے پوچھا "تم کون ہو؟"

آسیہ نے کہا "فون کرنے والے کا اخلاقی فرض یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنا نام بتائے پھر جس سے بات کرنا ہو اُس کا نام بتائے۔"

"زیادہ اخلاقیات نہ سمجھاؤ۔ میں جانتی ہوں، تم اس بنگلے کی ملازمہ ہو۔ وہ جو ایک لڑکی دُلہن بن کر آئی ہے۔ اس سے بات کراؤ۔"

"کیا تم اُس دلہن کو جانتی ہو؟"

"غیر ضروری سوال نہ کرو۔ آسیہ کو فون دو۔"

آسیہ حیران ہوئی کہ پنڈی میں اس کا نام جاننے والی یہ کون عورت ہے؟ وہ بولی "میں ملازمہ نہیں، آسیہ بول رہی ہوں۔ تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

دوسری طرف ہنسی کی آواز سنائی دی، پھر وہ بولی "اچھا اتنی جلدی ملازمہ سے آسیہ بن گئی ہو۔"

"یقین کر لو کہ میں آسیہ ہوں۔ ورنہ فون بند کردوں گی۔"

"چلو یقین کر لیتی ہوں اور جو کہہ رہی ہوں اسے اپنی بھلائی کے لیے توجہ سے سنو۔ اگر تم ملازمہ ہی ہو تو اپنا فرض سمجھ کر آسیہ کو بتادو کہ جسے وہ اپنا شوہر محمد اعظم شاہ سمجھتی ہے، وہ ایک بے غیرت فریبی ہے۔ اُس نے آسیہ کو پیر اعظم شاہ کی حرم سرا میں پہنچانے کے لیے شادی کا یہ ناٹک کیا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"میری سچائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ آسیہ کے ساتھ سہاگ رات تو کیا کوئی دوسری رات ایک سیج پر نہیں گزارے گا۔ اس کا اصل نام پاشا ہے، احمد پاشا۔ وہ

طان ابن سلطان کا ایک پالتو کتا ہے۔ تم ایک ملازمہ سہی، مگر ایک عورت ہو۔ عورت نے کے ناتے آسیہ کو ایک عیاش کی حرم سرا میں جانے اور تباہ ہونے سے بچاؤ۔"

"تم اتنی باتیں کر رہی ہو۔ اپنے متعلق تو کچھ بتاؤ؟"

"میں بیگم لاثانی کی پرسنل سیکریٹری ہوں۔ یہ شہر اور یہاں کے لوگ آسیہ کے لیے نے ہیں۔ اگر اُسے ہماری سچائی کا ثبوت مل جائے اور وہ پاشا سے نجات حاصل کرنا ے تو ہم اسے پناہ دیں گے، اسے ہمارا یہ فون نمبر نوٹ کرادو۔"

دوسری طرف سے فون نمبر بتایا گیا۔ پھر رابطہ ختم ہوگیا۔ آسیہ ریسیور ہاتھ میں ے خلا میں تک رہی تھی۔ کسی بیگم لاثانی کی سیکریٹری نے جو کچھ کہا تھا، وہ باتیں بکواس رہی تھیں۔ وہ کسی بیگم لاثانی کو بھی نہیں جانتی تھی۔ کسی اجنبی زبان سے پاشا کے ں برائیاں سن کر یقین نہیں کرسکتی تھی لیکن نئی دُلہن کو یہ بات پتھر کی طرح لگی کہ ا شوہر اس کے ساتھ کوئی رات نہیں گزارے گا۔

اور وہ سہاگ کی سب سے اہم رات گزر چکی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ پاشا نے اس زیادہ کسی سرکاری معاملہ کو اہمیت دی تھی۔ اس نے صبر سے سوچا "کوئی بات نہیں، بہت اہم تھی اس لیے ایک اہم رات ضائع ہوگئی مگر ہر رات ڈیوٹی نہیں ہوگی اور تو میں اسے اپنی ذات سے زیادہ اہم نہیں ہونے دوں گی۔"

پاشا کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر روشندان کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا نے دروازے پر دستک دی۔ تمہیں آوازیں بھی دیں مگر تم گہری نیند تھیں۔ آخر کی گھنٹی نے تمہیں جگادیا۔ ویسے کس کا فون تھا۔ ہمارا تو نہیں ہوسکتا۔ یہ تم ابھی تک ر پکڑے کیوں بیٹھی ہو؟ دروازہ کھولو۔"

وہ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کا منہ تک رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا، وہ فراڈ ہے۔ اس نے فون پر جو کچھ سنا، وہ دھوکا تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بستر سے اٹھ روازہ کھول دیا۔ وہ اسٹول سے اتر کر قریب آیا۔ پھر بولا "فوراً منہ ہاتھ دھو کر تیار ۔ ہم ابھی واپس جائیں گے۔"

"کہاں جائیں گے؟"

"کراچی۔ اپنے گھر۔ میں نے ملازمہ سے کہہ دیا ہے، وہ ناشتا تیار کر رہی ہے۔"

وہ اٹیچی سے اپنا لباس نکال کر بولی "کیا وہ اہم کام اتنی جلدی ختم ہوگیا؟"

"ہاں، ختم ہو چکا ہے۔"

وہ لباس لے کر باتھ روم کے دروازے پر پہنچی، پھر بولی "جب ڈیوٹی نہیں ہے تو پھر

چھٹی ہے۔ میاں بیوی شادی کے بعد اپنے گھر اپنے شہر سے دور خوشیاں منانے جاتے
ہیں۔ ہم اتفاق سے مری کے قریب ہیں۔ کیوں نا مری میں کچھ دن گزارے جائیں۔"

"پھر کبھی مری جائیں گے۔ ابھی ہمارا واپس جانا ضروری ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں۔ امی میری رخصتی روکنے والی تھیں۔ میں نے آپ کی محبت
میں ایسا نہیں ہونے دیا۔ میکے سے ہزاروں میل دور چلی آئی۔ اب آپ میری بات مانیں
گے، ہم ابھی مری جا رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے باتھ روم کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ اپنی ماں کا حکم نہیں مانتا تھا پھر
ایک عورت کی بات کیسے مان لیتا؟ لیکن حالات موافق نہ ہوں تو عورت کے آگے دب کر
رہنا پڑتا ہے۔ وہ آسیہ پر سختی نہیں کر سکتا تھا۔ جبراً اپنی بات منوانا چاہتا اور وہ نہ مانتی
ایک مرد کی حیثیت سے اس کی پٹائی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس کے منہ پر یا نازک بدن
پر سخت ہاتھ پڑ جاتا اور نشان رہ جاتا تو یہی شبہ ہوتا کہ اس نے اسے میلا کر دیا ہے۔ اس کے
بعد پھر بڑے لوگوں کا عذاب اس پر نازل ہوتا۔ بڑی مجبوری تھی، اسے ایک شوہر کے
حقوق حاصل نہیں تھے۔

ملازمہ ناشتے کی ٹرالی لے کر آئی۔ اس نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دے کر
کہا "ناشتا آگیا ہے۔"

"ابھی آرہی ہوں، آپ شروع کریں۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں پہاڑی علاقوں کی
سیر کروں گی۔"

"آسیہ! ابھی وہاں کی باتیں نہ سوچو۔ ہم پھر کبھی وہاں جائیں گے۔"

"گھر میں سب مجھے پیار سے آسی کہتے تھے۔ آپ بھی پیار سے مخاطب کریں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "میں پیار سے آسی کہہ رہا ہوں۔ ضد نہ کرو، جلدی باہر آؤ۔
ہمیں کراچی جانا ہے۔"

دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک نئے خوب صورت سے لباس میں ڈھلی دھلائی کھڑی تھی۔
کیا غضب کی کشش تھی، کیا حسن کا نظارہ تھا۔ لگتا تھا، دودھ سے نہا کر نکلی ہے۔
زلفوں سے پانی ٹپک رہا تھا، جہاں جہاں لباس کو بھگو رہا تھا، وہاں لباس کے اس حصے کو
ٹرانسپیرنٹ کر رہا تھا۔ پاشا نے ایک گہری سانس کھینچی، پھر ناشتے کی ٹرالی کی طرف دیکھتے
ہوئے بولا "آؤ جلدی سے ناشتا کرو۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے تو کوئی گولی مار دے گا؟"

"یہی بات ہے، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ خطرات سے کھیلتا رہتا ہوں۔"

وہ پاس آکر بیٹھتے ہوئے بولی "میں آپ کی شریکِ زندگی ہوں۔ مجھے معلوم ہونا
چاہیے کہ آپ کیسے خطرات سے کھیلتے ہیں اور کیوں کھیلتے ہیں؟"

"یہ مردوں کے معاملات ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ میری پریشانیاں کم کرو۔"

"پریشانیاں معلوم ہوں گی تو کم کروں گی۔ میں آپ کی دوسری آنکھ ہوں، دوسرا
بازو ہوں، دوسرا پاؤں ہوں، ایک کو جو خطرہ ہو گا، وہی دوسرے کو بھی ہو گا۔ پلیز مجھ سے
کچھ نہ چھپائیں۔"

"آسیہ! ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔"

"کیا آپ مجھے آسیہ کہیں گے؟"

"سوری آسی! میں اپنائیت سے آسی کہہ رہا ہوں۔ ابھی کچھ نہ پوچھو۔"

"کیا صرف اپنائیت سے کہہ رہے ہیں؟"

"نہیں۔ وہ اسے کیا کہتے ہیں؟ ہاں پیار سے بھی کہہ رہا ہوں۔"

آسیہ نے خوش ہو کر سلائس کے ایک ٹکڑے اور انڈے کے پوچ کا لقمہ بنایا، پھر
اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا۔ کیا محبت تھی؟ کیا ممتا
تھی؟ بچپن میں ماں ایسے ہی کھلاتی تھی۔ جوانی میں بیوی اسی رومانی انداز میں دیتی ہے۔
بچے کو جوان مرد بننے کے بعد بھی ایسی عورت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے آگے دلکشی
کے پیچھے ممتا ہو۔

وہ منہ کھول کر اس کے ہاتھ کا لقمہ لے کر چبانے لگا۔ وہ بڑی محبت سے مسکرا کر دیکھ
رہی تھی۔ وہ لقمہ چبانے کے بعد اپنے ہاتھ سے جلدی جلدی کھانے لگا۔ پھر سر اٹھا کر
دیکھا تو وہ نہیں کھا رہی تھی۔ خاموش بیٹھی اسے تک رہی تھی۔ اس نے پوچھا "بیٹھی
کیوں ہو، کھاؤ۔ بھئی جلدی کرو۔"

اس نے ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا، سر جھکا لیا "کیا یہ ناشتا پسند نہیں ہے؟ وہ دال بھری
پوریوں والا ناشتا صرف اورنگی ٹاؤن میں ملتا ہے۔ عادت بدلو اور جلدی کھا کر چلو۔"

وہ پھر بھی خاموش رہی۔ اس نے سر اٹھا کر پاشا کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔
ناشتے کو دیکھا۔ پھر پاشا کو دیکھا۔ وہ پریشان ہو کر بولا "پلیز مجھے بتاؤ۔ تم ناشتا کیوں نہیں
کر رہی ہو؟ خاموش کیوں ہو؟"

"آپ کیسے آدمی ہیں؟ محبت کے طور طریقے نہیں جانتے ہیں۔ میں نے پہلا لقمہ
آپ کو کھلایا ہے۔ مجھے پہلا لقمہ کون کھلائے گا۔"

وہ جھینپ کر ہنستے ہوئے بولا "اچھا اچھا یہ بات ہے۔"

پھر لقمہ اس کی طرف بڑھا کر بولا "میں نے آج تک کسی لڑکی سے بات نہیں کی۔ محبت کیا ہوتی ہے، نہیں جانتا۔ تم سکھاؤ گی تو.........."

وہ آگے کہنے سے پہلے سوچنے لگا' تو کیا محبت کے آدب سیکھے گا؟ بے غیرتی بھو جائے گا؟ نہیں۔ ایسا تو اس کے بڑے کرنے نہیں دیں گے۔ اسے ایک انسان اور محب کرنے والا شوہر بننے کی اجازت نہیں دیں گے اور وہ جو سامنے بیٹھی ہوئی تھی وہ قدر کی بے زبان ہدایت تھی' اسے اس کی لاعلمی میں محبت کی ہدایت دے رہی تھی۔

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولی "میں آپ کی ہر بات مان رہی ہوں لیکن ایک شرط کراچی واپس جاؤں گی۔"

"ہوں۔ کیا شرط ہے؟"

"آپ دن کی ڈیوٹی کریں گے اور رات کو گھر میں رہیں گے۔ آئندہ کبھی رات مجھے تنہا نہیں چھوڑیں گے۔"

یہ ایسی بات تھی کہ لقمہ حلق میں پھنس گیا۔ بڑے زور کا ٹھسکا لگا۔ وہ کھا کھانستے ذہرا ہونے لگا۔ آسیہ نے جلدی سے اٹھ کر گلاس میں پانی پیش کیا۔ اس نے گھونٹ پانی پیا۔ پھر کھانستا رہا۔ دعا کرتا رہا کہ کھانسی ہوتی رہے اور آسیہ اپنی شرط بھو جائے۔

بڑی دیر بعد آرام آیا۔ ا... نے اور دو چار گھونٹ پیئے۔ آسیہ اسے چائے پ کرتے ہوئے بولی "تو پھر شرط منظو...؟"

وہ بھلا ازدواجی راتیں گزارنے والی بات کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ پریشان ہو کر "تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ جب تک خطرہ نہیں ٹلے گا' میرے دن رات میرے نہیں؛ سرکار کے ہیں۔"

"دنیا کی کوئی سرکار ایک شوہر کو اس کی بیوی کے پاس جانے سے نہیں روکتی۔ یہ کون سی سرکار ہے؟ ہمارے ملک کے مصروف ترین فوجی بھی کسی نہ کسی وقت بیرکوں میں سوتے ہیں کوئی چوبیس گھنٹے ڈیوٹی انجام نہیں دیتا' اگر آپ رات کو مصر رہیں تو دن کو گھر آسکتے ہیں۔"

وہ جھنجلا کر بولا "سیدھی سی بات ہے۔ میں کچھ روز تمہارے ساتھ نہیں رہ گا۔"

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "تو پھر سیدھی سی بات یہ بھی ہے' جب تک سچی نہیں بنوں گی' اپنے میکے' اپنے شہر میں واپس نہیں جاؤں گی۔"

"یہ.......... یہ سچی سہاگن کا مطلب کیا ہوا؟ تم تو سہاگن ہو۔"

"نہیں ہوں' آپ اپنے دل سے' اپنے ضمیر سے پوچھیں۔ میری پہلی رات کہاں گم ی ہے؟ کیا آپ اُس ایک رات کا حساب دیں گے؟"

وہ بری طرح اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ دل میں چھپا ہوا چور کہہ رہا تھا' آسیہ کو کچھ م ہو گیا ہے یا وہ یونہی کسی طرح کا شبہ کر رہی ہے۔ وہ بولی "آپ کہتے ہیں یہاں خطرہ کراچی چلو۔ وہاں کی بات کرتے ہیں کہ کئی روز میرے ساتھ نہیں رہ سکیں گے کیونکہ بھی خطرہ ہے تو پھر وہاں کیوں جائیں گے اور یہاں خطرہ ہے تو یہاں بھی کیوں رہیں۔ ں نہ ہم مری چلے جائیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے وہاں پہنچ کر حاضری دینی ہے۔"

"کہاں حاضری دینی ہے؟ کیا سلطان ابن سلطان کے قدموں میں؟"

وہ حیرت سے اچھل کر کھڑا ہو گیا "تت.......... تم حضور کو کیسے جانتی ہو؟"

"آپ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں؟ کیوں اتنا گھبرا رہے ہیں؟"

"میں پوچھ رہا ہوں' تم حضور ابن سلطان کو کیسے جانتی ہو؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی' پھر بولی "جناب شوہر صاحب! میں بیگم لاثانی کو بھی جانتی ں۔ میرے ذہن میں موصوفہ کا نمبر محفوظ ہے۔ اگر آپ نے شوہر کے فرائض انجام نہ ے تو میں اپنی سلامتی کے لیے بیگم لاثانی کے پاس چلی جاؤں گی۔"

اس نے دو ہی فقروں میں یہ واضح کر دیا کہ وہ دلالی کر رہا ہے۔ اگر شوہر بن کر نہیں ے گا تو وہ اسے چھوڑ کر مخالف پارٹی میں چلی جائے گی۔ وہ ایسے وقت کیا اسے روک گا؟ کم از کم پنڈی میں اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کر سکے گا۔ کل رات پی اے پیر محمد اور ابھی آسیہ کی باتوں نے سمجھا دیا کہ مخالف پارٹی نئی حرم سرا کے لیے آسیہ کے ف مضبوط جال پھینک رہی ہے۔ اگر اس نے محبت اور نرمی سے کام نہ لیا اور اگر ں' اسے باغی بننے پر مجبور کیا تو وہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔

ابھی وہ نہیں جانتی تھی کہ پیر صاحب کون ذاتِ شریف ہیں اور دو پارٹیاں ایک رے کے خلاف پیر صاحب سے تعویذ لکھوانے کے لیے کس طرح ان کے حرم سرا کی ق بڑھاتی ہیں اور اس سلسلے میں آسیہ کتنا اہم رول ادا کر رہی ہے؟ اتنا اہم کہ وہ جس کی طرف سے حرم سرا میں داخل ہو گئی اس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ آسیہ کھیل کو نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے فون پر صرف سلطان ابن سلطان اور بیگم لاثانی نام سنے تھے اور تیسرا اہم چیلنج یہ سنا تھا کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ رات نہیں

گزارے گا۔ یہ ایک بیوی کی سب سے بڑی توہین ہوتی اور یہ توہین آسیہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اپنی بات کہنے کے بعد پاشا کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اس کے دل کے چور کو پہچان رہی تھی اور ٹوٹے ہوئے دل سے سوچ رہی تھی "کیا میرا شوہر اتنا بے غیرت ہے کہ مجھے دوسرے کی امانت سمجھ کر میرے ساتھ رات نہیں گزارنا چاہتا ہے؟ فون پر اس اجنبی عورت نے صاف طور پر کہا تھا کہ پاشا نے مجھے پیراعظم شاہ کی حرم سرا میں پہنچانے کے لیے شادی کا ناٹک کیا ہے۔ چونکہ میں پرایا مال ہوں اس لیے میرا شوہر مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر پاشا نے پوچھا "کیا وہ فون کسی دشمن کا تھا؟"

"میں کیا جانوں کون دوست ہے اور کون دشمن؟ اگر فون پر کسی نے مجھ سے جھوٹ کہا ہے تو وہ میرا اور آپ کا دشمن ہے اور اگر سچ کہا ہے تو پھر آپ سے بڑا کوئی دشمن نہیں ہے۔"

"وہ.......... کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ کہہ رہی تھی' آپ نام کے شوہر ہیں۔ کام کے نہیں ہیں۔ مجھے بیوی کے حقوق نہیں دیں گے۔"

"حقوق کیوں نہیں دوں گا۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ تمہیں میرے خلاف بھڑ رہی ہے۔ تم میری بیوی ہو' میں تمہارے تمام حقوق ادا کروں گا۔ تم واپس چلو۔"

"واپس کیوں چلوں' کیا حقوق یہاں ادا نہیں ہو سکتے؟"

"ہاں۔ مگر اپنا گھر پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ یہاں سے زیادہ وہاں ہماری سلامتی ہے۔"

وہ بولی "لیکن میری سلامتی یہاں ہے۔ یہاں دوسری پارٹی کا فون نمبر میرے پاس ہے۔ اگر آپ نے یہاں مجھے بیوی نہ تسلیم کیا اور میری عزت پر کوئی آنچ آنے والی ہوگی مجھے دوسری طرف سے تحفظ حاصل ہو جائے گا۔"

وہ پریشانی سے ٹہلتے ہوئے بولا "تم میرے لیے اور اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہو۔ تم بیگم لاثانی کو نہیں جانتی ہو۔ یہ بیگم بھی تمہیں اُسی حرم سرا میں پہنچائے گی۔ لاثانی کے آدمی اپنی پارٹی کی قوت بڑھانے کے لیے تمہیں میرے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ اِس دلدل سے نکلو گی تو اُس دلدل میں جا کر دھنسو گی۔"

"تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ میں اس وقت دلدل میں ہوں۔"

"ہاں تسلیم کرتا ہوں' میں نے تم سے' تمہاری ماں اور خود اپنی ماں سے دھوکا کیا ہے ہیں نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے۔ ہمارے ہاں راتوں رات امیر کبیر بننے کے لیے ں اور اپنی بیٹیوں کو بیچ دیا جاتا ہے۔ آدمی سونے کا پہاڑ بیچ کر بھی ایک ملک خرید نہیں یکن اپنی عورت بیچ کر دولت اور طاقت حاصل کر لیتا ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے مختصر سی تالیاں بجا کر بولی "اس لیے تمہیں بھی ایسا کرنا چاہیے اس لیے تم ایسا کر رہے ہو۔ میں نہیں جانتی تم نے میرے عوض کتنی دولت کمائی جتنی بھی کمائی ہے' اس دولت کا کیا بنے گا' جب تمہارا یہ مشن پورا نہیں ہوگا؟ اس ت نے فون پر تمہیں سلطان ابن سلطان کا کتا کہا تھا۔ میں کچھ زیادہ نہیں جانتی لیکن سنا کہ کتا وفادار نہ رہے اور گھوڑا ریس میں ہار جائے تو بڑے لوگ اُسے گولی مار دیتے "

پاشا نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ایک صوفے میں دھنس کر دونوں ہاتھوں سے سر ر کہا "ہاں یہی میرا انجام ہونے والا ہے اور شاید تمہارا بھی۔"

"میرا کیوں؟ کیا میں موم کی گڑیا لگ رہی ہوں۔ میرے پاس تعلیم کی روشنی ہے۔ ہے' ذہانت ہے۔"

"آسیہ! یہ جذباتی باتیں ہیں۔ تمہاری ذہانت اور تعلیم دھری کی دھری رہ جائے گی۔ طان ابن سلطان یا بیگم لاثانی کے خلاف کچھ نہیں کر سکو گی۔ ہم جیسے کارندوں کے کسی تھانے میں رپورٹ درج نہیں ہوگی۔ اخبارات والے کہیں گے کہ تمہارے زیادتی ہو رہی ہے تو پہلے ایف آئی آر لکھواؤ۔ تھانے کی پرچی لاؤ تو تمہارا بیان شائع ئے گا۔ بے شمار مظالم ایسے ہیں' جنہیں اخبارات' تھانے اور کچہری تک پہنچنے نہیں ۔ ایسے وی آئی پی طرز کے مظالم کی داستانوں کو اندر ہی اندر مٹا دیا جاتا ہے۔ جب کے خلاف کچھ نہیں کر سکو گی تو خدا سے انصاف مانگتے مانگتے مر جاؤ گی۔ میں نے ایسے سے مرنے والوں کو دیکھا ہے۔"

"خدا سے انصاف کیوں مانگا جائے؟ اس نے تو یہ دنیا ہمارے حوالے کی ہے۔ یہاں ظالم ہیں خود مظلوم ہیں۔ خود فریادی ہیں' خود منصف ہیں۔ میں تو خدا سے جب ہوں' روشنی مانگتی ہوں۔ ہدایت کی روشنی اور مجھے ان لمحات میں ہدایات مل رہی یہ آگہی مل رہی ہے کہ تم مجھے اس دلدل میں لائے اور تم ہی اس دلدل سے نکالو میں تمہارا گریبان نہیں چھوڑوں گی۔ دلدل میں دھنسوں گی تو تمہیں ساتھ لے کر ں گی۔"

پاشا پلکیں جھپکائے اسے تک رہا تھا۔ اس کے عزائم کو سمجھ رہا تھا اور اپنی کمزو
پوزیشن پوری طرح واضح تھی۔ وہ حضور سے غداری کرتا تو مارا جاتا۔ آسیہ کو تحفظ دینے
مطلب یہ ہوتا کہ دوسری پارٹی بھی اُس کی جانی دشمن ہو جاتی۔ آسیہ دونوں پارٹیوں میں
سے کسی کو نہ ملتی تو دونوں اسے عزت و آبرو سے واپس جانے نہ دیتیں۔

وہ سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولنے لگا۔ آسیہ کو دونوں پارٹیوں کے متعلق تفصیل
سے بتانے لگا کہ وہ دونوں پیر صاحب کی خاطر کیا کھیل کھیل رہی ہیں اور اس کھیل میں
آسیہ کتنی ضروری ہوگئی ہے۔ اب وہ کہیں بھی جا کر چھپے گی تو دیر سویر ڈھونڈ لی جائے گی۔

آسیہ نے تمام کھیل کی روداد سننے کے بعد کہا "واقعی بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔
تم ایک شوہر کی زبان سے بولو' ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "ساری باتیں کھل گئی ہیں۔ اب یہ راز بھی کھل
جائے کہ میں تمہارا شوہر نہیں ہوں۔"

"کیسے نہیں ہو؟ کیا تم دُلہا بن کر نہیں آئے تھے؟ کیا نکاح قبول نہیں کیا تھا؟"

"پوری شادی میں یہی ایک سچ ہے کہ میں نے اپنی زبان سے نکاح قبول کیا ہے
لیکن نکاح نامہ پر دستخط پیر صاحب کے تھے۔"

اس نے تفصیل سے بیان کیا کہ کس طرح نکاح نامہ پر پہلے سے پیر صاحب
دستخط ہو چکے تھے۔ نکاح بھی پیر صاحب کا نام لے کر پڑھایا گیا تھا اس طور سے آسیہ
صاحب کی منکوحہ ہے۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ بڑے مضبوط ارادوں والی تھی۔ بڑی سے بڑی با
برداشت کر لیتی تھی مگر روتی نہیں تھی لیکن ان لمحات میں بے اختیار آنکھوں میں آ
آگئے' وہ بولی "میں رو رہی ہوں' ابھی میں بڑی تیزی و طراری سے بول رہی تھی۔ چن
بنی ہوئی تھی مگر اب رو رہی ہوں۔ آگ لگے ایسی محبت کو جو رلا دیتی ہے۔ میں ایک ر
گلی کے نکڑ سے گزر رہی تھی۔ پان کی دکان کے پاس کھڑے ہوئے دو غنڈوں نے
چھیڑا تو میں نے انہیں دھمکی دینے کے لیے کہا بلاؤں پاشا کو؟ یہ سنتے ہی وہ بھاگ کھڑ
ہوئے۔ اُس دن سے تم میرے آئیڈیل بن گئے۔ میں دل ہی دل میں تم سے محبت ک
رہی۔ دعا مانگتی رہی' خدایا! جس پاشا کا نام سن کر بدمعاش بھاگ جاتے ہیں' مجھے اسی
مقدر میں لکھ دے میرے مالک!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "اور میرے معبود نے تمہارے مقدر میں لکھ د
ہائے میں کیسی نادان تھی۔ یہ بات عقل میں نہیں آئی کہ جس کا نام سن کر بدمعاش بھا

اتے ہیں' وہ خود کتنا بڑا بدمعاش ہوگا۔ میری شامت آئی تھی کہ میں نے اپنی دعاؤں میں
ہیں مانگا۔ تمہارے اندر تھوڑا سا بھی انسان زندہ رہا ہو تو میری محبت اور عقیدت کو
مجھو اور اس کفر کو سمجھو کہ جو دُعا خدا نے قبول کی' اس کی تم نفی کر رہے ہو۔"

ایک چھناکے سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ آسیہ نے چونک کر دیکھا۔ پاشا نے شیشے
گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔ پھر اُس نے سینٹر ٹیبل اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ آتش
شاں پھٹ پڑا تھا۔ آسیہ پیچھے ہٹ کر ایک دیوار سے جا لگی۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر گرج کر بولا
ہاں' میں بے غیرت بدمعاش ہوں۔ جو دُعا خدا نے قبول کی' اُس کی میں نے نفی کی۔ میں
شیطان ہوں اور جب شیطان ہوں تو پھر کبھی انسان نہیں بن سکتا۔"

وہ چیخ کر بولی "تم انسان بن رہے ہو۔ تمہارے اندر چھپا ہوا انسان باہر آنے کے
لیے یہ توڑ پھوڑ کر رہا ہے۔ توڑو اور توڑو اپنے اندر کا سارا غبار نکال دو۔"

وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ میں کسی
ورت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ کبھی کسی لڑکی کے قریب نہیں جاتا تھا کیونکہ تم
ب بدذات ہوتی ہو' مرد کو اُلو بناتی ہو۔"

اس نے غصے میں اس کی کلائی پکڑلی' وہ بولی "یہ چوڑیاں نہ توڑنا' میں نے تمہارے
نام سے پہنی ہیں۔"

پاشا نے ایک بار اسے دیکھا۔ دوسری بار چوڑیوں کو دیکھا' وہ بولی "نکاح پڑھانے
والے جانیں کہ کس کے نام سے پڑھایا۔ جب میری شادی کی ڈھولک بجی اور سکھیوں نے
گیت گائے تو وہ تمام گیت تمہارے لیے تھے۔ پہلی بار میرے بدن پر جو ابٹن لگائی گئی' تو
میرے بدن پر تمہارے تصورات رینگ رہے تھے۔ جب میرے ہاتھوں میں مہندی لگائی
جارہی تھی' تب میں نے ایک سہیلی کے کان میں کہا "میری دائیں ہتھیلی پر پاشا کا نام لکھ
دو۔"

اس نے پاشا کے سامنے مٹھی کھول دی۔ گوری گلابی ہتھیلی پر بیل بوٹوں کے درمیان
پاشا لکھا ہوا تھا۔ وہ بولی "میری سہیلی نے کہا تھا۔ اب اس کا نام پاشا نہیں' نظام شاہ ہے۔
میں نے کہا پہلے دن سے جو نام میرے دل پر نقش ہے اور میرے ذہن کو معطر کر رہا ہے'
وہی لکھو۔"

وہ اسی طرح اس کی کلائی پکڑے رہا۔ اسے چھوڑنا بھول گیا۔ اگر چھوڑ بھی دیتا تو نام
ہتھیلی سے نہ چھوٹتا۔ مہندی کا رنگ اُڑتا تو ذہن میں اس نام کی خوشبو بسی رہتی۔ وہ قید
ہو چکا تھا۔ رہائی ممکن نہیں تھی۔

اس نے ہتھیلی پر اپنے نام کو دیکھا۔ پھر اس پر اپنی ہتھیلی رکھ کر پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہم میاں بیوی ہیں؟"

"ہاں۔ اسلام میں شادی سے پہلے عورت کی رضامندی ضرور معلوم کی جاتی ہے۔ اس لیے پہلے عورت سے نکاح قبول کرایا جاتا ہے اور میں تم سے راضی تھی۔ میں نے اس نظام شاہ کو قبول کیا تھا جس کا نام پاشا تھا اور اب بھی میری ہتھیلی پر اور میرے دل میں تم ہی ہو۔ نکاح کی اہمیت عورت سے ہے' وہ جسے قبول کرے گی' وہی اس کا مجازی خدا ہو گا۔ ایسے میں کوئی دھوکا کرے گا تو وہ دھوکے باز کبھی شوہر کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ میں ایسے فریبی پر تھوکتی ہوں۔"

اس نے آسیہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ذرا دور ہو کر کہا "تم اپنے طور پر درست کہہ رہی ہو لیکن اسلام میں کسی بھی عمل کے دوران نیت دیکھی جاتی ہے اور میری نیت تم سے نکاح پڑھانے کی نہیں تھی۔ میں پیر صاحب کا قائم مقام بن کر آیا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو تمہارا نکاح نہ اُس کمبخت پیر سے ہوا ہے اور نہ مجھ سے..........."

آسیہ نے کہا۔ "یہ ہم اپنی حقیر سی معلومات کے مطابق کہہ رہے ہیں۔ اب ہم کسی مفتی سے رجوع کریں گے۔ اب تو تمہاری نیت میں کھوٹ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا پھر بولا "ابھی مجھے بہت سے اہم فیصلے کرنے ہیں۔ یہ فیصلے تنہا کیسے کروں؟"

وہ قریب آکر بولی "میں جو ہوں۔"

"تم میری منکوحہ نہیں ہو۔"

"میں کسی پیر کی جاگیر نہیں ہو۔ میں آزاد ہوں۔ خود مختار ہوں۔ اگر مفتی نے بھی یہی کہا تو پھر ہمارا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔"

"اتنا زبردست دھوکا کھانے کے بعد بھی مجھے اس قابل سمجھتی ہو؟"

"ایک تم ہی اس قابل ہو۔ تم نے پہلے دن غنڈوں سے بچایا تھا اور اب پیر اور اس کے بدمعاش مریدوں سے مجھے بچائے رکھو گے۔"

وہ ایک طرف رکھی ہوئی اٹیچی کے پاس گیا۔ پھر اسے اٹھا کر بولا "آؤ پہلے ہم اس معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا اجازت نامہ حاصل کریں گے۔ یہاں قریب ہی ایک بہت بڑی مسجد اور مدرسہ ہے۔ وہاں مفتی صاحب تشریف رکھتے ہیں' ہم نکاح کے سلسلے میں فتویٰ حاصل کریں گے۔"

وہ کمرے سے جانے لگے۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دونوں رک گئے۔ ٹیلی ن کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے' پھر وہ اٹیچی کو فرش پر رکھ کر فون کے پاس آیا' ریسیور ا کر کان سے لگا کر بولا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے کہا گیا "صرف ہیلو نہ کہو۔ اپنا نام بھی بتاؤ۔ ویسے اس بنگلے میں ب مرد اور دو عورتیں ہیں اور میں مردانہ آواز سن رہا ہوں۔ تم پاشا ہو۔"

"ہاں' تم کون ہو؟"

"تمہارا دوست اور ہمدرد ہوں۔ تم جن مشکلات میں پھنسنے والے ہو' ان سے ہیں نجات دلا سکتا ہوں۔"

"اپنا نام اور جغرافیہ بتاؤ؟"

"پچھلی رات پی اے پیر محمد نے تمہیں میرا فون نمبر اور نام بتایا تھا۔"

"ہاں' میری یادداشت اچھی ہے۔ تمہارا نام برکت علی ہے اور تم بیگم لاثانی کے نٹ ہو۔ واقعی ایک بیگم لاثانی ہی ایسی ہیں جو مجھے حضور ابن سلطان کے عذاب سے ا سکتی ہیں۔"

"بے شک! ہم پر پورا بھروسہ کرو۔"

"کیسے کروں؟ اِدھر کے عذاب سے نکل کر بیگم لاثانی کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ کسی کی بھی پناہ میں رہ کر آسیہ کو بربادی سے نہیں بچا سکوں گا۔"

"آسیہ کی قربانی دو۔ تمہیں یہ حقوق ضرور ملیں گے۔"

"میں بے غیرتی سے حقوق حاصل نہیں کروں گا۔"

"کیا پیر صاحب کی امانت پر عاشق ہو گئے ہو؟ تم کل تک نارمل تھے۔ یہ حرام موت رنے کا شوق کیوں پیدا ہو گیا ہے؟ دیکھو میری بات غور سے سنو۔ ہم باہر موجود ہیں۔ تہیں حکم دیتے ہیں کہ آسیہ کے ساتھ اپنی کار میں نکلو۔ جب تم سڑک پر آؤ گے تو ہارے آگے ایک گاڑی ہوگی اور دوسری گاڑی پیچھے چلے گی۔ تم درمیان رہو گے۔ کسی وڑ پر کترا کر بھاگنے کی حماقت نہیں کرو گے۔"

"یعنی اس طرح باراتی بن کر ہمیں بیگم لاثانی کے پاس لے جاؤ گے؟"

"ہاں' خوش نصیب ہو کہ بیگم صاحبہ تم سے براہِ راست گفتگو کریں گی۔"

"برکت علی! میں اس بنگلے میں ہوں۔ میرے باہر نکلنے سے پہلے ایک کام کرو۔ بیگم صاحبہ سے رابطہ کرو اور محترمہ سے پوچھو' انہیں آسیہ زندہ چاہیے یا مردہ؟"

"یہ کیا بکواس ہے۔ وہ ہمیں زندہ چاہیے۔"

"تو پھر اسے زندہ حاصل کرنے کی راہ اختیار کرو، اگر تمہاری گاڑی آگے پیچھے نظر آئے گی یا کوئی بھی آسیہ کو جبراً حاصل کرنے کے لئے قریب آئے گا تو اس سے پہلے ہی میں آسیہ کو گولی ماردوں گا۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ تم اس پر عاشق ہوگئے ہو، اسے کبھی گولی نہیں مارو گے۔"

"تم نے میری پوری بات نہیں سنی برکت علی! اس کے بعد میں خود کو گولی ماردوں گا۔ جیوں گا تو آسیہ کے ساتھ اور مروں گا تو آسیہ کے ساتھ۔"

آسیہ کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ قریب آکر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر مسکراتے ہوئے رونے لگی۔ وہ بولا "جاؤ اور اپنی بیگم صاحبہ سے کہو، اس کے اور حضور ابن سلطان کے پاس لامحدود اختیارات ہیں۔ پیر صاحب کے بڑے مؤثر تعویذ ان کے پاس لکھے ہوئے ہیں پھر ان کے پاس بدترین بدمعاشوں کا لشکر ہے۔ اتنی ناقابلِ شکست قوتوں کے مقابلے میں میرے پاس صرف محبت ہے۔ جاؤ، سوچو اور سمجھو کہ یہ محبت زندہ رہے گی۔ اگر مرے گی تو دونوں پارٹیوں میں سے کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔ ہم آدھے گھنٹے بعد نکل رہے ہیں۔ باہر تمہارا سایہ بھی نظر نہ آئے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ آسیہ خوشی کے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "پاشا! میں بیان نہیں کرسکتی کہ تم پر کتنا پیار آرہا ہے۔ تم مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہو، جتنی فون پر ظاہر کر رہے تھے تو تمہیں میری محبت کی قسم ہے جیسے ہی کوئی دشمن میرے قریب آئے، مجھے گولی مار دینا۔ میں تمہارے ہاتھوں ہنستے ہنستے مروں گی۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا "یہ بات اچانک ہی ذہن میں آئی کہ ہمیں جان دینی ہوگی۔ ایک ساعت کے لیے مجھے ایک بچے کی ماں یاد آئی۔ ہم نے اس بچے کو اغوا کیا تھا اور تاوان ملے بغیر بچے کو ماں کے حوالے کردیا تھا۔ تب اس ماں نے کہا تھا۔ ساری زندگی اسی طریقہ پر چلتے رہو، جو چیز تمہاری نہیں ہے، اسے دوسروں سے نہ لو، اور جو تمہاری ہے اسے اپنائے رکھنے کے لیے جان لڑاتے رہو۔ ابھی فون پر جب میں بول رہا تھا تو میرے منہ میں اسی ماں کی زبان بول رہی تھی۔ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس ماں نے تمہاری خاطر مجھ میں مرنے کا حوصلہ پیدا کردیا ہے۔ تم میری ہو اور میں تمہارے لیے جان لڑاتا رہوں گا۔"

آسیہ نے اس کے بازو پر محبت سے سر رکھا، پھر کہا "میں جتنی بدنصیب تھی، اب اس سے زیادہ خوش نصیب ہوگئی ہوں۔ کیا اتنا وقت ہے کہ میں سجدہ شکر ادا کرسکوں؟"

"بے شک اپنے رب کے آگے سر جھکانے کے لیے وقت ہی وقت ہے۔ پوری

ندگی ہے، تم جاؤ۔"

"اور تم؟"

"وہ......... میں پھر کبھی تمہارے ساتھ نماز پڑھوں گا۔"

"ابھی کیوں نہیں؟"

"بھئی ضد نہ کرو۔ بات یہ ہے کہ میں پاک صاف نہیں رہتا ہوں۔"

"ہم کسی وقت بھی مرنے والے ہیں۔ کیا ناپاکی کی حالت میں جان دو گے؟"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ اٹیچی کھول کر ایک لباس نکال کر باتھ روم میں جاتے ہوئے ولا "ریوالور اپنے ہاتھوں میں رکھو۔ دشمن اچانک حملہ کرکے ہمیں بے بس کرسکتے ہیں۔ ضور ابن سلطان اور بیگم لاثانی کا ایک ہی مشترکہ مسئلہ ہے اور وہ ہے تمہاری زندگی۔ ان ی پوری کوشش ہوگی کہ تمہیں زندہ سلامت اپنے قابو میں کیا جائے۔"

اس نے باتھ روم کا دروازہ بند کرلیا۔ آسیہ نے کمرے کے دروازے کو اندر سے اک کیا۔ پھر کھڑکیوں کو چیک کیا۔ ان کی چٹخنیاں اندر سے لگی ہوئی تھیں۔ آہنی جالیوں سے کوئی اندر نہیں آسکتا تھا۔ وہ جلد ہی غسل سے فارغ ہو کر صاف لباس پہن کر آگیا۔ دونوں نے وضو کیا۔ کمرے میں جائے نماز بچھانے کو نہیں تھی۔ آسیہ نے اپنا دوپٹہ بچھا دیا۔ پھر وہ ریوالور کو ایک طرف رکھ کر عبادت کے لیے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگئے۔

کمرے میں گہری خاموشی طاری رہی۔ باہر دنیاوی ہنگامے اور بدمعاشیاں تھیں۔ اندر عبادت کا سکون اور سناٹا تھا۔ آسیہ آخری سجدے کے بعد اٹھی۔ پاشا اسی طرح سجدے میں رہا۔ وہ بڑی دیر تک اللہ تعالیٰ سے اپنی اور پاشا کی محبت کی پائیداری اور سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو وہ بدستور سجدے میں تھا۔

وہ حیران ہوئی۔ پھر جھک کر دیکھا تو ہنسی آگئی۔ پاشا خراٹے لے رہا تھا۔ سجدے میں سو گیا تھا۔ وہ دانستہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ نیند تو بے اختیار آتی ہے۔ وہ دو راتوں سے جاگتا آرہا تھا۔ اسے سونے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ حالات اسے چابک مار مار کر جگا رہے تھے۔ صرف ایک سجدے کا مقام ہی ایسا تھا، جہاں وہ دشمنوں کو بھول گیا تھا۔ صرف وہ تھا، سجدہ تھا اور ایمانی سکون تھا۔ ایسے میں لازمی نیند آتی، سو آگئی۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ اپنے پیار کو اپنے دوپٹے پر سربسجود دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی، اس کے دوپٹے پر پھیل کر سو جائے، اسے اپنا بچھونا بنالے۔ پتا نہیں کتنی مختصر زندگی رہ گئی تھی۔ جتنی بھی رہ گئی ہو، اسے بے انتہا مسرتیں مل رہی تھیں۔

پھر وہ ایک دم سے چونک گئی۔ لپک کر ریوالور کو دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا۔ کوئی

نہیں تھا۔ فون کی گھنٹی نے چونکا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی فون کے پاس آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھنٹی کی آواز سے محبوب کی آنکھ کھل جائے۔ اس نے ریسیور کو کریڈل سے الگ کر دیا۔ سوچنے لگی' فون اٹینڈ کرے یا بند کر دے؟ ریسیور سے ہیلو ہیلو کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ فون بند کرنے سے تھوڑی دیر میں پھر گھنٹی بجے گی۔ کیا ریسیور کو الگ رکھا جائے؟ پھر خیال آیا' مخالفین کی باتیں سن کر ان کے ارادوں اور نئے منصوبوں کو سمجھنا چاہیے۔ وہ اسے کان سے لگا کر دھیمی آواز میں بولی "ہیلو! کون ہے؟"

"میں برکت علی ہوں' کیا تم آسیہ ہو؟"

"ہاں میں ہوں۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ بہت اچھا ہوا کہ تم نے ریسیور اٹھایا ہے۔ بیگم صاحبہ تم سے باتیں کریں گی' پلیز ہولڈ آن۔"

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی رہی پھر ایک کھنکتی ہوئی سی نسوانی آواز سنائی دی "ہیلو تم آسیہ ہو؟"

"ہاں' میں آسیہ ہوں۔ فرمائیے۔"

"میرا مشورہ ہے' دوست اور دشمن کو پہچانو۔ کیا ایسے شخص کے ساتھ رہو گی' جو تمہیں گولی مارنے کا فیصلہ سنا چکا ہے۔"

"بیگم صاحبہ! کیا آپ کو یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ مجھے گولی کیوں مارے گا؟"

"وہ تم سے عشق کا جھوٹا دعویٰ کر رہا تھا۔"

"بات محض عشق کی نہیں ہے۔ وہ میری عزت کا محافظ ہے اور چاہتا ہے کہ میں عزت سے مر جاؤں۔"

"اس کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم تمہیں نہیں مرنے دیں گے۔"

"اور میں اپنے پاشا کی قسم کھاتی ہوں' زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

بیگم لاثانی نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے سامنے برکت علی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پیر محمد بھی تھا۔ بیگم کے پیچھے دو مسلح گارڈز تھے۔ وہ برکت کو دیکھ کر غصے سے بھونکنے کے انداز میں بولی "تم سب کتے ہو کتے! صرف دم ہلانا جانتے ہو۔ اس دو کوڑی کے پاشا کو قابو میں نہیں کر سکتے۔ ایک لڑکی کو وہاں سے نہیں لا سکتے۔"

پھر وہ پیر محمد کو دیکھ کر بولی "اور تم! تم کہتے ہو' پاشا جان دے دے گا مگر وفاداری نہیں بدلے گا' پھر وہ کیسے ابن سلطان سے بغاوت کر رہا ہے اور ایک لڑکی پر مرا جا رہا

ہے۔ تم لوگ حرام کی رقمیں لیتے ہو۔ حرام کھا کھا کر موٹے ہو رہے ہو۔ چربی اتنی چڑھ گئی ہے کہ عقل سے کام لینا بھول گئے ہو۔"

پیر محمد نے کہا "بیگم صاحبہ! چند تدبیریں ہیں' آپ ان پر عمل کرائیں' پہلی تدبیر تو یہ ہے کہ برکت علی اور اس کے ساتھیوں کے پاس بے ہوشی کی دوائیں ہوں۔ موجودہ حالات میں ہتھیار کام نہیں آئیں گے۔ بے ہوشی کی دوائیں انہیں کھانے پینے کی چیزوں میں دی جا سکتی ہیں۔ یا اُن کے قریب پہنچنے کا موقع ملے تو اُن پر یہ دوا اسپرے کی جا سکتی ہے۔"

"ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں کون وہ دوائیں ملائے گا۔ وہ لڑکی کسی اجنبی کو بنگلے کے احاطے میں دیکھتے ہی خودکشی کر لے گی۔"

"بیگم صاحبہ! وہ دونوں بنگلے سے باہر نکلیں گے۔ واپس کراچی جانا چاہیں گے۔ ہوائی جہاز سے اس لیے نہیں جا سکیں گے کہ مسافروں کو ہتھیار ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ پاشا کے پاس ایک ریوالور ہے۔ وہ کار کے ذریعے یا ٹرین کے ذریعے سفر کریں گے۔ راستے میں کتنی ہی جگہ کھانا خرید کر کھائیں گے۔ ہمیں کئی جگہ ان کے کھانوں میں دوائیں ملانے کا موقع مل سکے گا۔"

بیگم لاثانی نے برکت علی سے کہا "جاؤ اور یہاں سے کراچی تک میرے تمام وفاداروں کو الرٹ کر دو۔ اگر وہ سپرہائی وے سے جائیں تو بندے اور گاڑیاں بدل بدل کر ان کا تعاقب کیا جائے۔"

پیر محمد نے کہا "ہماری پارٹی کی جتنی خواتین کارکن ہیں انہیں ہر بڑے اسٹیشن پر تیار رہنے کے لیے کہا جائے۔ ٹرین میں آسیہ خواتین ہم سفر پر زیادہ اعتماد کرے گی اور دھوکا کھائے گی۔"

وہ منصوبے بنانے لگے اور ٹیلیفون کے ذریعے ان منصوبوں کو دور اپنے کارکنوں تک پہنچانے لگے۔ پھر بیگم لاثانی نے پیر محمد سے کہا "ابن سلطان سے بات کراؤ۔"

اس نے ٹیلی فون کے پاس آ کر ریسیور اٹھایا پھر رابطہ کیا دوسری طرف سے آواز سننے کے بعد کہا "حضور ابن سلطان سے کہو بیگم لاثانی صاحبہ بات کرنا چاہتی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد سلطان ابن سلطان کی آواز سنائی دی۔ پیر محمد نے ریسیور بیگم کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولی۔ "ہیلو۔ سلطان صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے' تمہارا سب سے وفادار کتا اب تم پر بھونک رہا ہے۔"

"مجھے اس نمک حرام پیر محمد پر شبہ ہو رہا تھا کہ وہ تمہارے لئے کام کر رہا ہے۔ مگر

دیر سے میری آنکھ کھلی۔"

"میں پیر محمد کی نہیں' احمد پاشا کی بات کر رہی ہوں' وہ پیر صاحب کی نامزد حسینہ سے عشق کر رہا ہے۔ اگر وہ حرام سرا کے قابل نہ رہی تو تمہارا بھلا ہو گا نہ میرا۔"

"میں یقین نہیں کروں گا کہ پاشا مجھے دھوکا دے سکتا ہے۔"

"سانچ کو آنچ کیا ہے۔ وہ پچھلی رات سے اسی بنگلے میں ہے۔ اس سے بات کرو۔ ہوا کا رخ بدل چکا ہے۔"

"تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے' تم آسیہ کو حاصل کرنے میں ناکام رہی ہو۔"

"پاشا' ہماری ضرورت کو سمجھ کر ایسی چال چل رہا ہے کہ ناکامی تمہارا ابھی مقدر بن جائے گی۔"

"صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے بعد تم سے رابطہ کروں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ بیگم نے ریسیور پیر محمد کو دے کر کہا۔ "پیر صاحب سے بات کراؤ۔"

تھوڑی دیر میں ان سے رابطہ ہو گیا' وہ بولی۔ "محترم پیر صاحب! کنیز سلام عرض کرتی ہے۔"

غراہٹ سنائی دی۔ "میں بہت مصروف ہوں' کام کی بات کرو۔"

"حرم سرا کی ایک نامزد حسینہ ابن سلطان کے قابو سے باہر ہو رہی ہے۔"

"کیا آسیہ کی بات کر رہی ہو؟"

"آپ اسے بے حد پسند کرتے ہیں۔ اس لئے آپ نے بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کا نام یاد رکھا ہے۔"

"ہاں۔ وہ میرے اعصاب پر سوار ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میں نے کئی بار اُسے خواب میں دیکھا ہے۔ اسے کون حرام زادہ لانے والا تھا؟"

"اس کا نام پاشا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ آسیہ کو ہاتھ لگائے' میرے بندے اسے گولی مار دیں گے۔"

"لاثانی! اپنی کارکردگی دکھاؤ۔ یہی موقع ہے کہ تم ابن سلطان کو تمام اختیارات سے محروم کر سکتی ہو۔ جس روز آسیہ کو حرم میں لے آؤ گی' تمہارے لئے تعویذ لکھ دوں گا۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ میں بہت جلد اسے لے آؤں گی۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ بولی۔ "پیر محمد! وہ بڈھا آسیہ پر بری طرح مر مٹا ہے۔ اختیارات حاصل کرنے کا سارا کھیل آسیہ پر مرکوز ہو چکا ہے۔ کوئی تدبیر کرو۔ کسی طرح اسے کوئی

ہان پہنچائے بغیر حاصل کرو۔"

برکت علی نے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس بنگلے کا محاصرہ کیا جائے۔ دونوں کو لنے نہ دیا جائے۔ ان کی پاس زیادہ راشن نہیں ہو گا۔ وہ بھوک پیاس سے مجبور ہو کر خود ہمارے حوالے کر دیں گے۔"

بیگم لاثانی نے کہا۔ "اس گدھے کو لات مار کر باہر نکالو۔ اسے اتنی عقل نہیں ہے کہ وہ خود مرنا چاہتے ہیں' ہمارا محاصرہ دیکھتے ہی جان دے دیں گے۔"

مسلح گارڈز نے برکت علی کو دھکے دیتے ہوئے باہر نکال دیا۔

پاشا سجدے میں سوتے سوتے ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ آسیہ کے دوپٹے پر آرام ے پھیل کر سو رہا تھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھی اسے بڑی معصومیت سے دیکھ رہی تھی۔ سکرا رہی تھی اور ہولے ہولے اسے چھو رہی تھی۔ کبھی اس کے چہرے کو' کبھی اس کے ھر جیسے سخت بازوؤں کو اور کبھی اس کے چٹان جیسے پھیلے ہوئے سینے پر اپنی ہتھیلی پھیر رہی ی۔

ایک بار پھر فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ وہ فوراً ہی فرش پر سے ریوالور اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی فون کے پاس آئی پھر ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگایا۔ کوئی ہیلو ہیلو کہہ رہا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "ہیلو' کیا بات ہے؟"

"پاشا کو فون دو۔"

پاشا صاحب یا پاشا بھائی کو۔"

"بکواس مت کرو۔ وہ کہاں کا لاٹ صاحب آیا ہے؟ اسے فون دو۔"

"پہلے ادب سے بات کرو۔"

"ارے تم کون ہو؟"

"میں پاشا کی محبت ہوں' میرا نام آسیہ ہے۔"

"ارے تم وہی آسیہ ہو' ایک منٹ۔ ذرا ایک منٹ' ابھی فون بند نہ کرنا۔"

اُدھر سے خاموشی رہی۔ وہ انتظار کرنے لگی۔ پھر ایک بھاری بھرکم رعب دار آواز سنائی دی۔ "تم آسیہ ہو؟"

وہ بولی۔ "فون پر اپنی صورت دکھا نہیں سکتی' یقین کرنا ہے تو کر لو۔"

"لڑکی! حدِ ادب میں رہ کر گفتگو کرو۔ ہم سلطان ابنِ سلطان ہیں۔"

"اچھا تو ایک دلال وہ بیگم ہے اور دوسرے تم ہو۔"

"یوشٹ اپ! میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"مجھے مار دو گے تو حرم سرا میں کیا اپنی بہن کو پہنچاؤ گے؟"
حضور ابن سلطان پھٹ پڑے۔ گرج گرج کر گالیاں دینے لگے۔ اصلیت ظاہر ہو
گئی' وہ بولی۔ "اس بادل کا گرجنا کیا' جو برس نہ سکے۔"
"لڑکی تمہاری گفتگو کا انداز بتا رہا ہے کہ تم بہت چالاک ہو' پاشا کہاں ہے'
بلاؤ۔"
"پاشا نہیں' پاشا صاحب کہو۔"
"نان سنس۔ اس کتے کو صاحب کہوں' جو میرے قدموں میں لوٹتا ہے۔"
"آدمی کو کتا نہ کہو۔ جب اس کا مغز گھومتا ہے تو یہ قدموں میں لوٹنے والا ٹانگ
کر کھینچ لیتا ہے۔ دیکھو تمہاری ٹانگ کیسے کھینچی ہے۔ دھڑام سے گر پڑے ہو۔"
"میں کہتا ہوں پاشا کو فون دو۔"
آسیہ جوش میں آ کر زور سے بولنے لگی تھی۔ ایسے میں پاشا کی آنکھ کھل گئی
نے سر اٹھا کر آنکھیں سکیڑ کر دیکھا پھر پوچھا۔ "آسی! کس سے بول رہی ہو؟"
"اس کتے سے بول رہی ہوں' جو تمہیں گالیاں دے رہا ہے۔"
وہ جلدی سے اٹھ کر آیا پھر ریسیور لے کر بولا۔ "ہیلو' میں پاشا بول رہا ہوں
ہو تم؟"
دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں وہ ہوں جو تمہیں ٹھوکروں میں رکھتا
ذلیل' نمک حرام! تم مجھے اس لڑکی سے گالیاں سنوا رہے ہو۔ میں تم دونوں کو جہنم
پہنچا دوں گا۔"
پاشا نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "ہمیں جہنم میں پہنچانے کے بعد تم کہاں پہنچو
سلطان ابن سلطان؟"
"یوشٹ اپ! تمہاری اتنی جرأت ہو گئی کہ تم میرا نام لے رہے ہو؟"
"میرے اس رویے سے اپنی اوقعات سمجھو۔ آسیہ زندہ رہے گی تو تمہا
اختیارات زندہ رہیں گے۔ اگر یہ زندہ رہے گی اور بیگم لاثانی کے ہاتھ لگ جائے گی
اس میدان میں بیگم سے اس بری طرح شکست کھاؤ گے کہ آئندہ کبھی تمہیں
نصیب نہیں ہو گی۔ اس لئے اپنی اوقعات سمجھو۔ آسیہ کو سلام کرو کیونکہ یہی تمہیں
سے بچائے گی۔ کبھی بیگم لاثانی کی جھولی میں نہیں جائے گی۔"
ابن سلطان نے ایک دم سے نرم پڑ کر کہا۔ "ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں' وہ بیگم
کے ہاتھ نہ لگے' تم میرے وفادار ہو' میرا ساتھ دیتے رہو۔"

"جس ملک میں وفاداریاں پل پل بدلتی ہوں' وہاں وفاداری کی بات نہ کرو۔ بیلنس
ے پاور کی بات کرو۔ تمہارے پاس اختیارات کی طاقت ہے۔ میرے پاس آسیہ کی۔ فی
تت ہمارے درمیان طاقت کا توازن قائم ہے۔ اس لئے مجھے غلام اور وفادار نہ کہو۔"
"مجھے منظور ہے۔ اس دنیا کا ہر شخص اپنے سے بڑی طاقت کو سلام کرتا ہے۔ میں
یہ کو سلام کرتا ہوں۔"
پاشا نے "ذرا ایک منٹ" کہہ کر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا۔ پھر سنجیدگی سے مسکرا کر
یہ سے کہا۔ "وہ حضور جو تمہاری آبرو کا سودا کرنا چاہتا ہے' وہ تمہیں سلام کر رہا ہے۔
تمہاری موجودہ قوت کو سلام کرتے کرتے تمہیں حرم سرا میں پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ سوچ
ر شرم آتی ہے کہ ہم انسانی تاریخ کے انتہائی کمینے دور سے گزر رہے ہیں۔"
آسیہ نے کہا۔ "واقعی شرم کی بات ہے۔ ویسے تم نے یہ کیوں کہا کہ میرے بیگم
ثانی کی طرف نہ جانے کا مطلب یہ ہو گا کہ میں ابن سلطان کو ذلت آمیز شکست سے
اؤں گی۔"
"میرے ایسا نہ کہنے سے بھی یہی ہو گا' تم بیگم کے ہاتھ نہیں آؤ گی اور وہ ابن
لطان اپنے پیر کی نظروں میں کمتر نہیں ہو گا۔"
"آخر یہ کھیل کس نتیجے پر پہنچے گا؟"
"جب ہم نے جان دینے کی ٹھان لی ہے تو نتیجے کی پروا کیوں کریں؟"
وہ ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر بولا۔ "ابنِ سلطان صاحب! اگر آپ چاہتے ہیں کہ
ہ کو کوئی ہاتھ نہ لگائے تو آپ بیگم لاثانی کے منصوبوں کا توڑ کریں۔ میں نے دھمکی دی
اگر کوئی بھی آسیہ کے قریب پہنچنا چاہے گا' تو میں اس کے قریب آنے سے پہلے آسیہ کو
مار دوں گا۔"
ابنِ سلطان نے کہا۔ "یہ کیسی احمقانہ بات کر رہے ہو؟"
"یہ احمقانہ بات تم سے بھی کہہ رہا ہوں۔ تم دونوں کی یہ مجبوری ہے کہ اسے زندہ
نا چاہتے ہو۔"
"تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے' تم آسیہ کو میرے مقصد کے لئے بھی استعمال نہیں
نے دو گے۔"
"میں اس سلسلے میں یہاں بات نہیں کروں گا۔"
"تو پھر کراچی چلو۔"
"وہاں بھی نہیں۔ ہمارے معاملات ملک سے باہر طے ہوں گے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ ایک تو وہ بڈھا پیر مجھ سے ناراض ہے پھر اسے معلوم ہو گا کہ میں نے آسیہ کو ملک سے باہر بھیج دیا ہے تو وہ بیگم لاثانی کو اتنا اہم تعویذ لکھ کر دے دے گا' جس کے لئے اتنی جدوجہد کر رہا ہوں۔"

"آپ حکمتِ عملی سے کام لیں۔ بڈھے پیر کو اپنے اعتماد میں لے کر سارا الزام مجھ پر ڈالیں اور اس سے کہیں کہ میں نے آسیہ کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ کیونکہ میں پچیس لاکھ ڈالر کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ یہ رقم میں لندن میں وصول کروں گا اور وہیں آسیہ کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

"پاشا! تم پیر صاحب کے لئے چیلنج نہ بنو۔ اُن کے مرید تمہیں کہیں بھی کسی وقت بھی گولی مار سکتے ہیں۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ بڈھے کو یہ بتا دیں کہ جس طیارے میں مجھے اور آسیہ کو لندن جانے دیا جائے گا' اس میں مجھے ریوالور رکھنے کی خصوصی اجازت ہو گی۔ تاکہ کسی بھی مصیبت کے وقت میں آسیہ کے ساتھ خودکشی کر سکوں۔"

"ٹھیک ہے' میں ابھی پیر صاحب سے بات کرتا ہوں۔"

"اور ایک بات سن لیں۔ ہم صرف ایک ریوالور پر بھروسا نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے مجھ پر اچانک کہیں سے حملہ ہو۔ یا خصوصی طیارے کے اندر مضر رساں گیس کے ذریعے ہمیں بے ہوش کیا جائے۔ ہمیں ذرا سی بھی غنودگی یا کمزوری کا احساس ہو گا تو ہم فوراً زہر کھا لیں گے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو۔"

"میں کسی پر بھروسا نہیں کروں گا۔ آپ دو گھنٹے کے اندر کسی بچے کے ہاتھ سے زہر کی کافی مقدار ہمیں بھیج دیں۔ میں کسی مرد یا عورت کو اپنے دروازے تک آنے نہیں دوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں بھیج دوں گا۔"

"اس بنگلے میں ایک کتا ہے۔ ہم نے ایک بلی بھی دیکھی ہے۔ بلی ہے تو شاید چوہے بھی ہوں گے۔ ہم وہ زہر پہلے جانوروں پر آزمائیں گے۔ آپ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ زہر میں ملاوٹ نہ ہو۔"

"او گاڈ! میں تمہیں اپنے دشمنوں کے لئے خطرناک اور چالاک سمجھتا تھا۔ تم میرے ساتھ بھی ویسی ہی چالاکیاں دکھا رہے ہو۔ ٹھیک ہے' دو گھنٹے کے اندر سب کچھ ہو جائے گا۔ میرے اگلے فون کا انتظار کرو۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ آسیہ فون پر ہونے والی ایک طرفہ گفتگو سے ساری باتیں سمجھ گئی ں۔ پاشا نے اسے وہ باتیں بھی بتائیں جو ابن سلطان کہہ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "میں سوچ رہی ں' ہمیں اس ملک میں سکون اور سلامتی نہیں ملے گی۔ ہم جہاں جا کر ایک سیدھی سادی ندگی گزارنا چاہیں گے' وہ شیطان پیر کے مرید موت بن کر پہنچ جائیں گے۔ یہ تم نے اچھا ا کہ ملک سے باہر جانے کی بات کہہ دی۔ یہ سوچ کر دکھ ہو رہا ہے کہ ہماری زمین سے رے قدم اکھڑ جائیں گے۔ مگر کیا کیا جائے' زندہ رہنے کو کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"ہاں۔ ہماری یہ زمین بہت خوب صورت ہے۔ بہت پاک ہے اگر کوئی ڈبا پیر اور ا کے مرید اسے ناپاک کر رہے ہیں تو میں اسے تمہارے وجود کے حوالے سے ناپاک ں ہوں دوں گا۔ میں ایسا کروں گا تو کوئی دوسرا پاشا بھی اپنی آسی کے حوالے سے اسے ک نہیں ہونے دوں گا۔ یہ روایت قائم رہے گی تو پیروں اور مریدوں کا بھرم کھلے گا۔"

"کیسے کھلے گا۔ ایسی باتیں نہ پریس تک پہنچنے دی جاتی ہیں' نہ عوام کو کبھی معلوم تی ہیں۔ ایسے راز اندر ہی اندر دفن کر دیئے جاتے ہیں۔"

"پاکستان میں صرف نیت کی پاکیزگی چاہئے۔ ایک دن عوام کو سب معلوم ہو گا' اور وہ دن ہو گا' جب ہم جیسے چمچوں کی نیت نیک ہو گی۔ بڑے لوگ تو انتہائی بزدل ہوتے ا وہ ہم جیسوں کی بدنیتی اور لالچ کو ہتھیار بناتے ہیں۔ میں بدنیت تھا' تمہیں حرم میں پا رہا تھا۔ اب نیک نیت ہوں' تمہیں اپنی لاش پر سے گزار کر ملک سے باہر پہنچانا چاہتا ں' اب دیکھو ابن سلطان اور بیگم لاثانی کیسے کمزور پڑ گئے ہیں۔"

وہ لیاقت علی خان کا مکا لہراتے ہوئے بولا۔ "وہ تعلیم یافتہ نوجوان جو بے روزگاری ے مجبور ہو کر چمچے بن جاتے ہیں' وہ میرے جیسی قوت بھی بن سکتے ہیں۔ ایسی قوت کہ ا بات منوانے کے لئے پیروں اور مریدوں کو ملک سے باہر چلنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"

مجبوری اٹل ہوتی ہے۔ اٹل ارادوں کو بھی متزلزل کر دیتی ہے۔

مردانگی مجبور کرتی ہے کہ اپنی نمائش ہو اور یہ نمائش گھر میں نہ ہو' باہر ہو۔ اس ے داشتائیں خریدی جائیں۔

دنیا کی ہر داشتہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا ایک باپ بھی ا ہے اور کئی بھائی بھی ہوتے ہیں۔

جب باپ اور بھائی یا نام نہاد شوہر کو لالچ کا روگ لگتا ہے' چھوٹے بڑے اختیارات ل کرنے کا خبط سوار ہوتا ہے اور رشوت دینے کا ہنر آنے لگتا ہے تو ماں کے پیٹ سے ا ہونے والی معصوم بچی کی جوانی' رشوت کے کاؤنٹر پر کیش ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

جس طرح رشوت دینے والے کی مجبوری ہوتی ہے اسی طرح رشوت لینے والے کی ہوس بھی اسے مجبور کرتی ہے۔ پیر نظام شاہ پر ہوس ایسی غالب آئی تھی کہ وہ خوابوں میں آسیہ کو دیکھنے لگے تھے۔ اس بوڑھے کے خوابوں کو اس حد تک بوڑھا ہونا چاہئے تھا کہ وہ کسی بوڑھی مائی کو دیکھتا۔ ہوس اسی کو کہتے ہیں کہ وہ پوتی کے برابر آسیہ کو دیکھ رہا تھا اور للچا رہا تھا۔ اگر وہ معزز اور معروف پیر نہ ہوتا تو اسے کھلم کھلا بدمعاشیوں سے حاصل کر لیتا۔

اس کی ظاہری عزت اور شرافت نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ صبر و تحمل سے شرافت کے دائرے میں رہ کر اسے حاصل کرے۔ پیر صاحب کے دستِ راست نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جناب عالی! سلطان ابن سلطان آپ سے گفتگو کی اجازت چاہتے ہیں۔"

پیر صاحب اس سے ناراض تھے۔ بات کرنا گوارا نہ تھا لیکن کھوپڑی کے اندر بیٹھی ہوئی آسیہ نے کہا۔ "شاید مجھے تم تک پہنچانے کی خوش خبری ہو۔ بات کر لو۔"

پیر نامراد نے ریسیور لے کر کان سے لگایا' پھر خشک لہجے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

ابن سلطان نے کہا۔ "محترم! ہمارا اختلاف کسی اور مسئلے پر ہے۔ آپ فی الحال اسے نظرانداز کریں۔"

"کیوں نظرانداز کروں؟"

"اس لئے کہ آسیہ کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ اگر آپ اہمیت نہیں دے رہے تو پھر جانے دیں۔"

پیر صاحب جانے کیسے دیتے۔ انہوں نے کہا۔ "میں کسی کو اہمیت نہیں دیتا۔ تم آسیہ کے ذریعے میرے سر چڑھنا چاہتے ہو۔"

"آپ پیر ہیں۔ ہم فقیر ہیں۔ میں آپ کے قدموں میں رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' آسیہ کی بات کرو۔"

ابن سلطان تفصیل سے بتانے لگا کہ پاشا نے کس طرح آسیہ کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ اس کے پاس ایک ریوالور اور زہر کی ایک شیشی ہے۔ اگر کوئی آسیہ کے قریب آنا چاہے تو وہ آسیہ کو زندہ نہیں رہنے دے گا۔ اگر اسے لندن جانے دیا جائے اور پچیس لاکھ ڈالر ادا کئے جائیں تو وہ لندن میں آسیہ کو ہمارے حوالے کرے گا۔

پیر صاحب نے تمام روداد سن کر کہا۔ "یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک معمولی آدمی ہم سب کو مجبور اور بے دست و پا کر کے یہاں سے نکل بھاگے گا اور تاوان بھی

ے گا۔"

محترم! آپ تو محض تعویذ لکھنے والے پیر ہیں۔ کسی بھی ملک کے حکمراں سے
کہ لیڈروں پر جب برا وقت آتا ہے تو وہ کس طرح اعلیٰ حکام کی کمزوریوں اور
سے کھیل کر سرحد پار چلے جاتے ہیں اور ایسے لوگ زیادہ تر لندن ہی پہنچتے

"کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ پاشا کو ایک خصوصی طیارے میں سوار کرایا جائے اور
رے کے اندر اسے قابو کر کے آسیہ کو نجات دلائی جائے؟"

"یہ آسیہ کے حق میں نقصان دہ ہوگا۔ وہ بہت محتاط رہ کر بنگلے سے ائرپورٹ جائے
کو اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دے گا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ پچیس لاکھ لے کر آسیہ کی جان چھوڑ دے گا' اسے ہاتھ
لگائے گا۔"

"میں پورے یقین سے کہتا ہوں' پاشا عورت سے بیزار ہے۔ وہ بہت لالچی ہے۔
لے کر آسیہ کو ہمارے حوالے کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ان کے لیے.........طیارہ چارٹر کرنے کا انتظام کر رہا ہوں۔
گھنٹے بعد رابطہ کرو۔ روانگی کا وقت بتا دیا جائے گا۔ پاشا کو اتنا سمجھا دینا کہ رقم لے
کا نہ کرے۔ میں بہت پہنچا ہوا ہوں۔ لندن پہنچ کر وہاں بھی اس کی موت کا تعویذ
تا ہوں۔"

"ایک عرض اور ہے۔ بیگم لاثانی کو تاکید کر دیں کہ پاشا اور آسیہ کے راستے میں
نہ بنیں' دونوں کو بخیریت لندن جانے دیا جائے۔"

پیر صاحب نے ریسیور رکھ کر اپنے دستِ راست کو خصوصی طیارے کے سلسلے میں
پھر سوچا' میرے صبر کا پیمانہ چھلک رہا ہے۔ ان دنوں لندن کا موسم بڑا ہی خوشگوار ہو
یں آسیہ ملے گی' وہیں ہنی مون مناؤں گا تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑے گی۔

انہوں نے ٹھنڈ پانے کے لیے مزید احکامات جاری کیے' پھر آسیہ کے خیالوں میں کھو

ایک چھوٹے سے بچے کے ذریعے زہر کی ایک بڑی شیشی پہنچا دی گئی۔ پاشا نے
لے کر بچے کو رخصت کر دیا۔ ملازمہ کو پہلے ہی چھٹی دے دی گئی ہے۔ پاشا نے
کو ریوالور دیتے ہوئے کہا "ہوشیار رہنا۔ کوئی بھی اچانک قریب آئے تو اپنے آخری
عمل کر لینا۔"

وہ کچن میں آیا۔ فریج کھول کر اس میں سے کچا گوشت نکالا۔ اسے ایک پلیٹ میں رکھ کر زہر کی شیشی کھولی۔ اس کے چند قطرے گوشت پر ٹپکائے۔ پھر اسے لے کر بنگلے کے احاطے میں آیا۔ وہاں ایک طرف کتا بندھا ہوا تھا۔ اس نے وہ پلیٹ کتے کے سامنے رکھ دی۔ پھر دور تک نظریں دوڑاتا ہوا کمرے میں آسیہ کے پاس آگیا۔ دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد وہ دونوں کھڑکی کے پاس آگئے۔ وہاں سے کتے کو دیکھنے لگے۔ وہ گوشت کھا رہا تھا۔

آسیہ نے پوچھا "کیا باہر مشکوک افراد نظر آرہے ہیں؟"

"کتنے ہی لوگ سڑک سے گزر رہے ہیں۔ دو چار بندے فٹ پاتھ پر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ دور ایک ویگن کھڑی ہوئی ہے۔ یوں دشمن نظروں میں نہیں آسکتے۔ ویسے پورا یقین ہے کہ دشمن تاک میں لگے ہیں۔"

کتا اچانک ہی حلق سے عجیب عجیب سی آوازیں نکالنے لگا۔ جب وہ زمین پر لوٹنے لگا تو آسیہ نے منہ پھیرلیا۔ ذرا دیر اس کی کراہیں سنائی دیں۔ پھر خاموشی چھاگئی' وہ بولی "خدا معاف کرے۔ ہم نے ایک اور جاندار پر ظلم کیا ہے۔"

"ڈاکٹر طبی تجربات کے لیے کتوں اور بندروں پر ایسا ہی ظلم کرتے ہیں اور انسانی زندگی بچانے کے لئے مؤثر دوائیں ایجاد کرتے ہیں۔ میں نے تمہاری عزت بچانے کے لیے ایک حیوان پر یہ ظلم کیا ہے۔ میں بھی خدا سے معافی چاہتا ہوں۔"

انہوں نے دو ننھی سی شیشیاں ڈھونڈ کر نکالیں۔ ان دونوں میں زہر کے رقیق مادے کو منتقل کیا پھر پاشا نے کہا "ایک شیشی تم چھپا کر رکھو' ایک میں رکھوں گا اور یہ بڑی شیشی پانی سے بھر کر ہم نمائش کے طور پر اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔"

تقریباً دو گھنٹے بعد ابن سلطان نے فون پر پاشا سے کہا "تم دونوں کی روانگی کے لیے خصوصی طیارے کا انتظام ہو چکا ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر ایک شخص موٹر سائیکل پر آئے گا۔ تم اپنی کار میں رہو گے۔ اس کی راہنمائی میں اس رن وے پر جاؤ گے جہاں وہ چارٹرڈ طیارہ ہو گا۔"

پاشا نے کہا "اس ایک شخص کے علاوہ میں کسی کو برداشت نہیں کروں گا۔ اس سے کہہ دیں کہ وہ ہم سے دس گز کی دوری پر رہے گا۔ طیارے کے آس پاس بھی کوئی نہ رہے۔ اندر صرف ہم دو مسافر ہوں گے۔ طیارے کی سیڑھیاں چڑھتے وقت ہم دونوں کے منہ سے زہر کی شیشیاں لگی رہیں گی۔ ذرا سی بھی چالاکی ہمیں موت دے گی اور تمہیں بھاری نقصان پہنچائے گی۔"

"تمہاری مرضی کے مطابق یہی سب کچھ ہو گا۔ کیا تم نے اس زہر کو آزمایا؟"

"ہاں' اس بنگلے میں ایک کتا مر چکا ہے۔ اس کے بعد ہماری باری ہے۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ تم چلے جاؤ۔"

پاشا نے ریسیور رکھ کر آسیہ سے کہا "ایک شخص موٹر سائیکل پر آ رہا ہے۔ ہم اس راہنمائی میں ائرپورٹ جائیں گے۔"

آسیہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "کیا ہم اپنا ملک چھوڑ ہے ہیں؟"

"ہاں اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس ملک میں کوئی شہر' کوئی گلی اور کوئی گھر ایسا نہیں ہے ں بے گناہ معتوب افراد کو شیطانی قوتوں سے پناہ ملے۔ ہم جہاں رہیں گے' وہاں پولیس رنے آئے گی۔ گرفتاری کا کوئی قانونی جواز نہ ہو گا تو غنڈے یا دہشت گرد آئیں گے۔ ن سے بھاگنا چاہیں گے تو اندھی گولیاں سنسناتی ہوئیں کہیں سے آئیں گی۔ یہ کبھی ریکارڈ نہیں آئے گا کہ وہ کہاں سے آئی تھیں اور قاتل کون لوگ تھے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "کروڑوں افراد نے بڑی محبت سے یہ ملک بنایا ہ۔ کسی بھی عام آدمی سے کہو کہ یہ ملک چھوڑ دے' وہ نہیں چھوڑے گا۔ جان دے ے گا مگر اس پاک سرزمین سے ہمیشہ کے لئے الگ نہیں ہو گا۔ اگر صرف جان دینے کی ت ہوتی تو ہم نہ جاتے۔ یہاں تو عزت مانگی جا رہی ہے۔ مانگی نہیں' چھینی جا رہی ہے اور ں یہ منظور نہیں ہے کہ پاک زمین پر کسی بھی آسیہ کے وجود کو ناپاک کیا جائے۔ بہت ا لڑائیاں میدان میں نہیں لڑی جاتیں۔ میدان کے باہر بھی ذہانت کے راؤنڈ ٹیبل پر ی جاتی ہیں۔ ہم ملک سے باہر جا کر پیر نظام شاہ کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ دنیا کو یں گے کہ ہمارے قومی ترانے میں "پاک سرزمین کا نظام" پیش کیا گیا ہے۔ یہ پیر نظام ناپاک سرزمین کا نظام کیوں پیش کر رہا ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد بولنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ دونوں سر جھکائے بیٹھے ہے۔ ان کے جھکے ہوئے سر کہہ رہے تھے۔

باغباں دل میں بھری ہیں مزے باتیں کیا کیا
آشیاں جا کے کہیں اور بنالوں تو کہوں

ایک گھنٹے بعد وہ دونوں اپنی اٹیچی اٹھائے کار میں آکر بیٹھ گئے۔ احاطے کے باہر ایک ص موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاشا نے کار اسٹارٹ کی۔ جب موٹر سائیکل والا آگے ھا تو وہ اس کے پیچھے اپنی کار ڈرائیو کرنے لگا۔

وہ ائرپورٹ کے جس حصے میں پہنچے' وہ عام مسافروں کی گزر گاہ نہیں تھی۔ وہاں کے کچھ ملازم اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ وہ کار سے اتر کر اٹیچی اٹھائے' اس شخص کے پیچھے کافی فاصلہ رکھ کر چلتے ہوئے طیارے کے پاس پہنچ گئے۔ کچھ مسلح افراد طیارے سے دور کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اندر آئے۔ ایک اسٹیوارڈ نے کہا "میں اس دروازے کو لاک کرنے کے بعد سامنے والے کیبن میں جاکر ادھر سے دروازہ بند کرلوں گا۔ یہاں صرف آپ دونوں رہیں گے۔ سفر کے دوران کھانے پینے کا تمام سامان رکھا ہوا ہے۔"

طیارے سے سیڑھی ہٹائی گئی۔ اسٹیوارڈ نے دروازے کو بند کرکے مقفل کردیا پھر سامنے والے کیبن میں جاکر اس دروازے کو بھی دوسری طرف سے لاک کرلیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ طیارہ رن وے پر دوڑتے دوڑتے پرواز کرنے لگا۔

ایسے وقت ابن سلطان کے نئے پی اے نے بیگم لاثانی سے رابطہ کیا' پھر کہا "بیگم صاحبہ! مجھے حضور یہ حکم دے گئے ہیں کہ میں آپ سے رابطہ کروں اور یہ بتادوں کہ سونے کی چڑیا اُڑ گئی ہے۔"

بیگم لاثانی نے کہا "مجھے پتا ہے۔ جب میں سوتی ہوں تو میرے کتے جاگتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ان دونوں کو ایک خصوصی طیارے میں جاتے دیکھا ہے۔"

وہ ریسیور رکھ کر پیر محمد سے بولی "ابن سلطان نے بڑی چالاکی دکھائی ہے۔ وہ آسیہ کو ہمارے آدمیوں سے بچانے کے لیے ملک سے باہر لے جارہا ہے۔ وہ مناسب وقت کا انتظار کرے گا۔ پیر صاحب اس سے ناراض ہیں۔ وہ پہلے ناراضی دور کرے گا پھر آسیہ کو پیش کرے گا۔"

پیر محمد نے کہا "بیگم صاحبہ! میں نے کہا تھا کہ پاشا ابن سلطان کا جان دینے والا وفادار ہے۔ آپ سے یہ جھوٹ کہا گیا تھا کہ وہ غدار ہوگیا ہے۔ وہ ابن سلطان کے ساتھ آسیہ کو لے گیا ہے۔ ملک سے باہر جاکر اسے حضور کے حوالے کردے گا۔"

"میں مانتی ہوں ابن سلطان بڈھے پیر کی دیوانگی سے کھیل رہا ہے۔ کنوئیں کو دور لے جاکر پیاسے کی پیاس بڑھا رہا ہے۔ مگر میں اسے سبقت لے جانے نہیں دوں گی۔ میں یہ دھوکا کھاگئی کہ پاشا غدار ہوگیا۔ اب آسیہ ابن سلطان کے ہاتھ نہیں لگے گی۔ کوئی بات نہیں' میں اب بھی ہاتھ لگنے نہیں دوں گی۔ لندن' پیرس' فرینکفرٹ وغیرہ چند شہر ایسے ہیں' جہاں بڈھے پیر کے مارے لوگ پناہ لیتے ہیں۔ جو سودے بازی ملک میں نہیں ہو پاتی' وہاں بیٹھ کر ہو جاتی ہے۔ ان شہروں میں ہمارے پارٹی کے کارکنوں کو ابھی فون کرو۔

کارکن مخالف پارٹی کے اس غنڈے پاشا کو اچھی طرح پہچانتے ہوں گے۔ ان سب
ی بات کراؤ۔ ان سب کو میرا ایک ہی حکم ہو گا کہ پاشا کے ساتھ جو بھی حسین
ائی دے' اسے اور پاشا کو فوراً گولی مار دی جائے۔"

ر محمد سمندر پار رابطہ کرنے کے لیے ٹیلیفون کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر یورپ کے
ے شہروں میں رہنے والے پارٹی کے کارکنوں سے باتیں کرنے لگا۔ لندن میں ایسے
ن تھے' جو پاشا کو اچھی طرح جانتے تھے انہوں نے کہا "فکر نہ کرو۔ طیارے کو
نچنے دو۔ ہم پاشا کے قدم اس دنیا سے اکھاڑ دیں گے۔"

ر محمد نے کہا "ایک بات اچھی طرح یاد رکھو۔ پاشا اہم نہیں ہے۔ ہماری اس پارٹی
ی اسی میں ہے کہ پاشا کے ساتھ دیکھی جانے والی حسینہ زندہ نہ رہے۔ اُس کا نام
ہے۔"

ر محمد یورپ کے کئی بڑے شہروں کے پارٹی کارکنوں کو یہی ذہن نشین کراتا رہا کہ
ساتھ جو بھی حسینہ ہو گی' وہ آسیہ ہو گی۔ اس حسینہ کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔"

دنیا بہت بڑی ہے لیکن اتنی بڑی دنیا میں ایک انچ بھی ایسی جگہ نہیں ہے' جہاں
ر شرافت سے رہنے والوں کو سلامتی مل سکے۔ وہ دونوں عزت اور سلامتی کے
، چھوڑ کر جہاں جارہے تھے' وہاں موت کے فرشتوں کو پہلے سے اطلاع دے دی
۔

یارے کو ایک پرائیویٹ پورٹ پر اتارا گیا۔ جب وہ رن وے پر دوڑتا ہوا رُک گیا
ر آسیہ نے سیفٹی بیلٹ کھول دیا۔ اسی وقت سامنے والے کیبن کا دروازہ کھلا۔
ن سلطان نظر آیا اس نے کہا "ابھی آرام سے بیٹھو اور میری باتیں سنو۔ میں نے
شرائط پوری کر دیں۔ یہاں سفر کے دوران تم دونوں کے ساتھ کوئی تیسرا نہیں
دھر والے کیبن میں تھے۔"

ثانے پوچھا "ہم سے کیا مراد ہے؟ کوئی اور بھی ہے؟"

ہاں' یہاں محترم پیر محمد نظام شاہ تشریف رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے' یہ تنہا چار دیواری
نہیں نکلتے۔ ان کے ساتھ مسلح باڈی گارڈز بھی ہیں۔"

سنتے ہی پاشا نے ریوالور کی نال آسیہ کی کنپٹی سے لگا دی۔ ابن سلطان نے کہا
باؤ۔ ہمیں غلط نہ سمجھو۔ کوئی دھوکا کرنا ہوتا تو ہم وہیں ملک کے اندر تم سے کہتے
اری پیش کرو یا آسیہ کو گولی مار کر مرجاؤ۔"

یہاں ہمارے ساتھ آنے کا مقصد کیا ہے؟"

پیر صاحب یہاں ایک ہاتھ سے تمہیں رقم دے کر دوسرے ہاتھ سے آسیہ کو ا
چاہتے ہیں۔"

"میں سمجھ رہا تھا' ملک سے باہر سلامتی ملے گی اور آسیہ عزت کی زندگی گزار
گی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ہمارے معاملات ملک سے باہر طے ہوں گے۔ یہ نہیں
تھا کہ آسیہ کا سودا طے ہو گا۔ میں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ بڈھے پیر کو جھوٹا دلاسہ
کہ آسیہ اُس کے حوالے کی جائے گی لیکن تم سچ مچ اس بوڑھے شیطان کو ساتھ لے آ
ہو۔"

کیبن کے اندر سے پیر نظام شاہ کی غراہٹ سنائی دی "یہ کُتا مجھے شیطان کہہ
ہے' اسے گولی مار دو۔"

پاشا نے مسکراتے ہوئے کہا "تم اس ملک میں نہیں ہو' جہاں تمہارے تعویذ گنڈ
کام دکھاتے رہتے ہیں۔ یہ لندن ہے اور یہ خصوصی طیارہ پاکستان سے آیا ہے۔ ابھی ی
گولیاں چلیں گی اور لاشیں گریں گی تو پوری دنیا کے اخبارات ہمارے ملک کی بگڑی
صورت پیش کریں گے۔ تم لوگ گرفت میں آجاؤ گے۔"

پیر نے کہا "تمہارا خیال ہے کہ تم ہمیں ملک سے باہر لا کر بے بس کر رہے ہو۔
تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تم احمق ہو۔ ہم اپنی عزت اور نیک نامی کی خ
تمہیں یہاں سے جانے دیں گے لیکن اتنے بڑے شہر میں کہاں چھپو گے؟ کوئی غنڈہ موا
دونوں پر گولیاں برسا کر گزر جائے گا اور ہم پر کبھی الزام نہیں آئے گا۔"

آسیہ نے کہا "بڈھے کا دماغ چل گیا ہے۔ ہم یہاں اپنی موت کا سامان کیے بیٹھے
اور یہ ہمیں موت سے خوف دلا رہا ہے۔"

پاشا نے اسٹیوارڈ سے کہا "سیڑھیاں لگواؤ۔ دروازہ کھولو۔ یہاں گولی نہیں چا
گا۔ جب یہ فائرنگ کریں گے تو پھر دیکھا جائے گا۔"

ابن سلطان نے کہا "رن وے کلیئر کرنے کے لیے ہمیں طیارہ خالی کرنا ہی ہ
دروازہ کھول دو۔"

اسٹیوارڈ حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ پیر نے کہا "ابن سلطان! انہیں پھر ایک بار سم
یا مجھے آسیہ سے تھوڑی دیر تنہائی میں باتیں کرنے دو۔"

آسیہ نے کہا "مجرمانہ نکاح پڑھانے والے پیر! میں تجھے گالیاں نہیں دوں گی۔
دیدار نہیں کراؤں گی۔ تُو نے مجھے ایک بار کہیں دیکھا تھا۔ پھر آج تک میری تصو
تصور سے بہل رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں' ابھی مجھے دیکھ تاکہ تیری بے قراری اور

ت پیدا ہو۔ تیرا بلڈ پریشر بڑھ جائے اور تیرا دم نکل جائے۔"

دروازہ کھل گیا۔ سیڑھی لگ چکی تھی۔ پاشا نے کہا "میں اپنا ریوالور جیب میں چھپا رہا
ا کہ باہر کسی کو معلوم نہ ہو کہ آسیہ گن پوائنٹ پر لے جائی جا رہی ہے۔ اس کے
ہم نہتے نہیں رہیں گے۔ ہمارے ہاتھوں میں یہ زہر کی شیشیاں رہیں گی۔"

دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک ایک شیشی دکھائی۔ پاشا نے ریوالور
ں میں چھپا کر اٹیچی اٹھائی۔ پھر دروازے پر آکر سیڑھی کی بلندی سے باہر دیکھا۔
ٹ پورٹ کے سیکیورٹی گارڈز دور کھڑے ہوئے تھے۔ وہ آسیہ کے ساتھ نیچے اترنے

طیارے کے کیبن کے پاس دوسری سیڑھی سے پیر نظام شاہ اور ابن سلطان اتر
تھے۔ ان سب کو خصوصی طیارے کے کاغذات دفتر میں پیش کرنے کے بعد
ٹ کے احاطے سے باہر جانا تھا۔ پیر صاحب ویٹنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ وہیں آسیہ
شا کے ساتھ تھی۔ بوڑھا اسے بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

ابن سلطان ویٹنگ روم کے باہر کاریڈور میں آیا۔ وہاں اس کی بیوی اور ایک نوجوان
نظار کر رہی تھیں۔ بیٹی اسے دیکھتے ہی پاپا کہہ کر سینے سے لگ گئی۔ بیوی نے کہا "ابھی
ئے پہلے آپ کے نئے پی اے نے فون کیا تھا کہ آپ آ رہے ہیں۔ میں گاڑی لے کر
ہوں۔"

"کیا پی اے نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ یہاں نہ آؤ۔ میں خود ہی پہنچ جاؤں گا۔"

"اس نے تو کہا تھا لیکن گاڑی لے آئی ہوں تو کیا فرق پڑ گیا ہے۔"

"میں سرکاری کام سے آیا ہوں۔ ابھی پیر صاحب کے ساتھ جاؤں گا۔ تمہیں میری
و یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔"

"یہ تو آپ کی لاڈلی ہے۔ اسے آپ کے بغیر چین نہیں اور آپ اس سے روز فون
ت نہ کریں تو آپ کو نیند نہ آئے۔ میں اسے یہاں آنے سے کیسے روک لیتی۔"

اس دفتری عمارت کے باہر گیٹ کے قریب ان کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور ان
ذرا فاصلے پر بیگم لاثانی کے وفادار موجود تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ان میں سے تین
گاڑیوں کے ڈرائیوروں سے دوستی کی تھی۔ انہیں بیئر اور سگریٹ پلا رہے تھے۔
تھے شخص نے چار گاڑیوں کے ایک ایک پہیے کی ہوا نکال دی تھی تاکہ پاشا اپنی آسیہ
ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر فوراً ہی وہاں سے نہ جا سکے۔

اُن کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ جب طیارے کے تمام مسافر گاڑیوں کے پاس آنے

لگے تب ڈرائیوروں کو پتا چلا کہ ان کی غفلت سے گاڑیاں عارضی طور پر بیکار ہو گئی ہیں
ذرا فاصلے پر چھپے ہوئے چاروں مسلح شخص پیر اعظم شاہ' ابن سلطان اور پاشا کو پہچان ر
تھے۔ مگر آسیہ کو پہچاننے میں دقت ہو رہی تھی کیونکہ آسیہ کے ساتھ ابن سلطان کی جوا
اور حسین بیٹی تھی۔ حکم تھا کہ حسینہ کو گولی ماری جائے اور وہاں ایک نہیں دو حسینا
تھیں۔

آسیہ پاشا کے دائیں طرف تھی اور وہ نوجوان لڑکی اپنی ماں کے ساتھ پاشا کے بائ
طرف چلتی ہوئی آکر گاڑیوں کے پاس رک گئی تھی۔ وہ تمام ڈرائیور چاروں گاڑیوں
پہیے جلدی جلدی تبدیل کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

بیگم لاثانی کے ایک وفادار نے دوسرے سے کہا۔ "پاشا کے دائیں طرف والی آ
ہو گی۔"

دوسرے وفادار نے کہا۔ "پاشا کے بائیں طرف والی بھی ویسی ہی حسین و جم
ہے۔ کیا وہ آسیہ نہیں ہو سکتی؟"

تیسرے نے کہا۔ "ایسے تو ہم اندازے کرتے رہیں گے اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر چ
جائے گی۔"

چوتھے نے کہا۔ "تم لوگوں کی عقل گھاس چرنے گئی ہے۔ اب میری عقل دیکھو۔"
دونوں ہاتھوں سے ریوالور تھام کر پاشا کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ "اس کے دائ
بائیں کوئی ایک آسیہ ہے اور جو آسیہ ہے' وہ دیارِ غیر میں اپنا نام سن کر چونکے گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے پوری قوت سے چیخ کر پکارا۔ "آسیہ۔ یا.......... یا..........
یا.........."

ایک دم سے آسیہ نے چونک کر آواز دینے والے کو دیکھنا چاہا۔ ایک جھٹکے سے
اٹھایا۔ حیرانی ظاہر کی۔ قاتل نے اسی لمحہ میں گولی چلا دی۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔
گولی کھاتے ہی اچھل کر گرتے گرتے پاشا کے بازوؤں میں آئی۔ پاشا نے اسے سنبھا
ہوئے جیب سے ریوالور نکالا اور ہوائی فائر کرتے ہوئے یہ معلوم کرنا چاہا کہ گولی کس سم
سے آئی تھی اور قاتل کہاں چھپا ہوا ہے؟

اس سے پہلے کہ سراغ ملتا' دوسری گولی اسے آکر لگی۔ ریوالور ہاتھ سے چھو
گیا۔ وہ آسیہ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ اس دوران سب ہی اِدھر اُدھر بھاگ رہے
سیکورٹی گارڈز ہوائی فائر کرتے ہوئے گیٹ کے باہر قاتلوں کا پیچھا کرنے دوڑنے مگر یہاں
قصہ تمام ہو چکا تھا۔

آسیہ اور پاشا ایک دوسرے کی آغوش میں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ عورت جب
ل کو لگتی ہے تو پھر کینسر کی طرح لگتی ہے۔ خدا کینسر سے بچائے مگر اس سے نہ بچائے۔ یہ
بت سے جینا اور محبت سے مرنا سکھا دیتی ہے۔ دونوں کا لہو ایک دوسرے سے گھل مل کر
ہ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

ہم خون کی قسطیں تو بہت دے چکے لیکن
اے خاکِ وطن قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

ایسی گولیاں چلی تھیں کہ بھاگنے اور اپنی جان بچانے والوں کے ہوش اُڑے ہوئے
تھے۔ کسی کو بھی اپنے سوا دوسرے کا ہوش نہیں رہا تھا۔ ابن سلطان نے دفتری عمارت کی
طرف دوڑ لگائی تھی۔ بیوی اس کا دامن پکڑتی چلی آئی تھی۔ جب فائرنگ تھم گئی تو وہ
روتی ہوئی بولی۔ "میری بیٹی! میری روشنی کہاں ہے؟"

بیٹی کا نام روشن آراء تھا۔ اسے پیار سے روشنی کہتے تھے اور اس کے حسن پر یہ نام
کھلتا بھی تھا۔ ابن سلطان پریشان ہو کر ایک سمت دوڑا۔ "روشنی! مائی سویٹ بے بی! تم
کہاں ہو؟"

وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ حواس باختہ تھی۔ خوف سمایا ہوا تھا کہ
ب تب میں کوئی گولی آکر لگے گی۔ ایسے میں گولی تو نہیں آئی' پیر نظام شاہ دوڑتا ہوا آیا۔
ٹھوکر کھا کر ایسا گرا کہ اس کا سر روشنی کی گود میں آگیا۔ بوڑھے کو ہانپنے اور کانپنے کے
لئے مزاج کے مطابق جگہ مل گئی۔

ادھر سے باپ دوڑتا ہوا آیا۔ "میری بچی! کیا تم خیریت سے ہو؟"

پیر نے زانو پر سر گھما کر کہا۔ "آؤ سلطان! میں آپس کی رنجشیں ختم کر رہا ہوں۔ تم
نے کبھی ذکر کیوں نہیں کیا کہ تمہاری روشنی اس قدر حسین ہے؟"

باپ تیزی سے آ رہا تھا۔ ایک دم سے لڑکھڑا کر گرتے گرتے زمین پر بیٹھ گیا۔ جہاں
وہ سجدے کے انداز میں جھکا بیٹھا تھا' وہاں سے کچھ فاصلے پر آسیہ کی لاش پڑی تھی۔ وہ
چراغ بجھ گیا تھا۔ دوسری طرف بیٹی چراغ کی طرح لَو دے رہی تھی۔

یہ نام روشنی اس کے حُسن پر کھلتا تھا۔ کیا اب یہ ہماری پاک زمین پر جا کر کھلے گا؟
ابھی بڈھے کا سر زانو پر دھرا ہے۔ اسے دھرنا دینا کہتے ہیں۔

===============

مدفن

پاکستان کی دو معروف اور ناقابلِ فراموش

ہستیوں کی داستان جو اپنا مدفن چھوڑ کر دنیا میں آ گئی تھیں۔

پھر جو کچھ ہوا وہ شرمناک ہی نہیں عبرتناک بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس فانی دنیا میں جتنی بھی معزز اور معروف شخصیات اپنی زندگی
یں کارہائے نمایاں انجام دیتی ہیں' وہ اپنی زندگی کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔ اُن کی صرف
سانسیں ختم ہوتی ہیں' کارنامے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ بعض عقیدت مند یہاں تک کہتے
یں کہ ایسی قابلِ احترام ہستیاں لوگوں کی نظروں میں مدفون ہوتی ہیں لیکن وہ اپنے مدفن
ے باہر اسی دنیا میں ہوا کرتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عام لوگوں کی نظریں اِن عظیم
وگوں کو دیکھ نہیں پاتیں۔

ایسی محترم ہستیوں کو دیکھنے کے لئے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی لازمی ہے۔
بصیرت یعنی دل کی آنکھ سے جو نہیں دیکھتا' انہیں زندہ جاوید ہستیاں دکھائی نہیں دیتیں۔

بیسویں صدی میں متعدد حضرات نے مرزا غالب کو کراچی کے بندر روڈ پر دیکھ لیا۔
پھر بیسویں صدی کے اختتام سے چھ برس پہلے یہ عظیم شاعر امریکا میں دیکھا گیا۔ "مرزا
غالب ان امریکا" یقیناً موجودہ صدر کلنٹن اور دیگر امریکی اکابرین نے بھی برصغیر کے اس
لافانی شاعر کو دیکھا ہوگا' جو اپنی وفات کے سو سال بعد بھی زندہ اور تابندہ ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ملی۔ پھر میں نے
کراچی میں اور میرے ہمزاد نے لاہور میں دو محترم' معروف اور ناقابلِ فراموش اُن
ہستیوں کو دیکھا' جو ساری دنیا کے لئے مدفون تھیں لیکن مدفن سے باہر آ گئی تھیں۔

ان محترم ہستیوں کو میرا اور پوری قوم کا سلام۔ وہ کیسے آئیں؟ کیوں آئیں؟ میں
نے اور میرے ہمزاد نے اُن کے ساتھ کیسے وقت گزارا؟ یہ ساری روداد میں بیان کر رہا
ہوں۔

☆==========☆==========☆

یہ ۳۰ دسمبر ۲۰۰۰ء کی شب ہے۔ رات کے بارہ بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔
جب پندرہ منٹ گزر جائیں گے اور ٹھیک بارہ بجیں گے تو اس آدھی رات سے دسمبر کی
۳۱ تاریخ شروع ہو جائے گی۔ یہ بیسویں صدی کی آخری تاریخ ہو گی۔ رات کا بقیہ حصہ
گزرنے کے بعد بارہ گھنٹے کا آخری دن ہو گا اور پھر چھ گھنٹے کی آخری آدھی رات ہو گی۔

اِس کے بعد ٹھیک بارہ بجے سے اکیسویں صدی کی پہلی تاریخ شروع ہو گی۔

ابھی اکیسویں صدی کے شروع ہونے میں پورے چوبیس گھنٹے اور پندرہ منٹ ہیں۔ رات بہت سرد ہے۔ شبنم کی سفید دُھند میں دُور دور تک راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ ایسے میں ایم اے جناح روڈ پار کرتے ہی پرانی نمائش سے ذرا آگے ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی ہے۔ ٹیکسی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ کسی موٹر میں' کسی انسان میں یا کسی قوم میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خرابی کتنی دیر بعد یا کتنے دور گزرنے کے بعد دور ہو گی؟

تھوڑی دیر بعد میں پچھلی سیٹ سے اتر کر باہر آتا ہوں۔ ڈرائیور بونٹ اٹھائے انجن پر جھکا ہوا ہے۔ میں قریب آ کر کہتا ہوں۔ "یہاں اندھیرا ہے۔ بونٹ کے سائے میں اور زیادہ تاریکی ہے۔ یہاں تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟ تم کون سی خرابی اندھیرے میں درست کر رہے ہو؟"

وہ بونٹ کے سائے میں جھکا ہوا تھا۔ سیدھا کھڑا ہو گیا اور کہہ رہا ہے "اب یہاں اتنی تاریکی بھی نہیں ہے کہ تمہیں میرے ہاتھ میں ریوالور نظر نہ آئے۔"

مجھے شاک پہنچتا ہے۔ بزرگوں کی نصیحت یاد آتی ہے کہ سواری وہی کرو' جس کی لگام تمہارے ہاتھوں میں ہو۔ فی زمانہ ہم رکشا' ٹیکسی جیسی گاڑیوں میں سوار ہونے پر مجبور ہیں' جس کا اسٹیئرنگ ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہوتا۔ ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر کہیں دھوکا کھانے یا بے موت مرنے کا سامان کر چکے ہوتے ہیں۔

وہ حکم دے رہا ہے۔ "تمہاری جیب مین اور اس بیگ میں جتنی رقم ہے' فوراً نکالو۔"

"میری جیب میں صرف سو روپے کا ایک نوٹ ہے اور بیگ میں کہانی کا مسودہ او چند رسالے ہیں۔"

اسے یقین نہیں آ رہا ہے۔ وہ میرے بیگ کی اور پھر میری جیبوں کی تلاشی لے ر ہے اور بڑبڑا رہا ہے کہ کس کنگال مصنف کو اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر لے آیا ہے۔ وہ مجھ سو روپے چھین کر کہتا ہے۔ "تجھے تو پتا ہو گا پیٹرول کس قدر مہنگا ہو گیا ہے۔ برنس روڈ یہاں تک تیس روپے کا پیٹرول جل چکا ہے۔ آگے پولیس والا مجھ سے پچاس روپے لے گا۔ میرے پاس صرف بیس روپے رہ جائیں گے۔"

میں جواباً کہتا ہوں۔ "میرے پاس تو اب بیس پیسے بھی نہیں رہ گئے۔ اگر تم زنا چھوڑ دو گے تو میں اپنے گھر تک کیسے پہنچوں گا؟"

"تُو کیا سمجھتا ہے' میں تجھے گولی ماروں گا؟ تُو کہانیاں لکھتا ہے' تجھے پنسل یا قلم کی قیمت معلوم ہو گی۔ تجھے کیا پتا ہے؟ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب ریوالور کی ایک گولی پچیس روپے کی آتی ہے۔ میں نے تجھ سے بیس روپے کمائے ہیں اگر گولی ماروں گا تو مجھے پانچ روپے کا نقصان ہو گا۔ چل بھاگ جا یہاں سے..........."

میں جان کی سلامتی پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور وہاں سے پیدل جانا چاہتا ہوں لیکن ٹھٹک جاتا ہوں۔ ڈرائیور بھی چونک کر اپنا ریوالور اُدھر کرتا ہے۔ ہاں اُدھر اندھیرے سے کوئی ہماری طرف آ رہا ہے۔ ہم نے اپنی باتوں کے دوران آنے والے پر پہلے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ہم سے ایک گز کے فاصلے پر آ کر رک جاتا ہے۔

ہم دونوں حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے کبھی اُس اجنبی کو اور کبھی اُس کے پیچھے کچھ فاصلے پر واقع قائداعظم کے مزار کو دیکھتے ہیں۔ ڈرائیور اسے ریوالور دکھاتے ہوئے پوچھتا ہے۔ "تم کون ہو؟"

میں تعجب سے کہتا ہوں۔ "جناب! آپ ہمارے قائداعظم محمد علی جناح سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ پھر لباس بھی وہی ہے۔ ویسی ہی شیروانی اور جناح کیپ بھی ہے۔ بخدا مزارِ قائداعظم کے پس منظر میں آپ ایسے لگ رہے ہیں جیسے خداوند کریم نے ہمارے ملک کو عزت اور وقار سے اکیسویں صدی میں لے جانے کے لئے پھر سے قائداعظم جیسی ایک ہستی کو ہماری زمین پر بھیج دیا ہے۔"

اجنبی کہتا ہے۔ "تم جو سمجھ رہے ہو' میں وہی ہوں۔ اس ریوالور والے کے ہاتھ میں جو سرخ رنگ کا کاغذ ہے' اس پر میری تصویر ہے۔"

ڈرائیور اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھتا ہے۔ "کیا جنگل سے آ رہے ہو؟ سو روپے کے نوٹ کو سرخ رنگ کا کاغذ کہتے ہو۔ ویسے یہ بڑے تعجب کی بات ہے' تم ہوبہو اس تصویر جیسے ہو۔"

"تو پھر مان لو کہ یہ میری تصویر ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ پاکستان کی کرنسی پر میری تصویریں شائع ہو رہی ہیں۔ کیا میں اسے ہاتھ میں لے کر دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیا مجھے اُلو سمجھتے ہو۔ جو سو روپے میں نے چھین کر لئے ہیں' اسے کیا تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اپنی خیریت چاہتے ہو تو دور ہو جاؤ۔ تم میں سے کوئی بھی مجھے روکنا چاہے گا تو میں گولی مار دوں گا۔"

وہ بونٹ کو گراتا ہے پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر ٹیکسی کو اسٹارٹ کر کے چلا جاتا ہے۔ وہ ریوالور سے دھمکی دے کر اس اجنبی سے بھی کچھ وصول کر سکتا تھا لیکن وہ

قائداعظم کی شبیہہ دیکھ کر کچھ بوکھلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہم دونوں مزارِ قائد کے احاطے کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے رہ جاتے ہیں۔ بزرگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ "کیا واقعی وہ سو روپے کا نوٹ تھا؟ اور کیا وہ تم سے چھین کر لے گیا ہے؟"

"ہاں' وہ ضرورت مند تھا۔ ٹیکسی کے میٹر کے مطابق لے جاتا تو نقصان میں رہتا۔ ہمارے حکمرانوں نے اتنی مہنگائی بڑھا دی ہے کہ اب عوام کی اکثریت حلال کی کمائی کے ساتھ تھوڑا سا حرام بھی کماتی ہے۔"

"حرام بہت ہو یا تھوڑا' حرام ہی ہوتا ہے اور خلافِ ایمان ہوتا ہے۔"

"آپ شاید اُس دور کی بات کر رہے ہیں' جب ہم پولیس والوں کو حرام کھانے کا طعنہ دیا کرتے تھے اور وہ جواز پیش کرتے تھے کہ سپاہیوں اور افسروں کی تنخواہ اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ رشوت لے کر اپنے ماہانہ اخراجات پورے کرتے ہیں۔"

"لیکن رشوت کھانا' اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔"

"آج آپ کی بات کوئی نہیں سمجھے گا۔ پولیس والوں کی مجبوریاں سمجھ میں آتی ہیں کیونکہ مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ایک شخص کو اپنی بیوی اور صرف دو بچوں کے لئے کم از کم دس ہزار روپے ماہانہ کمانا پڑتا ہے۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے سے عام ملازمین کو ماہانہ دس ہزار تنخواہ نہیں ملتی ہے۔ لہٰذا اخراجات پورے کرنے کے لئے اب اِس ملک میں چوری' ڈکیتی' چھینا جھپٹی' اغوا برائے تاوان' بلیک میلنگ اور دہشت گردی وغیرہ روز مرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ ویسے میں آپ کو ایسے سمجھا رہا ہوں' جیسے آپ اس ملک کے نہیں ہیں۔ کیا آپ کسی خوشحال ملک سے آئے ہیں۔"

وہ کہتے ہیں۔ "تم ایک تعلیم یافتہ اور معقول پاکستانی لگتے ہو مگر پاکستان بنانے والے اپنے اس محمد علی جناح کو نہیں پہچان رہے ہو' جسے تم نے اور تمہارے بزرگوں نے قائداعظم کا خطاب دیا تھا۔"

میں زیرِ لب مسکراتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ خدا ایک ہی شکل و صورت کے کتنے ہی بندے پیدا کرتا ہے۔ یہ بزرگ بھی ہمارے قائداعظم کے ہم شکل ہیں اور اس بڑھاپے میں بضد ہیں کہ انہیں قائداعظم ہی تسلیم کیا جائے۔

وہ مجھے دیکھ کر کہتے ہیں۔ "تم یوں زیرِ لب مسکرا رہے ہو جیسے میں کسی پاگل خانے سے آیا ہوں.......... مجھے پہچانو۔ میں پاگل خانے سے نہیں' ابھی ٹھیک بارہ بجے اپنے اس مزار کی چار دیواری سے نکل کر آیا ہوں۔"

وہ بزرگ ہیں' نہایت سنجیدہ اور بے حد ذہین نظر آ رہے ہیں۔ وہ دنیا کی کوئی بھی

بات کہتے' میں اسے تسلیم کر لیتا لیکن عقل یہ کیسے تسلیم کرتی کہ ہمارے محترم قائداعظم اپنی وفات کے باون برس بعد اس دنیا میں دوبارہ تشریف لے آئے ہیں؟

میں اپنا یہ خیال اُن پر ظاہر کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں۔ "تمہاری بات معقول ہے۔ کسی بھی ذی فہم کے لئے میرا یہ دعویٰ ناقابلِ فہم ہو گا لیکن ہر پاکستانی کیا یہ نہیں چاہے گا کہ اس ملک میں ہزاروں لاکھوں قائداعظم پیدا ہوتے رہیں؟"

"آپ ہزاروں لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں ہمارے ہاں آج بھی ایک جناح پیدا ہو جائے تو یہ ملک جو کھنڈر بنتا جا رہا ہے.......... ایک بار پھر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے پاکستانیوں کے ایمان اور قومی جذبوں سے جگمگانے لگے گا۔ ہم چوبیس گھنٹے کے بعد اپنے قائداعظم کے پیچھے بڑے وقار سے اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے۔"

"کسی راہنما یا قائداعظم کے پیچھے کیوں نئی صدی میں داخل ہونا چاہتے ہو؟ کیا ترپن برسوں میں اس قوم کا ہر فرد اپنا راہنما آپ نہیں بن سکا؟"

"جی نہیں۔ ایک طویل سازشی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اس قوم کے پچانوے فیصد افرا کو ناخواندہ رکھا گیا ہے۔ یوں تو پچانوے فیصد افراد میں چالیس فیصد لکھنا پڑھنا جانتے ہیں لیکن یہ سینما کے پوسٹر اور مردانہ قوت حاصل کرنے والی دواؤں کے نام پڑھتے ہیں یا لو لیٹر لکھنے کی عیاشی سے دل بہلاتے ہیں اور سیاسی حالات سے اس لئے لاعلم اور بے خبر رہتے ہیں کہ ایک عرصے سے خاموش سفارتکاری اور خفیہ سیاسی عمل کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ سیاست اب عوام کے لئے نہیں صرف وی آئی پی طبقے کے لئے رہ گئی ہے۔"

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم.......... ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بولتے ہو۔ یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات ہے کہ ایک میاں بیوی اور دو بچوں کو ماہانہ اخراجات کے لئے دس ہزار روپے درکار ہوں۔ جب ترپن سال پہلے ہم نے پاکستان بنایا تھا تب چھ افراد کی فیملی کے ماہانہ اخراجات سو سوا سو روپے ہوتے تھے۔"

میں انہیں حیرانی سے دیکھتا ہوں۔ وہ بیسویں صدی کی آخری تاریخ میں ایسی باتیں کر رہے ہیں جیسے وہ آج کے انسان نہ ہوں۔ وہ پوچھ رہے ہیں۔ "کیا تم مجھے نادان سمجھتے ہو؟ کیا میری عقل یہ تسلیم کر لے گی کہ چند سیاستدان پوری پاکستانی قوم کو ناخواندہ رکھیں گے اور ایمانی جذبوں سے سرشارہ رہ کر پاکستان بنانے والی قوم بڑی خاموشی سے ناخواندہ رہ جائے گی۔"

میں اُن کی باتیں سن رہا ہوں دور اُن کے پیچھے مزار قائداعظم کو دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں یا اللہ! کیا مرحوم کی روح مجسم ہو کر آ گئی ہے؟ وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

"تم کرتے کیا ہو؟ یعنی کہ پیشہ کیا ہے؟"

"میں ایک قلم کار ہوں۔ ایسی کہانیاں لکھتا ہوں جو اوپر سے فسانہ اور اندر سے عاقبت اندیشانہ ہوتی ہیں۔"

"اب میں سمجھ گیا۔ لکھنے والے ایک بات کو شیطان کی آنت کی طرح لمبی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟"

"بڑی مہربانی ہو گی' آپ بتائیں کہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟"

"میں نے بتایا تھا کہ کون ہوں مگر تم نے یقین نہیں کیا۔ یہ بھی بتایا کہ کہاں سے آیا ہوں' اس پر بھی تم نے یقین نہیں کیا۔ شاید یہ سن کر یقین کر لو کہ میں پیشے کے اعتبار سے ایک بیرسٹر ہوں۔"

"تعجب ہے۔ آپ بیرسٹر ہو کر ملکی حالات کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔"

وہ سوچنے کے انداز میں سر جھکاتے ہیں۔ پھر تائید میں سر ہلا کر کہتے ہیں۔ "میں اپنی موجودہ لاعلمی کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں تو خداوند کریم کی رضا سے سوتا رہا۔ ویسے جو رہنما لمبی نیند سوتے ہیں' ان کی قوم پر ضرور عذاب نازل ہوتے ہیں۔ تم جو معلومات فراہم کر رہے ہو' ان پر مجھے کچھ بھروسا کرنا ہو گا اور کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہوں گا۔ کیا تم میرے کسی کام آؤ گے؟"

"آپ بزرگ ہیں۔ آپ کے چہرے پر ایک عجیب سا نور ہے۔ دل آپ کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ میں ہر طرح آپ کے کام آؤں گا۔ آپ فرمائیں' کیا چاہتے ہیں؟"

"کبھی میں راہنما کہلاتا تھا۔ آج تمہیں اپنا راہنما یا گائیڈ بنانا چاہتا ہوں۔ یہ جگہ' یہ عمارتیں' یہ کشادہ راستے اور وسیع و عریض راؤنڈاباؤٹ اور اونچی عمارتیں ایسی لگ رہی ہیں جیسے میں کسی نامعلوم شہر میں ہوں۔ جبکہ یقین سے سمجھ رہا ہوں کہ یہ میرا کراچی شہر ہے اور پاکستان کا دارالسلطنت ہے۔"

"آپ کس دور کی باتیں کر رہے ہیں۔ دارالسلطنت کراچی نہیں' اب اسلام آباد ہے۔ آپ کی وفات کے صرف بارہ برس کے بعد یاروں نے نظریۂ ضرورت کے تحت دارالحکومت کراچی سے ۱۲۰۰ میل دور بنا دیا۔ آپ پوچھیں گے کہ اسلام آباد کہاں ہے؟ یہ راولپنڈی کا ایک نیا جڑواں شہر ہے۔"

"میں اس نئے شہر کو ضرور دیکھوں گا۔ فی الحال یہ تبدیل شدہ کراچی شہر دیکھنا چاہوں گا۔ پھر کل دن کی کسی فلائٹ سے لاہور جاؤں گا اور وہاں پاکستان کے محسن' مفکر اور عظیم

ناعر علامہ اقبال رحمت اللہ علیہ کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھاؤں گا۔ اس نے میرے ہن میں ایک پھول کھلایا۔ میں نے اس پھول کو جگہ جگہ کھلانے کے لئے ہندوؤں اور زنگیوں سے مسلمانوں کا مقدمہ لڑا اور مشرق و مغرب میں ان کے لئے ایک سائبان بنایا ہے پاکستان کا نام دیا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لمحات بں اس عظیم مفکر کو خوشبوؤں کا تحفہ پیش کروں۔"

میں سحر زدہ سا ہو کر اس بزرگ کو دیکھ رہا ہوں' جو علامہ اقبال سے اس قدر نقیدت کا اظہار کرتے وقت حقیقتاً قائداعظم محمد علی جناح نظر آ رہا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اسے قائداعظم تسلیم کر لوں لیکن عقل ابھی تسلیم نہیں کر رہی ہے۔

اسی وقت ایک چھوٹے سے ٹرک کی ہیڈلائٹس کی روشنی ہم دونوں پر پڑتی ہے۔ ہاری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ ہم آنکھیں بند کرتے ہیں اور کھولتے ہیں۔ اتنی دیر میں گاڑی ہمارے قریب سے گزر کر آگے جاتی ہے پھر رک جاتی ہے۔ بزرگ بیرسٹر کہتے ہیں۔ ثاید یہ گاڑی ہمیں لفٹ دینے کے لئے رک گئی ہے۔"

"یہ مسلح فوجی جوانوں کی گاڑی ہے۔ یہ لفٹ نہیں دیں گے۔ ہمارا محاسبہ کریں گے۔ ہم سے سوال کریں گے کہ ہم اس آفت زدہ شہر میں آدھی رات کو کس نیت سے یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔"

وہ حیرانی سے پوچھتے ہیں۔ "فوجی جوانوں اور افسروں کو چھاؤنیوں میں یا ہمارے ملک کی سرحدوں پر ہونا چاہئے۔ یہ شہر میں کیا کر رہے ہیں؟"

"سیاستدانوں کی کمزور حکمت عملی کی سزا صرف عوام ہی نہیں' فوج بھی بھگت رہی ہے۔ اب سے کوئی دس برس پہلے سندھ میں امن و امان قائم رکھنے میں پولیس اور انتظامیہ ناکام ہو گئی تھی۔ تب فوج کو مجبوراً بلایا گیا تھا۔ خیال تھا کہ حالات پر قابو پا لیا بائے گا لیکن قابو پانے کے لئے فوج کو محدود اختیارات دیئے گئے تھے۔ ہر آنے والی حکومت' فوج کو زیادہ اختیارات دینے سے ڈرتی تھی اور اپنی انتظامیہ اور پولیس کی نااہلی کے پیشِ نظر فوجی آپریشن کی مدت بڑھاتی رہتی تھی۔ یہ مدت بیسویں صدی سے گزر کر اکیسویں صدی تک بڑھتی جا رہی ہے۔"

"تو کیا یہاں جمہوری حکومت ہے؟"

"ہے مگر ہم اسے ڈنڈا جمہوریت کہتے ہیں۔"

وہ فوجی گاڑی جو رک گئی تھی' ریورس گیئر میں چلتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی ہے۔ گاڑی کے پچھلے حصے سے مسلح فوجی جوان اتر کر آتے ہیں پھر اگلے حصے سے اتر کر آنے

والے افسر کے سامنے الرٹ ہو جاتے ہیں۔ افسر ٹارچ کی روشنی بزرگ بیرسٹر پر ڈال کر کچھ دیر تک انہیں حیرانی سے دیکھتا ہے پھر پوچھتا ہے۔ "آپ کون ہیں؟"

وہ آنکھوں پر ہتھیلی کا سایہ کر کے کہتے ہیں۔ "پلیز' میری آنکھیں تیز روشنی کی عادی نہیں ہیں۔ میں بیرسٹر محمد علی جناح ہوں۔"

افسر ٹارچ کو بجھاتا ہے پھر سپاہیانہ کڑک دار آواز میں کہتا ہے۔ "سلیوٹ۔"

وہ ایڑیاں بجا کر سلیوٹ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تمام فوجی جوان بھی سلیوٹ کرتے ہیں.......... وہ خوش ہو کر کہتے ہیں۔ "خدا کا شکر ہے۔ میرے ملک کے فوجیوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔"

افسر کہتا ہے۔ "سوری مسٹر جناح! ہم آپ کو نہیں' آپ کے نام کو' آپ کی صورت کو اور آپ کی بیرسٹری کے پیشے کو اس لئے سلام کر رہے ہیں کہ ہمارے قائداعظم کی یہ تینوں باتیں آپ میں مشترک ہیں۔"

افسر ٹارچ کو دوبارہ اس طرح روشن کرتا ہے کہ ان کی آنکھوں پر روشنی نہیں پڑے لیکن چہرہ واضح طور پر دکھائی دیتا رہے۔ وہ افسر کہتا ہے۔ "آج موجودہ صدی کی آخری تاریخ ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے پہلے آپ کا پُرنور چہرہ دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے اللہ تعالیٰ اس ملک کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں ایک نیا حوصلہ دے رہا ہے۔ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟"

وہ بزرگ مزار قائداعظم کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میں وہاں سے آیا ہوں۔ مگر تم میں سے کوئی یقین نہیں کرے گا اور میں خود کو قائداعظم کہوں تو سب میرا مذاق اڑائیں گے۔"

افسر کہتا ہے۔ "ہم آپ کا احترام کرتے ہیں۔ پلیز آپ حد سے نہ بڑھیں۔ نام ایک ہو سکتا ہے چہرہ ایک ہو سکتا ہے مگر قائداعظم کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں خود کو قائداعظم نہیں کہوں گا لیکن.......... تب میں آپ کے اِس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔"

"آپ جواب کیوں نہیں دے سکیں گے؟ آپ کا یہاں کوئی گھر ہو گا؟ اور یہ شخص آپ کے ساتھ کون ہے؟"

میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ میرے مکمل تعارف کے بعد افسر کہتا ہے۔ "آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ آدھی رات کو اس ویران فٹ پاتھ پر کیا کر رہے ہیں؟ آپ دونوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ ہم تصدیق کریں گے کہ آپ واقعی

ے قائداعظم کے ہم شکل ہیں یا کہ یہ بہروپ ہے؟"

ہم افسر کے حکم سے گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ گاڑی چل پڑتی ہے۔ ایک عام شہری کی حیثیت سے اور ان صاحب کو قائداعظم کے مشابہ کی حیثیت سے اگلی منزل کا کچھ پتا نہیں ہے۔ پتا نہیں ہم کہاں پہنچائے جانے والے ہیں؟

☆=========☆=========☆

یہ لاہور ہے اور یہ ۳۰ دسمبر ۲۰۰۰ء کی شب ہے۔ رات کے بارہ بجنے میں پندرہ ے باقی ہیں۔ اس تاریکی اور سناٹے میں کئی کوٹھوں سے ہارمونیم کے سُر' طبلوں کی تھاپ گھنگھروؤں کی جھنکاریں ابھرتی ہوئی بادشاہی مسجد کے بیرونی گیٹ تک جا رہی ہیں۔

رات کو گیٹ کا ضمنی دروازہ کھلا رہتا ہے تاکہ عبادت گزار کسی وقت بھی اندر جا ں۔ گیٹ کا باقی حصہ بند رکھا جاتا ہے تاکہ کتے اندر نہ جا سکیں۔ جب سے یہ بادشاہی ید تعمیر کی گئی ہے تب سے نجس جانوروں کو اندر جانے سے روکنے کے مکمل انتظامات کر یے گئے ہیں لیکن مجرے کی آوازوں اور گھنگھروؤں کی جھنکار کو آج تک روکا نہ جا سکا۔ بٹ کے اندر جا کر مسجد کے سامنے بارہ دری میں بیٹھ کر مجرے کے سُر تال سنے جا سکتے ہا۔

سُر تال کا یہ سلسلہ رات کے ایک بجے تک چلے گا کیونکہ قانون کی طرف سے رف ایک بجے رات تک مجرے کا لائسنس دیا گیا ہے۔ طوائفوں کی انجمن کی طرف سے رخواست دی گئی ہے کہ ۳۱ دسمبر کی رات بیسویں صدی کی آخری آدھی اور اکیسویں صدی کی پہلی آدھی رات ہے۔ لہٰذا نئی صدی کے استقبال کے لئے تمام رات' صبح ہونے ک مجرے کی اجازت دی جائے۔

علمائے کرام اور دینی تنظیموں نے مسلمانانِ پاکستان کو ہدایت کی ہے کہ وہ ۳۱ دسمبر کی ہم رات عبادت کرتے ہوئے نئی صدی کا استقبال کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے فرمان پر اور آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت پر عمل جاری رہے گا تو ہارے ملک سے پچھلی صدی کے دلدر دور ہو جائیں گے اور نئی صدی میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں گی۔

جو مسلمان ہیں' وہ تو عبادت کریں گے۔ ضرور عبادت کریں گے کیونکہ ان کا دل خود بخود انہیں اپنے اللہ اور رسول کی طرف لے جاتا ہے۔

وہ بھی تو مسلمان ہیں جو سیاستداں ہیں۔ جاگیردار اور سرمایہ دار سیاستداں' جو اقتدار ں نہ ہوں تو مجرا سننے کوٹھوں پر آتے ہیں اور اگر اقتدار میں ہوں تو ہیرامنڈی کی تمام

طوائفوں کو اپنے اپنے ٹھکانوں پر بلا لیتے ہیں۔ اب معاملہ یہ ہے کہ پورے ملک کی طوائفوں کی انجمنوں کی درخواستیں متعلقہ حکام تک پہنچ گئی ہیں اور وہ انہیں نامنظور نہیں کریں گے کیونکہ انہیں منظور کرانے کے لیے بڑی بڑی اونچی اونچی سفارشیں آچکی ہیں۔ یہ سفارشیں کرنے والے موجودہ صدی کی آخری رات کو موج میلہ کرتے ہوئے نئی صدی کی صبح کرنا چاہتے ہیں۔

حکام کو اپنی من مانی کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا لیکن طوائفوں کی درخواست کو منظور کرنے کے سلسلے میں علماء آڑے آرہے ہیں۔ یہ اعلان ہو چکا ہے کہ اس رات تمام مساجد میں عبادت کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگ کر ملک کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کی دعائیں مانگی جائیں گی۔

چند عیاش فطرت حکام جھنجلائے ہوئے ہیں کہ لاہور کی تاریخی شاہی مسجد، ہیرا منڈی کے پڑوس میں کیوں ہے؟ انہیں پتا نہیں کہ وہاں پہلے مسجد تعمیر کی گئی تھی یا پہلے ہیرامنڈی کو آباد کیا گیا تھا؟ ویسے جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ صدیوں سے دونوں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ ہیں۔ جیسے پاکستان کے پڑوس میں بھارت ہے۔ اب اگر درخواستیں منظور کی جائیں گی تو بھارت سے مجرے کے اگنی اور پرتھوی میزائل داغے جائیں گے اور عبادت میں مرکوز رہنے والی توجہ اور ساعتوں پر دھماکے کیے جائیں گے۔

دینی جماعتیں جلسے جلوس کر رہی ہیں۔ حکومت کو الٹی میٹم دے رہی ہیں کہ عبادت کی رات اگر مجرے بند نہ کیے گئے تو پوری ہیرا منڈی کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا لیکن دھمکیاں دینے والی دینی جماعتیں یہ بھول رہی ہیں کہ خدانخواستہ مساجد پر بھی حملے ہو سکتے ہیں۔ یہ ایسی کالی صدی ہے کہ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں کئی بار مساجد میں بم کے دھماکے ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اس شہر میں عجیب کشیدگی کا عالم ہے۔ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ اس صدی کے آخری دن اور آخری رات کیا قیامت گزرنے والی ہے۔

ویسے ابھی مجرا جاری ہے۔ باہر سڑکوں اور گلیوں میں مسلح پولیس والوں کا سخت پہرا ہے تاکہ پُرجوش مسلمان وہاں مجرا سننے والے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی جان و مال کو اور اُن کی لاکھوں روپے کی گاڑیوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

ایسے وقت شاہی مسجد کے سامنے بارہ دری میں میرا ہمزاد بیٹھا ہوا ہے۔ یعنی کہ میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے کان دور سے آنے والی گھنگھروؤں کی جھنکاروں کو سن رہے ہیں۔ ان تاریخوں میں لاہور کی سردی اتنی شدید ہوتی ہے کہ باہر گھومنے والوں کی قلفی جم جاتی ہے۔ میں کھلی بارہ دری میں شوق سے نہیں بیٹھا ہوں۔ در اصل عشاء کی نماز پڑھنے کے

سجد سے نکل کر بارہ دری والے احاطے سے باہر جانا چاہتا تھا۔ تب پولیس والوں نے ے نمازیوں کے ساتھ مجھے بھی روک دیا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ہم تمام نمازی گیٹ نکل کر ہیرامنڈی کو بند کرانے کے لیے ہنگامے کریں گے۔

ہم نے یقین دلایا کہ ہم پُرامن نمازی ہیں۔ قانون کو ہاتھوں میں نہیں لیں گے لیکن رات خاص طور پر بڑے لوگوں نے پابندیاں عائد کرا دی ہیں۔ ہیرامنڈی کو عام گاہ نہیں رہنے دیا ہے۔ صرف کار والے ہی ادھر جا سکتے ہیں۔ تمام نمازی مجبور ہو کر گیٹ سے باہر چلے گئے ہیں، جو "یادگارِ پاکستان" کی طرف کھلتا ہے۔ صرف میں وہاں رہ ہوں۔

میں یہ بتادوں کہ میں باقاعدہ نمازی نہیں ہوں۔ اپنی کہانیوں میں دینِ اسلام کو صحیح مل طور سے پیش کرنے کے لیے قرآن حکیم اور دیگر دینی کتب کا مطالعہ کرتا رہتا ں اس بار یہ عہد کیا تھا کہ بیسویں صدی کی آخری دو راتیں مسجد میں گزاروں گا۔ ۳۰ دسمبر کی رات صرف عشاء کی نماز پڑھوں گا اور ۳۱ دسمبر کی تمام رات مسجد میں رہ عبادت کروں گا۔

جب باہر جانے کی اجازت نہیں ملی تو میں نے مسجد میں جا کر رات گزرنے کا ارادہ لیکن مسجد کی سیڑھیوں پر چند مسلح سپاہی آگئے ہیں۔ ایک افسر کہتا ہے۔ "نماز کا وقت ہو چکا ہے۔ یہاں آج اور کل رات نمازیوں کو یکجا ہونے اور جلسے جلوس کی اجازت ہے۔"

میں کہتا ہوں۔ "جناب میں کوئی جلوس نہیں ہوں۔ تنہا آدمی ہوں۔"

"کچھ بھی ہو۔ اپنے گھر جاؤ۔"

"یہاں میرا گھر نہیں ہے۔ میں کراچی سے آیا ہوں۔ میرا قیام ایک ہوٹل میں ہے۔"

"تو پھر ہوٹل میں جاؤ۔"

"جناب! آپ مسلمان ہو کر ہوٹل میں جانے کو کہہ رہے ہیں اور مسجد میں جانے روک رہے ہیں۔ جبکہ میرے پیچھے کوئی جلوس نہیں ہے۔"

"تم سے اندیشہ نہیں ہے۔ اس لیے سیڑھیوں پر نظر آرہے ہو، ورنہ یہاں سے بھگا ئے جاتے۔"

میں احتجاجاً بارہ دری میں آکر بیٹھ گیا ہوں۔ اگرچہ گرم کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اس باوجود سرد ہوائیں ہڈیوں میں اتر رہی ہیں لیکن اس غم و غصے سے لہو گرم ہو رہا ہے کہ

میں ایک اسلامی ملک میں ہوں اور مجھے مسجد میں جانے سے روکا جارہا ہے۔

جب مجھ سے ظلم اور ناانصافی برداشت نہیں ہوتی ہے تو میں برداشت کرنے اور خو کو پُرسکون رکھنے کے لیے آنکھیں بند کرلیتا ہوں اور خود کو سمجھاتا ہوں کہ خداوند کر نے مجھے ظالموں کے خلاف قلمی جہاد جاری رکھنے کے قابل بنایا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا میرے اندر کہانیاں لکھنے کے لیے مواد اور تحریک پیدا کر رہا ہے۔

پتا نہیں میں کتنی دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ پھر کسی کی شفقت بھر آواز سنائی دیتی ہے۔ "اسلام علیکم۔" میں وعلیکم اسلام کہتا ہوا آنکھیں کھولتا ہوں۔ پ چونک کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ میرے سامنے ایک ایسا اجنبی کھڑا ہوا ہے' جو اجنبی ہونے باوجود شناسا ہے۔

اگرچہ رات اندھیری ہے لیکن حفاظتی انتظامات کے لیے مسجد اور قلعے کی فوکس لائٹ کو آن رکھا گیا ہے۔ وہ روشنی بارہ دری کے اندر بھی کسی حد تک پہنچ رہی ہے او وہ اجنبی شناسا بڑی حد تک واضح طور سے نظر آرہا ہے۔

جب میں علامہ اقبال کی تصویر دیکھتا ہوں تو میرا ذہن انہیں شاعرِ مشرق نہیں کہتا میرا عقیدہ انہیں محدود نہیں کرتا کیونکہ اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ صرف مشرق کے ل نہیں بلکہ مغرب' شمال' جنوب اور تمام دنیائے اسلام کے لیے ہے۔ اُن کے شاہین قوتِ ارادی اور بلند پروازی دنیا کے ہر مسلمان کے لیے درس ہے جو سمندر ہو اور مسلمان کے اندر موجیں مار رہا ہو' اس کا کوئی کنارا نہیں ہو سکتا۔ اس کی کوئی حد مق نہیں کی جا سکتی۔ وہ ہمارے خوشۂ گندم کے ایک ایک دانے میں ہی نہیں' ہمارے ایٹ پلانٹ کے اندر بھی جاری و ساری ہے۔

جس شخصیت سے میرے دل و دماغ اس قدر متاثر ہوں' اسے رُوبرو دیکھ کر میرا حال ہوا۔ یہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہو رہا تھا۔ "آ......... آپ جناب! آپ کون ہیں؟"

وہ جواباً فرماتے ہیں۔ "میں وہی ہوں جسے ہے حکم اذاں لاالہ الا اللہ........."

"آ......... آپ ہُوبہو ویسے ہی ہیں۔ آپ کا اسم گرامی؟"

"محمد اقبال۔ شاعر محمد اقبال۔ پاکستان کے بنیادی پتھروں میں سے ایک اقبال........."

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں مانتا ہوں کہ اس ملک کا ایک ایک بچہ آپ کو دیکھ ہی علامہ اقبال کہے گا۔ خود میرا دل یہی کہہ رہا ہے۔ مگر دل جذباتی ہوتا ہے اور عقل

سمجھاتی ہے کہ اس دنیا سے جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔"

"میں بھی واپس نہ آتا لیکن یہ تو ایک دنیا جانتی ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ جو ات اور کردار گزر جاتے ہیں' وہ کبھی اعمال کی سزا اور جزا کے طور پر خود کو دہراتے گزرے ہوئے لوگ واپس نہیں آتے۔ لیکن اُن کے نیک مقاصد جو رہ جاتے ہیں' تکمیل کے لیے پھر کوئی اقبال آتا ہے۔"

"جی ہاں۔ آپ کی یہ باتیں سمجھ میں آرہی ہیں۔ آپ ہمارے علامہ کے ہم نام اور شکل ہیں۔ آپ کے چہرے سے جو نور اور دانش عیاں ہے' اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے ہماری سیاسی اور سماجی بیماریوں کا علاج کرنے والا مسیحا آگیا ہے۔"

"کیا ہماری قوم کسی اچانک آنے والے مسیحا کی محتاج ہے؟"

"ہاں' ترپن برس گزر چکے ہیں لیکن ایک محتاط سروے کے مطابق ڈھائی ہزار افراد ایک اسپتال کا بستر ہے۔ ساڑھے تین ہزار افراد کے لیے ایک ڈاکٹر اور سات ہزار افراد لیے ایک نرس میسّر ہوتی ہے۔ یہ حساب عام جسمانی بیماریوں کے سلسلے میں ہے۔ ای' سماجی اور اخلاقی بیماروں کا ایک بھی مسیحا نہیں ہے۔"

وہ میری باتیں سن کر کہتے ہیں۔ "تمہاری باتوں سے مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے۔ کیا منفی سوچ رکھنے والے شخص ہو؟ کیا تمہیں میری پاکستانی قوم سے اختلاف ہے؟ میں ہاری یہ رپورٹ کبھی درست تسلیم نہیں کر سکتا کہ میرے پاکستان کے مسلمان اس قدر ت اور محتاج ہو گئے ہیں۔"

"جناب! سانچ کو کیا آنچ؟ وہ دیکھیں' مسجد کی سیڑھیوں پر مسلح سپاہی موجود ہیں۔ یرے ساتھ تشریف لے چلیں اور یہ افسوسناک تماشا دیکھ لیں کہ ہمیں مسجد کے اندر انے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

وہ میرے ساتھ بارہ دری سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف چلتے ہیں۔ اسی وقت ایک حت افسر للکار کر مجھ سے کہتا ہے "اے! پہلے تم اکیلے آئے تھے۔ اب کس کو ساتھ لا ہے ہو۔ کیا اسی طرح تعداد بڑھاتے بڑھاتے جلوس کی صورت میں آنا چاہتے ہو؟"

حضرت اقبال صاحب فرماتے ہیں۔ "مسجد اسی لیے تعمیر کی جاتی ہے کہ یہاں زیادہ ے زیادہ مسلمان آئیں۔ عبادت کریں اور عبادت سے فارغ ہو کر ایک دوسرے کے سائل سنیں اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں۔"

ایک افسر نے کہا۔ "بزرگو! فی الحال مسلمان نمازیوں کا نہیں بلکہ یہ حکومت کا مسئلہ ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ صرف نماز کے اوقات میں یہاں دو دو یا تین تین نمازیوں کو

آنے کی اجازت دی جائے۔ مسجد کے باہر چار نمازی یکجا نہ ہوں۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گ ہے۔ مسجد کے اندر بے شک ہزاروں کی تعداد میں نمازی عبادت میں مصروف رہیں لیک کسی کو دین کی آڑ میں موجودہ حالات پر سیاسی تقریر کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔"

بزرگ نے فرمایا "مسجد کے اندر جو بات کی جائے یا تقریر کی جائے' وہ تقریر خلاف دین نہیں ہو سکتی۔ مسجد کی چار دیواری سے کبھی منفی تحریک نہیں ابھرتی۔ کیا تم تمام سپا مسلمان نہیں ہو؟"

"بے شک ہم مسلمان ہیں لیکن ہمیں حکم دینے والے بھی مسلمان ہیں۔"

"لیکن ایسا حکم تو شاید غیر مسلم ممالک میں بھی نہیں دیا جاتا۔ میں نے اسلامی مملکت کا خواب اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ یہاں نمازیوں اور مسجدوں کے درمیان قانون ک دیواریں کھڑی کی جائیں۔ کیا یہاں شریعت کے مطابق اسلامی قوانین پر عمل نہیں ہو ہے؟"

وہ باتوں کے دوران دو چار سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہیں۔ اُن کے چہرے پ روشنی پڑتی ہے۔ پولیس افسران اور تمام سپاہی حیرانی سے انہیں دیکھتے ہیں۔ پھر مزار اقبا کی جانب یوں دیکھتے ہیں جیسے گزری ہوئی اذان لا الہ الا اللہ کی بازگشت کو سُن رہے ہوں۔ پھر ایک افسر ایک زینہ اتر کر پوچھتا ہے "تم کون ہو؟"

وہ جواباً پوچھتے ہیں۔ "کیا میرے وطن کے پولیس والے بزرگوں کو تم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں؟"

میں جھجکتے سے کہتا ہوں "آپ برداشت کرلیں۔ ورنہ یہ ماں بہن کی شرمناک گالیا بھی دیتے ہیں اور یہ گالیاں انہوں نے اسمبلیوں میں ہونے والے اجلاس سے سیکھی ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسمبلی وہ ادارہ ہے' جہاں عوام کے مسائل حل کیے جاتے ہیں' اسلامی تہذیب' شائستگی اور ڈسپلن کو برقرار رکھا جاتا ہے۔"

"جناب! آپ بات بات پر میرا پاکستان اور میرا وطن کہتے ہیں لیکن باتیں ایسی کرتے ہیں جیسے اپنے وطن کے بدترین حالات سے واقف نہ ہوں۔ کیا آپ ایک طویل مدت کے بعد یہاں آئے ہیں؟"

وہ تائید میں سرہلا کر کہتے ہیں۔ "ہاں بات کچھ ایسی ہی ہے۔ میں اپنے آپ سے اور اپنے وطن سے غافل رہا۔ تمہاری باتوں سے اور پولیس والوں کے رویے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں پاکستان کا خواب دیکھ کر سو گیا تھا۔ آنکھ کھلی ہے تو وہ اب تک ایک خواب

ہے۔ کاش میں بیرسٹر جناح سے پوچھ سکتا کہ ہمیں ایک مقدس خواب کی تعبیر کیوں یں ملی؟"

ایسے ہی وقت اس گیٹ کا دروازہ کھلتا ہے' جو بازارِ حُسن کی طرف ہے۔ اس گیٹ ے ایک ڈی آئی جی' چار سپاہی اور مختلف اخبارات کے چھ صحافی اور فوٹو گرافر مسجد کی مت جاتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے افسران اور سپاہی ایڑیاں بجا کر یلوٹ کرتے ہیں۔ ڈی آئی جی ہمیں دیکھ کر پوچھتا ہے۔ "یہ دونوں کون ہیں؟ اتنی رات و یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

اجنبی اقبال آنے والوں کو دیکھنے کے لئے گھومتے ہیں۔ دوسری طرف کی فوکس ائٹ انہیں نمایاں کرتی ہے۔ تمام آنے والے انہیں دیکھتے ہی ٹھٹک جاتے ہیں۔ علامہ قبال کی ایک مخصوص تصویر' جو برسوں سے شائع ہوتی رہی ہے' وہ اجنبی اُس تصویر سے تنی مماثلت رکھتا ہے کہ تصویر میں اور اِس میں بال برابر فرق نظر نہیں آ رہا ہے۔ ایک شال ان کے شانوں پر پڑی ہوئی ہے۔

ایسی مماثلت دیکھتے ہی اخباری فوٹو گرافران کی تصویریں مختلف زاویوں سے اتارنے لگتے ہیں۔ فلیش لائٹس جلنے بجھنے لگتی ہیں۔ ڈی آئی جی قریب آ کر پوچھتا ہے۔ "تم کون ہو؟"

"کیا تم اپنے خاندان کے بزرگوں کو اور اپنے باپ کو بھی تم کہا کرتے ہو؟"

ڈی آئی اپنے عہدے اور وردی کے رعب اور دبدبے سے کہتے ہیں۔ "یوشٹ اپ! میرے سوال کا جواب دو۔"

ایک بزرگ صحافی آگے بڑھ کر کہتے ہیں۔ "ڈی آئی جی صاحب! جو بات معقول ہو' اس کے جواب میں آپ کا ردِ عمل بھی معقول ہونا چاہیئے۔"

پھر وہ علامہ اقبال سے مصافحہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "میں ایک آزاد صحافی ہوں۔ کسی خاص اخبار سے منسلک نہیں ہوں اور نہ ہی کسی حکومت کا پابند رہتا ہوں۔ میرا نام ملک مبارک حسین ہے۔"

وہ اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ "میں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ پوری قوم مجھے جانتی ہے۔ آپ حضرات بھی مجھے دیکھ کر چونک رہے ہیں اور حیران ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ میں وہ اقبال ہوں' جسے آپ حکیم الامت اور علامہ کہتے ہیں۔"

دوسرے صحافی نے کہا۔ "آپ بزرگ ہیں۔ محترم ہیں۔ ہمارے علامہ اقبال کے ہم

شکل ہیں لیکن دنیا کا کوئی ذی فہم آپ کو علامہ تسلیم نہیں کرے گا۔ آپ اپنے بارے میں کچھ چھپا رہے ہیں اور پولیس والوں کو شبہ کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

"مجھے نہ پہچاننے والوں کی عقل پر شبہ کرنا چاہئے۔ تمہاری عقل کو کم از کم یہ تو تسلیم کرنا چاہئے کہ ہر مسلمان کو اقبال اور جناح بنانے کے لئے پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ میں علامہ نہ سہی' ایک عام پاکستانی اقبال تو ہو سکتا ہوں۔"

صحافی ملک مبارک حسین نے کہا۔ "بے شک ہم علامہ سے محبت اور عقیدت میں اپنی اولاد کا نام اقبال رکھتے ہیں یعنی کہ انسان ہم نام بناتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہم شکل بناتا ہے۔ آپ ان کے ہم نام بھی ہیں اور ہم شکل بھی۔ ہم آپ کو سلام کرتے ہیں۔"

تمام صحافیوں نے انہیں سلام کیا۔ ایک نے کہا۔ "ہم یہ دیکھنے آئے تھے کہ انتظامیہ نے امن و امان قائم رکھنے کے لئے کیسے انتظامات کئے ہیں لیکن ہم یہاں خدا کی قدرت دیکھ رہے ہیں۔"

ملک مبارک حسین نے کہا۔ "جناب اقبال صاحب! ہماری گزارش ہے کہ ہمارے ساتھ چلیں۔"

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"ہم آپ سے کچھ باتیں کریں گے۔ پھر آپ جہاں کہیں گے' وہاں آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔"

"کیا آپ اپنی اہم گفتگو کے بعد مجھے کراچی پہنچا دیں گے؟"

"کیا آپ کراچی سے آئے ہیں؟"

"نہیں۔ میرا گھر اور میرا خاندان اسی شہر میں ہے۔ آپ حضرات کی طرح وہ بھی میری عزت کریں گے لیکن مجھے اپنے خاندان کے بزرگ تسلیم نہیں کریں گے۔ کبھی میری وفات سے انہیں بہت صدمہ پہنچا تھا۔ وہی نام' وہی شباہت دیکھ کر اُن کے صدمات پھر سے تازہ ہو جائیں گے۔ میں ان کی بھیگی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھ سکوں گا۔"

میں کہتا ہوں۔ "آپ کی گفتگو سن کر ایسا ہی لگتا ہے جیسے آپ غلط نہیں کہہ رہے ہیں' ہم غلط سمجھ رہے ہیں لیکن ہر معاملہ عقل سے سمجھا اور پرکھا جاتا ہے اور عقل کہتی ہے کہ ہم آپ جیسے سنجیدہ بزرگ سے بحث نہ کریں اور آپ کے ساتھ عزت اور احترام سے پیش آتے رہیں۔ ویسے میں بھی کراچی کا رہنے والا ہوں۔ آپ وہاں کہاں جائیں گے؟"

"میں اُس عظیم ہستی کے مزار پر جا کر پھولوں کی چادر چڑھاؤں گا جس نے میرے

خواب کو تعبیر دی اور یہ پاکستان بنایا۔"

ایک صحافی کہہ رہا ہے۔ "کل بیسویں صدی کا آخری دن ہو گا۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں قائداعظم کو پھولوں کا نذرانہ پیش کرنا چاہئے۔"

بزرگ اقبال پوچھتے ہیں۔ "کیا اکیسویں صدی شروع ہونے والی ہے؟"

"جی ہاں۔ پوری دنیا.......... بڑی مسرتوں اور جوش و خروش سے اکیسویں صدی کی منتظر ہے۔ پاکستان میں بھی جشن منانے کی ابتدا ہو چکی ہے۔"

بزرگ انگلیوں پر حساب کرنے کے بعد پوچھ رہے ہیں۔ "یعنی کہ تیرہویں صدی ہجری ختم ہو چکی ہے اور چودہویں صدی ہجری چل رہی ہے۔"

"جی ہاں۔ تقریباً بیس برس پہلے چودھویں صدی ہجری کا آغاز ہُوا تھا۔"

"کیا چودہویں صدی ہجری کے آغاز میں مسلمانوں نے جشن منایا تھا؟ کیا اپنی اور پاکستان کی سلامتی کی دعائیں مانگی تھیں؟"

"جی نہیں۔ بارہ کروڑ پاکستانیوں میں سے چند لاکھ افراد کو بھی شاید ہی معلوم ہوا ہو گا کہ تیرہویں صدی ہجری کب گزری اور چودہویں صدی ہجری کب آئی؟"

"یا خدا! یہ میں کیا سن رہا ہوں' پاکستان کی آبادی بارہ کروڑ ہو چکی ہے۔"

"یہ ہم دس برس پہلے کی بات کر رہے ہیں۔ اب تو شاید بیس کروڑ سے زیادہ ہے۔ شاید کا لفظ اس لئے اِستعمال کر رہے ہیں کہ پچھلے کئی برسوں سے مردم شماری نہیں کی گئی ہے۔"

بزرگ پوچھ رہے ہیں۔ "کیا ہم نے اس لئے پاکستان بنایا تھا کہ یہاں کے مسلمان ہجری تقویم یعنی اسلامی پیمانۂ وقت کو بھول جائیں اور عیسوی سلسلے کے حساب سے اکیسویں صدی کی آمد کا جشن منائیں؟ کیا عیسائیوں کی تقلید کرنے سے ۲۰۰۱ء کا آغاز ہوتے ہی عیسائی ممالک' مسلمانوں کو پھولوں کے اور نوٹوں کے ہار پہنائیں گے؟"

وہ بزرگ ایسا نکتہ بیان کرتے وقت سو فیصد علامہ اقبال لگ رہے۔ وہ فرما رہے ہیں۔ "اگر چودہویں صدی ہجری کے آغاز میں تمام پاکستانی اپنا محاسبہ کرتے اور تمام پاکستان اپنا قبلہ درست کر لیتے تو آج بیس برس کے عرصے میں ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہو جاتے اور اکیسویں صدی کے آغاز میں ساری دنیا' پاکستانیوں کے بلند وقار اور عزم و ہمت کو تسلیم کر لیتی۔ مجھے کوئی بتائے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟"

صحافی ملک مبارک حسین کہتے ہیں۔ "ہم قلم کار ہیں' صحافی ہیں اور دانشور بھی کہلاتے ہیں۔ صرف کہلاتے ہیں کیونکہ دانشوری کو کام میں لانے کی کوئی راہ اب تک

نہیں ملی لیکن آج آپ کو دیکھ کر راستہ سجھائی دے رہا ہے۔ اِس ملک میں جتنے خود غرض سیاستدان اور بااختیار لوگ بے لگام ہو چکے ہیں' اُن پر لگام ڈالنے کے لئے آپ ہمیں مل گئے ہیں۔"

وہ فرماتے ہیں۔ "آپ نے بے لگام کا لفظ درست استعمال کیا ہے۔ آدمی ہو یا گھوڑا' اگر وہ بے لگام رہے تو اندھا دھند دوڑتا ہوا کسی دلدل میں خود کو گراتا ہے اور اپنی پشت پر سوار ہونے والوں کو بھی اسی دلدل میں دھنسا دیتا ہے۔"

"آپ سے گزارش کہ ہمارے ساتھ پریس کلب چلیں۔ اب تو اخبارات چھپ رہے ہوں گے۔ پھر بھی کل صبح ایک زبردست دھماکہ کرنے کے لئے ہم خصوصی ضمیمہ شائع کریں گے۔"

ڈی آئی جی مسکرا کر کہتا ہے۔ "جناب مبارک! آپ اس ملک کے ایک نہایت ہی بے باک صحافی ہیں۔ آپ بڑی دانشمندی کی باتیں کرتے ہیں لیکن معاف کیجئے گا' علامہ اقبال صاحب کی اس نقل کو بے جا کر نادانی کر رہے ہیں۔ نقل آخر نقل ہی ہوتی ہے۔ کیا آپ اسے اصل بنا کر پیش کرنے کی غلطی کریں گے۔"

مبارک صاحب کوئی جواب نہیں دیتے ہیں۔ اُن بزرگ اقبال اور صحافی ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے جاتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔

ہم چالیس منٹ کے بعد پریس کلب پہنچتے ہیں۔ وہاں چند رپورٹر اور فوٹو گرافر وغیرہ موجود ہیں۔ وہ بزرگ کو حیرانی سے دیکھتے ہیں۔ مبارک صاحب اور ان کے ساتھی فون کے ذریعے دوسرے صحافی ساتھیوں اور اخبارات کے مالکان کو پریس کلب میں علامہ اقبال کی موجودگی کی اطلاع دیتے ہیں اور انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ اس سلسلے میں ایک ضمیمہ شائع کرنے کا انتظام کیا جائے۔

ایسے ہی وقت کراچی کے چند صحافی ٹیلیفون اور فیکس وغیرہ کے ذریعے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ایک فوجی افسر قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ کراچی پریس کلب میں موجود ہے اور وہ سب اس سلسلے میں ایک ضمیمہ شائع کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں لاہور کے صحافیوں کا تعاون ضروری ہے۔

کراچی والے اپنی دانست میں ایک چونکا دینے والی اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ لاہور والے جواباً علامہ اقبال کی موجودگی کی چونکا دینے والی اطلاع دیتے ہیں۔ پھر دونوں طرف سے مسلسل رابطے کے ذریعے یہ طے کیا جاتا ہے کہ ضمیمہ دونوں شہروں سے شائع کیا جائے گا اور اس میں کیسے کیسے انکشافات کئے جائیں گے۔

اِدھر سے مسٹر جناح اور اُدھر سے علامہ صاحب ہنگامی پریس کانفرنس میں کہتے ہیں۔

"آپ حضرات کے ارادے نیک ہیں۔ ہم ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں مگر ہمارے لئے دو باتیں اہم ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ایک شاعر اور ایک سیاستداں فون پر ایک دوسرے سے گفتگو کریں گے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں پچھلے ترپن برس کے پاکستان کے تمام سیاسی نشیب و فراز سے آگاہ کیا جائے۔"

طویل عرصے کے سیاسی حالات سے واقف ہونے کے لئے پریس کلب کی لائبریری میں بڑی مکمل اور جامع کتابیں ہیں پھر اُن کے سامنے فون لا کر رکھا جاتا ہے اور نمبر ڈائل کرنے کے بعد دونوں کا آپس میں رابطہ کرایا جاتا ہے۔ یوں جیسے صدیاں گزر جانے کے بعد دونوں عظیم راہنما ایک دوسرے کی آواز سنتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں۔ "اے میرے ہم مزاج' میرے برادر! میں آپ سے ہم کلام ہونے کی مسرتوں سے سرشار ہو رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہیں۔ "اے میرے ہم نوا! میرے ناقابلِ شکست قانون داں! میں نے جو خواب دیکھا' آپ نے اس کی تعبیر دی۔ میں آج اسی پاکستان میں ہوں۔ مگر آہ! یہ کیسا پاکستان ہے۔ میں نے ابھی اس کی ہلکی سی جھلک دیکھی ہے اور خداوند کریم سے دعا مانگ رہا ہوں کہ جتنی بدحالی اور لاقانونیت دیکھی ہے' اس سے زیادہ نہ دیکھوں۔ ورنہ پہلے طبعی موت آئی تھی اب دکھ اور شرم سے مر جاؤں گا۔"

"میں نے پرانی نمائش کے پاس اپنا مقبرہ دیکھا ہے۔ پتا نہیں اس مقبرے پر کتنے کروڑ روپے خرچ کئے گئے ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ پورا ایک پاکستان بننے میں اتنی رقم خرچ نہیں ہوئی ہوگی کیونکہ ان دنوں پاکستان اسٹیٹ بینک نہیں تھا اور نہ ہی ملکی خزانہ تھا۔ پاکستان بنانے والے مسلمانوں نے اپنے گھر بیچ کر' اپنی گھر والیوں کے زیورات بیچ کر اس ملک کو قائم کیا تھا اور یہ ملک جو پوری ایک قوم کا گھر ہے۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازے سیاستدانوں نے بیچ دیئے ہیں بیوروکریسی نے دیواروں میں کتنے ہی شگاف ڈال دیئے ہیں اور اس گھر کی چھت امریکا لے گیا ہے۔"

علامہ کہتے ہیں۔ "یہ تو غنیمت ہے کہ اِس کی بنیاد اسلامی تھی۔ ورنہ سیاسی نوسرباز اس قوم کے نیچے سے زمین بھی کھسکا دیتے۔"

"اب ہم آ گئے ہیں۔ جو لوگ ہمارے گھر کو کھنڈر میں بدل رہے ہیں ہم ان سے گھر کی ایک ایک اینٹ کا حساب لیں گے۔"

"بے شک۔ ہم تخریب کار سیاستدانوں کا محاسبہ کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ

سے ملاقات کرنے کراچی آؤں۔ پھر ہم اسلام آباد جائیں گے۔"

"محترم! آپ بزرگ ہیں۔ مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے۔ یہاں میرے ساتھ ایک مصنف ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ آپ کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھانے کل لاہور جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ بھی میری طرح اس ملک میں مجسم موجود ہیں۔"

"یہ ہمارے جذبات اور عقیدت ہے کہ ہم ایک دوسرے کی عزت اور قدر کرتے ہیں لیکن اب سامنے بہت بڑا سیاسی چیلنج ہے۔ اس سے نمٹنے کے لئے میں آپ کے پاس آؤں گا پھر ہم دونوں ٹرین کے ذریعے کراچی سے پشاور تک جائیں گے پھر واپس اسلام آباد پہنچیں گے۔ اس طویل سفر کے دوران ہم خوابیدہ قوم کو جھنجھوڑتے ہوئے اور ان کے اندر ایک نیا ترقی پذیر پاکستان بنانے کا عزم پیدا کرتے جائیں گے۔"

یہ طے ہو گیا کہ کل جو ضمیمہ شائع ہو گا اس کا سیاسی اور عوامی ردِعمل دیکھنے کے بعد وہ دونوں راہنما ایک تعمیری اور مستحکم لائحہ عمل تیار کریں گے پھر اس پر باقاعدہ عمل کریں گے۔

☆========☆========☆

اکیسویں صدی کے شروع ہونے کے ایک دن پہلے ہی سے ساری دنیا میں جشن منایا جا رہا تھا۔ ہر ملک کے اخبارات و رسائل بڑے فخر سے اپنی پچھلی صدی کے کارنامے شائع کر رہے تھے اور نئی صدی میں اپنے اپنے ملک کے ذہین ترین سائنس دانوں کے ذریعے ستاروں پر کمند ڈالنے کے دعوے کر رہے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اکیسویں صدی کے انسانوں نے اپنی ذہانتوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ آدمی چاند پر پہنچ گیا۔ سیٹلائیٹ کے ذریعے پلک جھپکتے ہی ایک ملک کی تصویری خبریں دوسرے ملکوں میں پہنچانے لگا۔ زمین کی تہہ میں چھپے ہوئے خزانے باہر نکالنے لگا۔ ایکسرے کے ذریعے انسانوں اور تجوریوں کے اندر پہنچ گیا۔ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے بچوں کی پیدائش سے پہلے ماؤں کی کوکھ سے معلوم کرنے لگا کہ بیٹی ہو گی یا بیٹا ہو گا؟

ایٹم بم' اور ہائیڈروجن بم تو بچگانہ کھیل بن گئے۔ دنیا کے نقشے میں ناخن برابر ننھے سے ملک اسرائیل نے ڈھائی سو ایٹم بم بنا لئے۔ اپنے عوام کو ننگا بھوکا رکھ کر پڑوسی ملک بھارت نے ایٹم بم' ہائیڈروجن بم اور بے شمار ایٹمی میزائل کا ذخیرہ کر لیا۔ تقریباً ہر ملک نے اکیسویں صدی کے آغاز تک کوئی نہ کوئی حیرت انگیز کارنامہ ضرور کیا۔

ایسے وقت سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان نے کون سا تیر مارا ہے؟

بیسویں صدی میں اتنے زیادہ حیرت انگیز کارنامے منظرِ عام پر آ چکے ہیں کہ پاکستان کو اور کوئی نیا چونکا دینے والا کارنامہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ قیامِ پاکستان سے اب تک آتے جاتے رہنے والے سیاستدانوں کو آپس کے جھگڑوں کے باعث اپنے عوام کی بے پناہ ذہانت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

لیکن پاکستان کی طرف سے قدرت نے یہ چونکا دینے والا کمال دکھایا کہ پاکستان کا قیام عمل میں لانے والے دو عظیم راہنما پھر سے مجسم ہو کر آ گئے۔ سائنس نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب کوئی بھی بات عجوبہ نہیں لگتی۔ اب جو بھی خلافِ توقع واقعہ رُونما ہوتا ہے' وہ ناقابلِ یقین نہیں ہوتا۔ دنیا یقین کر لیتی ہے کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے لیکن دو عظیم راہنماؤں کے مجسم ہو کر واپس دنیا میں آنے والی بات کا یقین شاید کوئی نہ کرتا۔

دوسرے دن گیارہ بجے تک بے شمار اخبارات کے ضمیمے شائع ہو کر ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں پہنچ گئے۔ وہ اخبارات زیادہ فروخت ہوتے ہیں' جن میں چونکا دینے والی سنسنی خیز خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اکثر اخبارات کی سرخیاں یہی تھیں۔ "شاعرِ امروز و فردا حضرت علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح ہماری دنیا میں' ہمارے پاکستان میں واپس آ گئے ہیں۔"

علامہ کی تصاویر لاہور کی شاہی مسجد کے پس منظر میں اور کئی موجودہ معروف صحافیوں کے ساتھ شائع کی گئی۔ قائداعظم کی تصاویر ایک اعلیٰ فوجی افسر' فوجی جوانوں اور کئی معروف صحافیوں کے ساتھ شائع کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ پچاس' ساٹھ اور ستر برس پرانی تصاویر نہیں ہیں بلکہ آج کے فوجی افسر اور جوانوں اور آج کے صحافیوں کے ساتھ ہیں اور یہ آج یعنی بیسویں صدی کے آخری دن پاکستان میں موجود ہیں۔

پھر یہ کہ فوجی افسر نے اور دونوں شہروں کے صحافیوں نے فرداً فرداً اپنے تحریری بیان میں کہا تھا کہ وہ سب بہ نفسِ نفیس دونوں عظیم راہنماؤں سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکے ہیں اور انہوں نے ماہرین سے تصدیق کرائی ہے کہ ان کے چہروں پر ماسک یا میک اپ نہیں ہے۔ وہ ان کے اصلی چہرے ہیں۔

ملک کے ایسے معتبر اور مستند افراد کی چشم دید گواہیوں نے تمام چھوٹے بڑے سیاستدانوں کو چونکا دیا۔ ایسے معتبر لوگ............ جھوٹ نہیں کہہ سکتے تھے مگر ان عظیم راہنماؤں کی اس دنیا میں واپسی قطعی ناممکن تھی۔ اس لئے وہ فون کے ذریعے ان صحافیوں سے رابطہ کر رہے تھے' جنہوں نے ان راہنماؤں سے ملاقات کرنے کا تحریری اور

تصویری دعویٰ کیا تھا۔ فوج کے اعلیٰ افسران کراچی کے اس میجر رحیم داد خان سے دریافت کر رہے تھے۔ ”یہ کیا مذاق ہے۔ اتنی عظیم ہستیوں کی نقل پیش کرنے والے صحافیوں کے ساتھ آپ بھی پیش پیش ہیں۔ کیا اس بھونڈے مذاق کو کوئی حقیقت سمجھے گا؟“

میجر رحیم داد خان نے کہا۔ ”جناب! میں بھی حقیقت نہیں سمجھتا ہوں۔ ہم مسلمان ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ مرنے کے بعد قیامت کے ہی دن اعمال کے حساب کے لئے اٹھائے جائیں گے لیکن آپ تمام افسران سے گزارش ہے کہ انہیں بہروپیا نہ سمجھا جائے۔ وہ دونوں قدرتی طور پر ہمارے عظیم راہنماؤں کے ہم شکل ہیں اور ہم نام بھی ہیں۔“

”ہم خدا کی قدرت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ہمارا خالق ہے اور کئی ہم شکل پیدا کر سکتا ہے لیکن نام تو انسان کا اپنا رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ان دونوں نے ہم شکل ہونے کا فائدہ اٹھانے کے لئے نام بھی وہی رکھے ہیں۔“

”جناب! اگر یہ کام بھی وہی کریں جو ہمارے عظیم راہنما ماضی میں کر گئے ہیں تو پھر ہم سب کو اُن کے ہم شکل اور ہم نام ہونے پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ دونوں پھر کوئی نیا پاکستان بنائیں گے یا موجودہ پاکستان کا بگڑا ہوا حلیہ درست کر دیں گے؟“

”اگر ہم فوجی ان سے تعاون کریں تو یہ موجودہ سیاست میں سے ساری غلاظتیں نکال کر پھینک دیں گے۔ آپ ذرا غور فرمائیں، یہ سیاستداں ایک طویل عرصے سے اپنی حکومت کو اسلامی جمہوریت کا نام دیتے آ رہے ہیں لیکن ہم فوجیوں کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر عوام پر حکومت کر رہے ہیں اور ہم محض ملک کی سلامتی اور بقا کے لئے ان حکمرانوں سے تعاون کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”آپ اِن دونوں حضرات کو جی ایچ کیو میں لے آئیں۔ ہم پہلے اِن کی حقیقت معلوم کریں گے پھر غور کریں گے کہ ان حضرات سے ملک کی سلامتی اور بہتری کے لئے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔“

اُدھر اقتدار میں رہنے والوں نے سوچا کہ اپوزیشن نے کوئی بھونڈا سیاسی شوشہ چھوڑا ہے۔ صرف یہ بات پریشان کر رہی ہے کہ مشہور صحافی حضرات کی تصاویر ان عظیم راہنماؤں کے ساتھ شائع ہو گئی تھیں جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ محض شوشہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے گہری چال ہے۔

حکمران مختلف صحافیوں سے رابطہ کر رہے تھے اور اُن سے کہہ رہے تھے کہ اُن

دونوں راہنماؤں سے اُن کی ملاقات کرائی جائے۔ انہیں صحافیوں کی طرف سے جواب مل رہا تھا کہ لاہور میں یادگار پاکستان کے وسیع و عریض سبزہ زار پر ایک بہت بڑا جلسہ ہو گا۔ اس جلسے میں عوام کے سامنے ان راہنماؤں کو پیش کیا جائے گا۔ وہاں حکمران بھی تشریف لا سکتے ہیں۔ یا پھر ایسے بڑے جلسے سے پہلے حکمران اجازت دیں کہ انہیں ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ کے ذریعے پورے ملک کے عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس ٹی وی پروگرام میں تمام حکمران بھی شریک ہو کر ان عظیم راہنماؤں سے طرح طرح کے سوالات کر سکتے ہیں۔

اپوزیشن کے لیڈر چاہتے تھے کہ یادگار پاکستان میں جلسۂ عام ہو تاکہ ان بزرگ راہنماؤں کی موجودگی میں حکمرانوں کی زیادہ سے زیادہ کمزوریاں بیان کرنے کا موقع ملے اور حکمران دباؤ ڈال رہے تھے کہ پہلے ان راہنماؤں سے ان کی خفیہ ملاقات کرائی جائے۔ انہوں نے پولیس، انٹیلی جنس اور انتظامیہ کے شعبے کے مختلف عہدیداروں کو حکم دیا تھا کہ وہ جلد سے جلد ان دو راہنماؤں کے پاس پہنچیں اور انہیں اپنی تحویل میں رکھیں۔ ان دونوں کو کسی سے ملنے نہ دیں۔

حکمرانوں کے مشیروں نے اور نوکر شاہی کے بڑے بڑے ستونوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ان دو ہم شکل راہنماؤں کو نظر بند رکھا جائے۔ اگر انہیں عوام کے سامنے آنے دیا جائے گا تو اپوزیشن والے انہیں سچ مچ علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح بنا کر پیش کریں گے۔ ان کے ذریعے محاسبہ کرائیں گے اور حکمرانوں کی سیاسی پوزیشن کمزور کریں گے۔

لیکن اس مسئلے پر غور کرنے، مشورہ کرنے اور پھر بزرگ راہنماؤں کو نظر بند رکھنے کا فیصلہ کرنے میں وہ دن گزر گیا۔ بیسویں صدی کا آخری سورج ڈوب گیا۔ جب پولیس اور انٹیلی جنس والے، میجر رحیم داد خان اور دونوں شہروں کے صحافیوں کے پاس پہنچے تو پتا چلا دیر ہو چکی ہے۔ دونوں عظیم راہنماؤں کو چارٹر طیاروں کے ذریعے پنڈی پہنچایا گیا۔ پھر وہاں سے انہیں آرمی ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دیا گیا ہے۔

حکمرانوں کے دماغوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ سمجھ میں آیا کہ صرف اپوزیشن والوں نے شوشہ نہیں چھوڑا ہے۔ فوج بھی ان بزرگ راہنماؤں کو اہمیت دے رہی ہے۔ ایک اعلیٰ حکمران نے فون کے ذریعے فوج کے سربراہ سے رابطہ کیا۔ ہیڈ کوارٹر سے جواب ملا کہ بری، بحری اور فضائی افواج کے اعلیٰ افسران ایک اہم اجلاس میں مصروف ہیں۔ شاید دو گھنٹے بعد ان سے گفتگو ہو سکے گی۔

اعلیٰ حکمران نے پوچھا۔ ”کیا علامہ اور قائداعظم کے دو ہم شکل ہیڈ کوارٹر میں ہیں؟“

”جی ہاں۔ اس فوجی اجلاس میں وہ بھی موجود ہیں۔“

خطرے کی گھنٹی کچھ اور زور سے بجنے لگی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے سچ مچ علامہ اور قائداعظم آگئے ہوں اور جی ایچ کیو میں فوجی انہیں گارڈ آف آنر پیش کر رہے ہوں۔

ویسے یہ خیال تسلی دے رہا تھا کہ ذہین اور تجربہ کار فوجی افسران ایسے موجودات کو تسلیم نہیں کریں گے‘ جو عدم کو سدھار چکے ہیں۔ شاید وہ انہیں جی ایچ کیو میں بلا کر عوام سے دور رکھ رہے ہیں کیونکہ عوام ناخواندہ اور جذباتی ہیں۔ اپنے علامہ اور قائداعظم کے ہم شکلوں کو دیکھ کر دھوکا کھائیں گے۔ انہیں پہلے اپنے سروں پر بٹھائیں گے اور پھر اقتدار کی کرسیوں پر بٹھا دیں گے۔

حکومت کے تمام وزراء اور اپوزیشن کے تمام لیڈر اسلام آباد میں منعقد ہونے والی مختلف تقاریب میں شریک ہونے والے تھے۔ رات بارہ بجے کے بعد اکیسویں صدی شروع ہونے والی تھی اور اس سلسلے میں سب ہی جشن منانے والے تھے۔ جشن منانے اور نئی صدی کا استقبال کرنے کے لیے ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔

اب یہ چار گھنٹے حلق میں ہڈی کی طرح اٹک رہے تھے۔ گزر نہیں رہے تھے۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آرمی ہیڈ کوارٹر میں کیسی کھچڑی پکائی جا رہی تھی؟ اگر حکمران جماعت کی حمایت میں کچھ کیا جا رہا ہے تو اعلیٰ حکام کو خفیہ اجلاس سے دور کیوں رکھا جا رہا ہے؟

حکمران اتنے بے لگام اور اتنے بااختیار تھے کہ قانون کو توڑ مروڑ کر اور عدلیہ کو اپنے زیر اثر رکھ کر ملک کو اندھیر نگری بنائے ہوئے تھے۔ کوئی باغی کتنا ہی سرکش ہو‘ اسے سر اٹھاتے ہی کچل دیتے تھے۔ فرعون بھی ایسا بااختیار نہیں رہا ہوگا‘ جیسے وہ تھے۔ بس ایک فوج ایسی تھی‘ جس پر ان کا زور نہیں چلتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے انہیں فوج کا اعتماد حاصل تھا۔ پھر انہوں نے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اور نہایت رازداری سے اپنے سرپرست امریکا کو اپنے ملک کے ایٹمی پلانٹ کا معائنہ کرا دیا۔ انہیں یقین تھا‘ عوام کو کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ انہوں نے اپنے ملک کا ایک اہم راز سرپرست سپرپاور کو بتا دیا ہے مگر خود کو برسرِ اقتدار رکھنے کے لئے انہوں نے جو ملک سے دشمنی کی‘ یہ کم ظرفی پاکستان آرمی سے چھپی نہ رہ سکی۔ ایسے حکمرانوں کو گرفتار کر کے مارشل لا نافذ کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن فوجی اکابرین اقوامِ عالم کو بار بار یہ تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ پاکستان میں اسلامی

جمہوریت قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ وہ ملک کا وقار بلند رکھنے کے لئے حکومت سے تعاون بھی کرتے تھے اور انہیں وارننگ بھی دیتے تھے کہ وہ ضمیر فروشی سے باز آجائیں ورنہ ان کے حق میں برا ہوگا۔

فوج کے لئے مشکل یہ بھی تھی کہ اگر وہ فوجی آپریشن کے ذریعے ایک حکومت کو چلتا کرے گی تو دوسرے بڑے سیاستدان کی جو حکومت قائم ہوگی‘ وہ بھی غریب نواز نہیں ہوگی اور نہ ملکی ترقی‘ خوشحالی اور اقوامِ عالم میں اسلامی جمہوریت کی نیک نامی کے لئے کچھ کرے گی۔ پچھلی نصف صدی سے یہاں لوٹنے کھسوٹنے والے سیاستداں اور حکمراں اپنے منشور اور نعرے بدل بدل کر سامنے آرہے تھے۔

فوج کے اور ملک کے دانشوروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس ملک کا کیا بنے گا؟ کیا پاکستان قائم کرنے والے بے لوث محب وطن سیاستداں پھر پیدا ہوں گے؟ ایسی کوئی توقع نہیں تھی اور اب یہ جو علامہ اور قائداعظم کے ہم شکل آئے تھے۔ انہیں کوئی اصل تسلیم نہ کرتا اور جو نقال ہوتے ہیں‘ ان کی نیک ہدایات بھی بے اثر ہوتی ہیں۔ ایسی کوئی توقع نہیں تھی کہ ان دو راہنماؤں سے کوئی بڑا کام لیا جاتا اور ملک کی تقدیر بدل دی جاتی۔

برسرِ اقتدار پارٹی کا لیڈر اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ اپنے اقتدار کو سلامت رکھنے کا اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ اپنے مائی باپ امریکا کو موجودہ حالات سے آگاہ کیا جائے۔ ویسے پاکستان میں امریکی سفیر نے اور امریکی سی آئی اے نے اپنے حکام تک علامہ اقبال اور قائداعظم والی بات پہنچا دی تھی۔

حکمران پارٹی کے لیڈر نے فون کا ریسیور اٹھا کر پہلے امریکی سفیر سے رابطہ کرنا چاہا تو پتا چلا‘ فون مُردہ پڑا ہے۔ وہ گرج کر سیکرٹری سے بولا۔ ”یہ کیا بدتمیزی ہے............ دوسرا فون لاؤ۔“

اس نے چیک کرنے کے بعد کہا۔ ”جناب عالی! دوسرا فون بھی خاموش پڑا ہے۔ حتیٰ کہ موبائل فون بھی کام نہیں کر رہا ہے۔“

اسی وقت ایک باڈی گارڈ دوڑتا ہوا آیا پھر ادب سے کھڑا ہو کر بولا۔ ”جناب عالی! بُری خبر ہے۔ فوج نے آپ کی رہائش گاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔“

پارٹی لیڈر اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے فوج۔ ے ایسے اقدامات کی توقع نہیں تھی۔ اتنا بڑا پارٹی لیڈر جس کی حفاظت مسلح گارڈز کرتے تھے اور فوجی افسران اسے ملک کے سربراہ کی حیثیت سے سلیوٹ کرتے تھے‘ وہ دیکھتے ہی دیکھتے نہتا ہو گیا تھا۔ ایک عام سا محنت کش پاکستانی جس طرح غیر محفوظ ہوتا ہے‘ اسی طرح وہ اپنے عالیشان محل میں بالکل دو کوڑی کا

ہو گیا تھا۔

ایک فوجی افسر نے اس ہال نما کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "سر! ہم اب بھی آپ کی عزت کرتے ہیں لیکن ملک کی سلامتی کی خاطر آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ اس رہائش گاہ سے باہر قدم نہ نکالیں۔"

پارٹی لیڈر نے پوچھا۔ "لیکن یہ فوجی آپریشن کس لئے ہے؟"

افسر نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "دس منٹ کے بعد ٹی وی سے نو بجے کی خبریں نشر ہوں گی۔ آپ وہ توجہ سے سن لیں۔"

وہ افسر باہر چلا گیا۔ سیکرٹری نے ٹی وی کو آن کیا۔ ٹھیک نو بجے خبریں نشر ہونے لگیں۔ اسکرین پر نیوز ریڈر نے کہا۔ "ناظرین! جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ اب سے ٹھیک تین گھنٹے کے بعد اکیسویں صدی کا آغاز ہو گا۔ بیسویں صدی میں ہم نے اور ہمارے ملک کے اکابرین نے کیا کیا؟ یہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں حیرت انگیز ترقیاں ہوئیں اور قابلِ ذکر کارنامے انجام دیئے گئے۔ ہمارے ہاں پسماندگی' ناخواندگی اور طوائف الملوکی ہے لہٰذا افواج پاکستان کے اعلیٰ افسران نے یہ عہد کیا ہے کہ وطنِ عزیز میں کوئی ایسی حکومت نہیں رہے گی' جو کسی سپرپاور کے زیر اثر ہو اور ورلڈ بینک سے ملنے والے قرضوں کی محتاج ہو۔ ان عزائم کے پیشِ نظر پاک فوج نے صرف تین گھنٹوں کے لئے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ اسے تین گھنٹوں کا مارشل لا کہا جا سکتا ہے۔ یہ بیسویں صدی کا پاکستان میں آخری مارشل لا ہے۔ ٹھیک بارہ بجے نئی صدی شروع ہو گی تو اس کے ساتھ صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریت قائم کرنے کے نیک اقدامات کا آغاز کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں جنرل شیر شاہ رحمانی آپ سے مخاطب ہو رہے ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے میں جنرل شیر شاہ رحمانی اسکرین پر نظر آئے۔ ان کے سامنے میز پر ایک چھوٹا سا پاکستانی پرچم تھا اور ان کے پیچھے دیوار پر قائداعظم کی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے اللہ کے نام سے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے بزرگوں کی بے شمار قربانیوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ملک دیا تھا' جسے ہمارے مفاد پرست سیاستدانوں نے تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔ ہم نے موجودہ اور سابقہ حکمرانوں کو بارہا سمجھایا کہ وہ خود غرضی اور ضمیر فروشی سے باز آئیں اور ملکی ترقی اور خوشحالی کے لئے کام کریں لیکن حکمران پارٹی اور اپوزیشن پارٹی کے تمام سیاستدان ایک دوسرے پر الزامات عائد کرتے رہے کہ کس نے ملکی خزانے سے کروڑوں اور اربوں روپے مختلف حیلوں بہانوں سے حاصل کئے ہیں۔ پھر وہ کثیر رقوم آج تک واپس نہیں کی گئی ہیں۔

یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف کچی پکی دستاویزات پیش کر کے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان میں سے جو بھی اقتدار سنبھالتا ہے وہ ملکی خزانے کو لوٹتا رہتا ہے۔ ہم عام طور پر چوریاں کرنے والوں کو گرفتار کرتے ہیں۔ انہیں جیل بھیجتے ہیں۔ انہیں قید بامشقت کی سزا دیتے ہیں لیکن جو بڑے بااثر سیاستدان کھلے عام چوری کرتے ہیں' پورا قومی خزانہ لوٹ لیتے ہیں' انہیں گرفتار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ اپنی مرضی کی عدالتیں قائم کر کے تمام الزامات سے بری ہو جاتے ہیں۔

ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سب سے پہلے اپنے ملک کے تمام جج صاحبان کو سیاستدانوں کے دباؤ سے نجات دلائیں گے۔ آئندہ انتظامیہ کا کوئی تعلق عدالتی معاملات سے نہیں ہو گا۔ دو چار سال کے لئے حکمران بن کر آنے والے سیاستدان اپنے حق میں فیصلے سنانے والے کسی شخص کو کسی عدالت کا جج مقرر نہیں کریں گے۔ تمام ملک کے وکلاء حضرات جو کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہ رکھتے ہوں' وہ جج صاحبان کی برسوں کی بہترین کارکردگی کے پیشِ نظر مختلف عدالتوں میں ان کی تقرری اور تبادلے کریں گے۔

اس ملک کے تمام سیاستدانوں کو تین ماہ کا وقت دیا جائے گا۔ وہ ملکی خزانہ لوٹنے کے مقدمے میں عدالتوں میں پیش ہوا کریں گے۔ اگر وہ تمام خزانہ واپس کریں گے تو انہیں کم سے کم سزا دینے کے علاوہ آئندہ الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے گی اور اگر خزانے کی رقم واپس نہ کی گئی تو ان کی زمین' جائیداد اور بینک میں جمع شدہ رقمیں ضبط کر کے انہیں جیل بھیج دیا جائے گا۔

آج رات ٹھیک بارہ بجے ہم حکومتی معاملات سے دست بردار ہو جائیں گے اور تین ماہ کے لئے ایک عبوری حکومت قائم ہو جائے گی۔ آج اس ملک کے عوام نے اخبارات کے ضمیموں میں پڑھا اور یہ چرچے سنے کہ ہمارے ملک میں علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح تشریف لائے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ حقیقتاً علامہ اور قائداعظم ہیں لیکن ان کے ہم شکل ہیں اور ان کے دلوں میں وہی جذبے ہیں' جو ہمارے ان عظیم راہنماؤں میں تھے۔ وہ صحیح حکمت عملی کے ذریعے ہمارے ملک کا وقار پھر سے بلند کر سکتے ہیں۔

اس ملک میں کئی بار عبوری حکومتیں قائم ہو چکی ہیں۔ ہم نے سوچا کہ جب امریکا سے آنے والا ہمارے ہاں عبوری حکومت کا نگراں بن سکتا ہے تو پھر ہمارے علامہ اور قائداعظم کے ہم شکل پاکستانی تین ماہ کے لئے اس ملک کے نگراں کیوں نہیں بن سکتے؟ لہٰذا آج رات بارہ بجے وہ بزرگ علامہ اور قائداعظم ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے آپ

سے مخاطب ہوں گے۔ یہ ہماری اور آپ کی خوش قسمتی ہے کہ یہ دونوں بزرگ ہمارے علامہ اقبال اور قائداعظم کی طرح ذہین' معاملہ فہم اور تدبر سیاستداں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو تاقیامت پائندہ اور تابندہ رکھنے کے لئے اِن بزرگوں کو آج یہاں بھیجا ہے۔ آئیں' ہم عہد کریں کہ ان دونوں بزرگوں سے بھرپور تعاون کریں گے۔ اور ان کی راہنمائی میں پاکستان کو دنیا کا ایک ترقی یافتہ ملک بنائیں گے۔ آمین۔ پاکستان زندہ باد.........."

تقریر ختم ہو گئی۔ سیاستدانوں کی بے چینی شروع ہو گئی۔ حکمران پارٹی کا لیڈر جواب حکمران نہیں رہا تھا' وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں ایک فوجی افسر کو دیکھ کر بولا۔ "ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے گئے ہیں۔ میں اپنے رشتے داروں سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

افسر نے کہا۔ "بارہ بجے مارشل لا ختم ہو جائے گا۔ آپ پر سے پابندیاں بھی اٹھ جائیں گی۔ پھر آپ اپنے سب سے بڑے رشتے دار امریکی سفیر سے گفتگو کر سکیں گے۔"

افسر کے پاس رکھے ہوئے موبائل پر اشارہ موصول ہوا۔ افسر نے اسے آن کر کے دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر پارٹی لیڈر کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ فون تمہارے لئے ہے۔ تمہارا اپوزیشن لیڈر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

وہ دو مختلف پارٹی کے سیاستداں ایک دوسرے سے ملاقات کرنا یا فون پر گفتگو کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ پچھلے کئی برسوں سے اخبارات کے صحافیوں' دانشوروں اور فوج کے اعلیٰ افسران نے انہیں بار بار مشورے دیئے' انہیں سمجھایا کہ آپس میں میل ملاپ کے ذریعے جمہوری عمل کو جاری رکھا جائے۔ حکمران کوئی غلطی کرے تو بڑی نرمی سے غلطی کی نشاندہی کی جائے لیکن وہ اور ان کے ساتھی اسمبلیوں میں ایک دوسرے کو اتنی گندی گندی گالیاں دیتے تھے کہ اس کے بعد گلے ملنے کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی تھی۔

لیکن اب اپنی محل نما کوٹھی میں نظربند ہونے کے بعد کسی سے ملنے اور بات کرنے کی بھی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ پارٹی کا کوئی فرد' کوئی مشیر نہ مل سکتا تھا نہ فون پر رابطہ کر سکتا تھا۔ ایسے میں اپوزیشن لیڈر سے بات کرنے کی اجازت دی جا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں کسی فضول آدمی سے باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔"

افسر نے کہا۔ "یہ تمہاری ٹکر کا سیاستدان ہے۔ کئی بار تمہیں شکست دے کر اپنی حکومت بنا چکا ہے۔ ایک گھنٹے پہلے تک اپوزیشن میں تھا۔ اب نہ وہ اپوزیشن میں ہے' نہ تم حکومت میں ہو۔ دونوں مٹی کے کیڑے تھے۔ مٹی میں پہنچ گئے ہو۔"

پھر افسر نے موبائل فون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مسٹر اپوزیشن لیڈر! تم بھی دوسری طرف بیٹھے میری باتیں سن رہے ہو لیکن اچھی باتیں سمجھنے کا وقت گزر چکا ہے آئندہ تم سب عوام کو جھانسا دے کر اقتدار حاصل نہیں کر سکو گے کیونکہ اس سے پہلے عدالتوں میں حاضری دے کر اپنے چہروں کے پیچھے چھپے ہوئے ڈاکوؤں کے چہروں کو آشکارا کرنا ہو گا۔ ملکی خزانہ جتنا خالی کیا ہے' اتنا بھرنا ہو گا۔ ایسے ہی وقت کے لئے کہتے ہیں۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔"

نظربند لیڈر نے موبائل فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اپنے مخالف سے بات کروں گا۔"

پھر اس نے موبائل لے کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو مسٹر نیک نام!"

دوسری طرف سے جواباً کہا گیا۔ "ہیلو مسٹر بلند مقام! آخر گرے زمین پر اونچی اڑان والے۔"

"کیا تم نے یہی کہنے کے لئے فون کیا ہے؟"

"ابھی اس فوجی افسر نے کہا ہے کہ کہنے اور سمجھنے کا وقت گزر چکا ہے۔ جب ہم اقتدار کے لئے جنگ لڑتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو حکمران نہیں رہ سکتے اور جب اقتدار سے الگ ہو جاتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کے دل میں گنجائش ہو تو ایک تخت پر دو حکمران بھائی بھائی بن کر اپنا اپنا اُلو سیدھا کر سکتے ہیں اور عوام کو.......... اُلو بنا سکتے ہیں۔"

"میں تو تمہیں بھائی سمجھتا تھا لیکن اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے تم نے محاذ آرائی شروع کی اور میرے خلاف بینک اسکینڈل شروع کیا۔ یہ جھوٹی خبر پھیلائی کہ میں نے بینک سے ایک ارب اسی کروڑ روپے لئے ہیں۔"

"میں نے جھوٹ نہیں کہا ہے۔ اسی عدالت میں ثابت کر دوں گا۔ ویسے محاذ آرائی کا آغاز تم نے کیا تھا۔ اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کرنے کے لئے ہارس ٹریڈنگ کی اور میری پارٹی کے چند ارکانِ اسمبلی کو خرید کر حکومت بنالی۔"

"ایسے تو میں بھی تم پر بے شمار الزامات عائد کر سکتا ہوں لیکن بات وہی ہے کہ وقت گزر چکا ہے۔ اب تو اپنے سروں پر اپنی اپنی پگڑی سنبھالنے کی فکر لاحق ہو گئی ہے۔ ویسے میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ بینک سے جتنی رقم لی تھی' اسے واپس کر دوں گا۔"

"یوں تو میں بھی قرضہ ادا کر دوں گا لیکن ہم نے اپنے اپنے دورِ اقتدار میں اپنے وزیروں اور مشیروں کو جو کروڑوں روپے قرضے دلائے تھے۔ انہیں کون ادا کرے گا۔ اگر

ہم اپنی اپنی پارٹی کے اہم ستونوں کو تحفظ فراہم نہیں کریں گے' انہیں سزا پانے کے لئے چھوڑ دیں گے تو ہماری سیاسی پارٹیوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ہم میں سے کوئی آئندہ الیکشن تک پوری طرح منظم نہیں ہو پائے گا۔"

"ہاں یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن میرے تمام راستے ابھی بند نہیں ہوئے ہیں۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں جانتا ہوں' تم امریکہ سے آشیرواد لے کر ایسا سمجھتے ہو جیسے کسی پیر یا ولی اللہ سے دعائیں اور تعویذ لے کر آ گئے ہو کہ اب تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی لیکن یاد رکھو علامہ اور قائداعظم کی شخصیات کے سامنے تعویذ گنڈے کام نہیں آئیں گے۔"

"ہوں۔ آج بارہ بجے یہی دیکھنا ہے کہ وہ علامہ اقبال اور قائداعظم کون لوگ ہیں ہم نے سیاست کے میدان میں بڑے بڑے شیر مارے ہیں اور یہ لوگ تو شیروں کی کھالیں پہن کر آئے ہیں۔ پتا نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ ہم ان کی کھالوں میں گھس کر ان کا شکار کریں گے۔"

"مجھے بھی بارہ بجے کا انتظار ہے اور یہ کمبخت وقت ہے کہ گزر نہیں رہا ہے۔"

فون سے رابطہ ختم ہو گیا۔ بعض حالات میں ایسا لگتا ہے کہ وقت نہیں گزر رہا ہے۔ جبکہ وہ گزرتا رہتا ہے۔ اتنا گزرتا رہتا ہے کہ صدیاں گزرنے لگتی ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی گزرنے کا آخری سیکنڈ بھی آ گیا۔

اُس رات ایک عالم جاگ رہا تھا اور ملک کے سارے ٹی وی آن تھے۔ سب نے ٹی وی اسکرین پر ایک گھڑی دیکھی جس کے دونوں کانٹے بارہ کے ہندسے پر آ کر یوں مل گئے تھے جیسے وہ دو سے ایک ہو گئے ہوں۔ پاکستان ٹیلیویژن کے پروگرام ہمیشہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتے ہیں۔ اس رات بھی بارہ کے ہندسے پر ملے ہوئے کانٹوں پر بسم اللہ کے الفاظ نظر آئے۔

پھر علامہ اقبال کی وہ تصویر نظر آئی' جس میں وہ ایک ہاتھ پر سر ٹیکے سوچنے کے انداز میں بہت زیادہ فکر مند دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر پتا چلا وہ تصویر نہیں ہے بلکہ متحریک انسان ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "نصف شب کو جب دونوں کانٹے یکجا ہوتے ہیں تو اس وقت کوئی وقت نہیں ہوتا۔ ابھی اس لمحے میں ساعتِ صفر ہے۔"

گھڑی ٹن ٹن کے ساتھ بارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھی اور علامہ کی تائید کر رہی تھی کہ ابھی وقت نہ بارہ کے پیچھے ہے نہ بارہ کے آگے ہے۔ بیسویں صدی اور اکیسویں

صدی کے درمیان ابھی زیرو آور یعنی ساعتِ صفر ہے۔

جیسے ہی بارہ کی آخری ٹن کی آواز ختم ہوئی۔ علامہ نے کہا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ میں اکیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی بسم اللہ پڑھ کر سلام عرض کرتا ہوں۔ السلام علیکم میرے ہم وطنو!

"مسلمانوں کا ہر کام اللہ کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ ہم اکیسویں صدی کو بلائیں یا نہ بلائیں۔ اس نئی صدی کو شروع کریں یا نہ کریں۔ وہ تو اپنے وقت کے ساتھ آ گئی ہے۔ جیسے اس سے پہلے ان گنت صدیاں آئیں اور گزر گئیں۔ یہ بھی آ گئی ہے۔ اس کے آنے سے ہم پر رحمتیں نازل نہیں ہوں گی۔ البتہ بسم اللہ کہہ کر نئی صدی میں قدم رکھنے سے شاید اللہ تعالیٰ ہماری پچھلی غلطیوں کو معاف کر دے اور ہمیں ایمان کی روشنی میں ترقی اور خوشحالی کی راہوں پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

ناظرین! میرا نام محمد اقبال ہے۔ میں آپ کا صورت آشنا ہوں۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ مجھے شاعر' دانشور اور علامہ اقبال تسلیم کریں۔ آپ مجھے پہچاننے میں وقت ضائع نہ کریں۔ کیونکہ آپ تمام حضرات خود کو اور خودی کو پہچاننے میں آدھی صدی سے زیادہ وقت گزار چکے ہیں۔ آپ کو شاید یاد ہو گا۔ میں نے کبھی مسلمانوں کو ذہنی اور فکری غلامی کا احساس دلانے کے لئے کہا تھا۔

یہ غیر کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی۔

غرضیکہ آپ مجھے نہیں خود کو پہچانیں۔ راہنماؤں کو پہچانتے پہچانتے کئی نسلیں گزر گئیں ہیں۔ میں نے ایک بار مسٹر محمد علی جناح سے کہا تھا۔ ہندوستان میں بحیثیت مسلمان آپ ہی کی واحد ہستی ہے' جس سے ملت کو یہ توقع وابستہ کرنے کا حق ہے کہ شمال مغربی یا شاید پورے ہندوستان میں جو سیلاب آ رہا ہے اس میں آپ ملت کی صحیح راہنمائی فرمائیں گے۔

بعض راہنماؤں کو پہچاننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ خود اپنا تعارف آپ ہوتے ہیں۔ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کے علامہ اقبال کا ہم شکل ہوں۔ اب میں جناب محمد علی جناح کو پیش کر رہا ہوں۔ آپ انہیں بھی اپنے قائداعظم کا ہم شکل سمجھیں گے۔ بہرحال نام سے اور صورت سے نہیں' آدمی اپنے عمل سے پہچانا اور یاد رکھا جاتا ہے۔ آپ کے سامنے جو عظیم راہنما تشریف لا رہے ہیں' ان کی راہنمائی کی خصوصیات ان کے عمل سے ثابت ہوں گی۔"

ٹی وی اسکرین پر پاکستانی پرچم لہرانے لگا۔ قومی ترانے کی آواز ابھرنے لگی۔ قائداعظم محمد علی جناح پاک پرچم کو سلام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس عظیم راہنما کی شان میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لاہور میں ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ کو جو اجلاس ہوا، اس میں میاں بشیر احمد کی لکھی ہوئی ایک نظم کو انور قریشی نے پڑھا تھا۔ اس کے دو اشعار یہ ہیں۔

لگتا ہے ٹھیک جاکے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح
ملت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے
تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح

اب اس سے ساٹھ برس پہلے جسے تقدیر کی اذان کہا گیا تھا، وہی پھر پاکستانی مسلمانوں کا مقدر بن کر اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔ پتا نہیں اس وقت اسکرین پر دیکھنے والے ملک دشمن عناصر پر کیا گزر رہی ہو گی۔ قائداعظم کہہ رہے تھے۔ "میرے عزیز ہم وطنو! میں اس عزم کے ساتھ آیا ہوں کہ تم میں سے جو دشمن ہیں، انہیں دوست بناؤں گا۔ جو دوست ہیں، انہیں محب وطن بناؤں گا اور جو محب وطن ہیں، انہیں ملک کا مایہ ناز سائنس داں قدیر خاں بناؤں اور اتنا بڑا کام کرنے کے لیے عوام کی ناخواندگی اور بے حسی کو ختم کروں گا۔

اگر آپ ناخواندہ ہیں اور حالات حاضرہ سے بے خبر رہتے ہیں اور بے خبری اور لاعلمی کے باعث ان ضمیر فروش سیاست دانوں کی غلامی کرتے ہیں، جو مغربی ممالک کے خود غلام ہیں تو مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھنے دیں۔

یورپ کی غلامی پر رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

جب کوئی ڈاکٹر تمہارے مرض کی تشخیص کرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ تم بے احتیاطی اور بدپرہیزی سے مسلسل بیمار چلے آرہے ہو۔ وہ تمہارے لیے دوائیں تجویز کرتا ہے اور تمہیں سمجھاتا ہے کہ کس طرح پرہیز کرنا چاہیے اور ایسے غلیظ ماحول سے اور غلیظ افراد سے دور رہنا چاہیے جن سے تمہیں بیماری لگتی ہے۔

میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں کہ تم سب بیمار سیاستدانوں کے زیر اثر رہے اس لیے نصف صدی تک ایک بیمار قوم کہلاتے رہے۔ اگر تم متحد ہوتے، تعلیم یافتہ اور وقت کے

نباض ہوتے تو بہت پہلے ہی خود غرض سیاستدانوں کو زندہ دفن کر دیتے۔

میں یہ باتیں نئی صدی کے آغاز میں کر رہا ہوں اور تمہارے اندر نیا حوصلہ اور نیا عزم پیدا کرنا چاہتا ہوں اور وہ طریقے اختیار کرنا چاہتا ہوں جن پر ہم اور تم عمل کر کے ماضی کے تمام سیاسی عذاب سے نجات حاصل کر سکیں گے۔

سب سے پہلے ملک کے ان تمام وکلاء اور جج صاحبان سے مخاطب ہوتا ہوں، جو کسی سیاسی پارٹی سے منسلک نہیں ہیں۔ میری ان سے گزارش ہے کہ وہ کل اسلام آباد تشریف لے آئیں۔ ہم ایک ایسا لائحہ عمل تیار کریں گے کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر ہمارے ملک کی عدلیہ سیاستدانوں اور نوکر شاہی افسروں کے دباؤ سے مکمل طور پر آزاد ہو جائے گی۔

میں اپنے ملک کی پولیس فورس سے مخاطب ہوں۔ میرے جانباز سپاہیو! تم نے پاکستان کے قائم ہوتے ہی کسی لالچ اور خود غرضی کے بغیر اپنے فرائض ادا کیے اور قانون کی بالا دستی قائم رکھی۔ بعد میں رفتہ رفتہ سیاستدانوں نے تمہیں اپنے تخریبی عزائم کی تکمیل کے لیے مجبور کیا۔ تم میں سے جس محبِ وطن نے ان کا آلۂ کار بننے سے انکار کیا، اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا یا اس کے موجودہ عہدہ سے اسے نیچے گرا کر دور دراز کے علاقوں میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ محبِ وطن سپاہیوں اور افسروں کے ساتھ ایسی انتقامی کارروائی کوئی سیاستدان نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ نئی صدی کے شروع ہوتے ہی خود غرض اور تخریبی سیاست کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ایسے وقت جبکہ سیاسی اور سماجی طور پر معاشرے کی تعمیر کی جا رہی ہے، ایسے میں اگر کوئی اپنی وردی اور عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے گا تو اس کے خلاف فوراً ہی قانونی کارروائی کر کے اسے سخت سزا دی جائے گی۔

ملک کے جتنے انتظامی شعبے ہیں، ان کے چھوٹے بڑے افسران سے کہتا ہوں کہ جب پہلی بار پاکستان کی سیاست میں پہلی گولی چلی اور لیاقت علی خان شہید ہوئے، تب سے بیوروکریسی (نوکر شاہی) کا بول بالا ہوا۔ تب سے وہ انتظامی امور میں گڑبڑ کرتے ہوئے ہر آنے والے حکمران پر حاوی ہوتے رہے ہیں لیکن اس نئی صدی کے آغاز سے ہی نوکر شاہی کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ میں انہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ مجھے محبِ وطن پاکستان آرمی کی خدمات حاصل ہیں۔ اگر کوئی بیوروکریٹ اپنے عہدے و اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے گا تو فوراً اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی اور ایسی عبرتناک سزائیں دی جائیں گی کہ دوسرے بیوروکریٹ اس سے عبرت حاصل کریں گے۔

میں اپنے ملک کے تمام سیاستدانوں سے مخاطب ہوں۔ یہ موجودہ عبوری حکومت

تین ماہ کے لئے ہے۔ اس عبوری حکومت میں کوئی صدر یا وزیراعظم نہیں ہے۔ تین ماہ تک ہمارے بزرگ محترم علامہ اقبال اس حکومت کے نگرانِ اعلیٰ رہیں گے۔ وہ نظام اسلام کے مطابق آئندہ انتخابات کرائیں گے اور میں ایک قانون دان کی حیثیت سے تین ماہ تک نظام حکومت سنبھالوں گا۔

آئندہ انتخابات سے پہلے لازمی ہے کہ تمام سیاستداں عدالت سے کلیئرنس سرٹیفکیٹ حاصل کریں کہ انہوں نے بینک کے تمام قرضے ادا کر دیئے ہیں اور یہ کہ انہوں نے ناجائز ذرائع سے کوئی جائیداد نہیں بنائی ہے۔ انٹیلی جنس والے ان کی سابقہ اور موجودہ جائیداد کے سلسلے میں چھان بین شروع کر چکے ہیں۔

میں اپنے ملک کے طلباء و طالبات کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ تعلیم پر توجہ دیں۔ انہیں بے شک سیاسی شعور کا حامل ہونا چاہئے اور ملک اور قوم پر کوئی آنچ آئے تو سیاست کے میدان میں غیر جانبدار بن کر آنا چاہئے لیکن کبھی کسی سیاسی پارٹی کا آلۂ کار نہیں بنا چاہئے۔

میں اپنے ملک کے صحافی حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان کے تعاون سے ہی میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آئندہ بھی ان سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ ہمیشہ سچ کو اسی طرح عوام کے سامنے پیش کرتے رہیں گے جیسا کہ آج انہوں نے مجھے اور علامہ اقبال صاحب کو پیش کیا ہے۔"

ان کی تقریر جاری تھی۔ وہ پوری تفصیل سے بتا رہے کہ آئندہ تین ماہ کے اندر کس طرح ہر چھوٹے بڑے سیاستدان' بااثر وڈیروں' جاگیرداروں اور سرکاری عہدیداروں کا محاسبہ کیا جائے گا اور انہیں صرف چوبیس یا اڑتالیس گھنٹوں کے اندر سزائیں دی جائیں گی۔ غریب اور ناخواندہ عوام کو دھوکا دینے کے لئے کوئی پانچ سالہ یا دس سالہ منصوبہ نہیں بنایا جائے گا۔ صرف چند ہفتوں کے اندر ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں سستی کر دی جائیں گی۔ یہ مہنگائی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کس طرح بے جا منافع خوری کی لت پڑ جاتی ہے؟ ان حقائق کو ماہرین خوب سمجھتے ہیں۔ ملک میں جتنے اناج کے گودام ہیں' انہیں سرکاری تحویل میں لے لیا جائے گا تاکہ ذخیرہ اندوزی کی لعنت کو ختم کیا جا سکے۔

دسویں جماعت تک تعلیم مفت دی جائے گی۔ تعلیم دینے والے اسکولوں اور سرکاری اداروں کو اس قدر فعال بنایا جائے گا اور دور حاضر کے مطابق ایسی معیاری تعلیم دی جائے گی کہ لوگ آئندہ مہنگے پرائیوٹ اسکولوں کا رخ نہیں کریں گے۔

جن کے گھروں میں ہتھیار ہیں' انہیں کل شام تک تھانوں میں ہتھیار جمع کرانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے بعد جس گھر سے ہتھیار برآمد ہوں گے اسے پانچ سال قید بامشقت دی جائے گی۔

سرحدی علاقہ کی ناکہ بندی ہو رہی تھی۔ وہاں سے منشیات اور ہتھیاروں کی سمگلنگ کو ناکام بنانے کی کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اب کوئی بااثر اسمگلر اور منشیات فروش کسی اسمبلی کا رکن نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ سیاست ختم کر دی گئی تھی۔

تمام ملک میں ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے یہ سب کچھ سنا جا رہا تھا۔ عوام خوش ہو رہے تھے اور منافع خوروں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ ذخیرہ اندوز جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے گوداموں میں منوں اور ٹنوں کے حساب سے مال بھرا ہوا تھا۔ وہ اس قدر مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے چھپا نہیں سکتے تھے۔ پہلے کبھی چھپانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ہر آنے والی حکومت انہیں تحفظ فراہم کرتی تھی۔ ایسے ذخیرہ اندوز اور منافع خور اپنے اپنے سرپرست سیاستدانوں سے رابطے کر رہے تھے اور پریشان ہو کر پوچھ رہے تھے کہ ان کا کیا بنے گا؟

سیاستداں جواب دے رہے تھے کہ خود اُن پر مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں۔ پھر بھی زیادہ پریشان ہونا اور گھبرانا نہیں چاہئے۔ یہ محض تین ماہ کی عبوری حکومت ہے۔ اس سے پہلے بھی عبوری حکومتوں نے آتے ہی بڑے زور و شور سے بااختیار اور بااثر لوگوں کا محاسبہ کرنے اور غریب عوام کو انصاف دلانے کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ پھر وہ حکومتیں رفتہ رفتہ نوکر شاہی اور منافع خوروں کے رنگ میں رنگ گئی تھیں۔

جو پولیس افسران محب وطن تھے' وہ ایسی تبدیلیوں سے خوش تھے اور جو افسران بسوں اور منی بسوں کے مالکان بنے ہوئے تھے اور جگہ جگہ جائیداد اور بینک بیلنس بنائے ہوئے تھے' وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر کہہ رہے تھے کہ آج تک کسی حکومت نے پولیس والوں سے جائیداد کا حساب مانگا ہے؟ یہ سب بکواس ہے۔ موجودہ عبوری حکومت سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ۱۹۴۷ء کے مسلمان سیاستدان کتنے حاضر دماغ اور تیز رفتار تھے۔ دوسری صبح جو سرکاری افسران بینک سے رقم نکالنے گئے وہ ناکام لوٹے۔ ان کے اکاؤنٹ عارضی طور پر منجمد کر دیئے گئے تھے۔ صرف صنعت کاروں اور چھوٹے کاروباری حضرات کو محدود رقم نکالنے کی اجازت تھی۔ پاکستانی کرنسی کو بیرونی ممالک ٹرانسفر کرنے والے تمام ایجنسیاں بند کر دی گئی تھیں۔

ملک کے اندرونی حصوں میں جتنے اناج کے گودام اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا سامان ذخیرہ کرنے والے گودام تھے' ان سب کو فوج نے سیل کر دیا تھا۔ تمام شہروں کی شاہراہوں پر مسلح فوجی گشت کر رہے تھے۔ اخبارات وغیرہ کے ذریعے عوام کو یقین دلایا جا رہا تھا کہ یہ مارشل لاء یا کسی اور نوعیت کی فوجی حکومت نہیں ہے بلکہ صرف علامہ اقبال اور قائداعظم جیسے دو محبِ وطن افراد کی سہ ماہی انتظامیہ ہے جسے جاری و ساری رکھنے کے لئے فوج ان سے تعاون کر رہی ہے۔

ایسی صورت میں سیاستداں احتجاج کرنے یا گڑبڑ پھیلانے کے لئے اپنے کرائے کے دہشت گردوں کو سڑکوں پر نہیں لا سکتے تھے۔ یہ حکم تھا کہ جو لوگ ہتھیاروں کے ساتھ دیکھے جائیں' انہیں فوراً گولی مار دی جائے۔ مختصر یہ کہ تمام تخریبی سیاست کی چالوں کو ناکام بنانے کی بھرپور کوششیں کی جا رہی تھیں۔

پچھلی رات بارہ بجے کے بعد حکمران پارٹی کے لیڈر' بلند مقام' پر سے پابندیاں ہٹالی گئی تھیں۔ اپوزیشن کے لیڈر' نیک نام' پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ تمام سیاستدانوں کو عدالتوں سے رجوع کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کی آزادی دی گئی تھی۔ ویسے دو دن کے لئے عدالتیں بند تھیں۔ اسلام آباد میں تمام وکلاء اور جج صاحبان کا اجلاس ہو رہا تھا۔ وہ علامہ اقبال اور قائداعظم کو بتا رہے تھے کہ فی الوقت ملک بھر میں چالیس ہزار مقدمات کو نمٹانے کے لئے جج صاحبان کی اور عدالتی عمارتوں کی کمی ہے۔ عدالت کے بیشتر کمرے بڑی کوٹھیوں کے باتھ روم کے برابر ہوتے ہیں' جہاں ایک جج' پیش کار' وکیل اور ملزمان وغیرہ بمشکل سماتے ہیں۔ بعض عدالتی عمارتیں اتنی مخدوش ہو گئی ہیں کہ ان کی دیواریں اور چھتیں کسی وقت بھی گر سکتی ہیں۔

پاکستان کا یہ اندرونی نقشہ دیکھ کر دونوں عظیم راہنماؤں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ پاکستان کے ابتدائی دو تین برسوں میں جذبۂ حب الوطنی کا یہ عالم تھا کہ جن لکڑی کے ڈبوں میں چائے پیک ہو کر آتی تھی۔ انہیں سیاسی راہنما الٹ کر زمین پر رکھتے تھے اور ان پر بیٹھ کر دفتری کام انجام دیتے تھے۔ آج کے وزراء اپنے دفتروں کی آرائش پر کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ بعض افراد اپنے بیٹھنے کے لئے جو کرسی منگواتے ہیں' وہ کم و بیش تیس ہزار روپے کی ہوتی ہے۔

کئی اخبارات نے بارہا لکھا کہ ایک وزیر نے اپنے استعمال کے لئے چودہ گاڑیاں رکھی ہیں لیکن یہ گاڑیاں اس سے واپس نہیں لی گئیں۔ کیونکہ وہ آزاد امیدوار تھا۔ اسمبلی میں حکومتی پارٹی کی تعداد بڑھاتا تھا۔ جتنے آزاد امیدوار ہوتے ہیں' وہ ایسے ہی بے لگام

ہوتے ہیں۔ اگر حکومت ان کی ناز برداری نہ کرے تو وہ اپوزیشن میں جانے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔

قائداعظم نے ایک فوجی افسر سے کہا۔ "جیسا کہ رپورٹس مل رہی ہیں' کسی وزیر نے اپنے دفتر کی آرائش کے لئے ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے خرچ کئے۔ کسی وزیر نے اپنے گھر کی آرائش کے لئے ستر لاکھ روپے خرچ کئے۔ ایسی کتنی ہی شاہ خرچی کے ریکارڈز پیش کئے جا رہے ہیں۔ آپ ایسے تمام دفاتر اور گھروں پر قبضہ کریں اور انہیں ملکی عدالتوں میں تبدیل کریں۔ ان دفاتر میں عدالتیں قائم کی جائیں گی اور جن گھروں میں ملکی خزانے سے لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ کئے گئے ہیں انہیں نیلام کر کے خزانے میں رقم واپس لائیں۔"

تیسرے دن ملک کے معروف سیاستدانوں کے ساتھ اجلاس منعقد ہوا۔ علامہ نے اس اجلاس کی صدارت کی اور کہا۔ "قوت اگر ملک اور قوم کے لئے ہے تو پھر مثبت ہے۔ اگر محض حصولِ اقتدار اور منافع خوری کر کے لئے ہے تو وہ منفی ہے۔ ہماری دنیا میں اقتدار کے نام پر کوئی شہنشاہ بنا' کوئی ڈکٹیٹر' کوئی فرعون بنا' کوئی نمرود۔ یہ قوت کی کرشمہ سازی ہے کہ یہ جتنی بڑھتی ہے اور بے لگام ہوتی ہے' اتنا ہی اس کا نشہ بڑھتا جاتا ہے۔

"فرعون نے کہا تھا۔ انا ربکم الاعلیٰ میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔ یہ شۂ قوت کی شدت تھی۔ وہ خود کو پروردگار کہنے والا فنا ہو کر کیڑوں کی خوراک بن چکا ہے۔ ہندوستان کے اکبر اعظم نے حکومت اور طاقت کے نشے میں دینِ الٰہی ایجاد کیا تھا اور روز صبح محل کی چھت پر آ کر رعایا کو اپنے درشن یوں کراتا تھا جیسے بھگوان ہو یا مظہرِ خداوندی ہو۔ تاریخ میں ایسے کئی حکمرانوں کی مثالیں ہیں' جو اقتدار کے نشے میں مدہوش رہا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے اسی سلسلے میں کہا تھا۔

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اجلاس میں گہری خاموشی طاری رہی پھر علامہ نے کہا۔ "میں نے "جاوید نامہ" میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ میں پیرِ رومی کی معیت میں ہفت افلاک کی سیر کرتے ہوئے فلک ...ل پر پہنچتا ہوں اور خون کا موجیں مارتا ہوا ایک دریا دیکھتا ہوں۔ اس دریا میں ایک ٹوٹی سی کشتی پر دو بدنصیب تھپیڑے کھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں اپنے پیرِ رومی سے ان

کا حال دریافت کرتا ہوں۔

"پیر رومی فرماتے ہیں۔ وہ دونوں قوم فروش غدار ہیں۔ انہوں نے برصغیر کی آزادی اقوام مغرب کو بیچ دی۔ ان میں سے ایک بنگال کا میر جعفر ہے اور دوسرا دکن کا میر صادق ہے۔"

علامہ نے اجلاس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آج کے پاکستان میں بھی میر جعفر اور میر صادق موجود ہیں۔ یہ دونوں سیاستدان اس اجلاس میں تشریف رکھتے ہیں۔ آج ان کے نام جعفر اور صادق نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "بلند مقام" ہے اور دوسرے کا نام نامی اسم گرامی "نیک نام" ہے۔"

حاضرین مجلس ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ علامہ نے کہا۔ "آپ سب جانتے ہیں' یہ دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈر ہیں۔ ان میں سے اگر بلند مقام اقتدار سے محروم ہوتا ہے تو نیک نام حکمران بن کر آ جاتا ہے۔ اگر نیک نام کے ہاتھوں سے حکومت نکلتی ہے تو بلند مقام کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔ آپ نے بندر بانٹ کا قصہ سنا ہو گا۔ قصہ یوں ہے کہ دو بلیوں کو ایک سالم روٹی مل گئی۔ دونوں اس روٹی کے لئے لڑنے لگیں۔ ایک بندر نے ہاتھ میں ترازو لے کر کہا' لڑتی کیوں ہو؟ میں برابر تقسیم کر دوں گا۔ اس نے روٹی کے دو ٹکڑے کیے اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں ایک ایک ٹکڑا ڈال کر اسے اٹھایا۔ ان میں سے ایک ٹکڑا کچھ زیادہ تھا اس لئے وہ پلڑا جھک گیا۔ بندر نے بڑے ٹکڑے کو اٹھا کر اس کا کچھ حصہ اپنے دانتوں سے کاٹ کر مزے سے چباتے ہوئے کھا لیا۔ بلیوں نے پوچھا۔ "ہماری روٹی تم کیوں کھا رہے ہو؟" بندر نے ڈانٹ کر کہا۔ "خاموش رہو۔ دیکھتی نہیں ہو کہ انصاف کر رہا ہوں۔ جو ٹکڑا بڑا ہو گا' اسے دوسرے کے برابر کرنے کے لئے چھوٹا کرنا ہو گا۔" اس نے چبائی ہوئی روٹی کا باقی حصہ خالی پلڑے میں ڈالا تو وہ چھوٹا پڑ کر ہلکا ہو گیا۔ دوسرا ٹکڑا بڑا ہو گیا۔ اس نے دوسرے کو اٹھا کر تھوڑا سا چبا کر کھایا پھر اسے خالی پلڑے میں رکھا تو وہ چھوٹا پڑ کر ہلکا سا ہو گیا۔ دوسرا ٹکڑا پھر بڑا اور بھاری ہو گیا تو وہ اسے اٹھا کر دانتوں سے چبانے لگا۔ دونوں بلیاں اس کا منہ تک رہی تھیں۔ بندر بانٹ پر اعتراض نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ انصاف کے لئے سپر پاور کے پاس گئی تھیں۔ اگر اس پر غرائیں تو وہ بندر دونوں کی گردنیں دبوچ لیتا۔ وہ اتنی مہربانی کر رہا تھا کہ روٹی چباتے وقت منہ سے گرنے والا جھوٹا انہیں کھانے کی اجازت دے دیتا تھا۔ دونوں بلیاں اس جھوٹے پر لپک رہی تھیں۔ کبھی ایک بلی کو جھوٹا کھانا مل جاتا تو دوسری اپوزیشن میں رہ کر منہ تکتی تھی۔ کبھی دوسری کو وہ کھانا مل جاتا تو پہلی اپوزیشن کے خانے

میں پہنچ جاتی تھی۔ بندر نے پہلا ٹکڑا چبایا اور مشرقی پاکستان کو نگل لیا۔ دوسرا ٹکڑا چبایا اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو اس طرح ہضم کیا کہ ڈکار بھی نہ لی۔ اندیشہ تھا کہ ڈکار لینے کی آواز پاکستانی قوم سن لے گی۔ اب وہ تیسرا ٹکڑا چبا رہا ہے اور کشمیر کو خاموش سفارتکاری سے نگلتا جا رہا ہے۔"

علامہ نے ان دونوں کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "اور تم دونوں کو اس کے عوض جو جھوٹا ملتا جا رہا ہے' اسے ورلڈ بینک کا قرضہ کہتے ہیں۔"

بلند مقام نے کہا۔ "آپ ہمیں صفائی کا موقع دیں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ جب میں نے حکومت کی ذمے داریاں سنبھالیں تو مجھ سے پہلے حکمران رہنے والا یہ سیاستداں نیک نام ہمارے ملک کا خزانہ خالی کر چکا تھا۔ مجھے ملکی ضروریات کے لئے مجبوراً ورلڈ بینک کی شرائط پر قرضہ لینا پڑا۔"

نیک نام نے کہا۔ "جناب! یہ بلند مقام جھوٹ کہتا ہے۔ جب تین برس پہلے میں نے حکومت سنبھالی تو مجھ سے پہلے یہ حکمران تھا اور ملکی خزانہ خالی کر چکا تھا۔ اس لئے مجھے بھی مجبوراً ورلڈ بینک کی شرائط پر قرضہ لینا پڑا۔"

علامہ نے کہا۔ "اس طرح تم دونوں اعتراف کر رہے ہو کہ دونوں نے خزانہ خالی کیا اور دونوں نے قرضے لئے۔ دونوں کے حاصل کردہ قرضوں کے تمام ریکارڈ موجود ہیں۔ دونوں نے یہ شرائط قبول کیں کہ حکمران تم دونوں میں سے کوئی بھی ہو .... لیکن حکومتی پالیسیاں ورلڈ بینک مرتب کیا کرے گا۔ یہ کڑوی حقیقت سب نہیں جانتے۔ صرف چند ماہرین ہی سمجھتے ہیں کہ تم لالچی حکمرانوں نے کس طرح ملک کو گروی رکھ دیا ہے۔"

بلند مقام نے کہا۔ "ہمارے ملک کا کوئی سرکاری ریکارڈ درست نہیں ہے۔ ہر آنے والا حکمران دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے کے لئے ایک دوسرے کے ریکارڈز میں تبدیلیاں کراتا رہا اور اپنا اصل ریکارڈ غائب کراتا رہا ہے۔ میں عدالت میں اپنی بے گناہی ضرور ثابت کر کے رہوں گا۔"

نیک نام نے کہا۔ "میں بھی کوئی مجرم نہیں ہوں۔ عدالت میں پہنچ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دوں گا۔"

علامہ نے کہا۔ "قانون کا چہرہ مسخ کرنے کے جتنے داؤ پیچ جانتے ہو' انہیں اور اچھی طرح یاد کر لو۔ تم لوگ جس عدالت میں بھی پہنچو گے وہاں کا نگرانِ اعلیٰ وہ محمد علی جناح ہو گا جو اپنے دور کا ناقابلِ شکست بیرسٹر کہلاتا تھا۔"

"۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی جوہر نے لاہور کے ایک عظیم الشان جلسے میں اپنے سر

سے ٹوپی اتار کر انگریزوں کو للکارتے ہوئے کہا تھا۔ "اے انگریز قوم! آج میں تم سے مخاطب ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ آج سے تین سو برس پہلے تم نے ایک بادشاہ چارلس اول سے تاج مانگا تھا۔ اس نے تاج دینے سے انکار کیا تو تم نے اس کا سر قلم کر دیا۔ آج میں تم سے تاج مانگتا ہوں۔ بتاؤ' تاج دو گے یا سر دو گے؟"

"ہندو اور انگریز ہمیں پاکستان کا تاج کبھی اپنے سر پر رکھنے نہ دیتے لیکن مسٹر محمد علی جناح نے جس ذہانت اور قانون فہمی سے ہندوؤں اور انگریزوں کے دو طرفہ حملوں کا منہ توڑ جواب دیا اور مسلمانانِ ہند کے لئے پاکستان کا تاج حاصل کیا۔ تم لوگوں نے اسی تاج کو ورلڈ بینک کے پاس گروی رکھ دیا۔

"جاؤ' عدالتوں میں جاؤ۔ تمہیں اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہے اور آئندہ الیکشن میں حصہ لینے سے پہلے کلیئرنس سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہے۔ اس لئے تمہیں عدالتوں میں جانا ہی ہو گا۔ وہاں وہ ناقابلِ شکست بیرسٹر تم سب سے پوچھے گا کہ بتاؤ' پاکستان کا تاج واپس لاؤ گے یا اپنے سر دو گے؟"

بلند مقام اور نیک نام کو چپ لگ گئی تھی۔ تاج واپس لانے کا مطلب یہ تھا کہ جو ملکی خزانہ خالی کیا ہے' اسے بھر دو۔ تاکہ پاکستان' ورلڈ بینک یا کسی دوسرے مالیاتی ادارے کا محتاج نہ رہے اور اگر انہوں نے خزانے کا ایک ایک پیسہ واپس نہ کیا تو اُن سب کے سر قلم کئے جائیں گے۔"

☆==========☆==========☆

ملک کے سیاستدانوں پر پہلے کبھی ایسا عذاب نازل نہیں ہوا تھا۔ فرعونوں کو ہمیشہ اس بات کا غرور رہا ہے کہ دنیا کا کوئی شخص اُن کا محاسبہ نہیں کر سکتا اور کوئی طاقت انہیں زیر نہیں کر سکتی۔

بلند مقام اور نیک نام سمجھ گئے تھے کہ انہوں نے آپس کی مخالفتوں کو بھول کر ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیا تو وہ بیرسٹر محمد علی جناح انہیں قانون کی بہت بُری مار ماریں گے۔ ان دونوں نے ایک جگہ ملاقات کی اور دوستی سے ہاتھ ملا کر یہ عہد کیا کہ پاکستان میں صرف وہی دو حکمران رہیں گے۔ کسی تیسرے کو آنے نہیں دیں گے۔

اِس مقصد کے لئے پھر ایک بار امریکا کا آشیرواد ضروری تھا لیکن وہ امریکہ نہیں جا سکتے تھے۔ تمام چھوٹے بڑے سیاستدانوں کے پاسپورٹ ضبط کر لئے گئے تھے اور یہ کہا گیا تھا کہ وہ سب مل کر جو کھچڑی پکانا چاہتے ہیں' وہ اپنے ملک میں ہی رہ کر پکائیں۔ انہیں ملک سے باہر جا کر سازش کرنے یا سیاسی پناہ حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

لہٰذا وہ اپنے ملک میں ہی امریکی سفیر سے اور امریکی ایجنٹوں سے رابطہ کر رہے تھے۔ اپنے مسائل بیان کر رہے تھے اور اُن کا حل پوچھ رہے تھے۔ ان دو چار دنوں میں علامہ اقبال اور قائداعظم کی تصاویر دنیا کے تمام اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان دو عظیم راہنماؤں کی رہائش گاہ کے سامنے غیر ملکی صحافیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ علامہ اور قائداعظم روزانہ انہیں صرف ایک گھنٹہ گفتگو' انٹرویو اور ویڈیو فلمیں تیار کرنے کی اجازت دیتے تھے پھر اُن سے سے معذرت چاہتے تھے۔

ایجنٹوں کے ذریعے امریکا سے مشورے اور مسائل کے حل امپورٹ کئے جا رہے تھے۔ پہلے مشورہ دیا گیا کہ پولیس اور انتظامیہ کو بھاری رشوتیں دو پھر ان کے تعاون سے اپنی سیاسی غنڈا فورس کو کام میں لاؤ۔ چھوٹے بڑے شہروں میں ایسی تخریبی کارروائیاں کرو کہ مقروض سیاستدانوں کا مقدمہ عدالت تک نہ پہنچنے پائے۔

یہ مشورے کمزور تھے۔ کیونکہ غنڈا فورس روپوش ہو گئی تھی۔ وہ ہتھیاروں کے بغیر دہشت گردی نہیں کر سکتے تھے۔ اُدھر مسلح فوجی تھے کہ ہاتھوں میں ہتھیار دیکھتے ہی گولی مار دیتے تھے۔

پولیس ڈیپارٹمنٹ میں جو سپاہی اور افسران محبِ وطن اور فرض شناس تھے' وہ بڑی تندہی سے فرائض ادا کرنے لگے تھے کہ کسی بدعنوان افسر کے ناجائز حکم کی تعمیل سے انکار کر دیتے تھے۔ انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کو وارننگ دی گئی تھی کہ جو فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا یا ملک دشمن عناصر کی پشت پناہی کرے گا' اسے ملازمت سے برخاست کر کے سخت سزائیں دی جائیں گی۔

ان حالاتِ کے پیشِ نظر سیاستدانوں کو پولیس اور انتظامیہ کی طرف سے تعاون حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ ان کی غنڈا فورس کام نہیں آ رہی تھی اور انہیں بیماری اور علاج کے بہانے سے ملک سے باہر جا کر سیاسی پناہ حاصل کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ علامہ اور قائداعظم نے انہیں زنجیریں نہیں پہنائی تھیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ملک کے اندر پابہ زنجیر ہو چکے تھے۔

امریکی سفیر نے علامہ اور قائداعظم کی رہائش گاہ میں آ کر ملاقات کی اور کہا۔ "آپ حضرات سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ ہماری حکومت نے آپ حضرات کو امریکا کے دورے کی دعوت دی ہے۔ میں یہ دعوت نامہ پیش کرنے آیا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس دورے کے بعد پاک امریکا دوستی پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گی۔"

انہوں نے دعوت نامہ لے کر پڑھا۔ قائداعظم نے جواب لکھا۔ "آپ کی دعوت

قبول کر کے ہمیں دلی مسرت ہو گی لیکن ہم تین ماہ تک اسلامی جمہوری حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں دن رات مصروف رہیں گے......... اس نیک کام کو بخوبی انجام دینے کے بعد ہم ضرور آپ سے ملاقات کرنے آئیں گے۔"

سفیر نے وہ جواب پڑھنے کے بعد کہا۔ "اس سے پہلے بھی بارہا الیکشن ہوتے رہے ہیں اور وہی جاگیردار اور سرمایہ دار کامیاب ہوتے رہے ہیں اور اپنی حکومتیں بناتے رہے ہیں کیونکہ ان کے سوا ملک میں اور کوئی قابلِ ذکر سیاستدان نہیں ہے۔"

علامہ نے کہا۔ "یہ آپ کا خیال ہے۔ ورنہ ہمارے ملک میں ذہین قانون دان اور محبِ وطن سیاستداں موجود ہیں۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے انتخابی مہم کو اس قدر مہنگا کر دیا ہے کہ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ اور محب وطن افراد کے پاس انتخاب میں کامیاب ہونے کے لئے دس لاکھ سے لے کر دس کروڑ تک رقم نہیں ہوتی۔"

سفیر نے پوچھا۔ "کیا ایسے غریب افراد کے پاس اتنی دولت جمع ہو جائے گی؟"

"ہم انتخابی مہم کو مہنگا نہیں ہونے دیں گے۔ کسی کو پوسٹر' پمفلٹ شائع کرنے اور بینر لگانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ سرکاری طور پر تمام امیدواروں کا تعارف اور اُن کی ہسٹری اخبارات میں شائع ہوا کرے گی اور اِن امیدواروں کو روزانہ دس دس منٹ کے لئے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پیش کیا جائے گا۔ جو امیدوار اپنی جیب سے رقم خرچ کرنا چاہے گا' اُس کے بینک اکاؤنٹ اور ذرائع آمدنی کو چیک کیا جائے گا۔ پھر اسے انتخابی مہم میں پچیس ہزار روپے سے زیادہ رقم خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

"ایسے دلکش اور متاثر کرنے والے پروگرام عوام کو خوش کرنے کے لئے اچھے ہوتے ہیں مگر ان پر کبھی عمل نہیں ہوتا۔"

"جی ہاں عمل نہیں ہوتا اسی لئے ہمارے ملک کی یہ حالت ہو گئی۔ اب ان تین ماہ میں آپ دیکھیں گے کہ ہم کتنے مستقل مزاج اور کس قدر قوت ارادی کے مالک ہیں۔ جو ارادہ کیا ہے اس پر ضرور عمل ہو گا اور جو مثبت اور خوش کن نتائج سامنے آئیں گے' اسے آپ کے ساتھ ساری دنیا بھی دیکھے گی۔"

"ہمیں خوشی ہو گی جب آپ کامیاب ہوں گے لیکن وہ آنے والی نئی حکومت ورلڈ بینک کا قرضہ ادا کرنے کی پابند رہے گی۔"

"بے شک قرضہ شیڈول کے مطابق ادا کرنا ہو گا لیکن وہ نئے حکمران' نظامِ اسلام کے قوانین پر عمل کریں گے۔ آئندہ یہاں ورلڈ بینک کی بنائی ہوئی پالیسیوں پر عمل نہیں

ہو گا۔"

سفیر ان سے رخصت ہو کر اپنی رہائش گاہ میں آیا پھر سیٹلائیٹ کے ذریعے امریکی صدر کو بتایا کہ وہ گفتار سے اور رفتار سے بالکل علامہ اور قائداعظم لگتے ہیں۔ گفتگو کے دوران ان کے لہجے میں نرمی ہوتی ہے لیکن اس نرمی کے پیچھے فولادی عزائم جھلکتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی جھکنے والے لوگ نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو جھکنا نہیں جانتے' وہ ٹوٹ جاتے ہیں' مگر یہ ٹوٹنے والے بھی نہیں ہیں۔

دوسری طرف سے فلیکس کے جواب میں کہا گیا کہ فوج کے جنرل شیر شاہ رحمانی سے ملاقات کرو اور بڑی سے بڑی آفر دو۔ کوشش کرو کہ وہاں الیکشن نہ ہوں۔ حکومت میں ہمارے آدمی آئیں یا پھر فوجی کے حکومت قائم ہو جائے۔ ایسا ہو جائے تو پھر ہم فوجی نوعیت کے دباؤ میں انہیں رکھیں گے۔

سفیر نے جنرل شیر شاہ رحمانی سے ملاقات کی پھر رسمی گفتگو کے بعد کہا۔ "دنیا کے اخبارات اور رسائل کہہ رہے ہیں کہ علامہ اور قائداعظم کے ہم شکل افراد کے ذریعے جو سیاسی ڈراما پلے کیا جا رہا ہے اس کے نتائج بڑے ہی مضحکہ خیز ہوں گے۔"

جنرل نے کہا۔ "ایک زمانے سے ہمارے مفاد پرست سیاستدان اس ملک میں اور ملک کی اسمبلیوں میں مضحکہ خیز حرکتیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک مضحکہ خیز ڈراما یہ بھی سہی۔ امریکا کو ایسے ہی ملک پسند ہیں' جہاں وہ مضحکہ خیز حرکتوں سے فائدہ اٹھا سکے۔"

"ہم فائدہ اٹھاتے ہیں تو فائدہ پہنچاتے بھی ہیں۔ آپ نے بارہا آزمایا ہے اس ملک میں جمہوریت ناکام رہی ہے۔ آپ پھر کیوں ناکام تجربہ کر رہے ہیں۔ آپ کو تو فوجی حکومت قائم کرنا چاہیے۔"

"فوجی حکومت سے آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"ہم پاکستان کی سلامتی اور اس سے مستحکم دوستی چاہتے ہیں۔ سیاستدانوں نے اِس ملک کو اِس قدر کمزور بنا دیا ہے کہ ہماری فوجی امداد کے بغیر آپ بھارت سے دو دن بھی جنگ جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ چونکہ ہم پاکستان کی پشت پر ہیں' اسی لیے بھارت حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر رہا ہے۔"

جنرل نے مسکرا کر کہا "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پاک آرمی امریکی امداد کی محتاج ہے تو یہ خوش فہمی آپ کو مایوس کرے گی اور اگر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ہم فوجیوں کے پاس جدید ہتھیار نہیں بلکہ چوڑیاں ہیں تو یہ بھی غلط نہیں ہے۔ پاکستان پر حملہ ہونے دو۔ ہمارے پاس جتنی چوڑیاں ہیں وہ ہم بھارت کو پہنا دیں گے۔"

"آپ کی گفتگو سے پاک آرمی کی خفیہ طاقت کا اظہار ہوتا ہے لیکن کسی بھی ملک کی فوج صرف طاقت سے نہیں حکمت عملی سے بھی لڑتی ہے اور اس کے لیے سپُر پاور کی دوستی کا کارڈ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ کیا آپ ہماری اہمیت سے انکار کریں گے؟"

"ہرگز نہیں۔ آئندہ پاکستان کی خارجہ پالیسی یہی ہو گی کہ امریکا سے دوستی مستحکم رہے لیکن یہ دوستی پاکستان کو محکوم اور مقروض سمجھ کر نہ رہے۔ ہماری خارجہ پالیسی کسی طرح کے دباؤ کا شکار نہیں ہو گی۔"

"آپ آئندہ کی باتیں کر رہے ہیں۔ جبکہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ تدابیر پر عمل کرتے رہنے کے دوران کس طرح حالات بدل جاتے ہیں۔ آپ ابھی کی باتیں کریں۔ آپ کی سرپرستی میں یہ عبوری حکومت ہے۔ اگر آپ ہمارہ مشورہ مان لیں تو ہماری حکومت کی طرف سے آپ کے لیے بڑی بڑی آفرز ہیں۔"

"آپ کا مشورہ اور آفرز کیا ہیں؟"

"یہ ہیں کہ آئندہ الیکشن میں ہمیں موقع دیا جائے کہ ہم پھر بلند مقام کو یا نیک نام کو یہاں حکمران بنانے کے لیے ہتھکنڈوں پر عمل کریں۔ اس کے عوض ہم آپ کو جدید ترین جنگی سامان فراہم کریں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم اپنے ذخیرے میں سے آپ کو دو ایٹم بموں کا تحفہ پیش کریں گے۔ جب آپ کے دشمنوں کو اور پڑوسی ملک کو یہ معلوم ہو گا کہ آپ کے پاس بھی ایٹم بم ہیں تو تمام دشمن ممالک کے بڑے عزائم جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔"

جنرل نے کہا۔ "اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ سب سے بڑی امریکی امداد ہو گی لیکن آپ نے یہ امداد دینے میں دیر کر دی۔ ہم پہلے ہی چار ایٹم بم حاصل کر چکے ہیں۔"

"پلیز! آپ ایسی بچکانہ باتیں نہ کریں۔ بہت عرصہ پہلے ہی ہم آپ کے ایٹمی پلانٹ کا معائنہ کر چکے ہیں۔ آپ کے پاس ایک بھی ایٹم بم نہیں ہے۔"

"سیاستدانوں نے بڑے خفیہ طور سے آپ کو وہاں کا معائنہ کرایا تھا لیکن ان آنے جانے والے سیاستدانوں کو کیا معلوم کہ ایٹم بم تیار ہوتے ہی ہم فوجی اسے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ آپ نے معائنہ کیا اور خوش ہو گئے۔ اللہ آپ کو اور خوش رکھے۔"

وہ حیرانی اور بے یقینی سے بولا۔ "کیا واقعی آپ یہ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ہم نے دو ایٹم بم انتہائی رازداری سے چھپا رکھے ہیں اور باقی دو ایٹم بموں کو ظاہر کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام علامہ اقبال اور دوسرے کا نام قائداعظم

محمد علی جناح ہے۔"

سفیر نے سمجھ لیا کہ سودے بازی نہیں ہو سکے گی۔ وہ جنرل سے مصافحہ کر کے چلا آیا پھر اس نے بلند مقام اور نیک نام سے باری باری ملاقات کی اور ان سے کہا۔ "نہ جنرل کو نہ ہی ان دونوں کو خریدا جا سکتا ہے۔ اگر پاکستان ہمارے زیر اثر نہ رہا تو جنوبی ایشیا میں ہماری پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔ اگرچہ بھارت سے بھی ہمارے اچھے تعلقات ہیں لیکن بھارت چین' کی طرف زیادہ جھکا ہوا ہے۔ لہٰذا چین اور بھارت کو ان کی سرحدوں تک محدود رکھنے کے لیے یہ تاثر دنیا لازمی ہے کہ امریکا مکمل تیاریوں کے ساتھ پاکستان کے سیاچین گلیشیر میں موجود ہے۔"

"مگر یہ ہو گا کیسے؟ ہمیں تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہم ۱۹۴۷ء والے پاکستان میں پہنچ گئے ہیں۔ سنا ہے اس وقت نہ گھوڑے بکتے تھے نہ لوٹے لڑھکتے تھے اور نہ تھالی کے بیگن ہوا کرتے تھے۔"

سفیر نے کہا۔ "کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ اب یہ صرف تم سیاستدانوں کا داخلی معاملہ نہیں ہے۔ امریکا کی خارجہ پالیسی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ پاکستان رہے گا تو ہمارا رہے گا ورنہ مشرقی پاکستان کی طرح دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا۔"

وہ پاکستانی جو ملک سے باہر رہتے تھے اور بلند مقام اور نیک نام کے ایجنٹ اور آلۂ کار تھے' اپنے امریکی آقاؤں سے ملاقاتیں کر رہے تھے اور اپنے مخالف حالات سے نمٹنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے بنا رہے تھے۔ حالات کا جائزہ لینے سے یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ پاکستان آرمی نے پہلے وطن دشمن سیاستدانوں کا محاسبہ کیوں نہیں کیا تھا؟ دراصل وہ ملک کی سلامتی اور بقا کے لئے بگڑے ہوئے حالات سے سمجھوتا بھی کر رہے تھے اور سیاستدانوں کو وارننگ بھی دیتے آ رہے تھے

وہ ایسا کرنے پر اِس لئے بھی مجبور تھے کہ محبِ وطن سیاستدانوں اور دانشوروں کو اسمبلیوں تک پہنچنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اب علامہ اور قائداعظم جیسے ہم شکل راہنماؤں نے آ کر یہ حوصلہ اور یقین پیدا کیا تھا کہ پاکستان میں آج بھی علامہ اور قائداعظم جیسے بے لوث' محب وطن راہنما پیدا ہو سکتے ہیں۔

ملک دشمن عناصر کی سمجھ میں یہ بھی آ رہا تھا کہ ایسے راہنما اگر پیدا نہ ہوں یا پیدا ہوں تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تو پاکستانی فوج پھر پہلے کی طرح مایوس ہو کر ملک کے بگڑے ہوئے سیاسی حالات سے سمجھوتا کرے گی۔

دشمنوں کو یہ بنیادی بات سمجھ میں آ گئی کہ پہلے فوج کو کسی طرح مجبور کر دیا جائے

اور یہ بھی سوچنے پر مجبور کر دیا جائے کہ ضمیر فروش سیاستدانوں کے ذریعے ہی پاکستان کو دنیا کے نقشے پر برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ انہیں خالص، سچا اور محبِ وطن سیاستداں کبھی نہیں ملے گا۔

پھر یہ طے پا گیا کہ فی الوقت وہ جو دو محب وطن ہیں، انہیں کسی طرح وجود سے عدم کو پہنچا دیا جائے۔ یہ کام اگرچہ آسان نہیں تھا مگر مشکل بھی نہیں تھا۔ ان کی رہائش گاہ کے اطراف مسلح فوجی جوان پہرا دیتے تھے۔ پھر بڑی شاہراہوں اور چوراہوں پر فوجی نظر آتے تھے اسی لئے ملک کے اندر دہشت گردی اور لاقانونیت نہیں رہی تھی۔ تخریب کاری اس وقت ممکن تھی جب فوج کو کسی طرح بیرکوں میں واپس جانے پر مجبور کر دیا جائے۔

بلند مقام اور نیک نام کے آقاؤں نے کہا۔ "یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ فوج ہمارے ارادوں کے مطابق بیرکوں میں نہیں جائے گی لیکن ہماری سازش کے نتیجے میں اس ملک کے اندرونی معاملات سے دست بردار ہو کر سرحدوں کی حفاظت کے لئے جانا پڑے گا۔ کیونکہ مشرقی سرحدوں پر بھارت حملے کرے گا اور شمال مغربی سرحدوں سے وہ افغانی آلۂ کار حملے کریں گے، جو برسوں سے امریکا کا نمک کھا رہے ہیں۔"

اِن آقاؤں نے بھارت کے لیڈروں سے ملاقات کی اور کہا۔ "ہم ایک سیاسی سودا کرنا چاہتے ہیں۔ سودا تمہارے مزاج کے مطابق ہے یعنی پاکستان کے اندر امن و امان کا مسئلہ پیدا کرنا ہے۔"

ایک بھارتی نیتا نے کہا۔ "ہماری خفیہ تنظیم "را" کے ایجنٹوں نے بتایا ہے کہ شہروں میں فوج گشت کر رہی ہے اور اقبال اور جناح کے ہم شکل پیش کر کے وہاں کے عوام کو الو بنایا جا رہا ہے۔"

ایک امریکی ایجنٹ نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر ہم الو بن جائیں۔ وہ دونوں جیسی ذہانت اور حکمت عملی سے پاکستان کی تقدیر بدل رہے ہیں، اس کے پیشِ نظر وہ سچ مچ کے علامہ اور قائداعظم لگتے ہیں۔"

دوسرے امریکی ایجنٹ نے کہا۔ "آپ سب ہندو ہیں اور آواگون کو مانتے ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد پھر جنم لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ کیا آپ عقیدے کے خلاف اس بات سے انکار کریں گے کہ علامہ اقبال اور محمد علی جناح نے آواگون کے مطابق پھر ایک بار جنم لیا ہے؟"

ایک نیتا نے کہا۔ "جب سے ہم نے اخبارات میں ان دونوں کی تصویریں دیکھی ہیں

اور ٹی وی اسکرین پر چلتے پھرتے اور تقریر کرتے دیکھا ہے، تب سے ہمارا عقیدہ کہتا ہے کہ انہوں نے پھر سے اس دنیا میں جنم لیا ہے.......... مگر سیاسی نقطۂ نظر سے عقل یہ بھی کہتی ہے کہ ان کے ہم شکل پیش کر کے کوئی بہت بڑا ڈراما پلے کیا جا رہا ہے۔"

"دیکھئے اگر آپ آواگون کے عقیدے کے مطابق نہ بھی سوچیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن آپ دسہرے کے تہوار میں راون کا پتلا جلاتے ہیں کیونکہ وہ رام کا دشمن تھا اور سیتا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ اسی طرح اقبال اور جناح نے بھی تمہاری بھارت ماں کے ٹکڑے کئے تھے اور تمہاری ماں کے دو ٹکڑوں کو مشرف بہ اسلام کر کے اس کا نام پاکستان رکھ دیا تھا۔ آج وہ اسی پاکستان میں موجود ہیں۔ اگر ہم ان دونوں کو تمہارے حوالے کر دیں اور تم اپنی تمام جنتا کے سامنے فخر سے کہہ سکو کہ تم نے بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے والوں کو گرفتار کر لیا ہے پھر تم تمام ہندوؤں کے سامنے ان دونوں کو راون کی طرح جلاؤ گے تو خود ہی سوچو، تمہاری حکومت کتنی پائیدار ہو گی۔"

بات ایسی ٹھوس اور مدلل تھی کہ بھارتی لیڈر قائل ہو گئے۔ ایک لیڈر نے امریکی ایجنٹ سے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ پاکستان کی مشرقی سرحدوں پر جنگ کا آغاز کریں۔ یہ جنگ صرف دو دنوں کے لئے ہو گی۔ پھر ہم سیز فائر کرا دیں گے۔"

ایک نیتا نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ دو دنوں کے جنگی اخراجات کیا ہوتے ہیں؟"

"ہم آپ کو مطلوبہ مالی امداد دیں گے۔ اس کے علاوہ ہتھیار ہمارے ہوں گے اور فوجی تمہارے۔"

دوسرے نیتا نے پوچھا۔ "اور ان اقبال اور جناح کو کب اور کیسے ہمارے حوالے کرو گے؟"

"جب پاکستانی فوج سرحدوں پر آئے گی تو شہروں میں ہمارے دہشت گردوں کو کھل کر تخریب کاری کرنے کا موقع ملے گا۔ علامہ اقبال اور قائداعظم کہلانے والے دونوں افراد کے اطراف پہلے کی طرح سخت پہرا نہیں رہے گا۔ ہمارے گوریلے فائٹران دونوں کو اغوا کر کے تمہارے ملک میں پہنچا دیں گے۔ اس سلسلے میں ہم باقاعدہ ٹھوس منصوبہ بنائیں گے۔"

پھر منصوبے بنائے جانے لگے۔ اِن سازشی منصوبوں میں ہندو تھے۔ مغربی ممالک کے نمائندے تھے اور پاکستان کے ضمیر فروش سیاستدانوں کے ایجنٹ تھے۔ جن عظیم راہنماؤں نے حصولِ پاکستان کی تحریک ہندوستان سے چلائی تھی، اسی ہندوستان میں اِن

راہنماؤں کو پہنچانے' انہیں پاکستان بنانے کا مجرم گردانتے اور انہیں ہندوؤں کے ہاتھوں سزائے موت دلانے کی پلاننگ کی جا رہی تھی۔

اِدھر بلند مقام اور نیک نام کے خلاف مقدمات کی فائلیں تیار ہو چکی تھیں۔ اُن کے آقا نہیں چاہتے تھے کہ انہیں عدالت میں مقروض اور مجرم ثابت کیا جائے۔ جس دن انہیں عدالت میں پیش ہونا تھا اس سے پہلے ہی رات کو بھارت نے حملہ کر دیا۔ پاکستان میں ہنگامی حالات کا اعلان ہُوا اور فوج سرحدوں کی طرف جانے لگی۔

ملک کے اندر دہشت گردوں کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ عام شاہراہوں پر فائرنگ' بینک ڈکیتی اور اغوا برائے تاوان کی وارداتیں ہونے لگیں۔ پُرامن شہریوں کو گن پوائنٹ پر مجبور کیا گیا کہ وہ علامہ اقبال اور قائداعظم کے خلاف جلوس نکالیں اور اپنے بیانات سے انہیں فراڈ اور غیر ملکی ایجنٹ ثابت کریں۔

فوج کے اعلیٰ افسران نے علامہ اور قائداعظم سے کہا کہ دشمن انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں لہٰذا وہ آرمی ہیڈ کوارٹر میں چلے جائیں مگر انہوں نے کہا۔ "ہمیں جتنا بھی نقصان پہنچایا جائے' وہ کم ہو گا کیونکہ بے قصور عوام کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ ایسے وقت ہمیں عوام کے ساتھ ہونا چاہئے۔"

وہ دونوں عظیم راہنما اخبارات کے ذریعے عوام کو حوصلہ دے رہے تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے یہ سمجھا رہے تھے کہ ملک دشمن عناصر کس طرح اسلامی جمہوری نظام کا راستہ روک رہے ہیں۔ وہ پنڈی اور اسلام آباد کی شاہراہوں پر کھلی گاڑی میں گھوم کر عوام کا حوصلہ بڑھانا چاہتے تھے۔ فوجی افسران نے منع کیا۔ علامہ نے کہا۔ "اگر دشمن ہمیں گولی ماریں گے تو ہم مر جائیں گے لیکن دشمن عناصر کے خلاف عوام کا جوش اور جنون ہمیشہ کے لئے زندہ رہا کرے گا۔"

فوجی افسران دشمنوں سے جنگ کے دوران سرحدوں کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ انہوں نے ایک فوجی افسر اور چار جوانوں کو ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ وہ پانچوں جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔ انہوں نے راہنماؤں سے درخواست کی تھی کہ وہ کھلی گاڑی میں سفر نہ کریں بلکہ لینڈ کروزر میں رہیں اور ہر بڑے چوک پر گاڑی سے اتر کر عوام کو مخاطب کریں۔

انہوں نے یہ تجویز مان لی تھی۔ جس رات پڑوسی ملک نے حملہ کیا' اس کے دوسرے دن وہ دونوں راہنما اپنی رہائش گاہ سے نکلے مسلح فوجیوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر سب سے پہلے اسلام آباد اور پنڈی کے درمیان زیرو پوائنٹ پر آئے۔ گاڑی میں مائیک

اور لاؤڈ اسپیکر کا انتظام تھا۔ وہ دونوں گاڑی سے نکل کر لوگوں کو مخاطب کرنے لگے۔

جس سازشی منصوبے پر عمل ہو رہا تھا اس کے مطابق بلند مقام اور نیک نام کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ اپنے حواریوں اور دہشت گردوں کے ساتھ علامہ اور قائداعظم کی تاک میں رہیں۔ جب اپنی رہائش گاہ سے نکلیں تو انہیں بڑی ہوشیاری سے گھیر کر اسلام آباد سے دور ایک وسیع میدان میں لے آئیں اور موبائل فون کے ذریعے رابطہ رکھیں۔ جیسے ہی فون سے کامیابی کی اطلاع دی جائے گی' ویسے ہی افغانستان کے ایک سرحدی علاقے سے ہیلی کاپٹر آئے گا اور دونوں راہنماؤں کو وہاں سے لے جائے گا۔ بعد میں انہیں ایک خصوصی طیارے کے ذریعے ہندوستان پہنچا دیا جائے گا۔

بلند مقام اور نیک نام نے اپنی اپنی ٹیم بنائی تھی۔ دونوں ٹیموں میں ان کے اپنے ایک ایک مشیر اور اپنی پارٹی کے دو اہم افراد تھے جو اپنے دورِ حکومت میں وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ جدید ہتھیاروں سے لیس دہشت گرد یعنی پالتو غنڈے تھے۔ انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ علامہ اقبال اور قائداعظم پر گولیاں نہ چلائیں۔ صرف اُن کے آس پاس فائرنگ کر کے دہشت زدہ کریں اور انہیں ہانک کر اس میدان کی طرف لے جائیں' جہاں ہیلی کاپٹر آنے والا تھا۔

اِن غنڈوں نے زیرو پوائنٹ پر پہنچتے ہی اپنی گاڑیوں کی کھڑکیوں سے فائرنگ شروع کی۔ فوجی افسر نے فوراً ہی دونوں راہنماؤں کو گاڑی میں بٹھایا۔ دوسرے فوجی جوان جوابی فائرنگ کرتے ہوئے گاڑی میں آ گئے۔ وہ اسلام آباد سے آئے تھے۔ واپس نہیں جا سکتے تھے کیونکہ بلند مقام کی گاڑیاں رکاوٹ بن گئی تھیں۔ وہ پنڈی کا بھی رخ نہ کر سکے۔ اِدھر سے نیک نام کی ٹیم فائرنگ کرتی آ رہی تھی۔ ایسے میں انہیں اسی راستے پر جانا پڑا جہاں دشمن لے جانا چاہتے تھے۔

ایک فوجی جوان بڑی مہارت اور تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ تعاقب کرنے والوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے سے پنڈی کی سمت مڑ جائے لیکن دشمنوں کی گاڑیاں بھی تیز رفتاری سے آ رہی تھیں۔ ان کے تعاقب کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ آگے جانے والی گاڑی کو کسی پختہ سڑک پر مڑنے نہیں دیں گے۔ ایسی صورت میں فوجی جوان کو مجبوراً ایک کچے راستے پر گاڑی کو لے جانا پڑا۔

دونوں سیاستداں خوش تھے۔ آگے والی گاڑی اُن کی مرضی کے مطابق اسی میدان کی سمت جا رہی تھی۔ بلند مقام موبائل فون کے ذریعے کسی کو مخاطب کر رہا تھا اور ہیلی کاپٹر لانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ یہ یقین تھا کہ علامہ اور قائداعظم کی مدد کرنے مزید فوجی یا

پولیس والے نہیں آ سکیں گے۔ کیونکہ فوجی جوان سرحدوں کی حفاظت میں مصروف تھے اور پولیس والے شہر کے اندر امن و امان کے مسئلے میں الجھے ہوئے تھے۔ دونوں راہنماؤں کے ساتھ صرف پانچ محافظ تھے۔ ان کے مقابلے میں بلند مقام اور نیک نام کے مسلح غنڈوں کی تعداد تین گنا تھی۔

ہیلی کاپٹر کے آنے میں کم از کم آدھا گھنٹا ضرور لگتا۔ اِدھر فوجی جوان اتنی تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا کہ اس رفتار سے اس مخصوص میدان کو پار کر چکا تھا' جہاں ہیلی کاپٹر کو پہنچنا تھا۔ بلند مقام اور نیک نام نے اپنے ڈرائیوروں سے کہا۔ "رفتار تیز کرو۔ اسے آگے جانے سے روکو اور گھیر کر میدان میں واپس لاؤ۔"

اگر وہ آگے جانے والی گاڑی تک پہنچتے تو فائرنگ کے ذریعے اس کے ڈرائیور کو میدان کی سمت واپس لے آتے یا گاڑی کے پہیئے پر فائر کر کے اسے رکنے پر مجبور کر دیتے لیکن اس لینڈ کروزر کے پہیئے اسٹیل کے مڈگارڈ سے چھپے ہوئے تھے۔ اس لیے بلٹ پہیوں کو برسٹ نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے کئی بار ناکام فائرنگ کی۔ پھر اس گاڑی کے اور قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔

انتظار طول پکڑ رہا تھا۔ آگے پیچھے دوڑنے والی گاڑیاں اب درختوں اور پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھیں۔ کوئی پون گھنٹے بعد فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ ایسے ہی وقت لینڈ کروزر ایک جگہ رک گئی۔ اِس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اب اُس خرابی کو معلوم کرنے اور اسے دور کرنے کا موقع نہیں تھا۔ پیچھے دشمن آ رہے تھے۔ وہ سب گاڑی سے اتر کر اسلحہ کی کیٹ وغیرہ اٹھا کر پتھروں اور چٹانوں کی آڑ میں چلنے لگے تاکہ دشمنوں کی طرف سے ہونے والی فائرنگ سے محفوظ رہ سکیں۔

وہ لوگ دور ہی گاڑی سے اترنے کے بعد فائرنگ کر رہے تھے اور جوابی فائرنگ سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں تین غنڈے مارے گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے فائرنگ رک گئی۔ ہیلی کاپٹر فضا میں پرواز کرتے ہوئے چکر کاٹ رہا تھا۔ اس میں بیٹھا ہوا شخص موبائل فون کے ذریعے بلند مقام سے کہہ رہا تھا۔ "تمہارے دشمن نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اُدھر ایک غار ہے۔ شاید اس میں جا چھپے ہیں۔"

بلند مقام نے کہا۔ "ہم انہیں غار سے نکلنے نہیں دیں گے۔ تم ہیلی کاپٹر میدان میں اتار کر یہاں چلے آؤ۔"

اس نے فون بند کر کے ایک پالتو غنڈے سے کہا۔ "تم آگے بڑھو اور دیکھو وہ غار میں ہیں یا نہیں؟"

وہ بولا۔ "جناب! آپ کے حکم پر جان دے سکتا ہوں لیکن دوسری پارٹی کے آدمی کو بھی میرے ساتھ جانا چاہیے۔"

نیک نام نے کہا۔ "ٹھیک ہے' میرا بھی ایک بندہ تمہارے ساتھ جائے گا۔"

اس نے بھی اپنے ایک پالتو غنڈے کو غار کی طرف جانے کا حکم دیا۔ وہ دونوں دبے پاؤں محتاط انداز سے چلتے ہوئے اُدھر جانے لگے اور للکارنے لگے۔ "تم سب چھپ نہیں سکو گے۔ بہتر ہے' ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔"

انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ دونوں خطرہ مول لے کر غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے پھر للکارا۔ شام ہو رہی تھی۔ غار کے اندر ذرا دور تک دھیمی روشنی تھی اور جہاں تک روشنی تھی' وہاں تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

انہوں نے پھر للکارنے کے بعد کلاشنکوف سے غار کے اندر اندھا دھند فائرنگ کی۔ لیکن اس فائرنگ کا بھی جواب نہیں ملا۔ ایک غنڈے نے بلند مقام کو آواز دے کر کہا۔ "جناب عالی! وہ لوگ اِدھر نہیں ہیں۔"

بلند مقام اور نیک نام اپنے حواریوں اور غنڈوں کے ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے وہاں آ گئے۔ تھوڑی دیر پہلے جو فائرنگ کی گئی تھی اس کے نتیجے میں غار کے اندر اوپری حصے سے مٹی جھڑ رہی تھی اور کچھ کنکر پتھر گر رہے تھے۔ نیک نام نے پوچھا۔ "آخر وہ کہاں چلے گئے ہیں؟"

ایک نے کہا۔ "یہ بہت وسیع و عریض غار ہے۔ پتا نہیں کتنی دور تک ہو گا۔ وہ اسی کے اندر کہیں جا کر چھپ گئے ہیں۔"

بلند مقام نے موبائل فون کے ذریعے ہیلی کاپٹر میں آنے والے کو مخاطب کیا' کہا۔ "تم اِدھر نہ آؤ۔ ہیلی کاپٹر میں اس پہاڑ کے چاروں طرف پرواز کرو۔ اس غار کے اندر والے پہاڑ کے دوسری طرف کسی دوسرے دہانے سے نکل کر فرار ہو سکتے ہیں۔ اگر نظر آئیں تو فائرنگ کے ذریعے انہیں فرار ہونے سے روکو۔"

غار کے اندر خاصی کشادہ جگہ تھی۔ دور اندر تک کہیں راستہ چلا گیا تھا۔ غار کی چھت کہیں اونچی تھی کہیں نیچی اور کہیں کہیں قدرتی طور پر زمین سے چھت تک پتھریلے ستون نظر آ رہے تھے۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے بھاری پتھر اور اونچی نیچی چٹانیں تھیں۔

اقبال اور قائداعظم فوجی جوانوں کے ساتھ ایک بڑی چٹانی دیوار کے پیچھے کھڑے فون پر ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ فوجی افسر نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ "یہ بلند مقام کی ہے اور یہ کمبخت بڑے زبردست انتظامات کے ساتھ آپ دونوں حضرات کو نقصان

پہنچانے آیا ہے۔ ان کے پاس ہیلی کاپٹر بھی ہے۔"

قائداعظم نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔ "۱۹۴۷ء سے پہلے جب حصولِ پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی تو برصغیر کا ایک ایک مسلمان میرا دوست اور میرا معتقد تھا اور مجھ پر جان نچھاور کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ آج میرے پاکستان کے یہ مسلمان جان کے دشمن بن کر صرف مجھ سے نہیں، پورے ملک اور پوری قوم سے دشمنی کر رہے ہیں۔"

علامہ نے کہا۔ "ہمارے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر بھی ایسا ہی ایک وقت آیا تھا۔ جب انہوں نے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک غار میں پناہ لی تھی۔ ایک مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا بُن دیا تھا۔ تعاقب کرنے والے دشمنوں نے مکڑی کے جالے کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی اندر جاتا تو مکڑی کا یہ جالا ٹوٹا ہوا نظر آتا۔ اپنی جان بچانا اور پھر نئی حکمت عملی سے دشمنوں کو زیر کرنا سنتِ رسولؐ ہے۔"

فوجی افسر نے سرگوشی میں کہا۔ "اس غار سے باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ جہاں سے ہم داخل ہوئے ہیں، وہیں سے باہر نکلا جا سکتا ہے اور وہ دیکھیں، دشمن غار کے اندر چلے آئے ہیں۔"

انہوں نے چٹان کے پیچھے سے دیکھا۔ بلند مقام، نیک نام، ان کے حواری اور مسلح غنڈے نظر آ رہے تھے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر قدم آگے بڑھاتے ہوئے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے اور مختلف بڑے پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے انہیں تلاش کر رہے تھے۔

فوجی افسر اور مسلح جوان اِن بزرگ راہنماؤں کے ساتھ اس چٹان کے پیچھے سے ہٹ گئے۔ دبے قدموں چلتے ہوئے وہاں سے دور جانے لگے۔ ایسے وقت نیک نام کی آواز غار میں گونج رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ابھی ہمیں فون پر بتایا گیا ہے کہ اس غار سے نکلنے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے تم لوگ یہیں کہیں چھپے ہوئے ہو۔ اب ذرا سوچو کہ کب تک چھپے رہو گے؟ ہمارے لئے باہر سے اور امداد آ رہی ہے۔ تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔ اگر ہتھیار پھینک دو گے تو ہمارا وعدہ ہے کہ ہم کسی کو گولی نہیں ماریں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کچھ فاصلے پر چھت سے تھوڑی مٹی اور کچھ چھوٹے سے پتھر گرے۔ انہوں نے سمجھا پیچھے سے حملہ ہونے والا ہے۔ ان میں سے کئی مسلح غنڈوں نے تیزی سے پلٹ کر فائرنگ کی مگر نشانے پر کوئی نہیں تھا۔ گولیاں دیواروں، ستونوں اور چٹانوں سے ٹکرائیں۔ اس کے ساتھ ہی دیواروں اور چھتوں سے مٹی اور پتھر ٹوٹ کر

گرنے لگے۔ فائرنگ بند ہو گئی تھی مگر آوازیں دیر تک غار کی محدود فضا میں گونجتی رہی تھیں۔

بلند مقام نے ڈانٹ کر مسلح غنڈوں سے کہا۔ "یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں فائرنگ کے نتیجے میں پتھر ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ اگر کوئی بھاری پتھر ہم پر آ کر گرے گا تو دشمن ہماری لاش پر جشن منائیں گے۔ خبردار! کوئی میرے حکم کے بغیر گولی نہ چلائے۔"

دونوں راہنما ایک دوسری چٹان کے پیچھے آ گئے تھے۔ فوجی افسر نے کہا۔ "پتا نہیں ہیلی کاپٹر میں کتنے مسلح افراد ہوں گے۔ دوسری طرف غار کا راستہ نہ پا کر ابھی اِدھر آئیں گے۔"

ایک فوجی جوان نے کہا۔ "ہم فائرنگ کرتے ہوئے اور ان سے مقابلہ کرتے ہوئے باہر جا سکتے ہیں لیکن فائرنگ کے نتیجے میں اوپر سے پتھر ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں۔ اس طرح ہمارے قائدین............ کو نقصان پہنچے گا۔"

قائداعظم نے کہا۔ "ہمارے نقصان کی پرواہ نہ کرو۔ تم لوگ اپنے ملک، قوم کے اور سرحدوں کے محافظ ہو۔ تم ہماری بھی حفاظت کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پاک فوج کے جوان اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں، میں جان بوجھ کر پوچھ رہا ہوں کیا ہمارے ساتھ بھی جان پر کھیلو گے؟"

"سر! ہم آپ کے ایک اشارے پر ابھی جان دے دیں گے لیکن پہلے آپ حضرات کو یہاں سے زندہ سلامت لے جانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ناکامی ہو گی تو دشمنوں کو فنا کرتے کرتے خود فنا ہو جائیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "فرض کرو، اس جنگ میں ہمارا خاتمہ ہو گا اور دشمن یہاں سے واپس جائیں گے تو کیا ہو گا؟ وہی ہو گا۔ ان کی وہی حکمرانی قائم ہو جائے گی۔ ضمیر فروشی اور ملک کو گروی رکھنے کی پالیسیوں پر حکمرانی جاری رہے گی۔"

علامہ نے کہا۔ "اپنے قائداعظم کی باتوں کو سمجھو۔ پاکستان کی سابقہ تمام سیاسی غلاظتوں کو یہیں ختم کر دو۔"

"آپ بزرگوں کا حکم سر آنکھوں پر۔ کیا ہم انہیں نشانہ بنائیں؟"

قائداعظم نے کہا۔ "نہیں انہوں نے جو جال ہمارے لئے بچھایا ہے ہم اسی جال میں انہیں پھانسنا چاہتے ہیں۔ بلند مقام، نیک نام اور اس کے حواریوں پر گولی نہ چلانا۔ ابھی علامہ نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارک کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ میں چاہتا ہوں، آج ہم اس اسلامی تاریخ کو دہرائیں۔ میرے جوانو! اس غار کے دہانے پر ایسا مضبوط جالا بن دو کہ

یہاں سے کوئی باہر نہ جا سکے اور باہر سے کوئی اندر نہ آ سکے۔"

فوجی افسر اور جوانوں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دشمنوں کا راستہ روکنے کے لئے غار کے دہانے پر کس قسم کا مضبوط جالا بنایا جا سکتا ہے؟

انہوں نے کہا۔ "ابھی ہم نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جب فائرنگ کی جاتی ہے تو چھت کی اور دیواروں کی مٹی جھڑتی ہے اور پتھر ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ ایسا فائرنگ کے نتیجے میں ہوتا ہے اگر تم ہینڈ گرینیڈ کا دھماکا دہانے کی طرف کرو تو کیا نتیجہ نکلے گا؟"

افسر نے کہا۔ "سر! میں سمجھ گیا۔ دہانے کی طرف بم کے ایک دو دھماکے کئے جائیں تو اس حصے کی تمام چٹانیں ٹوٹ جائیں گی۔ چھوٹے بڑے پتھروں اور ملبے کا ایسا ڈھیر ہو گا کہ غار کا دہانہ بند ہو جائے گا۔"

"ہاں' یہی مکڑی' کا جالا ہو گا۔ پھر کوئی دشمن باہر نہیں نکل سکے گا۔"

"ابھی حکم کی تعمیل ہو گی سر! آپ حضرات دو جوانوں کے ساتھ غار کے اندر دور تک چلے جائیں۔ ہم اپنا کام کر کے آپ کے پاس چلے آئیں گے۔"

وہ دونوں راہنما دو جوانوں کے ساتھ غار کے اندرونی حصے میں زیادہ سے زیادہ دور تک جانے لگے۔ نیک نام کے حواری نے کہا۔ "آپ لوگ ذرا کان لگا کر سنیں۔ قدموں کی دھیمی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ وہ لوگ غار کے اندرونی حصے میں چھپتے پھر رہے ہیں۔"

پھر کسی نے کہا۔ "ہمیں بھی اُدھر چلنا چاہئے۔ آؤ محتاط رہ کر آگے بڑھو۔"

وہ سب دہانے سے دور غار کے اندر آگے جانے لگے۔ اسی وقت ایک زبردست سا دھماکہ ہوا۔ وہ دھماکا ایسا غیر متوقع تھا کہ سب کی چیخیں نکل پڑیں۔ وہ غار کے اندر دور تک دوڑنے لگے۔ چھت کی چٹانیں اور پتھر ٹوٹ کر مٹی کے بڑے بڑے تودوں کے ساتھ گر رہے تھے۔ ان سب کو جہاں پناہ مل رہی تھی وہاں چٹانوں کے سائے میں جا کر پتھروں کی بارش سے بچ رہے تھے۔

بڑی دیر تک پتھروں کی بارش ہوتی رہی۔ چٹانوں کے ٹکڑے اِدھر سے اُدھر جا کر دیواروں سے ٹکراتے رہے۔ مٹی دھول کا غبار اس طرح پھیل رہا تھا کہ سب کھانسنے لگے تھے۔ ایسی گہری تاریکی چھا گئی تھی کہ کوئی کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ غار کی چھت اور دیواریں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ باہر سے شام کو جو ڈوبتی ہوئی روشنی اندر آ رہی تھی' اس کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھی کہ غار کا دہانہ پوری طرح بند

ہو چکا ہے۔ نہ روشنی' نہ باہر کی تازہ ہوا اندر آ سکتی تھی اور نہ ہی اندر سے کوئی باہر جا سکتا تھا۔

چھت اور دیواروں سے بے تحاشا ملبہ گر چکا تھا اور ابھی گرتا ہی جا رہا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اب باہر نکلنا ممکن نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس کدال اور بیلچے ہوتے تو وہ ساری رات ملبہ ہٹانے کے لئے محنت کرتے رہتے' تب شاید انہیں باہر نکلنے کا راستہ ملتا۔

لیکن ان سب کے پاس طرح طرح کے ہتھیار تھے' کدال اور بیلچے نہیں تھے۔ ان میں سے دو چار کے پاس لمبے پھل والے چاقو تھے اور وہ چاقوؤں سے پتھروں اور چٹانوں کو توڑ کر راستہ نہیں بنا سکتے تھے۔

کوئی انسان کبھی زندہ قبر میں جا سکتا ہے؟ اگر کوئی تجربہ کے طور پر گیا ہو گا تو وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ علامہ اور قائداعظم کے ساتھ زندہ درگور ہونے والے اب کیسے کیسے عذابوں میں مبتلا ہوں گے؟

ویسے تمام زندہ انسان اتنا ضرور جانتے ہیں کہ قبر کے اندر گہری تاریکی ہوتی ہے۔ وہاں قدرتی طور پر چاند سورج بھی اپنی روشنی نہیں پہنچا سکتے اور نہ ہی کسی بجلی گھر سے ٹیوب اور بلب کا کنکشن دیا جاتا ہے۔ وہ غار جو کئی زندہ انسانوں کا مدفن بن گیا تھا' وہاں بھی روشنی پہنچنے کے تمام ذرائع ختم ہو چکے تھے۔ ہاں مگر فوجیوں کی کِٹ میں ایک ٹارچ موجود تھی۔ بلند مقام' نیک نام اور ان کے حواریوں کے پاس سگریٹ جلانے کے لئے ماچس اور لائٹر وغیرہ تھے۔

سب چاہتے تھے کہ تاریکی میں روشنی ہو لیکن پہلے کون ٹارچ روشن کرے گا؟ کون اپنا لائٹر یا ماچس جلائے گا؟

ہر ایک کے دل کو یہ دھڑکا تھا کہ جدھر روشنی ہو گئی' اسی طرف دشمن کی گولی آئے گی۔ اب کسی دشمن سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ تم ہمیں گولی نہ مارنا۔ آخر ہر ایک نے اپنے پاس ہتھیار' اپنے مخالف کو معاف کرنے کے لئے نہیں رکھے تھے۔ موقع تو ایسے ہی وقت ملتا ہے' جب ایک سے ذرا چوک ہوتی ہے اور دوسرے کا ہتھیار کام آ جاتا ہے۔

ایسی گہری تاریکی میں بلند مقام کو موبائل پر اشارہ موصول ہوا۔ شاید ہیلی کاپٹر والے رابطہ کر رہے ہوں گے۔ یہ اچھا موقع تھا وہ انہیں اپنی مدد کے لئے بلا سکتا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے خیال آیا کہ وہ گہرے سناٹے میں فون پر کچھ بولے گا تو اس کی طرف گولی آئے گی۔ اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔

عجیب مشکل تھی۔ وہاں زندہ لوگ نہ بول سکتے تھے نہ اندھیرے میں چراغ جلا سکتے تھے اور نہ ہی تاریکی میں بے زبانی سے زندگی گزار سکتے تھے۔ اس مدفن میں تو ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہاں کے حبس اور گھٹن میں صبح تک اپنی سانسیں تمام کرلیں گے اور یہی ان کی مدتِ حیات ہوگی۔

پھر اس تاریکی اور خاموشی میں قائداعظم کی آواز ابھری۔ "اے بدبخت سیاستدانو! یہ وہی تاریکی ہے جو تم نے میرے پاکستان میں پھیلا رکھی تھی۔ یہ وہی زبان بندی ہے' جو تم نے میرے وطنِ عزیز میں روا رکھی تھی اور یہ وہی حبس اور گھٹن ہے' جس میں عوام برسوں سے گھٹ گھٹ کر جیتے رہے ہیں اور مرتے رہے ہیں۔"

علامہ کی آواز ابھری۔ "اور سنو کہ ہماری زبان بند نہیں ہے۔ اٹھاؤ ہتھیار اور ہماری آواز کی سمت فائر کرو۔ کیا ایسا کر سکو گے؟ تم سب شکاری ہو مگر سہمے ہوئے ہو۔ تمہاری بندوق سے گولی چلے گی تو تاریکی میں شعلہ سا لپکے گا۔ ہمارے فوجی جوان اس شعلے کی سمت جوابی فائر کریں گے۔ اب ذرا غور کرو' کیا ہم میں سے یا تم میں سے کوئی ہتھیار استعمال کر سکتا ہے؟"

بلند مقام نے ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے بیٹھ کر کہا۔ "آپ درست فرماتے ہیں۔ فائرنگ یوں بھی نہیں کرنا چاہئے کہ چھت اور دیواروں سے پتھر اور چٹانیں ٹوٹ کر گرنے لگتی ہیں۔"

نیک نام نے ایک چٹان کے پیچھے سے کہا۔ "بے شک ہم ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں کہ یہاں ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار استعمال نہیں کر سکیں گے۔"

فوجی افسر نے کہا۔ "ایک بات یاد رکھو کہ ہم فوجیوں کے پاس ہینڈ گرینیڈ ہیں۔ صرف ایک دھماکے سے تم نے دیکھ لیا کہ باہر جانے کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ اگر تم میں سے کوئی کمینگی دکھائے گا یا ہمیں زیر کرنے کے لئے کوئی حرکت کرے گا تو دوسرے اور تیسرے دھماکے میں یہ پورا پہاڑ ہم سب پر آ گرے گا۔"

"ہم تمہاری مرضی کے خلاف کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ ہم دشمنی سے باز آتے ہیں اور دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔"

"دوست بننے کا وقت گزر چکا ہے۔ رہی دشمنی تو ہمارے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

بلند مقام نے کہا۔ "تم فوجی ہو۔ تمہارے پاس روشنی کا کوئی انتظام ہو گا۔ یہاں تاریکی میں گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

قائداعظم نے کہا۔ "آخر ملک کے حکمران بنتے آئے ہو تمہارا محل' تمہارا دفتر' تمہاری کار حتیٰ کہ تمہارا ٹائلٹ بھی ائرکنڈیشنڈ رہتے تھے۔ یہاں پہلی بار گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھوڑی تھوڑی سی ہوا مل رہی ہے۔ گھٹن سے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ تم لوگ بجلی کی روشنی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب بجلی چلی جاتی ہے تو تم لوگ بھاری بھرکم جنریٹر کے ذریعے اپنے محل روشن کرلیتے ہو۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولے۔ "ہم نے چند دنوں میں بہت سی معلومات حاصل کی ہیں۔ یہاں اسپتالوں میں بجلی جاتی ہے تو آپریشن ادھورا رہ جاتا ہے اور مریض مرجاتا ہے۔ اگر تمہارے محلوں کے جنریٹران اسپتالوں میں ہوں تو آپریشن ادھورا نہ رہے۔ مریض نہ مرے۔ گرمی اور حبس کے باعث مریض عورتوں' بچوں اور بوڑھوں پر بیہوشی طاری نہ ہو۔ ذرا سوچو' اس وقت تم سب اپنے اعمال کے آپریشن تھیٹر میں ہو۔ روشنی تو ابھی ٹارچ کے ذریعے ملے گی۔ مگر ٹھنڈی ہوا کے لیے ائرکنڈیشنر کہاں سے لاؤ گے؟"

بلند مقام نے کہا۔ "ہم اپنی غلطیوں اور تمام جرائم کو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ مزید طعنے نہ دیں۔ ہم سب کو ٹارچ روشن کر کے یہاں سے باہر جانے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

ایک ٹارچ روشن ہو گئی۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے نیم تاریکی تھی اور سامنے دور تک روشنی پھیل گئی تھی۔ قائداعظم نے کہا۔ "لو روشنی ہو گئی۔ اب یہ بتاؤ کہ باہر جا کر کیا کرو گے؟"

"آپ جو حکم دیں گے وہی کریں گے۔"

"میں نے تو پاکستان بنتے ہی حب الوطن شہری اور غیرت مند مسلمان بننے کی بہت ہی سیدھی راہیں دکھائی تھیں۔ کیا تم لوگ ان راہوں پر چل رہے تھے؟"

"ہم گمراہ ہو گئے تھے۔ اب آپ کے فرمان پر چلیں گے۔ آپ نے جو راستہ بتایا تھا اسی کے مطابق حکومت کریں گے۔"

"آج تک کوئی فرعون اپنے مدفن سے نکل کر مسندِ اقتدار پر نہیں آیا اور تم ہو کہ اپنی قبر میں بیٹھ کر دوبارہ دنیا میں جانے اور حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہے ہو۔"

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم یہ ملبہ ہٹا کر باہر جا سکتے ہیں۔"

"تو پھر جاؤ۔ دور تک روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ مشقت کرو۔ ملبہ ہٹاؤ اور باہر چلے جاؤ۔"

بلند مقام نے موبائل فون آن کیا۔ پھر ہیلی کاپٹر والوں سے رابطہ کیا۔ مگر رابطہ نہ ہونے پر عجیب سی بے ربط اور شکستہ سی آوازیں رک رک کر آ رہی تھیں۔ وہ بار بار

ہیلو ہیلو کہہ رہا تھا۔ موبائل فون کی خرابی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوجی افسر نے کہا۔ "میرے پاس بھی ایک پاکٹ ٹرانسسٹر ہے مگر اتنی عقل ہے کہ قبر چاروں طرف سے بند ہو تو بیرونی دنیا سے آواز کا رابطہ ایسا ہی شکستہ اور ناقابلِ فہم ہوتا ہے۔ تمہارے موبائل فون کا ایریئل کام نہیں کرے گا۔"

اس نے موبائل فون کو بند کر کے آدمیوں سے کہا۔ "تم سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔ اُدھر ملبے کی طرف جاؤ اور اسے کسی طرح ہٹاؤ۔ باہر نکلنے کا راستہ بناؤ۔"

نیک نام نے بھی اپنے آدمیوں کو یہی حکم دیا۔ ان میں سے چار افراد کے پاس چاقو تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے چاقو کھول لیے۔ ایک نے کہا۔ "ان سے صرف مٹی ہٹائی جا سکے گی اور مٹی ہاتھوں سے بھی ہٹائی جا سکتی ہے لیکن پتھر اور چٹانوں کو کیسے توڑا جا سکے گا؟"

"پتھر سے پتھروں کو مار مار کر توڑو۔ اسی طرح چٹانوں کو توڑنے کی کوششیں کرو۔ یہاں سے رہائی پانے کے لیے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

قائداعظم نے کہا۔ "رہائی پانے کے لیے کچھ کرنا نہیں بلکہ بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے برصغیر کے مسلمانوں اور انگریزوں کی غلامی سے اور ہندو بنئے کی سیاست سے نجات دلانے کے لیے دن رات محنت کی ہے۔ آج تم سب کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔"

دونوں سیاسی لیڈر ابھی تک پتھروں کے پیچھے تاریکی میں چھپے ہوئے تھے۔ سامنے روشنی میں نہیں آ رہے تھے۔ صرف ان کے آٹھ آدمی ملبہ ہٹانے کے لیے دہانے کی طرف جا رہے تھے۔ علامہ نے پوچھا۔ "اور باقی لوگ کہاں ہیں؟"

بلند مقام نے کہا۔ "میری پارٹی کے دو اہم ستون ہیں۔ یہ دونوں میرے ساتھ رہتے ہیں اور میرے دورِ حکومت میں اہم وزارتیں سنبھالتے ہیں۔"

علامہ نے کہا۔ "نیک نام! تمہارے ساتھ بھی تمہاری پارٹی کے اہم ستون ہوں گے۔ تم دونوں اپنے اہم ستونوں کے ساتھ روشنی میں آ جاؤ۔"

تاریکی سے نیک نام کی آواز آئی۔ "آپ حضرات کو بھی روشنی میں ہمارے سامنے آنا چاہیے۔"

"فی الحال تم سب وہی کرو جو کہا جا رہا ہے۔"

نیک نام نے کہا۔ "آپ ایسے حکم دے رہے ہیں جیسے ہم پر غالب آ گئے ہیں۔ مانا کہ آپ کے پاس ہینڈ گرینیڈ ہیں۔ آپ مزید دھماکے کر کے یہ پورا پہاڑ ہم پر گرا دیں گے اور

یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے ساتھ خود بھی دب کر مر جائیں گے۔ اس دعوے میں کہاں تک صداقت ہے؟ کیا آپ لوگوں کو اپنی زندگیوں سے محبت نہیں ہے؟"

"اگر ایک منٹ میں ہمارے سامنے نہیں آؤ گے تو دوسرا منٹ شروع ہوتے ہی پھر یہاں کی دیواریں اور ستون ٹوٹیں گے اور چھت سے پتھروں کی بارش ہوگی۔"

نیک نام نے تاریکی میں ایک طرف منہ کر کے پوچھا۔ "مسٹر بلند مقام! تم کیا کہتے ہو؟ کیا ہم بازی ہار رہے ہیں؟"

بلند مقام کی آواز آئی۔ "اگرچہ یہ دونوں اصلی نہیں ہیں تاہم علامہ اور قائداعظم جیسی سیاسی ذہانت دکھا کر ہمیں روشنی میں لانا چاہتے ہیں۔ یہ تو موٹی عقل سے بھی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں پاکستان کی سیاست اور اس کا مقدر بدلنے آئے ہیں اس لیے یہاں سے باہر ضرور جائیں گے۔ اس غار میں خودکشی نہیں کریں گے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ ہلکی سرگوشیوں کی آواز ابھرتی رہی۔ جیسے فوجیوں سے مشورے کیے جا رہے ہوں پھر علامہ نے کہا۔ "ہم کس طرح اپنی جان پر کھیل سکتے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ دیکھو۔"

ان کی بات ختم ہوتے ہی پانچ فوجی جوانوں نے بیک وقت فائرنگ کی۔ تڑاتڑ گولیاں چلنے کی آوازوں کے ساتھ ہی ملبے کے پاس کام کرنے والے پانچ غنڈوں کی لاشیں گریں۔ باقی اِدھر اُدھر چھلانگیں مار کر تاریکی میں چلے گئے۔ فائرنگ بند ہو گئی لیکن دیواروں سے مٹی جھڑنے لگی۔ چھت سے پتھر ٹوٹ کر گرنے لگے۔ پھر گرد و غبار پھیلنے لگا۔ سب کھانسنے اور منہ اور ناک کو کپڑوں سے ڈھانپنے لگے۔ ایک ٹارچ کی روشنی تھی جو غبار کے باعث دھندلا گئی تھی۔

بڑی دیر تک کسی کو کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر غبار بیٹھنے لگا۔ غار کی دیواریں، ستون، پتھر اور چٹانیں واضح نظر آنے لگیں۔ فوجی افسر کی آواز گونجنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہم بم کا دھماکہ بھی کر سکتے تھے لیکن نمونہ دکھانے کے لیے صرف فائرنگ کی ہے اور تمہارے پانچ پالتو کتے مارے ہیں۔"

علامہ نے کہا۔ "ویسے فائرنگ کا بھی نقصان دیکھو کہ تمہارے آدمی کم ہو گئے اور ملبہ کچھ اور بڑھ گیا۔ اب بتاؤ روشنی میں آ رہے ہو یا کچھ اور نمونے دکھائے جائیں۔"

بلند مقام کی آواز آئی۔ "ہم یہاں دب کر مرنا نہیں چاہتے۔ ہم سامنے آ رہے ہیں لیکن ہمارے جو آدمی سامنے تھے، انہیں آپ لوگوں نے مار ڈالا۔ آپ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

فوجی افسر نے کہا۔ ”تو پھر پیچھے رہو۔ ہم ایک منٹ بعد چھت کی طرف گولیاں برسائیں گے۔ تم سب کے لیے پتھروں کی بارش مناسب رہے گی۔“

ایک منٹ کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ سب پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے سے نکل کر روشنی میں آگئے۔ چونکہ روشنی کے قریب تھے اس لیے پیچھے ان کے سائے دور تک پھیل گئے تھے بقول شاعر؂

روشنی کے پاس ہیں تو ہوگیا سایہ طویل
ورنہ سچ پوچھیں تو ان جسموں کا قد کچھ بھی نہیں

بلند مقام اور نیک نام کے ساتھ ان کی پارٹیوں کے دو اہم سیاستداں بھی تھے۔ ان کے علاوہ دو تین غنڈے تھے جو پچھلی فائرنگ سے بچ گئے تھے۔ فوجی افسر نے گرج کر حکم دیا۔ ”وہ جس پتھر پر ٹارچ رکھی ہوئی ہے اسی پتھر کے پاس زمین پر تمام ہتھیار پھینک دو۔“

بلند مقام نے کہا۔ ”آپ حضرات نے ہمیں ایسے غیر متوقع مصائب میں مبتلا کر کے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ہمارا ضمیر بیدار ہو گیا ہے۔ آپ ایک بار ہم پر بھروسا کریں۔ آپ حکم دیں گے تو ہم ہمیشہ کے لیے سیاست چھوڑ دیں گے۔“

”ہمیں ایسی باتوں سے نہ بہلاؤ۔ سیاست کیسے چھوڑو گے؟ یہاں سے باہر جاؤ گے تو کروڑوں اور اربوں روپے کے قرضوں کی ادائیگی سے بچنے کے لیے پھر سیاسی داؤ پیچ سے کام لو گے۔“

نیک نام نے کہا۔ ”ہم اپنی تمام زمینیں بیچ کر قرضہ ادا کریں گے۔“

”ہم کبھی یقین نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود اجازت دیتے ہیں کہ مشقت کرو۔ ملبہ ہٹاؤ اور باہر چلے جاؤ۔

بلند مقام نے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔ پلیز ایک احسان اور کریں۔ ہمارے پانچ ملازمین ابھی مارے گئے ہیں۔ صرف تین رہ گئے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ آپ کے فوجی بھی ملبہ ہٹانے میں مدد کریں تو شاید ہم صبح تک باہر نکل جائیں گے۔“

فوجی افسر نے کہا۔ ”جسے باہر جانا ہو گا‘ وہی ملبہ ہٹائے گا۔ ہم نے اپنے دونوں قائدین کو زبان دی ہے کہ ان کے ساتھ یہیں جانیں دیں گے۔ اب جان نہ دینے اور زندگی بچا کر باہر جانے والوں میں تم سات عدد رہ گئے ہو۔ اگر تین کو صرف ملازم کہو گے اور اس مدفن میں بھی خود کو آقا سمجھتے رہو گے تو ملبہ نہیں ہٹا سکو گے۔ وقت تم جیسے آقاؤں کو غلام سمجھ کر چابک مار رہا ہے۔ جاؤ مشقت کرو۔“

وہ تین تابعدار تھے۔ ملبے کی طرف چلے گئے۔ بلند مقام نے اپنی پارٹی کے دو اہم ستونوں سے کہا۔ ”ہم پر یہ بُرا وقت آگیا ہے۔ باہر کسی طرح جانے کے لئے تم دونوں کو ملبہ ہٹانا چاہئے۔“

ان میں سے ایک اہم ستون نے پوچھا۔ ”اور آپ ہم معزز سیاستدانوں کو غلامی کرتے ہوئے دیکھتے رہیں گے؟ ہم وی آئی پی ہیں۔ آپ وی وی آئی پی بن کر ہم سے مشقت کرائیں گے۔ باہر آپ کو بھی جانا ہے۔ آپ بھی محنت کریں۔“

نیک نام کے اہم ستونوں نے بھی یہی جواب دیا۔ نیک نام نے کہا۔ ”جب ہم اقتدار میں رہتے ہیں تو ہم سے وزارتیں لینے کے لئے ہمارا چھوٹے سے چھوٹا‘ ادنیٰ سے ادنیٰ کام بخوشی کرتے ہو۔ آج یہ ملبہ ہٹانے سے انکار کر رہے ہو؟“

”انکار نہیں کر رہے ہیں۔ دکھ سکھ میں ساتھ دینے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ مشقت کریں۔“

بلند مقام نے کہا۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں تمہاری سیاسی پارٹی کا لیڈر ہوں۔ ایک محترم راہنما ہوں۔“

”کیسے محترم راہنما ہو۔ ہمیں جیتے جی قبر میں پہنچا کر یہاں بھی آقا اور جاگیردار بنے ہوئے ہو۔“

بلند مقام اور نیک نام نے بڑی مجبوری اور بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کبھی اپنے جوتے نہیں پہنتے تھے۔ پھر مٹی دھول ہٹانے والی محنت کیسے کر سکتے تھے؟

بلند مقام نے کہا۔ ”ہمیں انتظار کرنا چاہئے۔ ہیلی کاپٹر والوں کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ ہم اس غار میں بند ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ باہر سے ملبہ ہٹانے کے انتظامات کر رہے ہوں گے۔“

ایک پارٹی کے سیاستدان نے کہا۔ ”ہمیں اس قبر میں دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ یہاں دم گھٹ رہا ہے اور تم انتظار کرنے کو کہہ رہے ہو؟ ایک بات اچھی طرح سمجھ لو کہ یہاں پارٹی لیڈر نہیں ہو۔ چلو اور ہمارے ساتھ محنت کرو۔ اگر باہر سے ملبہ ہٹانے کی آوازیں سنائی دیں گی تو پھر ہم محنت نہیں کریں گے۔ آرام سے آقاؤں کی طرح باہر چلے جائیں گے۔“

نیک نام کی پارٹی کے سیاستدان نے بھی کہا۔ ”ہو سکتا ہے‘ ہیلی کاپٹر والوں کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔ ایسی صورت میں ہمارے کسی آدمی کو ہمارے زندہ دفن ہونے کی

اطلاع نہیں ملے گی۔ لہٰذا دانشمندی یہی ہے کہ بیرونی امداد پہنچنے تک محنت کی جائے۔ چلو وقت برباد نہ کرو۔"

بلند مقام اور نیک نام مجبور ہو کر اُن کے ساتھ دہانے کی طرف گئے۔ اب وہاں غار کا دہانہ نہیں رہا تھا صرف ملبہ ہی ملبہ تھا اور یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی دور تک دبیز دیوار بن گئی ہے۔ وہ آقا اور غلام وہاں سے مٹی اور پتھر ہٹانے لگے۔ بقول علامہ اقبال وہاں کوئی بندہ رہا تھا' نہ بندہ نواز۔

☆==========☆==========☆

اس ہیلی کاپٹر میں سینٹرل انٹیلی جنس بیورو کے تین جاسوس اور بھارتی خفیہ تنظیم "را" کے دو ایجنٹ تھے۔ وہ دونوں' سپر پاور کے تعاون سے علامہ اور قائداعظم کو اغوا کر کے بھارت لے جانے آئے تھے۔ جیسی ٹھوس پلاننگ کی گئی تھی اس سے یقین تھا کہ ان بزرگوں کو بچانے فوج نہیں آئے گی۔ وہ سرحدوں پر مصروف رہے گی۔ ملک کے اندر دہشت گردی کے باعث پولیس اور انتظامیہ بھی اِن بزرگوں کو تحفظ نہیں دے سکے گی۔ ایسے میں ایک کامیاب اغوا کی واردات سے انہیں کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

جب غار کا دہانہ بند ہو گیا تو دشمنوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان پاکستانی اکابرین کی حکمتِ عملی کیا تھی۔ بات یہ سمجھ میں آئی کہ غار کے اندر ایک دوسرے پر فائرنگ اور بلاسٹنگ کرنے کے باعث دہانے پر ملبے کا ڈھیر لگ گیا ہے۔

ان کے پاس ملبہ ہٹانے کے لئے بلڈوزر اور کرین وغیرہ نہیں تھی۔ انہوں نے موبائل فون کے ذریعے دوبارہ رابطہ کیا تھا۔ دوسری بار جواب میں شکستہ اور ناقابلِ فہم سی آوازیں سنائی دی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوا تھا کہ غار کے اندر ان کے لوگ زندہ ہیں۔

تب "را" کے ایک ایجنٹ نے اپنے دیس کی وزارتِ خارجہ سے رابطہ کیا اور سی آئی بی کے ایک جاسوس نے امریکی سفیر کو بتایا کہ منزل قریب آتے آتے دور ہو گئی ہے۔ علامہ اور قائداعظم ہاتھ آتے آتے ذرا ہاتھ سے پھسل گئے ہیں مگر بازی ابھی اپنے ہی ہاتھ میں ہے۔ غار کے دہانے سے ملبے کو ہٹا کر ان دونوں کو بھارتی ایجنٹوں کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ ہمارے سب سے بڑے کٹھ پتلی سیاستداں بلند مقام اور نیک نام بھی اسی غار میں پھنسے ہوئے ہیں۔

یہ باتیں تمام بھارتی اور امریکی حکام تک پہنچائی گئیں۔ دونوں ممالک کے اکابرین سر جوڑ کر سوچنے لگے۔ پھر بھارتی ایجنٹوں سے کہا گیا کہ وہ عارضی طور پر واپس چلے جائیں۔ پہلے ملبہ ہٹا کر مدفون افراد کو باہر نکالنا ضروری ہے اور جب اسلام آباد کی ایک پہاڑی کے

قریب بلڈوزر اور کرین وغیرہ پہنچانے کی بات کی جائے گی تو پاکستانی اور غیر ملکی صحافیوں سے یہ بات چھپی نہیں رہے گی کہ اس غار میں کتنی اہم ہستیاں بند ہو گئی ہیں۔ ایسے میں "را" کے ایجنٹوں کو وہاں نہیں رہنا چاہئے۔

بھارتی فوج کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ "اگر ہم جنگ جاری رکھیں گے تو پورے پنجاب کو فتح کرتے ہوئے اسلام آباد تک پہنچ جائیں گے۔ پھر اس پہاڑ کے اندر سے علامہ اور قائداعظم کو بھی نکال لے جائیں گے۔"

امریکی ایجنٹ نے کہا۔ "زیادہ خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی۔ تم نے پچھلی رات سے جنگ لڑتے ہوئے کیا یہ نہیں دیکھا ہے کہ میزائل تو ہر ملک کی فوج کے پاس ہوتے ہیں لیکن پاکستانی فوج نے ایٹمی میزائل استعمال کئے ہیں۔ کیا اس سے یقین کی حد تک اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے پاس ایٹم بم بھی ہیں اگر تم دونوں نے ایک دوسرے پر ایٹم بم برسائے تو دونوں ملک کھنڈر ہو جائیں گے۔"

بڑے بڑے ممالک بھی ایک دوسرے کو اپنے ایٹم بموں کی دھمکیاں دیتے ہیں لیکن انہیں استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ جوابی کارروائی کے طور پر حالتِ جنگ میں رہنے والے ہر ملک کی تباہی لازمی ہوتی ہے۔ دنیا کے تمام ممالک ایٹم بم محض اس لئے بناتے ہیں کہ ان کی موجودگی کے خوف سے دشمن ملک جنگ تو لڑ سکتا ہے مگر کوئی تباہ کن اور فیصلہ کن حملہ نہیں کر سکتا۔

امریکی ایجنٹ نے بھارتی فوج کے افسر سے کہا۔ "تم سے معاہدہ ہوا تھا کہ صرف دو دنوں تک پاکستان پر حملے کرو گے پھر ہم سیز فائر کرا دیں گے۔ لہٰذا اب یہ جنگ بند کرو۔ ہم کسی دوسری حکمت عملی سے علامہ اور قائداعظم کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔"

صبح ہونے سے پہلے ہی کئی ممالک کے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بتایا گیا کہ دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے امریکا کی کوششوں سے پاکستان اور بھارت کی جنگ بند ہو گئی ہے۔ دونوں ممالک کے اکابرین مذاکرات کی میز پر ایک دوسرے کی شکایت دور کریں گے۔

ادھر پاک آرمی کے افسران اور پاکستانی پریس کو بتایا گیا کہ چند دشمنوں نے سابقہ حکمرانوں بلند مقام اور نیک نام کو اغوا کیا تھا اور انہیں ایک پہاڑ کے غار میں پہنچا دیا تھا۔ اب اس غار کا دہانہ بند ہو چکا ہے۔ لہٰذا فوراً دہانے سے تمام ملبہ ہٹا کر سابقہ حکمرانوں کو وہاں سے نکالا جائے۔

صبح ہونے تک پاک آرمی کے جوان وہاں بلڈوزر اور کرین وغیرہ لے کر پہنچ گئے۔

اخبارات کے رپورٹر اور فوٹو گرافر اور بیرونی ممالک کے اخباری نمائندوں کی بھی بھیڑ لگ گئی۔ بلند مقام اور نیک نام کی پارٹیوں کے جوشیلے کارکن بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ علامہ اور قائداعظم کے ہم شکل بزرگوں نے ان کے محبِ وطن لیڈروں بلند مقام اور نیک نام کو اغوا کر کے انہیں اس پہاڑ میں زندہ دفن کرا دیا ہے۔ ان ہم شکل بزرگوں کو گرفتار کیا جائے۔

پتا چلا وہ دونوں بزرگ اپنی رہائش گاہ میں نہیں ہیں۔ وہ پچھلے روز عوامی رابطے کے لئے ایک فوجی افسر اور چار فوجی جوانوں کے ساتھ شہر میں گشت کرنے نکلے تھے۔ پھر انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ آرمی ہیڈکوارٹر میں بھی نہیں تھے اور فوج کو دشمن سے جنگ لڑنے میں اتنا مصروف کر دیا گیا تھا کہ وہ ملک کے اندرونی معاملات پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔

اب یہ شوشہ چھوڑا جا رہا تھا کہ وہ دو بزرگ عوام سے رابطہ کرنے کے لئے اپنی رہائش گاہ سے نہیں نکلے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنے چند آدمیوں کے ذریعے بلند مقام اور نیک نام کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو کر ان سیاستدانوں کو غار میں بند کر کے خود کہیں روپوش ہو گئے تھے۔

سیاست میں اکثر بے تکے الزامات عوام کو الجھا دیتے ہیں۔ جنہیں الزامات عائد کرنے کا فن آتا ہے' وہ بڑی کامیابی سے سیاہ کو سفید اور جھوٹ کو سچ بنا دیتے ہیں۔ اب ان کے ہم شکل ہونے والی بات کو اچھالا جا رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ وہ دونوں کسی دشمن ملک کے ایجنٹ تھے۔ علامہ اور قائداعظم کے بہروپ میں آئے تھے۔ انہوں نے اپنا رول عمدگی سے نبھا کر عوام اور فوج کو دھوکا دیا تھا۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ بلند مقام اور نیک نام جیسے محبِ وطن سیاستدانوں کو ہلاک کر دیں تاکہ پاکستان کبھی ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن نہ رہ سکے۔

یہ غلط کو صحیح بنا کر پیش کرنے والی سیاست اور خوشحالی اور ترقی کا فریب دینے والی مکاری نصف صدی سے چلی آ رہی تھی اور جب یہ رواج بن جائے اور مزاج بن جائے تو مفاد پرست اپنے باپ پر اور اپنی ماں پر بھی الزامات عائد کرنے سے نہیں چوکتے۔ پھر ایسے لوگ بھلا علامہ اور قائداعظم محمد علی جناح کو کہاں بخشنے والے تھے۔ پہلے انہیں اغوا کرنے کی کوشش کی۔ اب الزام تراشی ہو رہی تھی۔ اگر ملبہ ہٹ جاتا تو وہ ان بزرگوں کو سچائی بتانے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتے۔

ملبے کو ہٹانے سے پہلے امریکی ڈپلومیٹ یہی فیصلہ کر رہے تھے کہ علامہ اور قائداعظم

کو اس غار سے مُردہ اور بلند مقام اور نیک نام کو زندہ نکلنا چاہئے اور پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ وہاں اجتماعی مدفن میں کتنے زندہ ہیں اور کتنے مر چکے ہیں؟ انہوں نے پچھلے کئی برسوں میں بلند مقام اور نیک نام کو آزمایا تھا۔ وہ دونوں ایسے سچے تابعدار ثابت ہوئے تھے کہ انہیں جیسے نچایا جاتا تھا' ویسا ہی وہ اپنی قوم کے سینے پر کھڑے ہو کر ناچتے تھے۔ وہ ان کے حسبِ منشا فضول خرچ' عیاش اور لٹیرے تھے۔ قرضوں کے نام پر اس قدر قرضے لیتے رہے تھے کہ پھر قرض لینے کے لئے ملکی بینکوں میں کچھ نہ رہا تھا۔

پاکستان میں انہیں ایسے ہی سیاستدانوں کی ضرورت تھی۔ کبھی وہ بلند مقام اور کبھی نیک نام کو اس ملک میں حکومت بنانے کے سلسلے میں زبردست پشت پناہی کرتے تھے۔ وہ دونوں بہت بڑے جاگیردار تھے۔ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ زرعی ترقی سے ملکی مسائل حل ہو جائیں گے لیکن وہ مسائل حل کرنے کے لئے اپنی ہزاروں ایکڑ زمینیں آباد نہیں کرتے تھے۔ صرف چند سو ایکڑ زمینیں آباد کرنے سے انہیں اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ وہ مزے سے تفریحی سیاست کرتے تھے۔ باقی زمینوں پر غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے جانور پالتے تھے۔

ان کی زرعی ترقی یہ تھی کہ کسانوں سے فارم پر انگوٹھا لگوا کر زرعی بینکوں سے قرضے لیتے تھے اور یہ اعلان جاری رکھتے تھے کہ حکومت کسانوں کی فلاح کے لئے قرضے دیتی رہتی ہے۔

ان کی زرعی ترقی یہ تھی کہ وہ زرعی ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔ اپنے خلاف ٹیکس کا کوئی قانون ہی نہیں بنایا تھا۔ پھر یہ دھاندلی کرتے تھے کہ کوئی صنعتی یونٹ لگاتے تھے اور اس سے ہونے والی آمدنی کو زرعی آمدنی کے کھاتے میں ڈال کر ٹیکس بچاتے تھے۔

یہ روداد پاکستان ابھی اس مرحلے پر ہے کہ تمام قارئین اپنے دو محترم بزرگوں اور دو شیطان صفت سیاستدانوں کے متعلق معلوم کرنے کے لئے بے چین ہوں گے کہ اس مدفن میں ان پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا ملبہ ہٹا دیا جائے گا اور وہ سب زندہ سلامت باہر نکل آئیں گے؟

ویسے اس سلسلے میں بے چینی مناسب نہیں ہے۔ پڑھنے والوں نے اکثر یہی دیکھا ہے کہ ہر کہانی کا اہم کردار یا تو کسی مقصد کے لئے جان پر کھیل جاتا ہے یا اپنی ہیروئن کے ساتھ شادی کر کے ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہے۔ انجام شادی ہوتا ہے یا غم یا پھر شاعر کے مطابق ؎

جہاں تک ہو سکے اپنی روش کو

طریقِ عام سے ملنے نہ دینا
کہانی کی اسی میں آبرو ہے
اسے انجام سے ملنے نہ دینا

یہ ۲۰۰۱ء کے پہلے ماہ کی آخری رات ہے۔ یہ روداد پاکستان میں نے ہی شروع کی ہے۔ میں نے ہی کراچی میں قائداعظم سے اور لاہور میں علامہ اقبال سے ملاقات کی تھی۔ اب اس روداد کو انجام تک پہنچانا میرا فرض ہے لیکن یہ موضوع ایسا ہے کہ نباہنے کا فرض صرف میرا ہی نہیں، تمام پاکستانیوں کا ہے۔

ابھی ہم مدفن میں جائیں گے لیکن اس سے پہلے تمام پاکستانی یہ تو سوچیں کہ اس مدفن میں ہم اپنے محترم بزرگوں سے ملاقات کرنے جائیں گے یا پاکستان پر فاتحہ پڑھنے کے لئے اگر بتی لے کر جائیں گے؟

علامہ اور قائداعظم سے میری ملاقات بہت مختصر رہی کیونکہ وہ اسلام آباد جا کر مصروف ہو گئے تھے۔ میں نے ملاقات کے دوران سوال کیا تھا اور کہا تھا۔ "میں ایک کہانی نویس ہوں۔ حتی الوسع سچ لکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ جب آپ حضرات کے متعلق لکھوں گا تو قارئین سوال کریں گے، کیا واقعی میں نے علامہ اور قائداعظم سے ملاقات کی تھی؟ تب میں اس سوال کا جواب کیا دوں گا؟"

قائداعظم نے جواباً فرمایا تھا۔ "ہمارے ملک میں کتنے ہی سوالات ہیں، جو آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی جواب طلب ہیں۔ پہلے ان کے جوابات کو سمجھو۔ جو سوال ہمارے بارے میں ہے اس کا جواب ہم یہاں سے جانے کے وقت دے دیں گے۔"

علامہ نے کہا۔ "اگر تم ایک ذمے دار مصنف ہو تو اپنے بے خبر پاکستانی بھائیوں کو بتاؤ کہ اتنی تباہیوں کے باوجود ہمارا ملک کنگال نہیں ہے۔ ہمارے وسائل بے پناہ ہیں اور ہماری زمین میں اتنے خزانے دفن ہیں کہ انہیں نکالا جائے تو صرف یہ نہیں ہم پاکستانی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے بلکہ تمام بیرونی قرضے بھی ادا ہو جائیں گے۔"

بے شک بات "مدفن" کی ہے۔ ہماری زمین میں بے حد و حساب خزانے دفن ہیں۔

پوٹھوہار پلیٹو، سندھ طاس، پشاور طاس، میانوالی، ہاکڑ، خراسان، راجن پور اور مکران کی زمینوں کی تہہ میں بے انتہا پٹرول ہے۔ بیرونی ممالک کے ماہرین اور او جی ڈی سی (آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ کارپوریشن) کی رپورٹ کے مطابق ہمارے مذکورہ علاقوں کی زمین کے نیچے ۴۵ بلین بیرل تیل کے ذخائر ہیں لیکن ہمارے سیاستدان آپس کی لڑائی میں اتنے

مصروف رہتے ہیں کہ تیل کے کنوئیں کھودنے کی مہم شروع نہیں کر پاتے۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک صرف پونے دو سو کنوئیں کھودے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ قدرتی گیس، کوئلہ، اینتھرا سائٹ، تانبا، کرومائٹ، لوہا، سنگِ مرمر اور چٹانی نمک وغیرہ ایسی معدنیات کے ذخائر ہیں کہ جن کی تفصیلات بیان کروں تو اپنے ملکی خزانوں سے بے خبر رہنے والوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جائیں گی۔ کیا سمجھنے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ حکمران جاگیردار اپنی ہزاروں ایکڑ زمین کاشت نہیں کراتے ہیں تاکہ زرعی معیشت اس قدر کمزور ہو جائے کہ یہ ملک ہمیشہ اس سپرپاور کا محتاج رہے، جو انہیں یہاں کا حکمران بناتا رہتا ہے۔

علامہ نے کہا تھا۔ "مجھے یورپ سے نہیں، اپنی قوم سے شکایت ہے۔"

اور میں جو روداد پاکستان لکھ رہا ہوں۔ اس میں قائداعظم نے بلند مقام اور نیک نام سے ایک اجلاس میں کہا تھا۔

"میں اپنی قوم سے کیا کہوں؟ قوم ناخواندہ ہوتی ہے اور غفلت میں اپنا ایک ووٹ دیتی ہے تو گویا تمہیں ایک چیک دیتی ہے۔ تم یہ چیک لے کر ملکی خزانے سے کروڑوں اور اربوں روپے کیش کراتے ہو۔

"جب جعلی دواؤں اور انجکشن وغیرہ کے ذریعے بچے مرتے ہیں تو ان بچوں کے والدین کو ماتم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ تمہیں جعلی دواؤں کا لائسنس اپنے ووٹ کے ذریعے دیتے ہیں۔

"میں اپنی قوم کی کمزور یادداشت کو کیا کہوں؟ یہ تمہاری پچھلی بدمعاشیاں اور لوٹ کھسوٹ بھول جاتی ہے اور پھر سے تمہیں مومن کامل سمجھ کر آئندہ پانچ برسوں کے لیے اپنے سروں پر مسلط کر لیتی ہے۔"

ایک برطانوی مصنفہ نے لکھا تھا۔ "ایک وقت تھا، جب ایک قوم (مسلمان) ایک ملک کی تلاش میں تھی۔ آج یہ ملک (پاکستان) ایک قوم کی تلاش میں ہے۔"

قائداعظم نے کہا۔ "میں کہتا ہوں، یہ قوم پاکستان بننے سے پہلے بھی پاکستان میں موجود تھی۔ میں تو ایسے مسلمان چاہتا ہوں، جو تمام فرقوں اور جماعتوں کو ایک وحدت میں پرو دیں، تب وہ پاکستانی قوم کہلائے گی۔

"کہاں ہیں ایسے مسلمان؟ تم کیسے مسلمان ہو کہ جنازے اٹھاتے وقت کلمۂ شہادت پڑھتے ہو اور قومی جہاد کے وقت یہ کلمہ بھول جاتے ہو۔

"ہماری قوم میں نباض یا ڈاکٹر نہیں ہیں۔ اس لیے جو پاگل ہیں، وہ ذہنی امراض کے

اسپتال میں نہیں پہنچتے' اسمبلی میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں اور کرسیاں اور مائیک توڑ دیتے ہیں۔"

میں ایک مصنف کی حیثیت سے تجزیہ کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ ہماری قوم نے ضمیر فروش سیاستدانوں سے نکاح پڑھوا لیا ہے۔ ایک جاہل وفا شعار اور کمزور بیوی کی طرح یہ ان سے لات جوتے کھاتی رہتی ہے اور انہیں اپنا مجازی خدا مانتی رہتی ہے۔

☆=========☆=========☆

اس پہاڑ کے سامنے دور تک مجمع لگ گیا تھا۔ جہاں تک نظریں جاتی تھیں' انسانوں کے سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ پولیس اور فوج کے جوان تمام لوگوں کو اس غار کے دہانے سے دور رکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ صرف غیر ملکی نمائندوں' اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کو ذرا قریب رہنے کی اجازت دی جارہی تھی۔ وہ تمام اخبارات والے یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ غار کے اندر لوگ زندہ ہیں یا مرچکے ہیں؟

بلند مقام اور نیک نام کی سیاسی پارٹیوں کے اہم سیاستداں موبائل فون کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایک فوجی افسر ٹرانسمیٹر استعمال کررہا تھا۔ ان سب کو جواباً آوازیں مل رہی تھیں مگر وہ ناقابلِ فہم تھیں۔ ویسے فوجی افسران کو یہ اندازہ ہو گیا کہ علامہ اور قائداعظم زندہ سلامت ہیں۔

دشمنوں کا یہ الزام غلط ثابت ہوا کہ وہ دونوں بزرگ کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔ وہ ان ہی سیاستدانوں کے ساتھ تھے' جن کے اغوا کا الزام ان پر لگایا جا رہا تھا۔ اب اس حقیقت کو سامنے آنا تھا کہ کس نے کس کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔

اگرچہ بلند مقام اور نیک نام جیسے مفاد پرست سیاستدانوں کی لوٹ کھسوٹ نے بڑی حد تک یہ واضح کردیا تھا کہ وہ محاسبے سے بچنے اور مقدمات سے کترانے کے لیے ان فرشتوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں' جو پہلی بار کھلی عدالت میں ان کا محاسبہ کرنے اور ان کے اصلی چہرے دکھانے والے تھے۔

لیکن دونوں سیاسی پارٹیوں کے کارکن اور زرخرید حمایتی اپنے لیڈروں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ جبکہ ان بزرگوں کے ساتھ فوجی افسر اور فوجی جوان غار کے اندر موجود تھے۔ ان حالات میں فوج کے اعلیٰ افسران کو حکم دیا کہ سیاسی اشتعال انگیز نعرے لگانے والوں کو گرفتار کیا جائے۔

فوجی جوان ان اشتعال میں آنے والوں اور جھوٹا الزام لگانے والوں کی پٹائی کرنے اور انہیں گرفتار کرنے لگے۔ ادھر فوجی انجینئر دہانے سے ملبہ ہٹانے کے لیے بلڈوزر سے

کام لینے لگے تو اچانک ہی غار کے اندر سے ایک زور دار دھماکہ سنائی دیا۔ جو قریب تھے' وہ دور بھاگنے لگے۔ پھر سب نے دور جا کر دیکھا' دہانے کے قریب پہاڑ کی جو اونچائی تھی وہ دھنس گئی تھی۔ مٹی' پتھر اور چٹانیں' غار کے خالی حصے میں بھر گئی تھیں۔ یعنی ملبہ غار کے اندر اور دور تک بھر گیا تھا اور اس دوسرے دھماکے کے نتیجے میں زندہ لوگوں کا کیا انجام ہوا تھا؟ تشویش اور تجسّس سب کے دلوں میں تھا۔

دھماکے کی آواز دیر تک گونجتی رہی پھر بتدریج کم ہوتے ہوتے پہلے جیسی خاموشی چھا گئی۔ ایک فوجی افسر نے پھر ٹرانسمیٹر سے رابطہ کیا۔ جواب میں پھر شکستہ سی ناقابلِ فہم آوازیں سنائی دیں۔ اس سے اندازہ ہو گیا کہ فوجی افسران بزرگوں کے ساتھ ابھی زندہ ہیں۔ یا پھر ان میں سے کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے ہوں گے۔ بلند مقام کے موبائل فون سے بھی ٹوٹی پھوٹی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ پتا نہیں کتنے ساتھیوں کے ساتھ ابھی زندہ تھا۔

وہ پہاڑ جہاں تک دھنس گیا تھا وہاں اوپر جا کر دیکھا جا سکتا تھا شاید اوپر سے غار کے اندر جانے کا کوئی راستہ بن گیا ہو لیکن اب کوئی پہاڑ کے قریب نہیں جا رہا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ اندر سے پھر دھماکہ ہو گا تو اوپر چڑھنے والے بھی پتھروں اور چٹانوں کے ساتھ غار کے باقی خلا میں جا کر دفن ہو جائیں گے۔

اور یہ ضروری نہیں تھا کہ پھر کوئی دھماکہ ہو۔ جو دھماکے ہو چکے تھے ان سے پہاڑ کا اندرونی حصہ اوپر تک کمزور ہو چکا ہو گا۔ پہاڑ پر چڑھنے والوں کے پاؤں کسی جگہ بھی اندر کی طرف دھنس سکتے تھے۔ یوں بھی کسی قبر پر کوئی پاؤں رکھ کر نہیں چڑھتا۔ ڈر لگتا ہے کہ قبر دھنسے گی تو وہ سیدھا اندر جا کر مردے کے گلے لگ جائے گا۔

وہ سب مُردہ نہیں تھے۔ ابھی زندہ تھے۔ ہینڈ گرینیڈ کا وہ دوسرا دھماکا کرنے کے بعد غار کے دور افتادہ حصے میں آ گئے تھے۔ ایک اندازہ تھا کہ نصف سے زیادہ غار پتھروں اور چٹانوں کے ٹکڑوں سے بھر گیا ہے۔ اب وہ جہاں تھے وہاں غبار چھٹ رہا تھا اور ٹارچ کی روشنی میں وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ادھر چار فوجی جوان شہید ہو چکے تھے۔ علامہ اور قائداعظم کے ساتھ فوجی افسر ابھی زندہ تھا۔

دوسری طرف سامنے کچھ فاصلے پر بلند مقام اور نیک نام مٹی دھول میں اٹے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے تمام آدمی دھماکے کے نتیجے میں جہنم واصل ہو گئے تھے۔ وہ دونوں بھی رو رہے تھے' گڑگڑا رہے تھے اور کبھی غصے سے جھنجلا کر پوچھ رہے تھے۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ ہمیں مارنا اور خود مرنا کیوں چاہتے ہو؟"

علامہ نے جواب دیا۔ "ہم تمہارے ساتھ منفی سیاست کو مار رہے ہیں۔ اگر یہاں سے اپنے جانے کا راستہ رکھتے تو تم لوگ کسی مکاری سے بھاگ نکلتے۔ پھر باہر پہنچتے ہی تمہیں سپرپاور کی طرف سے تحفظ حاصل ہو جاتا۔"

قائداعظم نے کہا۔ "یہ چالبازی سمجھ میں آ رہی ہے کہ تم دونوں کو عدالت میں جانے سے اور محاسبے سے بچانے کے لیے پاکستان کی سرحدوں پر جنگ چھیڑی گئی ہے۔ تم لوگوں نے دولت سے' طاقت سے اور طاقت سے بڑی طاقت سپرپاور کے تعاون سے اپنے تحفظ کا مکمل انتظام کر رکھا ہے۔ پاکستان کے اندر اور پاکستان کے باہر تمہیں کوئی نہیں مار سکتا مگر یہ جگہ ایسی ہے جہاں تمہارا سپرپاور باپ بھی آ کر نہیں بچا سکے گا۔"

"ہم مانتے ہیں۔ ہمارے تمام ہمدرد اور محافظ اس مدفن سے باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی اندر آ کر ہمیں نہیں بچا سکے گا۔ ہم تو مجبوری اور بے بسی سے اپنی مرضی کے خلاف مرنے والے ہیں مگر تم لوگ خودکشی کر رہے ہو۔"

علامہ نے کہا۔ "ہم نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کا حال پڑھا ہے۔ ہماری قوم کے جاں نثار اپنے سینوں پر بم باندھ کر دشمنوں کے ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے تھے اور یوں دشمنوں کو پسپا کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ملک کی خاطر سینوں پر بم باندھے۔ ہم بھی یہاں بم کے دھماکوں سے امریکی اثر و رسوخ کو ختم کر رہے ہیں۔ تم اسے خودکشی کہتے ہو' ہم اسے شہادت کہتے ہیں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا ہمارے مرنے کے بعد یہاں دوسرے بلند مقام اور نیک نام پیدا نہیں ہوں گے؟"

"اور تم کیا سمجھتے ہو' ہمارے بعد دوسرے علامہ اور قائداعظم اس ملک میں نہیں آئیں گے؟ کیا تم نے کبھی نہیں سنا کہ ہر فرعون کے لیے موسیٰ پیدا ہوتا ہے؟"

"کیا تم یہاں صرف ہمیں امریکا سے ہمیشہ کے لیے جدا کرنے یعنی ہلاک کرنے آئے تھے؟"

"ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اپنے مخالفوں کو قانون کے ہتھیاروں سے ایسی شکست دیتا آیا ہوں کہ وہ پھر کبھی سر اٹھانے کے قابل نہیں رہتے لیکن تم لوگ جیسی چالیں چلنے لگے تھے' اس سے یقین ہو گیا کہ تم دونوں سپرپاور کے اتنے مضبوط قلعے میں محفوظ ہو کہ پاکستان کا قانون اور پاکستان کی عدالتیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی لیکن میں بھی قانون دان ہوں۔ جب دنیاوی قانون کمزور پڑنے لگتا ہے تو قدرت کے قانون کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ لہٰذا یہ جو کچھ ہو رہا ہے' اسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔"

علامہ نے کہا۔ "ہم تمہیں ہلاک کرنے نہیں آئے تھے۔ یہ تمہارے اعمال ہیں' جو تمہیں اس مقام تک لے آئے ہیں۔ رہ گئی ہماری حیات و موت کی بات تو ہمیں اپنے ملک اور قوم کی خاطر جان دینے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔"

قائداعظم نے کہا۔ "میری رہائش گاہ میں ایک ڈائری پڑی ہے۔ میں اس میں یہ لکھ آیا ہوں کہ جب تم دونوں کو عدالت کے فیصلے سے یا قانونِ قدرت کے مطابق سزا مل جائے تو پاکستان میں کیسی حکومت قائم ہو گی۔

"اور وہ حکومت خیالی اور خوابوں والی نہیں ہو گی۔ ہم نے پاکستانی عوام کے لیے یہ ملک بنایا تھا۔ اس لیے یہاں بے شک و شبہ عوام کی حکومت قائم ہو گی۔

"اس سلسلے میں شرط یہ ہے کہ ہماری صرف تین ہدایات پر عمل کیا جائے۔ ہمارے ملک میں بے شمار قانون دان ہیں جو ہر حال میں قانون کی بالادستی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے دانشور ہیں جو یہاں اسلامی تہذیب اور اخلاقی اقدار کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور ایسے محب وطن سیاستدان تاریکی میں پڑے ہیں' جو ملک کے اندر اور باہر پاکستان کی معیشت کے استحکام اور پاکستان آرمی کی غیر معمولی دفاعی صلاحیتوں کا ڈنکا بجا سکتے ہیں۔

"لہٰذا میری پہلی ہدایت یہ ہے کہ افواجِ پاکستان نے میرا اور علامہ کا ساتھ دے کر ضمیر فروش سیاستدانوں کو بے نقاب کیا ہے اور ہم پر اعتماد کیا ہے۔ اسی طرح وہ ایسے قانون دانوں' دانشوروں اور محب وطن سیاستدانوں پر اعتماد کریں' جو دولت مند نہیں ہیں اور الیکشن میں کروڑوں روپے خرچ کر کے اسمبلیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔

"میری دوسری ہدایت یہ ہے کہ افواجِ پاکستان کے تعاون سے عدلیہ کو اس طرح کا آزاد رکھا جائے کہ آئندہ وہ کسی منفی سیاست کے دباؤ میں نہ رہے اور ملک میں جب بھی کوئی ضمیر فروش سیاستدان عوام کے اعتماد کو دھوکا دینا چاہے تو جج اور بیرسٹر اسے عدالت میں بلا کر کسی دباؤ میں آئے بغیر قانون کے آئینے میں اس کا اصلی مکروہ چہرہ دکھا دیں۔

"میری تیسری ہدایت یہ ہے کہ افواجِ پاکستان کے تعاون سے محب وطن غریب سیاستدانوں کے لیے اسمبلیوں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ الیکشن کے اخراجات نہ ہونے کے برابر ہوں۔ جس طرح عبادت گزار صاف ستھرا رہنے کے اخراجات برداشت کر کے مسجد میں داخل ہوتے ہیں' اسی طرح مومن سیاستداں بھی اتنے ہی اخراجات برداشت کر کے اسمبلیوں میں قدم رکھیں۔ کیونکہ اسمبلیوں سے ہی پاکستانی مسلمان کا ایمان بگڑتا ہے تو بن بھی سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دل اور دماغ کی طہارت کے ساتھ اسمبلیوں میں جائیں۔

”صرف تین‘ صرف یہی تین ہدایات ہیں۔ اگر ان پر عمل ہو گا تو انشاءاللہ پاکستان قیامت تک قائم رہے گا۔“

قائداعظم نے اتنا کہہ کر فوجی افسر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ افسر نے ان کے ہاتھوں میں ایک ہینڈ گرینیڈ دیا۔ دوسرا گرینیڈ علامہ صاحب کو پیش کیا اور تیسرا اپنے ہاتھ میں رکھا۔ پھر وہ تینوں غار کے دور افتادہ حصوں میں تین مختلف سمت جانے لگے۔ بلند مقام نے لرز کر پوچھا۔ ”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

وہ تین حصوں میں بٹ گئے تھے۔ قائداعظم نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”میری پہلی ملاقات ایک مصنف سے ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا تھا کہ اگر لوگ ہمارے متعلق سوال کریں گے ہم اصلی تھے یا بہروپ میں تھے تو وہ تحریر کے ذریعے کیا جواب دے گا؟ میں نے وہ جواب اپنی ڈائری کے صفحہ پر یوں لکھا ہے۔

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

اتنا کہتے ہی تینوں نے اپنے اپنے ہینڈ گرینیڈ کی ”پن“ نکالی۔ پھر ان تینوں کو تین سمتوں میں اچھال دیا۔

قسم ہے اس مدفن کی!

یہ قوم تیشہ تو اٹھائے۔ ارضِ پاک کے چپے چپے میں خزانے دفن ہیں۔ ”ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!“

=======ختم شد=======